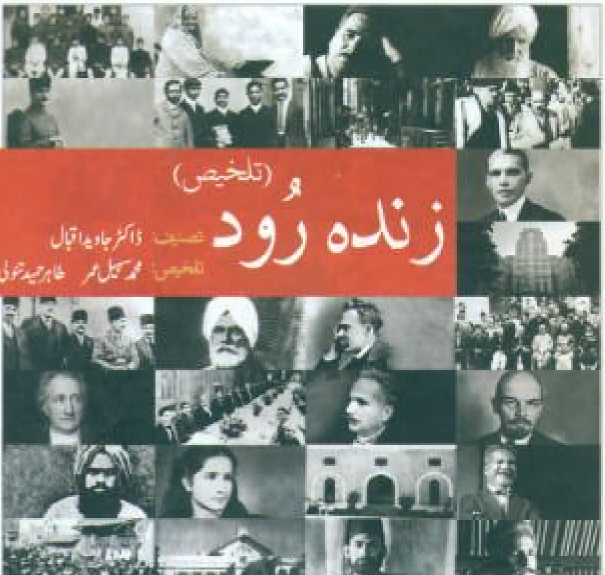

زندہ رُود
(تلخیص)

تصنیف: ڈاکٹر جاوید اقبال
تلخیص: محمد سہیل عمر   طاہر حمید تنولی

زندہ رُود (تلخیص)

ڈاکٹر جاوید اقبال

تلخیص: طاہر حمید تنولی

اقبال اکادمی پاکستان

جملہ حقوق محفوظ

ناشر

محمد سہیل عمر

ناظم

اقبال اکادمی پاکستان
(حکومتِ پاکستان، وزارت بین الصوبائی رابطہ)
چھٹی منزل، ایوانِ اقبال، لاہور

Tel: [+92-42] 36314-510
[+92-42] 99203-573
Fax: [+92-42] 3631-4496
Email: info@iap.gov.pk
Website: www.allamaiqbal.com

ISBN 978-969-416-463-2

طبع اوّل	:	۲۰۱۱ء
تعداد	:	۵۰۰
قیمت	:	-/۱۵۰ روپے
ٹائٹل ڈیزائن	:	خالد فیصل khalidfaisal@gmail.com
مطبع	:	شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور

محلِ فروخت: ۱۱۶ میکلوڈ روڈ، لاہور، فون نمبر ۳۷۳۵۷۲۱۴

فہرست

دیباچہ ڈاکٹر جاوید اقبال ۵
پیش لفظ ۷

تشکیلی دور [حصہ اوّل]

باب:۱ سلسلۂ اجداد ۱۱
باب:۲ خاندان سیالکوٹ میں ۲۳
باب:۳ تاریخِ ولادت کا مسئلہ ۳۱
باب:۴ بچپن اور لڑکپن ۴۷
باب:۵ گورنمنٹ کالج، لاہور ۶۷
باب:۶ تدریس و تحقیق ۷۵
باب:۷ یورپ ۹۳

وسطی دور [حصہ دوم]

باب:۸ فکرِ معاش ۱۱۵
باب:۹ ازدواجی زندگی کا بحران ۱۳۵
باب:۱۰ ذہنی ارتقا ۱۵۱
باب:۱۱ تخلیقی کرشمہ ۱۶۷

باب:۱۲	قلمی ہنگامہ	۱۸۹
باب:۱۳	خانہ نشینی	۲۱۱
باب:۱۴	ہندو مسلم تصادم کا ماحول	۲۳۵

اختتامی دور [حصہ سوم]

باب:۱۵	عملی سیاست کا خارزار	۲۵۹
باب:۱۶	دورۂ جنوبی ہند	۲۹۱
باب:۱۷	مسلم ریاست کا تصور	۳۲۱
باب:۱۸	گول میز کانفرنسیں	۳۴۷
باب:۱۹	افغانستان	۳۹۷
باب:۲۰	علالت	۴۱۷
باب:۲۱	آخری ایام	۴۵۵

دیباچہ

علامہ اقبال کی سوانح حیات زندہ رود کو جو عالمگیر پذیرائی ملی ہے اس کا نتیجہ ہے کہ یہ کتاب طبع مکرر کے مرحلوں سے بار بار گزر رہی ہے۔ اس کے تراجم دنیا کی مختلف زبانوں میں ہو رہے ہیں۔ فارسی میں جاویدانِ اقبال، عربی میں نہرالخالد کے نام سے اس کا ترجمہ شائع ہو چکا ہے جبکہ کئی دوسری زبانوں میں بھی ترجمے کا کام جاری ہے۔ زندہ رود کی اقبال کی ایک مستند سوانح حیات کے طور پر مقبولیت میرے لیے باعث مسرت ہے۔

اقبال اکادمی پاکستان نے بھی اس کتاب کے متعدد ایڈیشن شائع کیے۔ ازاں بعد یہ سنگ میل پبلشرز کے اشتراک سے بھی چھاپی گئی۔ موجودہ ایڈیشن جو اقبال اکادمی پاکستان کے زیر اہتمام شائع ہو رہا ہے، کتاب کا تلخیص شدہ ایڈیشن ہے۔ اقبال اکادمی پاکستان کے طاہر حمید تنولی نے محمد سہیل عمر صاحب کی نگرانی میں اس کی تلخیص کی ہے۔ میں نے تلخیص شدہ متن کو ملاحظہ کیا ہے اور جہاں ضروری سمجھا ہے کہیں کہیں قلم بھی لگایا ہے۔ کتاب میں وہ تمام تفصیلات موجود ہیں جو براہ راست علامہ کی زندگی، شخصیت، کارناموں اور فکر و فن کے ارتقا سے متعلق ہیں۔ اس ایڈیشن میں حوالہ جات اور تصاویر شامل نہیں کی گئیں جو اصل کتاب میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

عصر حاضر ایک تہذیبی بحران میں مبتلا ہے۔ آشوب کی اس گھڑی میں فکر اسلامی ایک کڑی آزمائش سے گذر رہی ہے۔ تہذیبوں کے تصادم کی اس فضا میں مغربی تہذیب و تمدن پر اقبال کی تنقیدی نظر سے ہم استفادہ کر سکتے ہیں کیونکہ بیسویں صدی میں علامہ سے بڑھ کر کسی نے اس تہذیب و ثقافت کا گہری نظر سے مطالعہ کر کے اساسی نتائج اخذ نہیں کیے جن کی مدد سے ہم اس تہذیب کا جائزہ لے کر بنیادی فیصلے کر سکتے۔ زندہ رود کا مطالعہ ہمیں صرف علامہ کے سوانح سے ہی آگاہ نہیں کرتا بلکہ اقبال کی جدوجہد، ذہنی ارتقا، تخلیقی کرشمے اور قلمی ہنگاموں کی تاریخ سے بھی شناسائی فراہم کرتا ہے۔ یوں عصر حاضر میں اقبال مسلمانوں کے لیے فکری رہنمائی کا ایک سرچشمہ ہے جو اب بھی تازہ کاری میں اپنی مثال نہیں رکھتا۔

دنیا بھر میں فکر اقبال کا مطالعہ ایک ایسی دانش کے طور پر کیا جا رہا ہے جس نے برصغیر کے مسلمانوں کو وہ نظریاتی اور سیاسی قوت فراہم کی جس پر پاکستان معرض وجود میں آیا، جو مذہبی اعتدال پسندی اور اسلام میں روشن خیالی کا استعارہ ہے اور جو مغرب اور مشرق میں رابطے اور تعلق کی اساس فراہم کرتا ہے۔ لہٰذا اقبال کا بطور ایک شخصیت اور مفکر کے مطالعہ از بس ضروری ہے۔ زندہ رود اسی مطالعے میں آپ کی مدد کرتی ہے کہ اس کے ذریعے اقبال کی شخصیت کی تفہیم کے وسیلے سے ان کی فکر سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔

موجودہ تلخیص شدہ اڈیشن کی اشاعت پر میں اقبال اکادمی پاکستان کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اس کتاب کے ذریعے طلبا اور اہل علم زندہ رود کی ضروری تفصیلات تک مختصر وقت میں رسائی حاصل کر سکیں گے۔

جاوید اقبال

پیش لفظ

علامہ اقبال کی ہماری قومی زندگی میں اہمیت، علمی وفکری عظمت اور عالمگیر شہرت کے باعث ان کی شاعری، فلسفہ اور عملی جدوجہد پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اور یوں اقبالیاتی ادب کا ایک وسیع ذخیرہ وجود میں آ چکا ہے۔ اس ذخیرۂ کتب کا ایک حصہ سوانح اقبال پر مشتمل ہے۔ علامہ کی سوانح پر لکھی جانے والی تحریریں اس لحاظ سے کلیدی اہمیت کی حامل ہیں کہ ان سے علامہ کے فکر وعمل اور قومی زندگی کی صورت گری کے لیے ان کی خدمات کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔

علامہ کی سوانح پر لکھی گئی ابتدائی کتب میں چراغ حسن حسرت کی حیات اقبال، محمد طاہر فاروقی کی سیرت اقبال، عبدالسلام ندوی کی اقبال کامل اور عبدالمجید سالک کی ذکر اقبال شامل ہیں۔ ان کے بعد بھی اقبال کی سوانح، مجالس، ملفوظات اور ان کی خانگی زندگی کے بارے میں کئی کتب منظر عام پر آئیں۔ زندہ رود اقبال کی سوانح پر لکھی جانے والی تمام کتب میں اپنی جامعیت اور تحقیقی استناد کے حوالے سے امتیازی حیثیت کی حامل ہے۔ اس میں علامہ کی زندگی کے واقعات، علمی وفکری ارتقا اور علامہ کی عملی جدوجہد کو زمانی ترتیب سے بیان کر دیا گیا ہے۔ ہر واقعے سے متعلق معاصر حالات اور واقعات کا تفصیلی تذکرہ بھی موجود ہے جس سے قاری اس ماحول کو بہ آسانی سمجھ سکتا ہے جس کے دائرے میں علامہ اپنا تخلیقی سفر طے کر رہے تھے۔ واقعات کی تحقیق کا حق بھی ادا کیا گیا ہے اور سوانح سے متعلق دستیاب کم وبیش تمام تاریخی حوالے اکٹھے کر دیے گئے ہیں۔ اس کتاب کی اہمیت کے پیش نظر اس پر ایم فل کی سطح کا تحقیقی مقالہ بھی لکھا جا چکا ہے۔

زندہ رود کی تلخیص آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اس میں تاریخی تفصیلات اور حواشی وحوالہ جات کو حذف کر دیا گیا ہے اور بقیہ مواد کا اختصار کیا گیا ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ وہ تمام واقعات

جو علامہ کی زندگی سے متعلق ہیں اور جن سے ان کے شخصی، علمی، فکری و فنی ارتقا اور قومی خدمات کی وضاحت ہوتی ہو انھیں اس بیانیے کا حصہ بنایا جائے۔ طباعت سے قبل تلخیص شدہ متن کو جناب ڈاکٹر جاوید اقبال نے بھی ملاحظہ فرمایا اور اس کی اشاعت کی اجازت دی۔ امید ہے کہ قارئین اس کے مطالعہ سے اقبال کی سوانح سے متعلق ضروری معلومات ضرور حاصل کر سکیں گے۔ تاریخی تفصیلات اور حوالہ جات کے لیے اصل کتاب سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔

محمد سہیل عمر/ طاہر حمید تنولی

تشکیلی دور

(حصہ اوّل)

باب:۱

سلسلۂ اجداد

ایک قلمی رجسٹری شدہ دستاویز میں اقبال نے اپنی قومیّت سپرو (کشمیری پنڈت) تحریر کی ہے۔ان کے جدّ اعلیٰ جنہوں نے اسلام قبول کیا، بابا لول حج یا لولی حاجی کے لقب سے پکارے جاتے تھے۔محمد دین فوقؔ اقبال کے احباب میں سے تھے اور ان کے والد کو بھی جانتے تھے۔ فوق نے اپنی کتاب مشاہیر کشمیر (جو ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئی) اور پھر اپنے مضمون بعنوان ''ڈاکٹر شیخ سر محمد اقبال'' (نیرنگ خیال، لاہور، اشاعت ستمبر، اکتوبر ۱۹۳۲ئ) میں تحریر کیا:

شیخ صاحب کا کشمیری پنڈتوں کے ایک قدیم خاندان سے تعلق ہے......شیخ صاحب کے جدّ اعلیٰ قریباً سوا دوسو سال ہوئے، مسلمان ہو گئے تھے۔گوت ان کی سپرو تھی۔

۱۹۳۴ء میں فوقؔ تاریخ اقوام کشمیر (جلد اوّل) میں تحریر کرتے ہیں کہ لفظ ''سپروٗ'' پر مزید تحقیق کے لیے انہوں نے اقبال سے رجوع کیا، جواب میں (محرّرہ ۱۶ جنوری ۱۹۳۴ئ) اقبال نے انہیں لکھا:

جب مسلمانوں کا کشمیر میں دور دورہ ہوا تو برہمنۂ کشمیر کے جس گروہ نے سب سے پہلے فارسی زبان وغیرہ کی طرف توجہ کی اور اس میں امتیاز حاصل کر کے حکومتِ اسلامیہ کا اعتماد حاصل کیا، وہ ''سپروٗ'' کہلایا۔''س'' تقدیم کے لیے کئی زبانوں میں آتا ہے اور ''پروٗ'' کا رُوٹ وہی ہے، جو ہمارے مصدر ''پڑھنا'' کا ہے۔ والد مرحوم کہتے تھے کہ یہ نام کشمیر کے برہمنوں نے اپنے ان بھائی بندوں کو از راہِ تعریض وتحقیر دیا تھا، جنہوں نے قدیم رسوم وتعصّباتِ قومی و مذہبی کو چھوڑ کر سب سے پہلے اسلامی زبان وعلوم کو سیکھنا شروع کیا تھا، جو رفتہ رفتہ ایک مستقل گوت ہو کر مشہور ہو گیا۔

اسی خط میں اقبال تحریر کرتے ہیں:

دیوان ٹیک چند ایم اے نے، جو پنجاب میں کمشنر تھے اور جن کو زبانوں کی تحقیق کا شوق تھا، ایک دفعہ انبالے میں مجھ سے کہا کہ لفظ ''سپرو'' کا تعلق ایران کے قدیم بادشاہ شاپور سے ہے اور ''سپرو'' حقیقت میں ایرانی ہیں، جو اسلام سے بہت پہلے ایران کو چھوڑ کر کشمیر میں آباد ہوئے اور اپنی ذہانت وفطانت کی وجہ سے برہمنوں میں داخل ہو گئے۔

فوق، تحریر کرتے ہیں کہ مسلمانوں میں اقبال کا خاندان، جن کے جدّ اعلیٰ سوا دو سو سال ہوئے عالمگیر کے زمانے میں مسلمان ہو گئے تھے؛ بہت مشہور ہے۔ پھر تاریخ اقوام کشمیر (جلد دوم) میں اقبال کے اسی خط کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ پنجاب میں کوئی اور گھر مسلمان سپروؤں کا نہیں، البتہ ہندو سپروؤں کے چند نام انہوں نے کتاب میں درج کئے ہیں۔

اقبال نے اپنے اجداد کا سراغ لگانے کے لئے ۱۵ اکتوبر ۱۹۲۵ء کو اپنے برادر شیخ عطا محمد کو لکھا۔

آپ اور والد مکرم یہ سن کر خوش ہوں گے کہ مدت کی جستجو کے بعد آج اپنے بزرگوں کا سراغ مل گیا ہے۔ حضرت بابا لول حج، کشمیر کے مشہور مشائخ میں سے تھے۔ ان کا ذکر خواجہ اعظم کی ''تاریخ کشمیر'' میں اتفاقاً مل گیا ہے۔ ان کا اصل گاؤں ''لوچر'' نہ تھا بلکہ موضع چکو پرگنہ آدون تھا۔ بارہ سال کشمیر سے باہر رہے اور مختلف ممالک کی سیر میں مصروف رہے۔ اشارۂ غیبی پا کر حضرت بابا نصر الدین کے مرید ہوئے۔ بقیہ عمر انہوں نے بابا نصر الدین کی صحبت میں گزاری اور اپنے مرشد کے جوار میں مدفون ہیں۔ میں خواجہ اعظم کی ''تاریخ کشمیر'' کا قلمی نسخہ دیکھ رہا تھا۔ دو چار ورق ہی الٹے تھے کہ بابا صاحب کا تذکرہ مل گیا، جس سے مجھ کو بڑی خوشی ہوئی۔ غالباً بابا نصر الدین کی اولاد کشمیر میں ہو گی۔

اقبال کے جدّ اعلیٰ بابا لول حج یا لولی حاجی کے متعلق اس ماخذ کا علم فوق کو بھی تھا اور اس کا ذریعہ غالباً اقبال خود تھے۔ فوق اپنی تصنیف تاریخ اقوام کشمیر (مطبوعہ ۱۹۴۳ئ) جو اقبال کی وفات کے پانچ سال بعد شائع ہوئی، میں تحریر کرتے ہیں:

سلطان زین العابدین بڈشاہ کے زمانے (تخت نشینی ۸۲۴ھ وفات ۸۷۴ھ) میں حضرت شیخ العالم شیخ نورالدین ولی کے ارادت مندوں میں حضرت بابا نصر الدین ایک بہت بڑے بزرگ گزرے ہیں۔ حضرت شیخ العالم نے اپنے اشعار (کشمیری) میں اپنے اس نامور خلیفہ کا بہت کچھ ذکر کیا ہے۔ بابا نصر الدین کے مریدوں میں بابا لولی حاجی ایک بزرگ تھے، جنہوں نے کئی حج کیے تھے اور بارہ سال تک کشمیر سے باہر سیر و سیاحت ہی میں رہے تھے۔ چنانچہ مصنف

تاریخ کشمیر اعظمی صفحہ ۷۲ پر لکھتا ہے کہ:

دوازدہ سال سیاست کردہ بہ کشمیر آمدہ۔ باشارات غیبی مرید حضرت بابا نصر الدین شد و بقیۂ عمر در خدمت و صحبتِ او گزرانید۔ ان کا اصل نام معلوم نہ ہو سکا۔ لول حج یا لولی حاجی کے نام سے انہوں نے شہرت پائی۔ انہوں نے کئی حج پا پیادہ کیے تھے۔ لول یا لالہ یا لال کشمیر میں پیار یا عزت کا لفظ ہے۔ جیسے بڑے بھائی کو کاک لال کہتے ہیں۔ وطن ان کا پرگنہ آدوِن کے موضع چکو میں تھا۔ قبول اسلام سے قبل ذات کے برہمن تھے، گوت سپرو تھی۔ پیشہ ان کا زراعت کاری اور زمینداری تھا، لیکن جب فقر اختیار کیا تو سب باتوں سے کنارہ کش ہو گئے۔ آپ کی قبر چرار شریف میں احاطۂ مزار شیخ نور الدین ولی کے اندر ہے۔ جہاں ان کے مرشد بابا نصر الدین بھی مدفون ہیں۔ چنانچہ صاحب تاریخ کشمیر اعظمی لکھتے ہیں: وقت رحلت در آستانۂ چرار در جوار پیر بزرگوار آسود۔

فوق نے بابا لول حج کے متعلق دیدہ مری کی تحریر دیکھنے کے بعد، جو کچھ اپنی طرف سے لکھا ہے، وہ اس سلسلہ میں کوئی سند پیش نہیں کرتے۔

بابا لول حج کا تذکرہ دیدہ مری سے تقریباً ڈیڑھ سو سال بعد ابو محمد حاجی محی الدین مسکین کی تالیف تحائف الابرار فی الاولیاء الاخیار (تاریخِ کبیر کشمیر ۱۹۰۳ء) کے رشیوں کے باب میں بھی مندرجہ ذیل الفاظ میں ملتا ہے:

ولادتش در موضع چکو حلبند پرگنہ آدوِن بود۔ ہر دو چشم و پایش کج بودند۔ پس دیرا داعیہ تزویج بظہور آمد و بازنی عقدِ نکاح بربست۔ چوں منکوحہ اش صورت ویرا بدید و بخندید، دلِ بابا از دی متنفر گردید۔ پس کمر ہمت بربستہ برآمد۔ سفرِ زیارتِ حرمین شریفین نمود و پس از تشریف یابی بزیارتِ مبارک چوں مراجعت بجانب کشمیر کرد، در خدمتِ بابا نصر الدین رومی ارادت آوردہ گوئی تجرید و تفرید ربود۔ چوں رحلت کرد، در مقبرہ مرشد آسود، و بعضی نوشتہ اند کہ در قریۂ زالرہ پرگنۂ کامراج مدفون است۔

روزگار فقیر جلد دوم میں شیخ اعجاز احمد (برادرزادہ اقبال) کے حوالے سے نہ صرف اقبال کے خط محررّہ ۱۵ اکتوبر ۱۹۲۵ء کا ذکر ہے، بلکہ شیخ اعجاز احمد کی سند پر یہ بھی لکھا ہے کہ اقبال کے بزرگوں کی ایک ولی عارف سے عقیدت، ان کے بزرگوں کے اسلام لانے کا سبب اور ذریعہ بن گئی اور یہ اب سے ڈھائی سو سال پہلے کی بات ہے، جب اقبال کے گھرانے میں ایمان و اسلام کی روشنی نمودار ہوئی۔ شیخ اعجاز احمد بیان کرتے ہیں کہ ان کے دادا نے اپنے بزرگوں کی زبانی سُنا تھا کہ ان کے آباء میں ایک بزرگ نے اتنی مرتبہ پا پیادہ حج کیا کہ ان کا لقب ہی لول حج (حج کا عاشق) پڑ گیا۔

یعنی سپرو دراصل شاپور کی اولاد یا ایرانی النسل ہیں۔ اس کے متعلق تاریخی شواہد موجود نہیں۔ البتہ مسکین کے ایک اقتباس سے یہ سراغ ملتا ہے کہ کشمیر میں ایک آتش پرست راہب شاپور نامی نے کسی شہر میں سید علی ہمدانی سے مرعوب ہوکر اسلام قبول کیا تھا۔

خواجہ حسن نظامی نے بھی اقبال پر اپنے مضمون میں یومِ اقبال کے موقع پر دہلی میں مقیم مصری سفیر کی تقریر کا ذکر کیا ہے، کہ کشمیری برہمنوں کا تعلق مصر سے ہے۔ تاہم ایسی توجیہات پر تبصرہ کرنا بیکار ہے کہ ان کے بارے میں بھی ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری کا ایک مضمون پہلے ہفتہ وار، قومی آواز، لکھنؤ (۲۴ فروری ۱۹۸۰ئ) میں اور دوسری بار چند تبدیلیوں کے ساتھ روز نامہ آفتاب سری نگر (۲۱ اپریل ۱۹۸۱ئ) میں شائع ہوا۔ اکبر حیدری فرماتے ہیں کہ دراصل فوق نے اقبال اور دیگر لوگوں کو اس غلط فہمی میں مبتلا کیا ہے کہ اقبال کشمیری برہمن زاد اور سپرو خاندان سے منسوب تھے۔ اس نے لفظ سپرو کی تشریح کے متعلق بھی افسانہ گھڑ دیا، بلکہ اپنے پہلے مضمون میں تحریر کرتے ہیں کہ اقبال کے حالاتِ زندگی سر عبدالقادر نے لکھے جو رسالہ خدنگ نظر لکھنؤ کے شمارہ مئی ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئے، لیکن سر عبدالقادر نے اپنے اس مضمون میں اقبال کے خاندان کے بارے میں ایسی کوئی بات نہیں کہی۔ مگر اکبر حیدری کا یہ بیان درست نہیں۔ سر عبدالقادر نے بھی متذکرہ مضمون میں تحریر کیا ہے کہ شیخ صاحب (اقبال) کشمیری الاصل ہیں اور ان کا کشمیری پنڈتوں کے ایک قدیم خاندان سے تعلق ہے، جس کی ایک شاخ اب تک وطن اصلی میں موجود ہے۔ خاندان کی وہ شاخ جس میں شیخ صاحب ہیں، دوسو سال ہوئے مسلمان ہوگئی۔ گوت ان کی ''سیفرو'' ہے اور ان کے بزرگوں کا اسلام پر ایمان لانا ایک ولی کے ساتھ عقیدت کی وجہ سے ہوا۔ بات دراصل یہ ہے کہ فوق اور عبدالقادر کو یہ معلومات اقبال یا ان کے والد نے فراہم کی تھیں۔ اکبر حیدری کی کوشش کہ لفظ ''سپرو'' کی جو تشریح فوق نے نہیں بلکہ والدِ اقبال یا خود اقبال نے بذاتِ خود پیش کی ہے، وہ کسی بھی تاریخی کتاب میں موجود نہیں۔ اقبال کو اپنے والد ہی سے یہ معلوم ہوا تھا کہ ان کے جدِ اعلیٰ جنہوں نے اسلام قبول کیا، بابا لول حج کے لقب سے پکارے جاتے تھے۔ بابا لول حج کے اصل پیر و مرشد شیخ نور الدین ولی رشی بھی تو اہل وعیال کو چھوڑ کر تارک الدنیا ہو گئے تھے۔ یہ کہنا درست نہیں کہ رشی کے لیے شادی ممنوع تھی، بلکہ شرط یہ تھی کہ اگر اولاد و ازدواج سے وابستگی ہے تو وہ اس تعلق کو توڑ کر ان سے مستقل علیحدگی، کنارہ کشی یا فراغت اختیار کر لے۔ سو خاندانی روایت کے مطابق بابا صاحب اسلام قبول کرنے سے پیشتر

ذات کے برہمن اور گوت کے ''سپرو'' تھے۔ البتہ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ان کا ہندو نام کیا تھا۔ یا اسلامی نام کیا رکھا گیا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بابا صاحب نے اپنا روایتی مذہب چھوڑ کر اسلام کیوں قبول کیا؟ اس کا جواب متذکرہ کتب میں موجود نہیں۔

فوق تحریر کرتے ہیں کہ اقبال کے بزرگوں کا اسلام پر ایمان لانا ایک ولی کے ساتھ عقیدت کی وجہ سے ہوا، اور وہ حسن عقیدت آج بھی ان کے خاندان میں موجود ہے۔ بہر حال یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ دائرہ اسلام میں آنے کے بعد بابا صاحب کا نکاح کسی مسلم گھرانے کی خاتون سے ہوا ہو۔ بارہ سال کی ہجرت کے بعد جب وہ واپس کشمیر آئے تو انہیں وہ اشارۂ غیبی ملا جس کا انہیں انتظار تھا اور انہوں نے بابا نصر الدین کی مریدی اختیار کر کے سلسلہ رشیاں سے وابستگی پیدا کر لی۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اقبال کے جد اعلیٰ کب مسلمان ہوئے؟ ولادت اقبال سے تقریباً سوا دو یا ڈھائی سو سال پیشتر ان کے بزرگوں نے اسلام قبول کیا تھا۔ فوق نے لکھا ہے کہ وہ تقریباً سوا دو سو سال ہوئے، عالمگیر کے زمانے میں مشرف بہ اسلام ہوئے تھے لیکن یہ بات درست معلوم نہیں ہوتی، بلکہ فوق کی اپنی تحریریں اسے غلط ثابت کرتی ہیں۔ فوق نے اپنی تصنیف تاریخ بڈشاہی مطبوعہ ۱۹۴۴ء کے باب عہد بڈشاہی کے علماء و مشائخ میں جن علماء و مشائخ یا سلسلہ رشیاں سے منسلک، بڈشاہ کے زمانے کے جن صوفیہ کے نام درج کیے ہیں، ان میں شیخ نور الدین ولی رشی اور شیخ نصر الدین کے ساتھ بابا لولی حاجی کا ذکر بھی کیا ہے۔ بڈشاہ ۱۴۲۰ء میں تخت کشمیر پر بیٹھا اور ۱۴۷۰ء میں اس نے وفات پائی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال کے جد اعلیٰ پندرہویں صدی میں مسلمان ہوئے، یعنی اقبال کی پیدائش سے تقریباً ساڑھے چار سو سال قبل، اور ظہیر الدین بابر کے ہندوستان میں ورود سے تقریباً ایک سو سال پہلے، جب تخت دہلی پر سادات یا ان کے بعد سلطان بہلول لودھی کا قبضہ تھا۔ پنجاب کے بیشتر حصہ پر جسرت گکھڑ حاوی تھا اور دکن میں بہمنی خاندان کی حکومت تھی۔

تیرہویں صدی کے شروع میں کشمیر پر شہمیری خاندان قابض ہوا۔ اس ترکی النسل مسلم خاندان کا بانی شاہ میر جو بعد میں سلطان شمس الدین کے نام سے کشمیر کا بادشاہ بنا، شمالی افغانستان کے علاقہ پنج گور (پنج کوڑہ) سے کشمیر آیا تھا۔ فوق کے اندازے کے مطابق فارسی بطور سرکاری زبان ۱۲۹۵ء میں کشمیر میں رائج ہوئی اور غالباً اسی دور میں کشمیری براہمنہ کے ایک گروہ نے قدیم قومی و مذہبی رسوم و تعصّبات کو خیر باد کہہ کر اسلامی زبان و علوم کی طرف رجوع کیا جو رفتہ رفتہ

ایک مستقل گوت کی ہیئت میں ''سپرو'' کہلایا۔

شہمیری خاندان کے مشہور سلاطین شہاب الدین، قطب الدین اور سکندر بت شکن ہو گزرے ہیں لیکن سب سے زیادہ شہرت سلطان زین العابدین بڈشاہ کے نصیب میں آئی۔ بڈشاہ ۱۴۲۰ء میں کشمیر کے دارالسلطنت نوشہرہ (میرا کدل اور گاندربل کے درمیان، سرینگر کا شمالی گوشہ) میں تخت نشین ہوا، اور ۱۴۷۰ء میں اس نے وفات پائی۔ اس کے پچاس سالہ عہد حکومت میں کشمیر نے ظاہری اور باطنی علوم میں بڑی ترقی کی۔ اس نے سنسکرت کی کتب کا ترجمہ فارسی میں اور فارسی کتب کا ترجمہ سنسکرت میں کرا کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کی مذہبی تعلیمات اور علوم سمجھنے کا موقع فراہم کیا۔ اسی مقصد کے حصول کی خاطر دارالترجمہ اور دارالتصانیف کا اجراء بھی کیا گیا اور سلطان کے کہنے پر ملا احمد نے مہا بھارت کو فارسی کا جامہ پہنایا۔ بڈشاہ ایک بے تعصب اور محب وطن بادشاہ تھا اور اپنے ذاتی حسن سلوک کی وجہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں ہردلعزیز تھا۔

بادشاہ نے ہندوؤں کی دلجوئی کے لیے جزیہ موقوف کر دیا اور بت خانوں اور مندروں کی نگرانی کے علاوہ ان کے ساتھ پاٹ شالے بھی بنوائے۔ اس نے لا اکراہ فی الدین کا عملی نمونہ پیش کیا۔ سابقہ سلاطین کے عہد میں جن ہندوؤں کو بہ اکراہ مسلمان کیا گیا تھا۔ سلطان کے حکم سے ان نومسلم ہندوؤں کی شدھی کی گئی اور کسی قاضی یا مفتی کو جرأت نہ ہوئی کہ ان سے ارتداد کا مواخذہ کرتا۔ جن ہندوؤں نے وطن سے دوری اختیار کر رکھی تھی، انہیں واپس بلوا کر ان کی جائدادیں انہیں لوٹائی گئیں اور ان کے لیے وظائف مقرر کیے گئے۔

فوق کے بیان کے مطابق فارسی زبان کشمیر میں عہد بڈشاہ سے سوا سو سال سے زائد عرصہ سے سرکاری زبان کی حیثیت سے رائج ہو چکی تھی، لیکن ابھی تک براہمنہ کشمیر میں سے بیشتر اسے ملیچھوں کی زبان سمجھتے تھے اور بادشاہ نے ہندوؤں کو فارسی پڑھنے کی تلقین کی۔ فارسی پڑھنے والے ہندو طلبہ کے لیے خاص وظائف مقرر کیے گئے۔ چنانچہ اس زمانے میں بہت سے کشمیری پنڈتوں نے فارسی پڑھنا شروع کی اور تھوڑے ہی عرصے میں ان میں فارسی زبان کے ایسے نامور شاعر اور عالم فاضل پیدا ہوئے کہ سلطان نے ان کی قابلیت کی وجہ سے انہیں سر آنکھوں پر بٹھایا اور اعلیٰ مراتب پر فائز کیا۔

بڈشاہ سے پہلے سلطان قطب الدین اور سلطان سکندر بت شکن کے عہد میں مسلمان

رشیوں کے نام تاریخوں میں ملتے ہیں، لیکن درحقیقت شیخ نورالدین ولی رشی، اس حلقے کے پیشوا اور سرخیل تھے۔ صوفیہ کے اس سلسلہ سے کشمیر میں اشاعت وتبلیغِ اسلام میں بڑی مدد ملی۔

بقول فوق، رشی بجائے خود کوئی ذات یا گوت نہیں بلکہ زہّاد کا طبقہ تھا، ان میں کھشتری، راجپوت، برہمن، ویش، میر اور بٹ ذاتوں کے افراد شامل تھے، مگر اکثریت ایسے صوفیہ کی تھی جو اپنا روایتی مذہب ترک کر کے دائرہ اسلام میں آئے تھے۔ چونکہ یہ لوگ محاربہ نفس وشیاطین میں جہادِ اکبر سے کام لیتے اور شمشیر ریاضت اور عبادت کثیر المشقت سے اپنے بدن کو ریشہ ریشہ کر دیتے تھے، اس لیے ''رشی'' کہلائے۔

بانی سلسلۂ رشیاں شیخ نورالدین ولی کے والد، جن کا ہندو نام سالار سنز تھا۔ جب مسلمان ہوئے تو ان کا اسلامی سالار الدین رکھا گیا۔ وہ ذات کے کھشتری راجپوت تھے اور راجہ پتا سنز (راجگان کشتوار) کی چوتھی پشت میں سے تھے۔ ان کی اہلیہ اور شیخ نورالدین ولی کی والدہ کا نام سدرہ ماجی تھا۔ حضرت شیخ موضع کیموہ میں ١٣٧٨ء میں پیدا ہوئے۔ فوق تحریر کرتے ہیں کہ جناب شیخ نے جوان ہو کر اپنے بھائیوں کے زیر اثر راہزنی اختیار کی، مگر تیس سال کی عمر میں راہزنی ترک کر کے اور اہل وعیال چھوڑ کر تارک الدنیا ہو گئے۔ کئی برس پہاڑوں اور جنگلوں میں صرف کاسنی کے پتے کھا کر گزارا کیا۔

شیخ نورالدین ولی کی تحصیل رشد و ہدایت اور کشف و کرامات اور کشمیری زبان کے معروف شاعر بھی تھے۔ انہوں نے ١٤٣٩ء میں ٦٣ سال کی عمر میں وفات پائی اور چرار شریف میں دفن ہوئے۔ بڈشاہ ان کا بڑا معتقد تھا، اس لیے اپنے امرا و وزرا سمیت ان کی نماز جنازہ میں شریک ہوا۔ روضہ کی تعمیر بھی سلطان ہی کے حکم سے کی گئی۔ بعد کے سلاطین نے اس تعمیر میں وقتاً فوقتاً اضافے کیے۔ ١٨٠٨ء میں کشمیر کے افغان صوبہ دار عطا محمد خان نے ان کی تعظیم میں ان کے نام کا سکہ بھی جاری کیا۔

حضرت شیخ کے خلیفہ اوّل کا نام بام الدین رشی تھا۔ آپ قبول اسلام سے پیشتر ذات کے برہمن تھے اور ان کا اصل نام بھیمہ سادھے تھا۔ خلیفہ دوم کا نام زین الدین رشی تھا۔ آپ ذات کے کھشتری راجپوت تھے اور ہندو نام جیا سین (یا سنگھ) تھا۔ خلیفہ سوم کا نام لطیف الدین رشی تھا۔ آپ بھی ذات کے کھشتری راجپوت تھے اور ہندو نام لدھے رینہ تھا۔ شیخ نصر الدین رشی جو اقبال کے جدِ اعلیٰ بابا لول حج کے مرشد تھے، شیخ نورالدین ولی کے خلیفہ چہارم تھے۔ آپ بھی

ذات کے کھشتری راجپوت تھے اور ہندو نام رؤتر تھا۔ آپ حضرت شیخ کی توجہ سے مشرف بہ اسلام ہوئے۔ وفات ۱۴۵۱ء میں ہوئی اور چرار شریف میں دفن ہوئے۔

شیخ نصرالدین کے معروف مریدوں کے نام یہ ہیں۔ لچھم رشی اوّل، لچھم رشی دوم، جوہر الدین رشی، صدرالدین رشی، بدرالدین رشی اور بابا لول حج۔ بابا لول حج کے جن مریدوں کا ذکر تذکروں میں ملتا ہے، وہ ہیں: رکن الدین رشی، جو اپنے مرشد کی وفات کے بعد ان کے جانشین ہوئے اور رنبو رشی جو موضع لاجورہ پتہ چھراٹ کے رہنے والے تھے۔

برصغیر میں صوفیہ کے کئی معروف سلسلے یا طریقے ہیں لیکن سلسلہ ُرشیاں کی ایک واضح خصوصیت یہ ہے کہ اس کے بانی کشمیر ہی کی سرزمین کے ایک نومسلم کھشتری راجپوت کے فرزند تھے اور ان کے خلفاء یا جانشین اور مرید بھی سب کے سب نومسلم تھے۔ دوسری خصوصیت اس طریقہ کی یہ ہے کہ اس کی تعلیمات ویدانتی اور وجودی فکر کے امتزاج پر مبنی تھیں۔ ترک دنیا کی تلقین تو خالصتاً ویدانتی نوعیت کی تھی۔

فوق نے اپنی تصنیف تاریخ اقوام کشمیر طباعت ۱۹۴۳ء میں اقبال کے دادا شیخ محمد رفیق سے چوتھی پشت میں ایک بزرگ شیخ اکبر کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> بابا لول حج کی اولاد میں ایک بزرگ شیخ اکبر کے نام سے ہوئے ہیں۔ باعمل صوفی اور بزرگوں کی صحبت میں بیٹھنے والے تھے۔ ان کے تقدس و اتقاء اور ان کی خاندانی نجابت کی وجہ سے اُن کی شادی اُن کے مرشد نے، جو سیّد تھے، اپنی صاحبزادی سے کر دی تھی۔ مرشد کی وفات پر اُن کے فرزند سیّد میر نام نابالغ تھے اس لیے وہی اپنے مرشد کے جانشین قرار پائے۔ شیخ اکبر سیلانی طبع تھے۔ کئی بار انھوں نے پنجاب کا سفر کیا۔

فوق نے یہ نہیں بتایا کہ ان کی معلومات کا ذریعہ کیا تھا، اس سلسلہ میں سید نذیر نیازی نے اپنی کتاب اقبال کے حضور میں میں اقبال کا ایک بیان نقل کیا ہے، جو قابلِ توجہ ہے۔ اقبال نے انہیں بتایا:

> ہمارے والد کے دادا یا پڑدادا کا نام تھا شیخ اکبر۔ انہیں پیری اس طرح ملی کہ سنکھترا میں سادات کا ایک خاندان تھا جسے لوگ سید نہیں مانتے تھے، اور اس لیے ان پر ہمیشہ طعن و تشنیع ہوا کرتی تھی۔ اس خاندان کے سربراہ کو ایک روز جو غصہ آیا تو ایک سبز کپڑا اوڑھ کر آگ میں بیٹھ گئے، جس کے متعلق روایت تھی کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی یادگار ہے۔ اس کی برکت سے

آ گ نے ان پر کوئی اثر نہ کیا۔ مخالفین نے یہ دیکھا تو انہیں یقین ہو گیا کہ وہ فی الواقعہ سید ہیں۔ ان کا انتقال ہوا تو شیخ اکبر نے ان کے مریدوں کو سنبھالا اور خاندان کی خدمت کرنے لگے۔ ایک مرتبہ اسی خاندان کا ایک فرد والد ماجد کے پاس آیا اور کہنے لگا، آپ دھسّوں کی تجارت کیوں نہیں کرتے؟ اس زمانے میں معمولی دھسّوں کی قیمت دو روپے فی دھسّے سے زیادہ نہ تھی۔ والد صاحب نے کوئی دو چار سو دھسّے تیار کیے، تو قدرت خدا کی ایسی ہوئی کہ سب کے سب اچھے داموں پر بک گئے، حالانکہ فی دھسّا آٹھ آنے سے زیادہ لاگت نہیں آئی تھی۔ دو چار سو دھسّے فروخت ہو گئے تو کافی روپیہ جمع ہو گیا۔ پس یہ ابتدا تھی ہمارے دن پھرنے کی۔ پھر بھائی صاحب بھی ملازم ہو گئے۔

سید نذیر نیازی نے حاشیہ میں سنکھترہ کو ضلع سیالکوٹ کا ایک گاؤں بیان کیا ہے۔ ضلع سیالکوٹ میں ایک گاؤں اس نام کا ضرور ہے، مگر فوق نے جو تفصیل دی ہے اس خاندان کی سکونت کشمیر ہی میں معلوم ہوتی ہے۔ فوق نے شیخ اکبر کو اقبال کے دادا شیخ محمد رفیق کی چوتھی پشت بیان کیا ہے، نیازی کی تحریر سے جو نئی بات پیدا ہوتی ہے، وہ شیخ اکبر کے پیر خاندان کی سکونت سے متعلق ہے، یعنی کیا یہ خاندان کشمیر میں تھا یا ضلع سیالکوٹ میں؟ اگر مؤخر الذکر سکونت درست ہے تو فوق کے بیان اور شیخ اعجاز احمد کی اپنی اطلاع کے مطابق کشمیر سے ہجرت شیخ نور محمد کے والد شیخ محمد رفیق اور ان کے تین بھائیوں نے نہیں کی، بلکہ ان کی پیدائش سے بہت پہلے یہ خاندان ہجرت کر کے سیالکوٹ آ چکا تھا اور شیخ نور محمد کے دادا یا پڑدادا شیخ اکبر ضلع سیالکوٹ ہی میں سکونت پذیر تھے۔ ان کی رائے کے مطابق:

> ہو سکتا ہے کہ چچا جان نے کشمیر کے کسی گاؤں کا نام لیا ہو، جسے نیازی صاحب نے سنکھترہ سنا ہو۔ میاں جی کے پاس ایک صاحب کشمیر سے آیا کرتے تھے، جن کے متعلق کہا جاتا تھا کہ ہمارے پیروں کے خاندان سے ہیں۔

ان (شیخ اکبر) کی چوتھی پشت میں ۔۔۔۔ چار بھائی تھے۔ ان کا وطن چونکہ تحصیل کولگام کے علاقے میں تھا، اس لیے وہ بانہال کو طے کرتے ہوئے جمّوں کے راستے سیالکوٹ آئے اور یہیں آ کر مقیم ہو گئے۔ فرزند اوّل شیخ محمد رمضان اور شیخ محمد رفیق فرزند دوم نے سیالکوٹ کو ہی مستقل وطن قرار دے دیا۔ شیخ عبداللہ ضلع سیالکوٹ میں موضع جیٹھ یکے میں سکونت پذیر ہو گئے۔ چوتھے بھائی نے لاہور میں سکونت اختیار کی۔ شیخ محمد رمضان صوفی منش بزرگ تھے۔ انہوں نے تصوف پر فارسی زبان میں چند ایک کتابیں بھی لکھی ہیں۔ شیخ محمد رفیق نے سیالکوٹ

میں بزازی کی دکان کھول لی۔ ان کے فرزند شیخ نور محمد (والد اقبال) بھی والد کی دکان پر کام کرتے رہے۔ البتہ شیخ محمد رفیق کے چھوٹے فرزند شیخ غلام محمد محکمہ نہر میں ملازم ہو گئے اور روپڑ میں تھے کہ شیخ محمد رفیق جو اپنے فرزند کی ملاقات کے لیے آئے ہوئے تھے، یہیں بیمار ہوئے اور یہیں انتقال کر گئے۔ آپ کی آخری آرام گاہ بھی روپڑ ہی میں ہے۔ تیسرے فرزند شیخ عبداللہ کی اولاد کا کثیر حصہ ریاست حیدرآباد دکن میں رہتا ہے۔ وہیں ان کی بود و باش ہے اور زراعت ان کا پیشہ ہے۔ چوتھے بھائی جو لاہور میں تھے وہ لاولد ہی انتقال کر گئے۔ شیخ محمد رفیق کے متعلق مولانا عبدالعزیز ملک (گوجرانوالہ عمر ۹۴ سال) کا بیان ہے کہ وہ درمیانے قد کے بزرگ تھے اور نہایت وجیہ اور خوبصورت تھے اور خدوخال لب ولہجہ اور درخشاں چہرے سے ان کی کشمیریت ٹپکی پڑتی تھی۔

فوق کی اس تفصیل میں کچھ خامیاں رہ گئی ہیں۔ شیخ محمد رفیق اور ان کے بھائیوں کے والد کا نام شیخ جمال الدین تھا، کیونکہ شیخ اعجاز احمد کے بیان کے مطابق بعض رجسٹری شدہ مسودات میں ان کی ولدیت یونہی درج ہے۔ اسی طرح شیخ محمد رفیق کے اس نامعلوم بھائی کا نام شیخ عبدالرحمن تھا۔ یہ درست نہیں کہ انہوں نے لاہور میں سکونت اختیار کی اور لاولد فوت ہوئے۔ شیخ عبدالرحمن کی رہائش بھی سیالکوٹ ہی میں تھی اور ان کی اولاد آج تک وہیں آباد ہے۔ اسی طرح شیخ عبداللہ کی اولاد بھی سیالکوٹ میں آباد ہے۔

روزگار فقیر (جلد دوم) میں شیخ اعجاز احمد کے حوالے سے تحریر ہے:

علامہ اقبال کے اجداد نے کشمیر سے ہجرت کر کے سیالکوٹ میں سکونت اختیار کی۔ اٹھارہویں صدی کے آخر میں یا انیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں یہ ہجرت ہوئی ہو گی اور ہجرت کرنے والے بزرگ یا تو علامہ کے دادا کے باپ شیخ جمال الدین تھے یا ان کے چار بیٹے، جن کا نام شیخ عبدالرحمن، شیخ محمد رمضان، شیخ محمد رفیق اور شیخ عبداللہ تھے۔ بہر حال یہ تو ثابت ہے کہ انیسویں صدی کے آغاز میں یہ چاروں بھائی سیالکوٹ میں سکونت پذیر تھے۔ ان چاروں بھائیوں کی اولاد آج تک شہر سیالکوٹ اور موضع جیٹھ یکے میں آباد ہے۔ علامہ کے دادا کی پہلی شادی شہر سیالکوٹ کے ایک کشمیری خاندان میں ہوئی۔ اس بیوی سے کوئی اولاد نہ ہوئی اور وہ وفات پا گئیں۔ دوسری شادی جلالپور جٹاں کے ایک کشمیری گھرانے میں ہوئی۔ یہ بیوی بہت خوبصورت تھیں، اس لیے ان کا لقب ''گجری'' پڑ گیا تھا۔ ان سے شیخ محمد رفیق کے اوپر تلے دس لڑکے ہوئے اور سب کے سب فوت ہو گئے۔ علامہ کے والد (شیخ نور محمد) شیخ محمد رفیق کی

گیارہویں اولاد تھے۔ قمری حساب سے ان کی عمر ۹۶ سال اور شمسی حساب سے ۹۳ سال کی ہوئی۔ انہوں نے اپنے قابل فخر بیٹے اقبال کی شہرت، عزت اور مقبولیت کی بہاریں بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ علامہ کے والد کی پیدائش کے بعد ان کے والدین کے یہاں ایک اور لڑکا بھی پیدا ہوا۔ ان کا نام غلام محمد تھا۔ وہ محکمہ نہر میں اوورسیئر تھے اور روپڑ ضلع انبالہ میں متعین تھے۔ روپڑ ہی میں وہ دفن ہوئے۔ شیخ غلام محمد نرینہ اولاد سے محروم تھے۔ وفات کے وقت ان کی دو لڑکیاں حیات تھیں، جن کی اولاد شہر سیالکوٹ میں آج تک آباد ہے۔

شیخ نور محمد کی وفات ۱۹۳۰ء میں ہوئی۔ اگر شمسی حساب سے انہوں نے ۹۳ سال عمر پائی تو سن ولادت ۱۸۳۷ء ہوگا اور اس کی تصدیق بھی اس بات سے ہوتی ہے کہ شیخ نور محمد کہا کرتے تھے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں وہ جوان تھے، یعنی ان کی عمر تب بیس برس تھی۔

بقول فوق جب اقبال کے بزرگ کشمیر سے ہجرت کر کے سیالکوٹ آئے تو کشمیر افغانوں کے ماتحت تھا۔ اگر یہ ہجرت اٹھارہویں صدی کے آخری یا انیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں ہوئی تو اس وقت کشمیر میں افغانوں کا زوال شروع تھا اور سکھ اس پر قابض ہو رہے تھے۔ فوق لکھتے ہیں کہ کشمیر سے ہجرت کرتے وقت بزرگان اقبال کی سکونت تحصیل کولگام کے علاقے میں تھی۔

پنڈت جواہر لعل نہرو کے جد اعلیٰ پنڈت راج کول بھی، جو فارسی اور سنسکرت کے عالم تھے، مغلوں کے آخری دور میں بادشاہ فرخ سیر کے زمانے میں، تقریباً ۱۷۱۶ء میں، دہلی آ کر آباد ہوئے۔ فرخ سیر بادشاہ جب کشمیر گیا تو پنڈت راج کول کی شخصیت سے متاثر ہوا اور انہیں خاندان سمیت دہلی لے آیا۔ بعد میں یہ خاندان الہ آباد منتقل ہوگیا۔ اقبال کے ہم گوت اور دوست سر تیج بہادر سپرو (جو فارسی کے عالم تھے) کے بزرگ، ان کے اپنے بیان کے مطابق ان کی پیدائش سے ایک سو تیس سال پہلے کشمیر سے ہجرت کر کے ہندوستان میں آباد ہوئے۔ خواجہ ناظم الدین کے بزرگ ۱۸۲۲ء میں اپنی طرف سے سکھ بربریت کی شکایت مغل بادشاہ کو کرنے دہلی گئے تھے۔ جب وہاں پہنچ کر انہیں بادشاہ کی بے بسی کا احساس ہوا یا یہ معلوم ہوا کہ بادشاہ اس سلسلے میں کوئی قدم اٹھانے سے قاصر ہے تو وہ بنگال جا آباد ہوئے اور ڈھاکہ کے نوابوں کے خاندان کی بنیاد رکھی۔

کشمیر پر افغانوں اور سکھوں کے تسلط کی مختصر روداد بیان کرنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی تا کہ واضح کیا جا سکے کہ اٹھارہویں صدی کے آخر یا انیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں،

جب اقبال کے بزرگوں نے کشمیر سے ہجرت کی تو وہاں کے حالات کیا تھے۔ اقبال کے بزرگ بھی انہی حالات کے پیش نظر عدم تحفظ کے عالم میں افغانوں کے آخری دور میں وطن سے ہجرت کر گئے اور سیالکوٹ پہنچ کر انہوں نے تجارت کو اپنا پیشہ بنایا۔

اقبال کے اجداد کا خاندان دنیوی یا مادی آسودگی سے کہیں زیادہ اخلاقی اور روحانی مسرتوں کی جستجو میں تھا اور جو دنیا کے مقابلے میں ہمیشہ دین کو ترجیح دیتا تھا۔ غالباً اسی بنا پر اقبال ضرب کلیم میں اپنی نظم ''جاوید سے خطاب'' میں ارشاد کرتے ہیں:

غارت گر دیں ہے یہ زمانہ — ہے اس کی نہاد کافرانہ
دربار شہنشہی سے خوشتر — مردان خدا کا آستانہ
خالی ہوا ان سے دبستاں — تھی جن کی نگاہ تازیانہ
جس گھر کا مگر چراغ ہے تو — ہے اس کا مذاق عارفانہ

ہندوؤں کو بالعموم اور برہمنوں کو بالخصوص اپنے اسلاف کے برہمن ہونے پر بڑا فخر رہا ہے۔ غالباً اسی سبب پنڈت رام چندر دہلوی فاضل عربی و سنسکرت نے اقبال پر اپنے مضمون میں تحریر کیا ہے:

> ایشوری گیان اور کلام ربانی کو برہمن زادہ ہی سمجھ سکتا ہے۔ اس میں اقبال نے کیا راز پنہاں رکھا ہے؟ یہی کہ وہ کشمیری پنڈت تھے۔ ہزاروں برس تک ان کے آباو اجداد نے روحانیت کی تربیت میں اقبال کو اپنے اندر پرورش کیا۔

برہمنی قیادت نے ہندوستان کو سیاسی آزادی دلائی، مگر عجیب اتفاق ہے کہ برصغیر میں مسلم قومیت کے اصول اور الگ مسلم ریاست یعنی پاکستان کے قیام کا تصور بھی ایک برہمن زادے نے دیا۔ اقبال کے جد اعلیٰ نے ان کی پیدایش سے تقریباً ساڑھے چار سو سال قبل اسلام قبول کیا۔ اس لیے اقبال کو اپنے اسلاف کے برہمن ہونے پر کیا فخر ہو سکتا ہے، مگر یہ حقیقت ہے کہ اقبال گائے کا گوشت نہ کھا سکتے تھے۔ اس لیے گائے کا گوشت گھر میں نہ پکتا تھا۔ اگر انہیں غلطی سے کوئی گائے کا گوشت کھلا دیتا تو ان کا معدہ قبول نہ کرتا اور ان کی طبیعت مکدّر رہو جاتی۔ علاوہ اس کے گو وہ علم نجوم کے قائل نہ تھے، انہوں نے راقم کی پیدائش پر دو جنم پتریاں بنوائیں، جو محفوظ رکھی گئیں۔ ایک جنم پتری لاہور میں راجہ نریندر ناتھ نے ترتیب دی اور دوسری میسور سے پنڈت سرنیواسیہ نے بنا کر بھیجی۔

بہرحال ان کے اشعار میں، جن میں برہمن نسبی کی طرف اشارے ہیں، طنز کا پہلو نمایاں ہے اقبال کے بعض اشعار سے یہ تاثر بھی ملتا ہے کہ ان کے نزدیک فلسفے ایسے علوم پر ان کے عبور کا سبب ان کی برہمن نسبی تھی، مگر اقبال نے خود ہی فلسفہ کو اپنی رہبری کے لیے ناکافی پا کر مسترد کر دیا۔ ان کے تجربے میں تو عشق رسولؐ ہی ایسی نعمت ہے جس کی ذریعے وہ اپنے تمام فکری مسائل حل کر سکے تھے۔ اس لیے قرآنی تعلیمات سے ان کا شغف، اسلام کے ساتھ ان کی محبت اور مسلمان ہونے پر ان کا فخر، وہ فطری عناصر تھے، جنھوں نے ان کی شخصیت کی تشکیل کی۔

۞ ۞ ۞

باب: ۲

خاندان سیالکوٹ میں

سیالکوٹ پنجاب کے شمال مشرق میں ایک نہایت قدیم شہر ہے۔فوق کی تحقیق کے مطابق اسے پانچ ہزار سال یا اس سے بھی زاید عرصہ قبل راجا شل نے آباد کیا اور شاکل نام رکھا۔ مہابھارت میں لکھا ہے کہ شاکل نگری اُپکا ندی کے کنارے مدر دیش میں واقع ہے۔اس زمانے میں پنجاب کا یہ حصہ مدر دیش کہلاتا تھا اور سیالکوٹ کے معروف نالۂ ''ایک'' کو اُپکا ندی پکارا جاتا تھا۔مہاراجا چندر گپت بکر ماجیت کے عہد میں، جسے گزرے تقریباً دو ہزار سال ہو چکے ہیں، راجا شالباہن نے یہاں ایک قلعہ تعمیر کرایا۔قلعہ کو ہندی زبان میں کوٹ کہا جاتا ہے۔اس لیے یہ قلعہ شالکوٹ پکارا جانے لگا اور صدیوں بعد سیالکوٹ کے نام سے مشہور ہو گیا۔

سیالکوٹ ابتدائی مسلم سلاطین کے مختلف ادوار سے گزرا،لیکن چودھویں صدی میں سلطان فیروز تغلق کے عہد میں (۱۳۵۱ء تا ۱۳۸۸ئ)، جب دہلی میں بدنظمی اور ابتری کا ظہور ہوا تو سیالکوٹ کے باجگزار حکمران راجا سہنپال نے مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کی خاطر قلعہ کو مضبوط بنانا چاہا۔اس نے نجومیوں کے مشورے پر ایک مسلمان نوجوان کو ذبح کیا اور اس کا خون قلعہ کے چاروں طرف چھڑک کر قلعے کی تعمیر شروع کی۔نوجوان کی بوڑھی ماں نے اس ظلم وستم کی شکایت سید امام علی الحق بن سید حسن کلی سے کی۔حضرت امام نے اس کا ذکر سلطان فیروز شاہ تغلق سے کیا۔سلطان نے حضرت امام کو ایک لشکر دیا تاکہ راجہ کے ظلم سے خلق خدا کو نجات دلائی جائے۔ حضرت امام لشکر اور اپنے مریدوں کے ساتھ راجا سہنپال کے ساتھ لڑائی کے لئے روانہ ہوئے۔ تین دن کی مسلسل جنگ کے بعد مسلمان نالۂ ''ایک'' عبور کرنے میں کامیاب ہوگئے اور مسلمانوں کو فتح ہوئی اس طرح سیالکوٹ میں ہندو راج کا خاتمہ ہو گیا۔

امام صاحب اور اس معرکے کے دیگر شہدا کے متعلق یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ جہاں کہیں اور جس حالت میں بھی کسی نے جام شہادت نوش کیا اسی مقام اور اسی حالت میں اسے

دفن کر دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ پرانے قلعہ سیالکوٹ کے ارد گرد متفرق مقامات پر شہدائے اسلام کے مزار نظر آتے ہیں۔ جس مقام پر امام صاحب کا روضہ مبارک ہے اس کے گرد و نواح میں سیکڑوں مزار ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو موجود ہیں۔ امام صاحب کے مزار پر آج بھی، ہر جمعرات کو مسلمان کثرت سے زیارت کے لیے آتے ہیں اور عیدین کے میلوں کے علاوہ ایام محرم میں روضۂ مبارک پر بہت سے زائرین جمع ہوتے ہیں۔

مغلوں کے عہد میں سیالکوٹ پھلتا پھولتا رہا۔ صوفیہ اور مشائخ کے حسن عمل اور خلق محمدی سے بیشتر ہندو مشرف بہ اسلام ہوئے اور مسلمانوں کی آبادی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ۱۸۰۷ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ، سیالکوٹ پر فوج کشی کر کے اس پر قابض ہو گیا، لہٰذا بزرگانِ اقبال اگر انیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں سیالکوٹ آئے ہوں تو اس زمانے میں سیالکوٹ سکھوں کے تسلط میں تھا۔

اقبال کے دادا شیخ محمد رفیق عرف شیخ رفیقا نے جب سیالکوٹ میں سکونت اختیار کر کے کشمیری لوئیوں اور دھسوں کی فروخت کا کاروبار شروع کیا تو پہلے اس شہر کے محلہ کھٹیکاں کے ایک مکان میں فروکش ہوئے۔ غالباً اسی مکان میں شیخ نور محمد (والد اقبال) اور ان کے چھوٹے بھائی شیخ غلام محمد پیدا ہوئے اور یہیں ان کی شادیاں ہوئیں۔

۱۸۶۱ء میں شیخ محمد رفیق نے موجودہ جدّی مکان جو بعد میں ''اقبال منزل'' کے نام سے موسوم ہوا، خریدا اور اس میں اقامت پذیر ہوئے اس وقت یہ مکان ایک منزلہ تھا اور دو کوٹھڑیوں دالان، ڈیوڑھی اور صحن پر مشتمل تھا۔ کونے والی کوٹھڑی کی کھڑکیاں گلی میں کھلتی تھیں اور مکان کا دروازہ محلہ چوڑیگراں کی جانب تھا۔ انہی کوٹھڑیوں میں سے کسی ایک میں اقبال پیدا ہوئے۔

۱۸۹۲ء میں اس مکان سے ملحق ایک دو منزلہ مکان جو اوپر نیچے دو کوٹھڑیوں، باورچی خانہ اور دالان پر مشتمل تھا، شیخ نور محمد نے خریدا اور دو ڈھائی سال بعد ۱۸۹۵ء میں دو دکانیں جو پہلے مکان کی پشت پر بازار چوڑیگراں (اقبال بازار) کی طرف تھیں، بھی خرید لی گئیں۔ ان تینوں قطعات مکان و اراضی کو ملا کر موجودہ مکان تعمیر ہوا۔ بعد میں شیخ عطا محمد (اقبال کے بڑے بھائی) نے جدّی مکان سے ملحق ایک اور دکان خریدی اور اس ساری عمارت کو ایک سہ منزلہ حویلی کی شکل دے کر اس کا نام ''اقبال منزل'' رکھا۔ شیخ نور محمد نے جدّی مکان کے قریب محلہ چوڑیگراں میں ایک اور مکان بھی خریدا، جو کرایے پر اٹھا دیا گیا۔ بعد ازاں جب انہوں نے

اپنی زندگی ہی میں جائداد کی تقسیم کی تو جدّی مکان اپنے بڑے بیٹے شیخ عطا محمد کے نام منتقل ہوا، اور چھوٹا مکان اقبال کے حصے میں آیا، یہ مکان کچھ عرصہ کے لیے راقم کے نام ہبہ رہا بعد میں انہوں (اقبال) نے لاہور ''جاوید منزل'' کی تعمیر سے پیشتر اسے فروخت کر دیا۔

شیخ نور محمد نہایت وجیہ صورت کے مالک تھے؛ سرخ رنگ، کشادہ پیشانی، ستواں ناک، روشن آنکھیں، پتلے ہونٹ اور نورانی چہرہ۔ اچھے قدآور تھے۔ غالباً جوانی ہی سے باریش تھے۔ صاف ستھرا لباس پہنتے تھے۔ انہوں نے کسی مکتب میں تعلیم نہیں پائی تھی، البتہ حروف شناس ہونے کے سبب اردو اور فارسی کی چھپی ہوئی کتابیں پڑھ لیتے تھے۔ وہ اصول کے پکے، عالی ظرف، بردبار، مخالفوں اور ناحق ایذا پہنچانے والوں کو معاف کرنے والے، طبیعت کے سادہ، نیک، شفیق، حلیم اور صلح کن تھے۔ فوق کے بیان کے مطابق تجارت پیشہ ہونے کے باوجود صوفیہ اور علماء کی مجلسوں میں بیٹھنے اور ان کی صحبت میں رہنے کی وجہ سے شریعت اور طریقت کے نکات و رموز سے پوری طرح آگاہ تھے۔ شب بیدار رہنے اور نمازِ تہجد ادا کرنے کے عادی تھے۔ کلام اللہ کی تلاوت اکثر کرتے اور اسی کو دین و دنیا کی ترقی کا سبب سمجھتے تھے۔ ان کی یہی تاکید اپنی اولاد کو بھی تھی۔ چونکہ وہ فکر کی عادت کے علاوہ تصوّف کی پیچیدگیوں سے بھی آشنا تھے، اس لیے بعض ہم عصر اکابر علم انہیں ان پڑھ فلسفی کہتے تھے۔ بعض لوگ تصوف کی کتابوں کے مشکل مطالب کی تشریح کے لیے ان سے رجوع کرتے تھے۔

شیخ نور محمد اپنے والد کے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹاتے رہے۔ بعد میں اس میں اضافہ کیا اور ٹوپیاں یا کلاہ سینے لگے۔ اس سلسلہ میں سلائی کی مشین سیالکوٹ میں سب سے پہلے انہی نے منگوائی تھی۔ دکان میں شاگرد اور ملازم بھی موجود تھے۔ یہ ٹوپیاں اس زمانے میں بڑی مقبول ہوئیں، اور یوں لوگ انہیں شیخ نتھو ٹوپیاں والے کہنے لگے۔ زندگی کے بیشتر حصے میں انہوں نے اپنے زور بازو سے کمایا لیکن جوں جوں عمر بڑھتی گئی وہ تصوّف کی طرف زیادہ مائل ہوتے چلے گئے۔ بڑھاپے میں ان کی دکان کچھ عرصہ کے لیے ان کے ایک داماد نے سنبھالی، مگر بعد میں ان کے الگ ہونے پر دکان بند ہو گئی۔ انہیں اپنے اور پرائے سب میاں جی کہہ کر بلاتے تھے۔

شیخ نور محمد کی شادی موضع سمبڑیال ضلع سیالکوٹ کے ایک کشمیری گھرانے میں ہوئی۔ ان کی بیوی (والدہ اقبال) کا نام امام بی تھا۔ شادی کے کچھ عرصہ بعد شیخ نور محمد کے سسرال والے بھی سیالکوٹ ہی میں آ کر آباد ہو گئے۔ امام بی کو سب ''بے جی'' کہتے تھے۔ وہ لکھنا پڑھنا نہ

جانتی تھیں۔ انہیں صرف نماز ازبر تھی جسے وہ باقاعدگی سے پڑھا کرتی تھیں۔ تاہم ناخواندہ ہونے کے باوجود بڑی سمجھ دار، معاملہ فہم اور مدّبر خاتون تھیں۔ برادری اور محلہ داری کے جھگڑوں کا نہایت خوش اسلوبی سے تصفیہ کراتی تھیں اور اپنے حسن سلوک کے باعث محلے کی عورتوں میں بڑی مقبول تھیں۔ گھرداری کے سب انتظامات خود کرتیں۔ اکثر مستورات اپنے زیور یا نقدی ان کے پاس بطورِ امانت رکھواتیں، جنہیں وہ علیحدہ علیحدہ سرخ کپڑے کی پوٹلیوں میں باندھ کر احتیاط سے رکھتیں۔ ان کی سب سے نمایاں خصوصیت غرباء پروری تھی۔ کئی حاجتمند خواتین کو خفیہ طور پر نقدی دیتی تھیں۔ ان کے بڑے بیٹے شیخ عطا محمد ایسی امداد کو مذاق میں ''گپت دان'' کہا کرتے تھے اور جب رخصت پر گھر آتے، تو انہیں ''گپت دان'' کے لیے علیحدہ رقم دیا کرتے تھے۔ امداد کرنے کا ایک اور طریقہ، ان کا یہ تھا کہ محلے کے غریب گھرانوں کی دس بارہ سال کی تین چار بچیاں اپنے یہاں لے آتیں اور ان کی کفالت کرتیں۔ بچیاں گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹاتیں اور بے جی کی بہو بیٹیوں سے قرآن مجید، نماز، ضروری دینی تعلیم، اردو لکھنا پڑھنا، کھانا پکانا اور سینا پرونا سیکھتیں، کچھ مدت بعد مناسب رشتہ تلاش کر کے ان کا بیاہ کر دیتیں۔ جتنا عرصہ وہ ان کی تحویل میں رہتیں، ان کی دیکھ بھال ایسے ہی کرتیں جیسے اپنی بیٹیوں کی، اور شادی کے وقت بھی انہیں بیٹیوں ہی کی طرح رخصت کرتیں۔ شادی کے بعد وہ لڑکیاں ان کے ہاں اسی طرح آتیں، جس طرح بیٹیاں میکے آتی ہیں۔

ان کے جذبہ ایثار کا ایک واقعہ شیخ اعجاز احمد کے بیان کے مطابق یہ ہے کہ میاں جی کے چھوٹے بھائی شیخ غلام محمد کے ہاں لڑکیاں ہی ہوتی تھیں۔ ان کی بیوی کو بیٹے کی خواہش تھی۔ دونوں بھائی اکٹھے رہتے تھے۔ ایک بار دونوں کی بیویاں امید سے ہوئیں۔ اس مرتبہ بے جی کو اللہ نے لڑکا دیا اور دیور کی بیوی کے ہاں پھر لڑکی پیدا ہوئی۔ ان کی افسردگی کو محسوس کرتے ہوئے بے جی نے ان سے کہا کہ لڑکا تم لے لو اور لڑکی مجھے دے دو۔ چنانچہ بچوں کا تبادلہ ہو گیا۔ بے جی نے لڑکی کو پالنا شروع کر دیا اور ان کی دیورانی نے لڑکے کو۔ چند ماہ بعد ایک دن صبح کے وقت دونوں گھر کے کام کاج میں مصروف تھیں، بے جی نے لڑکے کے متعلق پوچھا تو ان کی دیورانی نے کہا کہ ابھی دودھ پی کر سو گیا ہے۔ جب خاصی دیر ہو گئی اور بچہ بیدار نہ ہوا تو جا کر دیکھنے پر معلوم ہوا کہ مر چکا ہے۔ اس کے ہونٹوں پر دودھ لگا ہوا تھا۔ اس کے بعد بے جی نے لڑکی دیورانی کو لوٹا دی۔

شیخ اعجاز احمد بیان کرتے ہیں کہ اس فوت ہو جانے والے لڑکے کی پیدائش کا اندراج، رجسٹر میونسپل کمیٹی میں موجود نہیں۔ میونسپل کمیٹی کے رجسٹر کے جس اندراج کو غلطی سے اقبال یا اس لڑکے کی پیدائش کا اندراج (۱۸۷۳ئ) لیا گیا، دراصل محلہ کشمیریاں کے کسی نتھو کشمیری کے ہاں لڑکے کی پیدائش کا اندراج ہے۔

امام بی کی وفات ۱۹۱۴ء میں ہوئی اور انہیں امام صاحب کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔ اقبال کے والد شیخ نور محمد ان کے پہلو میں دفن ہیں۔ شیخ نور محمد کی اولاد کی تعداد سات تھی۔ سب سے بڑے بیٹے شیخ عطا محمد ۱۸۵۹ء میں پیدا ہوئے، اس وقت میاں جی کی عمر تیئس برس تھی، ان کے بعد دو بیٹیاں فاطمہ بی اور طالع بی پیدا ہوئیں۔ اس دوران ایک لڑکا بھی ہوا جو چند ماہ بعد فوت ہو گیا۔ اقبال کی پیدائش کے وقت میاں جی کی عمر تقریباً چالیس برس تھی۔ ان کے بعد دو بیٹیاں کریم بی اور زینب بی پیدا ہوئیں۔ جوں جوں اولاد بڑھتی گئی، میاں جی ضرورت کے مطابق جدّی مکان کو کشادہ کرتے چلے گئے۔

اقبال کے بھائی شیخ عطا محمد نے جوان سے عمر میں تقریباً اٹھارہ سال بڑے تھے، ابتدائی تعلیم سیالکوٹ میں حاصل کی۔ آپ کی دو شادیاں ہوئیں۔ پہلی بیوی کشمیری راٹھوروں کے خاندان سے تھی، جس کو طلاق ہو گئی۔ دوسری بیوی کا نام مہتاب بی تھا مگر انہیں سب بھابی جی کہتے تھے۔ شیخ عطا محمد کے پہلے سسرال والے فوجی وظیفہ خوار تھے۔ ان کے فوج سے تعلق اور شیخ عطا محمد اپنے طویل قد اور مضبوط جسم کے سبب رسالے میں بھرتی ہو گئے۔ کچھ عرصے بعد انہیں تھامپسن انجینئرنگ سکول رڑکی میں تعلیم پانے کے لیے بھیجا گیا، جہاں سے امتحان پاس کر کے وہ فوج کے شعبہ بارک ماسٹری میں تعینات ہوئے۔ ساری عمر سرکاری ملازمت کی۔ اقبال کو علمی لحاظ سے پروان چڑھانے اور اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ بھیجنے میں انہوں نے بڑی مدد کی۔ اقبال ان سے بڑی محبت کرتے تھے اور ان کے مداح تھے، ان کا بے حد ادب کرتے تھے کبھی ان کے سامنے اونچا نہ بولتے۔ وہ پنشن کے بعد کافی عرصے تک حیات رہے۔ انہوں نے ۱۹۴۰ء میں اکیاسی، بیاسی سال کی عمر میں سیالکوٹ میں وفات پائی اور اپنے والدین سے چند قدم کے فاصلے پر امام صاحب کے قبرستان میں دفن کیے گئے۔

۱۸۵۸ء میں عسکری بغاوت کی ذمہ داری انگریزوں نے مسلمانوں پر ڈالی۔ اس حوصلہ شکن ماحول اور ناموافق گرد و نواح سے تقریباً ہر مسلمان خاندان متاثر ہوا۔ سوال پیدا ہوتا ہے

کہ اقبال کے بزرگوں نے اس صورت حال سے کیا اثر قبول کیا۔ سیالکوٹ ایک چھوٹا سا شہر ہے اور اقبال کا تعلق ایک متوسط الحال تجارت پیشہ خاندان سے تھا، جس کی نمایاں خصوصیات شرافت اور دینداری تھیں۔ یہ قیاس کرنا تو صحیح نہیں کہ جس طوفان نے سارے ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا اور جس کی زد میں پنجاب بھی آ چکا تھا، اس سے سیالکوٹ [illegible]ط رہا ہوگا۔ ہوسکتا ہے، سید احمد کی تحریک اصلاح اور تنظیم جہاد کے مبلغ یا داعی یہاں بھی پہنچے ہوں اور سید صاحب کی تعلیمات کی بازگشت یہاں بھی سنی گئی ہو، لیکن اقبال کے دادا شیخ محمد رفیق کے لیے جو کشمیر سے ہجرت کر کے سیالکوٹ میں تلاش رزق میں سرگرداں تھے، یہ ممکن نہ تھا کہ وہ پہلے اپنے خاندان سمیت سیالکوٹ سے ہجرت کر کے ہندوستان کے کسی شہر کا رخ کرتے اور پھر وہاں سے سندھ کے رستے سرحد پہنچ کر سکھوں یا انگریزوں کے خلاف جہاد میں حصہ لیتے۔

سید نذیر نیازی بیان کرتے ہیں کہ انہیں اقبال نے بتایا کہ ان کے دادا شیخ محمد رفیق سکھوں کی طرف داری میں گجرات میں انگریزوں سے لڑے تھے۔ اس بارے میں انہوں نے مزید تفصیل نہیں دی۔ سکھ فوج مئی ۱۸۴۸ء اور فروری ۱۸۴۹ء میں آخری بار انگریزوں سے نبرد آزما ہوئی اور گجرات میں ان سے شکست کھائی۔ بہر حال اقبال کے دادا کے متعلق یہ بات پہلے کبھی سننے میں نہیں آئی۔ فوق اپنی کسی تحریر میں اس بات کا ذکر نہیں کرتے۔ اگر اقبال نے یہ بات کہی اور نیازی کو سننے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی تو ان کے اپنے بیان کے بعد اس امر واقعہ کی صحت کے متعلق مزید تحقیق کا سوال پیدا نہیں ہوتا اور اگر ہو بھی تو مزید تحقیق کے لیے اب کس سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔

جہاں تک اقبال کے والد شیخ نور محمد کا تعلق ہے، انہوں نے انگریزوں کے ظلم واستبداد کا وہ زمانہ ضرور دیکھا، جس نے مسلمانوں کے دلوں میں انگریزی حکومت کے لیے نفرت کا بیج بو دیا۔ فوق کے بیان کے مطابق سیالکوٹ میں عسکریوں نے ۹ جولائی ۱۸۵۷ء کو علم بغاوت بلند کیا، لیکن دہلی پر قبضہ کے بعد انگریزوں نے سیالکوٹ میں دو عہدیداروں کو سولی پر چڑھایا اور ۱۳۹ عسکریوں کو توپ سے اڑا دیا۔ ان میں بیشتر مسلمان تھے۔ شہر سیالکوٹ کے مکینوں پر پچاس ہزار روپیہ اجتماعی جرمانہ عائد کیا گیا۔ شیخ نور محمد طبعاً ایک حلیم، صلح کن اور امن پسند شخص تھے، جنہیں یا تو اپنے کام سے تعلق تھا یا ان کا وقت صوفیہ وعلماء کی مجلسوں میں بیٹھنے اور یادِ الٰہی میں گزرتا تھا۔ انہیں اپنے ہم عصر اہل علم کی طرح اس بات کا احساس ہوگا کہ برصغیر کی عنانِ حکومت مسلمانوں

کے ہاتھ سے چھن چکی ہے اور اس وقت انگریزوں کے خلاف جہاد میں کامیابی ممکن نہیں، کیونکہ ان کے مال و دولت، ہتھیاروں اور جدید انداز جنگ کا مقابلہ محدود وسائل اور پرانے طور طریقوں سے نہیں کیا جا سکتا۔ نیز اس خطے کے سارے کے سارے مسلمانوں کا ہجرت کر کے مسلم ممالک میں آباد ہونا بھی اگر عملی طور پر ناممکن نہیں، تو مشکل ضرور تھا۔

ماضی گزر چکا تھا اور مستقبل ابھی پس پردہ تھا۔ اس لیے اس دور کے مسلمانوں کے حال کی زندگی بڑے تذبذب اور کرب و اضطراب میں گزر رہی تھی۔ تعلیمی اداروں سے فارسی، عربی اور اسلامی علوم کا خاتمہ، عیسائی مشنریوں کے اسلام کی مخالفت میں مناظرے، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اقدس پر رکیک حملے وغیرہ ایسے اقدام تھے جن سے مسلمانوں کو اندیشہ ہوا کہ انگریزی حکومت ان کا نام ونشان مٹانے کے درپے ہے، چنانچہ اپنی انفرادی اور اجتماعی بقاء کے لیے مسلمانوں نے ضروری سمجھا کہ ان کے بچے انگریزی اسکول میں داخل ہونے سے پیشتر کچھ مدت کے لیے دینیات کی تعلیم حاصل کر لیا کریں تا کہ بچپن ہی سے اسلام پر ان کا ایمان اس قدر مضبوط ہو جائے کہ وہ بعد میں کسی بھی قسم کی غیر اسلامی تعلیمات کا اثر قبول نہ کر سکیں۔ چنانچہ سرکاری سطح پر دینی مدرسوں کے فقدان کی وجہ سے تقریباً ہر شہر کے علماء کو مسجدوں یا اپنے گھروں میں درسگاہیں اور مکتب کھولنا پڑے۔

سیالکوٹ میں ان دنوں درس وتدریس کے ایسے چار مراکز قائم تھے، جن میں مولوی غلام مرتضٰی، مولانا ابوعبداللہ، غلام حسن اور مولوی مزمل کے مدرسوں میں تو عربی زبان اور دینیات کی تعلیم دی جاتی تھی، البتہ مولانا سید میر حسن کے مدرسۃ العلوم میں عربی اور فارسی ادب کی تدریس ہوتی۔ شیخ نور محمد نے اپنی اولاد کو انگریزی اسکول میں داخل کرانے سے پیشتر نہ صرف دینیات یا اسلامی علوم کی تحصیل کے لیے درسگاہ میں بھیجا، بلکہ گھر میں بھی ان کی اسلامی تربیت کا خاص خیال رکھا۔ انیسویں صدی کے ربعِ آخر کے مسلم بزرگوں کا امت مسلمہ پر یہ بہت بڑا احسان تھا کہ ان کی توجہ کے باعث آنے والی نسل میں اسلامی عصبیت بیدار ہوئی جس نے بالآخر برصغیر میں مسلم قومیت کے جذبہ کو فروغ دیا۔ بہرحال شیخ نور محمد کے چھوٹے بھائی شیخ غلام محمد اور بڑے بیٹے شیخ عطا محمد نے غالباً اس وقت سرکاری ملازمت حاصل کی جب سر سید احمد خان کی سعی و کوشش سے رفتہ رفتہ مسلمانوں کی طرف انگریزی حکام کا رویہ بدلنا شروع ہوا۔

باب: ۳

تاریخِ ولادت کا مسئلہ

اقبال کی تاریخ ولادت عرصے سے ایک متنازع فیہ مسئلہ رہا ہے اور اس سلسلے میں کئی سنہ بیان کیے جاتے رہے ہیں۔ اقبال کی زندگی کے دوران میں جو مضامین یا کتابیں ان پر تحریر کی گئیں، ان میں اقبال کا سنِ ولادت ۱۸۷۰ئ، ۱۸۷۲ئ، ۱۸۷۵ئ، ۱۸۷۶ء یا ۱۸۷۷ء بتایا گیا ہے۔

اقبال نے یکم اکتوبر ۱۹۰۵ء کو ٹرینٹی کالج کیمبرج کے رجسٹر میں اپنے ہاتھ سے اپنی تاریخ ولادت محرم (۱۸۷۶ئ) تحریر کی۔ پھر انہوں نے ۶ نومبر ۱۹۰۵ء کو ''لنکنز ان لندن'' کے رجسٹر داخلہ میں اپنی عمر انتیس برس درج کی، جس کے مطابق سن ولادت ۱۸۷۶ء بنتا ہے۔ ۱۹۰۷ء میں جب اقبال نے ڈاکٹریٹ کے لیے اپنا تحقیقی مقالہ ایران میں فلسفہ مابعد الطبیعیات کا ارتقاء (انگریزی) میونخ یونیورسٹی میں پیش کیا تو اس کے ساتھ، اس یونیورسٹی کے دستور کے مطابق، ایک خودنوشت سوانحی خاکہ بھی منسلک کیا جس میں انہوں نے اپنے ہاتھ سے لکھا:

میں ۳ ذیقعد ۱۲۹۴ھ (مطابق ۱۸۷۶ئ) کو سیالکوٹ، پنجاب (انڈیا) میں پیدا ہوا۔

ڈاکٹریٹ کے لیے ان کا زبانی امتحان میونخ میں ۴/نومبر ۱۹۰۷ء کو پروفیسر ایف ہومل کے زیر صدارت ایک بورڈ نے لیا اور اس سے متعلقہ کارڈ میں ان کی تاریخ ولادت ۹/نومبر ۱۸۷۷ء درج ہے۔ بعد میں ۱۹۳۱ء میں جب گول میز کانفرنس میں شمولیت کی خاطر انگلستان جانے کے لیے پاسپورٹ بنوایا تو اس میں بھی انہوں نے اپنا سن ولادت ۱۸۷۶ء ہی تحریر کیا۔ اقبال کے حصول تعلیم کی خاطر یورپ جانے کا پاسپورٹ جو ۱۹۰۵ء میں بنوایا گیا ہوگا، موجود نہیں۔ ممکن ہے اس میں بھی سال ولادت ۱۸۷۶ء ہی درج ہو۔

خمخانہ جاوید جلد اوّل، مصنفہ لالہ سری رام (طباعت ۱۹۰۸ئ) میں اقبال کا سن

ولادت ۱۸۷۰ء درج ہے۔ اس کتاب کی تحریر یا اشاعت کے دوران اقبال انگلستان میں تھے اور عین ممکن ہے کہ لالہ سری رام نے اقبال کے حالات زندگی ان کے بعض جاننے والوں سے حاصل کیے ہوں، کیونکہ وہ مقدمہ کتاب میں شیخ عبدالقادر، پنڈت کیفی اور نواب سر ذوالفقار علی خان کا ذکر اسی سلسلہ میں کرتے ہیں۔ شاید ان احباب نے اپنے اندازے کے مطابق سال ولادت ۱۸۷۰ء بتایا ہو۔ انتخاب زرّیں مرتب سر سید راس مسعود (طباعت ۱۹۲۱ئ) میں تاریخ ولادت اگست ۱۸۷۰ء مطابق ۱۲۸۷ھ تحریر ہے۔ قاموس المشاہیر جلد اوّل، مرتب نظامی بدایونی (طباعت ۱۹۲۴ئ) میں سال ولادت ۱۸۷۰ء اور قند اردو مرتب جلال الدین احمد جعفری (طباعت ۱۹۲۴ئ) میں بھی سال پیدائش ۱۸۷۰ء ہی دیا گیا ہے۔ سر سید راس مسعود کے علاوہ باقی حضرات اقبال کے حلقہ احباب سے تعلق نہ رکھتے تھے۔ بلکہ عین ممکن ہے کہ اس زمانے میں سر سید راس مسعود کے ساتھ بھی اقبال کے تعلقات اتنے گہرے نہ ہوں جتنے بعد میں ہو گئے تھے، اس لیے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ان تمام حضرات نے سال ولادت خمخانہ جاوید مطبوعہ ۱۹۰۸ء سے اخذ کیا ہو۔

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم اور عبدالقادر سروری اقبال پر اپنے اپنے مضمونوں میں، جو آثار اقبال مرتب دستگیر رشید، ادارہ اشاعت اردو حیدر آباد (دکن) میں شائع ہوئے، اقبال کا سن ولادت ۱۸۷۲ء درج کرتے ہیں۔

اقبال کے احباب میں ان کے حالات زندگی پر ایک مضمون فوق نے تحریر کیا جو ''حالاتِ اقبال'' کے عنوان سے کشمیری میگزین لاہور میں ۱۹۰۹ء میں شائع ہوا۔ اس میں اقبال کا سالِ پیدائش ۱۸۷۵ء درج ہے۔ اس کے بعد نواب سر ذوالفقار علی خان نے اقبال پر اپنے انگریزی کتابچے مشرق سے ایک آواز (طباعت ۱۹۲۲ئ) میں ان کا سن ولادت ۱۸۷۶ء کے لگ بھگ تحریر کیا ہے۔ مولوی احمد دین ایڈووکیٹ نے اپنی کتاب اقبال (طباعت ۱۹۲۴ئ، بار اوّل اور ۱۹۳۶ء بار دوم) میں ان کا سال پیدائش ۱۸۷۵ء لکھا ہے۔ ۱۹۳۰ء میں فوق نے اپنی کتاب مشاہیر کشمیر کی طبع ثانی میں ۱۸۷۵ء ہی کو اقبال کا سن ولادت قرار دیا۔ لیکن ۱۹۳۲ء میں نیرنگ خیال کے اقبال نمبر میں فوق نے اقبال کی سوانح حیات پر اپنے مضمون میں پہلی بار ان کا سال پیدائش ۱۸۷۶ء تحریر کیا اور اسی طرح تاریخ اقوام کشمیر جلد دوم میں بھی ۱۸۷۵ء کی بجائے ۱۸۷۶ء ہی کو ان کا سن ولادت قرار دیا۔ یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ

فوق، نواب سر ذوالفقار علی خان اور مولوی احمد دین کے تعلقات اقبال سے بہت گہرے تھے۔ شیخ اعجاز احمد کے قیاس کے مطابق فوق نے سن ولادت کی تصحیح اقبال کے ایما پر کی ہوگی۔

''دیباچہ-کلیاتِ اقبال'' مرتب محمد عبدالرزاق علیگ (مطبوعہ ۱۹۲۲ئ) میں اقبال کا سنہ ولادت ۱۸۷۵ء درج ہے۔ رام بابو سکسینہ کی اردو ادب پر انگریزی کتاب (مطبوعہ ۱۹۲۹ئ) میں ان کا سنہ ولادت ۱۸۷۵ء ہی درج ہے۔ یاد اقبال مرتب چودھری غلام سرور فگار، میں محمد حسنین نے بھی اقبال پر اپنے مضمون میں ان کا سال پیدائش ۱۸۷۵ء تحریر کیا ہے اور جدید شاعری از عبدالقادر سروری میں بھی ۱۸۷۵ء ہی کو ان کا سال ولادت قرار دیا گیا ہے۔ اسی طرح سرمایۂ اردو مرتب حافظ محمود شیرانی میں بھی ان کا سنہ ولادت ۱۸۷۵ء ہی بیان کیا گیا ہے۔ عین ممکن ہے کہ ان مصنفین نے اس سلسلہ میں کشمیری میگزین یا مشاہیر کشمیر پر انحصار کیا ہو۔

جرمن مستشرق ہیلمتھ فان گلاسنیپ نے ہندوستانی ادب پر اپنی تصنیف (مطبوعہ ۱۹۲۹ئ) میں اقبال کا سنہِ ولادت ۱۸۷۶ء تحریر کیا ہے۔ اسی طرح ملک راج آنند نے اقبال پر اپنے انگریزی مضمون میں جو رائل اکیڈیمی جرنل میں شائع ہوا اور جس کا اردو ترجمہ ۱۹۳۲ء میں نیرنگ خیال کے اقبال نمبر میں چھپا، ان کا سال پیدائش ۱۸۷۶ء بیان کیا ہے۔ اقبال، شاعری اور پیغام مصنفہ: شیخ اکبر علی (انگریزی، مطبوعہ ۱۹۳۲ئ) میں بھی سن ولادت ۱۸۷۶ء تحریر کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں مندرجہ ذیل کتب میں بھی ان کا سن ولادت ۱۸۷۶ء ہی درج ہے:

۱۔ مختصر تاریخ اردو ادب از سید اعجاز حسین، مطبوعہ ۱۹۳۴ء
۲۔ تذکرہ شعرائے پنجاب، مرتب نسیم رضوانی، مطبوعہ ۱۹۳۷ء
۳۔ مجلہ اردو، انجمن ترقی اردو، اقبال نمبر، مطبوعہ ۱۹۳۸ء
۴۔ اقبال کامل از عبدالسلام ندوی ۱۹۴۸ء
۵۔ گلستان ہزار رنگ از سید بہاء الدین احمد
۶۔ مراۃ الشعراء جلد دوم از مولوی محمد یحییٰ تنہا

قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ان کتب کا ماخذ یا تو نواب سر ذوالفقار علی خان کا انگریزی کتابچہ تھا یا نیرنگ خیال اقبال نمبر میں فوق اور ملک راج آنند کے مضامین، البتہ مندرجہ ذیل کتب میں اقبال کا سال پیدائش ۱۸۷۷ء درج ہے:

۱۔ انڈین انسائیکلوپیڈیا مرتب پی ڈی چندر (انگریزی) مطبوعہ ۱۹۲۸ء

۲۔ ہندوستان میں کون، کون ہے مرتب تھامس پیٹر (انگریزی) مطبوعہ ۱۹۳۶ء

معلوم ہوتا ہے، انہی کتب پر انحصار کرتے ہوئے جرمن مستشرق گائفیلڈ سائمن نے بھی اسلام پر اپنی تصنیف (مطبوعہ ۱۹۳۷ئ) میں اقبال کا سنہ ولادت ۱۸۷۷ء تحریر کیا۔

اوپر دی گئی تفصیل سے ظاہر ہے کہ اقبال کی زندگی کے دوران میں جس سن ولادت کو ہمارے قیاس کے مطابق، اقبال کی تائید حاصل تھی وہ ۱۸۷۶ء ہی تھا۔ ۱۸۷۳ء کو کسی نے بھی ان کے سن ولادت کے طور پر پیش نہیں کیا۔ سوال یہ ہے کہ اس زمانے میں ۱۸۷۰ئ، ۱۸۷۲ئ، ۱۸۷۵ئ، یا ۱۸۷۷ء کے بارے میں ذریعۂ معلومات کیا تھا؟ اس کے جواب میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ اس بارے میں اقبال کی عدم دلچسپی یا عدم تعاون کے سبب محض اندازے سے کام لیا گیا۔

اقبال کی وفات کے دوسرے روز یعنی ۲۲ اپریل ۱۹۳۸ء کو انگریزی روز نامہ سول اینڈ ملٹری گزٹ نے اپنے ایک نوٹ میں ان کا سال ولادت ۱۸۷۷ء تحریر کیا۔ چند یوم بعد روز نامہ انقلاب میں ان کے حالات زندگی پر ایک مختصر مضمون شائع ہوا جو شیخ عطا محمد سے حاصل کردہ معلومات پر مبنی تھا۔ اس مضمون میں شیخ عطا محمد کے تخمینی بیان کے مطابق اقبال کی پیدائش کا مہینہ دسمبر اور سال ۱۸۷۶ء تحریر کیا گیا، لیکن بعدازاں روز نامہ انقلاب کی اشاعت ۷ مئی ۱۹۳۸ء میں علامہ اقبال کی تاریخ پیدائش کے عنوان کے تحت مندرجہ ذیل نوٹ شائع ہوا:

> حضرت علامہ اقبال کے جو مختصر سوانح حیات انقلاب کی کسی گزشتہ اشاعت میں چھپے تھے، ان میں شیخ عطا محمد صاحب برادرِ کلاں حضرت علامہ مرحوم کے تخمینی بیان کے مطابق حضرت مرحوم کی تاریخ پیدائش دسمبر ۱۸۷۶ء بتائی گئی تھی، لیکن اب تحقیقی طور پر یہ معلوم ہو چکا ہے کہ حضرت علامہ مرحوم ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء کو پیدا ہوئے۔ اسلامی تاریخ ۲۳، ۲۴ ذی الحجہ ۱۲۸۹ھ تھی۔ ان تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علامہ مرحوم کی عمر بحساب سنین شمسی ۶۵ برس دو ماہ اور بحساب قمری ۶۷ برس دو ماہ ہوئی۔

اقبال کے خاندان میں ایسا کوئی ریکارڈ سرے سے موجود ہی نہیں، جس میں ان کی تاریخ پیدائش ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء لکھی ہو۔ یہاں یہ بتا دینا بھی مناسب ہوگا کہ مرے کالج کے رجسٹر

میں اقبال کی تاریخ داخلہ کالج ۵ مئی ۱۸۹۳ء درج ہے، مگر تاریخ ولادت کی بجائے عمر ۱۸ سال لکھی ہے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اقبال ۱۸۹۳ء میں ۱۸ سال کے تھے تو بھی ان کا سن ولادت ۱۸۷۳ء کی بجائے ۱۸۷۵ء بنے گا۔

اس بحث سے نتیجہ نکلا کہ اقبال کے بعض سوانح نگاروں نے اسی تاریخ پیدائش کو اقبال کی تاریخ ولادت کے طور پر پیش کیا۔ محکمہ آثار قدیمہ نے اقبال کی بعض لاہور اور سیالکوٹ کی رہائش گاہوں پر جو کتبے نصب کیے ان پر بھی سن ولادت ۱۸۷۳ء ہی کندہ کیا گیا۔ یہاں تک کہ وفات اقبال کی بیسویں برسی کے موقع پر ۱۹۵۸ء میں حکومت پاکستان کے محکمہ ڈاک نے جو یادگاری ٹکٹ چھاپے ان پر بھی سن پیدائش ۱۸۷۳ء ہی درج کیا گیا۔

"انقلاب یا ذکرِ اقبال پر انحصار کرتے ہوئے جن کتابوں میں ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء کو تاریخ ولادت اقبال قرار دیا گیا، ان میں سے چند یہ ہیں:

۱۔ حیات اقبال از چراغ حسن حسرت، مطبوعہ تاج کمپنی، لاہور ۱۹۳۸ء
۲۔ اقبال از محمد حسین خان مطبوعہ ۱۹۳۹ء
۳۔ شاعر مشرق از عبداللہ انور بیگ (انگریزی) مطبوعہ ۱۹۳۹ء
۴۔ سیرت اقبال از محمد طاہر فاروقی، مطبوعہ ۱۹۳۹ء ۱۹۴۴ء، ۱۹۴۹ء
۵۔ اقبال از سچید انند سہنا (انگریزی) الہ آباد ۱۹۴۷ء
۶۔ سرگرم زائر (حیات اقبال) از اقبال سنگھ (انگریزی) ۱۹۵۱ء
۷۔ تذکرہ شعرائے متغزلین مرتب محمد اسمٰعیل پانی پتی، مطبوعہ ۱۹۵۶ء
۸۔ اقبال، اس کا آرٹ اور فکر از سید عبدالواحد معینی (انگریزی) مطبوعہ ۱۹۵۹ء
۹۔ کلیات اقبال مطبوعہ نظامی پریس بدایوں
۱۰۔ کلیات اقبال مطبوعہ نسیم بک ڈپو لکھنؤ
۱۱۔ یادگار اقبال مرتب: سید محمد طفیل احمد بدر امروہوی
۱۲۔ اردو انسائیکلوپیڈیا مطبوعہ فیروز سنز لمیٹڈ پاکستان، لاہور
۱۳۔ تاریخ ادب اردو از ڈاکٹر محمد صادق (انگریزی)
۱۴۔ شعر اقبال از سید عابد علی عابد

انقلاب کی دریافت کردہ تاریخ کے باوجود بعض اقبال شناسوں نے اسے درست تسلیم

نہیں کیا، بلکہ ۱۸۷۶ء یا ۱۸۷۷ء ہی کو ان کا سنۂ ولادت تحریر کرتے چلے گئے۔ مثلاً ولیم کینٹول سمتھ کی تصنیف ہند میں جدید اسلام (مطبوعہ ۱۹۴۶ئ)۔ (انگریزی) میں اقبال کا سن پیدائش ۱۸۷۶ء درج ہے۔ جرمن مستشرق فیوک نے اقبال پر اپنی تصنیف میں (جو ۱۹۵۴ء میں جرمنی میں شائع ہوئی) ۱۸۷۷ء ان کا سنۂ ولادت قرار دیا۔ اسی طرح روسی مستشرق کو بیکوا نے اپنی تصنیف نووو پیسکن لٹریچر (مطبوعہ ۱۹۵۶ئ) میں ان کا سالِ پیدائش ۱۸۷۷ء تحریر کیا ہے۔

سید عبدالواحد معینی کے بیان کے مطابق پہلی شخصیت جس نے انقلاب کی تحقیق پر شبہے کا اظہار کیا، پان (جرمنی) میں اردو کے استاد ڈی۔ سی۔ رائے تھے۔ رائے نے ۱۹۵۷ء میں پاکستانی سفارت خانہ واقع گاڈسبرگ کے ثقافتی اتاشی کو ایک خط لکھا جس میں اقبال کی تاریخ پیدائش کے متعلق الجھاؤ کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ چونکہ مختلف مصنف اور اہل قلم اس سلسلے میں مختلف تواریخ اور سنین تحریر کرتے ہیں، اس لیے یہ معاملہ مثبت اور مکمل تحقیق کے ذریعے طے کیا جانا چاہیے۔ لیکن اس مسئلے کو سلجھانے کے لیے پاکستان میں کوئی قدم نہ اٹھایا گیا۔

۱۹۵۸ء میں پراگ یونیورسٹی (چیکوسلواکیہ) کے پروفیسر یان مارک نے اقبال کی تاریخ پیدائش کے موضوع پر ایک مدلل مضمون، رسالہ آرچیو اورینٹلی پراگ میں شائع کیا۔ ان کے سامنے اقبال کا خودنوشت تعارفی نوٹ تھا، جو انھوں نے ۱۹۰۷ء میں اپنا تحقیقی مقالہ میونخ یونیورسٹی جرمنی میں پیش کرتے وقت ساتھ منسلک کیا تھا۔ اس تعارفی نوٹ کی روشنی میں یان مارک اس نتیجے پر پہنچے کہ اقبال کی صحیح تاریخِ ولادت ۹ نومبر ۱۸۷۷ء ہے۔

۱۹۶۳ء میں جرمن مستشرق این میری شمل نے فکر اقبال پر اپنی انگریزی تصنیف بعنوان بال جبریل میں یان مارک کے حوالے سے تحریر کیا کہ اُن کی صحیح تاریخ ولادت کے متعلق اختلافات ہیں۔ عام طور پر ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء ان کی تاریخ ولادت سمجھی جاتی ہے مگر اپنے تحقیقی مقالے کے نوٹ میں اقبال نے خود اپنی تاریخ ولادت ۳ ذیقعد ۱۲۹۴ھ مطابق ۱۸۷۶ء درج کی ہے۔ ہجری کا سن ۱۲۹۴ھ چونکہ جنوری ۱۸۷۷ء سے شروع ہوا، اس لیے ۹ نومبر ۱۸۷۷ء اقبال کی درج کردہ ہجری تاریخ کے عین مطابق ہے۔ یہ تاریخ اس لیے بھی درست ہے کہ اقبال کی زندگی کے مختلف تعلیمی مراحل یعنی ان کے کالج یا یونیورسٹی میں امتحانات کی تکمیل کی تواریخ سے اس کی مطابقت بمقابلہ ۱۸۷۳ء زیادہ قرین قیاس اور بہتر معلوم ہوتی ہے۔

اسی سال روزگار فقیر کے مصنف فقیر سیّد وحید الدین (نقشِ ثانی) نے شیخ اعجاز احمد کے پیش کردہ شواہد کی روشنی میں اس موضوع پر طویل بحث کے بعد یہ ثابت کیا ہے کہ اقبال کی صحیح تاریخ ولادت ۹ نومبر ۱۸۷۷ء ہے۔

اس کے بعد جن اہلِ علم نے اقبال پر مضامین یا کتب شائع کیں، ان میں سے بیشتر نے اسی تاریخ ولادت کو درست تسلیم کیا۔ مثلاً سیّد عبدالواحد معینی نے اپنی انگریزی تصنیف "اقبال، اس کا آرٹ اور فکر (مطبوعہ ۱۹۶۴ئ) میں اقبال کی تاریخ ولادت ۹ نومبر ۱۸۷۷ء درج کی، حالانکہ اسی کتاب کے طبع ۱۹۵۹ء میں انہوں نے ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء کی تاریخ تحریر کی تھی۔ اسی طرح رسالہ نقوش کے آپ بیتی نمبر (مطبوعہ ۱۹۶۴ئ) میں ان کی تاریخ ولادت ۹ نومبر ۱۸۷۷ء درج کی گئی۔ اس سے پیشتر اسی رسالے کے مختلف شماروں مثلاً غزل نمبر، مکاتیب نمبر، طنز و مزاح نمبر اور لاہور نمبر میں سنہ پیدائش ۱۸۷۵ء یا ۱۸۷۶ء درج کیا گیا تھا۔ رام بابو سکسینہ کی اردو ادب پر (انگریزی) تصنیف کے اردو ترجمے از عسکری (مطبوعہ ۱۹۶۵ئ) میں نظر ثانی کے بعد مرتضیٰ حسین فاضل نے ۱۸۷۵ء کی بجائے ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو اقبال کی صحیح تاریخ پیدائش قرار دیا۔ اسی طرح محمد طاہر فاروقی نے اپنی کتاب سیرت اقبال (مطبوعہ ۱۹۶۶ئ) میں اقبال کی تاریخ ولادت تصحیح کے بعد ۹ نومبر ۱۸۷۷ء لکھی جبکہ اس کتاب کی طبع ۱۹۳۹ء، ۱۹۴۴ء اور ۱۹۴۹ء میں ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء درج ہے۔

۱۹۶۷ء میں یوم اقبال کے موقع پر حکومت پاکستان کے محکمہ ڈاک نے جو یادگاری ٹکٹ شائع کیے، ان پر اقبال کا سن ولادت ۱۸۷۷ء چھاپا گیا، لیکن چونکہ ۱۹۵۸ء کے یادگاری ٹکٹوں پر سنہ ولادت ۱۸۷۳ء تحریر کیا گیا تھا، اس لیے ایک اخبار نے اس تضاد کے بارے ایک تبصرہ شائع کیا جس کے جواب میں حکومتِ پاکستان نے ۲۷ اپریل ۱۹۶۷ء کو ایک وضاحتی نوٹ جاری کیا، جس میں کہا گیا کہ ۱۸۷۷ء سنہِ ولادت اقبال اکادمی اور اقبال سرکل کراچی کا تصدیق شدہ ہے اور کرنل وحید الدین نے اپنی کتاب اقبال باتصویر میں یہی سن ولادت درج کیا ہے۔ نیز چیکوسلواکیہ یونیورسٹی کے پروفیسر یان مارک نے بھی اسی سنہ ولادت کی تصدیق کی ہے، لیکن ان کتابوں میں جن کا ذکر کسی اخبار میں سند کے طور پر کیا گیا ہے صحیح تاریخ ولادت اقبال درج نہیں۔

بعدازاں جب ۱۹۶۸ء میں انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کی جلد بارہ شائع ہوئی، تو اس میں اقبال کی تاریخ پیدائش ۹ نومبر ۱۸۷۷ء تحریر کی گئی۔ مارچ ۱۹۶۹ء کے روز

نامہ جنگ کے کسی شمارے میں حفیظ ہوشیار پوری نے اس موضوع پر ایک مضمون تحریر کیا اور شواہد کی روشنی میں ایک بار پھر ثابت کیا کہ صحیح تاریخ ولادت اقبال ۹ نومبر ۱۸۷۷ء ہے۔ اسی سال سید عبدالواحد معینی کی تصنیف نقش اقبال شائع ہوئی، جس کے پہلے باب میں اقبال کی تاریخ ولادت کے زیر عنوان اس موضوع پر پھر بحث کی گئی اور ثابت کیا گیا کہ پیدائش اقبال کی صحیح تاریخ ۹ نومبر ۱۸۷۷ء ہی ہے۔

تاریخ ولادت اقبال کے بارے میں اختلافِ رائے کے سبب پاکستان میں سرکاری ادارہ بزم اقبال، لاہور نے غالباً ۱۹۶۹ء میں اپنے طور پر جسٹس ایس۔اے۔رحمان کی سرکردگی میں ایک کمیٹی قائم کی تا کہ اقبال کی صحیح تاریخ ولادت کا تعین کیا جا سکے کمیٹی کی تحقیقات کئی سال جاری رہیں۔اسی دوران ۱۹۷۱ء میں بزم اقبال نے خالد نظیر صوفی کی کتاب اقبال، درون خانہ شائع کی۔جس میں تحریر کیا گیا کہ اقبال کی تاریخِ ولادت دراصل ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء ہے۔خالد نظیر صوفی، شیخ عطا محمد کی سب سے چھوٹی دختر کے فرزند ہیں۔ان کے والد نظیر صوفی اقبال کی بڑی بہن طالع بی کے بیٹے خورشید احمد کے فرزند ہیں۔ان کی تحقیق کے مطابق سیالکوٹ میونسپل کمیٹی کے رجسٹر پیدائش و اموات کے ایک اندارج کے تحت ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء کو ایک لڑکا محلہ چوڑیگراں کے نتھو مسلم خیاط کے ہاں پیدا ہوا، جس کا اطلاع کنندہ علی محمد ولد غلام محی الدین تھا۔ مصنف کی رائے میں یہ اندارج اقبال کی تاریخِ پیدائش کا تھا، کیونکہ اس میں اقبال کے والد شیخ نور محمد (عرف نتھو) کے ہاں، جن کا پیشہ خیاطی تھا، لڑکا پیدا ہونے کی اطلاع علی محمد ولد غلام محی الدین نے دی جو رشتے میں شیخ نور محمد کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔

جسٹس رحمان کمیٹی کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکی۔ بالآخر ۱۹۷۲ء میں حکومت پاکستان نے اقبال کی تاریخ ولادت کے تعین کے بارے میں حتمی فیصلہ کرنے کی خاطر مرکزی سیکرٹری تعلیم کی زیر قیادت ایک کمیٹی تشکیل کی۔اس کمیٹی کے کئی اجلاس ہوئے اور تحقیقات جاری رہیں۔

۱۹۷۳ء میں غالباً انقلاب یا خالد نظیر صوفی کی دریافت شدہ تاریخ ولادت پر انحصار کرتے ہوئے حکومت ہندوستان نے اعلان کر دیا کہ ۷۴۔۱۹۷۳ء کے سال میں پیدائشِ اقبال کے صد سالہ جشن کی تقریبات منعقد کی جائیں گی۔ بعدازاں اس سلسلے میں اس وقت کی وزیر اعظم اندرا گاندھی کی زیر قیادت ایک قومی کمیٹی قائم کی گئی اور بھارت میں جشن اقبال منانے کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔اس مسئلے پر ہندوستان میں بھی آراء کا اختلاف تھا۔مثلاً مالک رام نے اقبال کی

تاریخ ولادت سے متعلق اپنی تحریر میں ۲۰ دسمبر ۱۸۷۳ء کو تاریخ پیدائش اقبال قرار دیا۔ اسی طرح مولانا عبدالقوی کو ۳ ذیقعد ۱۲۹۴ھ بطور تاریخ ولادت اقبال تسلیم کرنے میں تامل تھا، کیونکہ ان کی رائے میں اس تاریخ کے سلسلے میں جو ثبوت فراہم کیے گئے وہ اطمینان بخش نہ تھے۔ لیکن مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنی تصنیف نقوش اقبال میں ۱۸۷۷ء کو بطورِ سنِ پیدائش اقبال قبول کیا اور اسی طرح جگن ناتھ آزاد نے بھی اقبال کی تاریخ پیدائش ۹ نومبر ۱۸۷۷ء ہی قرار دی۔

بہرحال حکومتِ ہندوستان کے اعلان پر مرکزی تاریخ ولادت کمیٹی نے اپنی کارروائی تیز کر دی، کیونکہ سوال پیدا ہو گیا کہ اگر بھارت اقبال کی صد سالہ جشن ولادت منانے کا اہتمام کر سکتا ہے تو پاکستان کیوں خاموش رہے۔ تاریخ ولادت کمیٹی کی کارروائی ڈیڑھ دو سال تک جاری رہی۔ بالآخر ۹ فروری ۱۹۷۴ء کو کمیٹی کی سفارشات پر حکومت پاکستان نے اعلان کیا کہ اقبال کی صحیح تاریخ ولادت ۹ نومبر ۱۸۷۷ء ہے۔ بعدازاں ۲۵ جولائی ۱۹۷۴ء کو حکومت پاکستان نے متذکرہ تاریخ ولادت کی بنا پر اعلان کیا کہ ۱۹۷۷-۷۸ء کے سال میں ولادت اقبال کا صد سالہ جشن منایا جائے گا۔ جس کے اہتمام و انتظام کے لیے اس وقت کے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی زیر قیادت ایک قومی کمیٹی قائم ہوئی۔ یہ جشنِ پاکستان اور ہندوستان میں ۱۹۷۷ء ہی کے سال میں منایا گیا۔

اقبال کی تین مختلف تواریخ پیدائش پیش کی گئی ہیں، جو اقبال کی وفات سے لے کر اب تک اہل علم میں موضوع بحث رہی ہیں۔ یہ ہیں ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء، ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء اور ۹ نومبر ۱۸۷۷ئ۔ ان تینوں میں سے کونسی ایک صحیح تاریخِ ولادت اقبال ہے؟ اس سلسلے میں کسی حقیقی نتیجے پر پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ ان تینوں تواریخ پیدائش کی تائید یا تردید میں جو کچھ کہا گیا ہے، اس پر غور کیا جائے۔

۲۲ فروری ۱۸۷۳ء

یہ تاریخ ولادت ادارہ انقلاب کی دریافت کردہ ہے۔ اس کا انحصار سیالکوٹ میونسپل کمیٹی کے رجسٹر پیدائش و اموات کے اس اندراج پر ہے کہ ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء کو نتھو کشمیری ساکن محلہ کشمیریاں کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا، جس کا اطلاع کنندہ نتھو درج ہے۔ مگر یہ اندراج شیخ نور محمد کے ہاں لڑکے کی پیدائش کے متعلق ہے جو اقبال سے تین چار سال پہلے پیدا ہو کر شیر

خواری کی عمر میں وفات پا گیا۔

پس متذکرہ تاریخ ولادت اقبال اس بناء پر غلط ثابت ہوچکی ہے۔ یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ شیخ نور محمد کی سکونت محلہ چوڑیگراں میں تھی۔ اس وقت کے رجسٹری شدہ مسودات میں بھی ان کے رہائشی مکان کا محل وقوع بازار یا محلہ چوڑیگراں درج ہے۔ شیخ نور محمد کی اولاد سے متعلق ہر وہ اندراج، جس میں سکونت والد کے خانے میں محلہ چوڑیگراں کی بجائے محلہ کشمیریاں درج ہے، مشکوک سمجھا جانا چاہیے۔ اس لیے متذکرہ اندراج کا تعلق اقبال کی پیدائش سے قبل اس لڑکے کی پیدائش سے بھی نہیں، جو شیر خواری کی عمر میں فوت ہوگیا تھا۔ عین ممکن ہے کہ یہ اندراج کسی ایسے بچے کی پیدائش کا ہو جو محلہ چوڑیگراں کی بجائے محلہ کشمیریاں میں سکونت پذیر کسی نتھو کشمیری کے ہاں ہوا ہو اور جس کا اطلاع کنندہ اس کا والد تھا۔

۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء

یہ تاریخ ولادت خالد نظیر صوفی کی دریافت ہے اور اس کا انحصار سیالکوٹ میونسپل کمیٹی کے رجسٹر پیدائش و اموات کے اس اندراج پر ہے کہ ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء کو ایک لڑکا محلہ چوڑیگراں کے نتھو مسلم خیاط کے ہاں پیدا ہوا، جس کا اطلاع کنندہ علی محمد ولد غلام محی الدین تھا۔

علی محمد ولد غلام محی الدین کے بارے میں شیخ اعجاز احمد بیان کرتے ہیں کہ ان کے خاندان میں اس نام اور ولدیت کے کسی شخص کے متعلق انہوں نے کبھی نہیں سنا، نہ کوئی ایسے نام کا شخص خاندان کی خوشی یا غمی کے موقعوں پر کبھی شریک ہوا۔

نظیر صوفی کی اس روایت کی تائید نہ تو اقبال کے اپنے بیانات سے ہوتی ہے اور نہ فوق کی تحریروں سے شیخ نور محمد، اقبال اور فوق کے نزدیک اقبال کے جد اعلیٰ بابا لول حج یا حاجی لولی کے لقب سے مشہور تھے اور انہوں نے پندرہویں صدی عیسوی میں بڈشاہ کے زمانے میں اسلام قبول کیا اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ انہوں نے صالح نام پایا، یا کسی سید کی بیٹی سے ان کی شادی ہوئی، یا وہ بعد میں بابا صالح کہلائے، لیکن نظیر صوفی کی روایت کو بغیر کسی تحقیق کے صحیح مان کر اقبال کے کئی سوانح نگاروں نے اسے ذکر اقبال سے اخذ کر کے اپنی اپنی تصانیف میں درج کرلیا۔

شیخ نور محمد کے شیر خواری کی عمر میں فوت ہونے والے لڑکے کی وفات کا اندراج میونسپل ریکارڈ میں موجود نہیں۔ اگر ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء کو اس لڑکے کی پیدائش کا اندراج سمجھ لیا جائے تو چند ماہ بعد اس کی فوتیدگی کا اندراج بھی ہونا چاہیے، لیکن اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ مذکورہ تاریخ

پیدائش کے اندراج کا تعلق اقبال کی ولادت سے قبل اس بچے کی پیدائش سے بھی نہیں، جو شیر خواری کی عمر میں انتقال کر گیا تھا۔ یہاں یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ شیخ نور محمد اور ان کے بھائی شیخ غلام محمد اکٹھے رہتے تھے اور خاندانی روایت کے مطابق دونوں بھائیوں کے ہاں ایک ہی وقت لڑکا اور لڑکی پیدا ہوئے، جن کا تبادلہ ہو گیا۔ کیا شیخ غلام محمد کے ہاں لڑکی کی پیدائش کا اندراج ریکارڈ میں موجود ہے؟ جواب ہے نہیں۔

طالع بی کی وفات کا اندراج ریکارڈ میں موجود ہے۔ آپ ۱۳ جولائی ۱۹۰۲ء کو فوت ہوئیں اور اطلاع کنندہ تاج دین درج ہے۔ اسی طرح اقبال کی بہن کریم بی کی وفات کا اندراج بھی ریکارڈ میں موجود ہے۔ وہ سیالکوٹ میں اپنے آبائی مکان واقع محلہ چوڑیگراں میں ۴ جولائی ۱۹۵۱ء کو فوت ہوئیں اور اطلاع کنندہ کا نام افتخار احمد درج ہے، جو شیخ اعجاز احمد کے بھائی شیخ امتیاز احمد کے فرزند ہیں۔ سو یہ سب اندراجات رشتہ داروں نے ہی کرائے تھے۔

متذکرہ اندراج کی صحت پر دوسرا اعتراض، جو شیخ اعجاز احمد نے کیا ہے؛ یہ ہے کہ شیخ نور محمد خیاط کے نام سے مشہور نہ تھے، کیونکہ ان کا تعلق خیاط برادری سے نہ تھا۔

یہ امر واقعہ ہے کہ شیخ نور محمد کا تعلق کشمیری برادری سے تھا، خیاط برادری سے نہ تھا۔ ہوسکتا ہے اسکاچ مشن سکول کے ریکارڈ میں شیخ نور محمد کو ان کے پیشے کی نسبت سے ٹیلر کہا گیا ہو، لیکن اگر محلہ چوڑیگراں میں خیاط برادری کے چند خاندان آباد تھے اور ان میں سے کسی بزرگ کا عرف عام نتھو بھی تھا، تو متذکرہ اندراج میں اطلاع کنندہ کی رشتہ داری کے مشکوک ہونے کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ کیونکر تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ پیشہ قوم اور مذہب کے خانے میں نتھو کشمیری یا ٹوپیاں والے کی بجائے اس مرتبہ ''خیاط'' شیخ نور محمد کے پیشے کی نسبت سے درج کیا گیا۔ عین ممکن ہے کہ اس اندراج کا تعلق خیاط برادری کے کسی نتھو کے ہاں لڑکے کی پیدائش سے ہو، اور جس کا اطلاح کنندہ اسی برادری سے متعلق کوئی رشتہ دار ہو۔

اب تک کی گئی بحث سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ شیخ نور محمد کی اولاد کی تواریخ پیدائش سے متعلق سیالکوٹ میونسپل کمیٹی کے رجسٹر پیدائش و اموات سے جو بھی اندراجات کتاب اقبال درون خانہ میں دیے گئے ہیں، ان میں ایک کے سوا باقی سب کے سب کسی نہ کسی وجہ سے مشکوک ہیں۔ جس اندراج کی صحت پر شبہے کی گنجائش نہیں، وہ طالع بی کی تاریخ پیدائش سے متعلق ہے، جس کے اطلاع کنندہ شیخ محمد رفیق تھے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا متذکرہ تاریخ ولادت اقبال کی تائید اقبال کے تعلیمی ریکارڈ یا ان کے خاندان کے بزرگ اور معتبر افراد کے بیانات سے ہوتی ہے؟ اقبال کے تعلیمی ریکارڈ میں سب سے پرانا مسودہ وہ سرٹیفکیٹ ہے، جسے پنجاب یونیورسٹی نے ۱۸۹۱ء میں ان کے مڈل اسکول امتحان پاس کرنے پر جاری کیا تھا۔ اس کی ۱۹۰۷ء میں جاری کردہ نقل شیخ اعجاز احمد کے پاس [illegible]ط ہے۔ اس سرٹیفکیٹ میں اقبال کی عمر پندرہ سال درج ہے۔ امتحان میں داخلے کی درخواست اقبال نے خود دی یا ان کے والد یا بڑے بھائی کی طرف سے دی گئی۔ ۱۸۹۱ء میں وہ اگر پندرہ سال کے تھے تو اس حساب سے ان کی سن پیدائش ۱۸۷۶ء بنتا ہے۔

اقبال نے میٹرک کا امتحان ۱۸۹۳ء میں پاس کیا اور اسکاچ مشن کالج میں ایف اے کے سال اوّل میں ان کے داخلہ کی تاریخ بمطابق ریکارڈ ۵ مئی ۱۸۹۳ء اور عمر اٹھارہ برس درج ہے۔ اس لحاظ سے سال ولادت ۱۸۷۵ء بنتا ہے۔ اقبال نے ۱۸۹۷ء میں بی اے کی ڈگری پنجاب یونیورسٹی سے حاصل کی۔ پنجاب یونیورسٹی کے کیلنڈر سال ۹۸-۱۸۹۷ء میں ان کی عمر جو داخلہ فارم میں ظاہر کی گئی ہے، انیس برس بنتی ہے۔ داخلے کا فارم بمطابق دستور ایک سال قبل یعنی ۱۸۹۶ء میں دیا گیا ہوگا۔ اس حساب سے ان کا سن ولادت ۱۸۷۷ء ہوگا۔

مصنف اقبال درون خانہ کے مطابق اقبال کی دو بہنیں (کریم بی اور زینب بی) بارہا یہ کہتے سنی گئیں کہ طالع بی، اقبال سے تقریباً تین سال بڑی ہیں اور کریم بی ان سے تین سال، چھوٹی۔ مصنف بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے کریم بی کی زبانی سنا کہ اقبال ان سے تین سال بڑے تھے۔ انہوں نے دو بہنوں کی تاریخ پیدائش کی نقلیں شایع کی ہیں۔ مصنف کے نزدیک طالع بی کی تاریخ پیدائش ۲ ستمبر ۱۸۷۰ء ہے اور کریم بی کی ۱۴ نومبر ۱۸۷۶ئ، اور پھر اسی بنا پر اقبال کا سن ولادت ۱۸۷۳ء قرار دیا ہے۔ طالع بی کا سن ولادت تو بلاشبہ درست تحریر ہے لیکن کریم بی کی پیدائش کا اندراج مشکوک ہے۔ اس لیے ان بیانات کی کوئی تائیدی شہادت موجود نہیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی سیالکوٹ میں اقبال کی ہم جماعت کرم بی بی کے بیان پر انحصار کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اقبال کی پیدائش ۲۹ر دسمبر ۱۸۷۳ء قرار دینے کے قرائن زیادہ وقیع ہیں۔ اقبال کی تاریخ ولادت کے تعین سے متعلق تحقیقات کے دوران کرم بی بی کا بیان ۱۹۷۴ء میں لیا گیا۔ کرم بی بی بیان کرتی ہیں کہ اقبال کی پہلی شادی کے وقت ان کی عمر انیس برس تھی اور کرم بی بی کی سترہ برس۔ یہ بیان اتنی مدت کے بعد حافظے کی بنیاد پر دیا گیا اور اتنے عرصے کے بعد یادداشت

کا صحیح رہنا ممکن نہیں۔ بہرحال ڈاکٹر وحید قریشی نے اس سے پیشتر اپنی تحریر میں اس موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے متذکرہ تاریخ ولادت کی بجائے ۹ نومبر ۱۸۷۷ء ہی کو صحیح قرار دیا ہے۔

۹ نومبر ۱۸۷۷ء

اس تاریخ ولادت کا اندراج سیالکوٹ کے میونسپل ریکارڈ میں موجود نہیں۔ مگر یہ اقبال کی ہجری سن میں اپنی بیان کردہ تاریخ ولادت کا عیسوی سنہ میں صحیح متبادل ہے۔ ۱۹۰۷ء میں اپنے تحقیقی مقالے کے ساتھ دیئے گئے۔ انگریزی میں تحریر کردہ اقبال کے تعارفی نوٹ کا لفظ بہ لفظ اردو ترجمہ یہ ہے:

میں ۳ ذیقعد ۱۲۹۴ھ (بمطابق ۱۸۷۶ئ) کو سیالکوٹ پنجاب (انڈیا) میں پیدا ہوا۔ میری تعلیم کی ابتدا عربی اور فارسی کے مطالعے سے ہوئی۔ چند برس بعد میں نے شہر کے ایک اسکول میں داخلہ لیا اور یونیورسٹی کے مراحل طے کرنے شروع کر دیے۔ میں نے پنجاب یونیورسٹی کا پہلا پبلک، امتحان ۱۸۹۱ء میں پاس کیا۔

اس تعارفی نوٹ سے واضح ہے کہ ۱۹۰۷ء میں اقبال نے ہجری سن میں اپنی مکمل تاریخ ولادت تحریر کرنے کے بعد قوسین میں اس کا متبادل عیسوی سال لکھا ہے۔

اقبال بھی اپنے بزرگوں کی طرح عیسوی سنین پر ہجری سنین کو ترجیح دیتے تھے۔ اقبال اگرچہ خطوط میں مکتوب الیہ کی سہولت کے خیال سے عیسوی تاریخیں دیتے تھے، لیکن انہوں نے جو منظوم تاریخیں کہی ہیں، آٹھ تاریخوں کے سوا باقی تمام ہجری سنین میں ہیں۔ اس لیے ہجری سن میں انہیں جو حتمی تاریخِ ولادت والدین نے بتائی، اسے جوں کا توں رکھا گیا۔ پس وہی تاریخ ان کی نگاہ میں معتبر تھی، جو ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کے برابر ہوتی ہے۔

اب ہم اس سوال کی طرف آتے ہیں کہ متذکرہ تاریخ ولادت اقبال کے تعلیمی ریکارڈ سے کس حد تک مطابقت رکھتی ہے۔ اقبال کے ۱۸۹۱ء میں مڈل پاس کرنے کے سرٹیفیکیٹ میں ان کی عمر پندرہ سال درج ہے۔ شیخ اعجاز احمد کی رائے میں دراصل عیسوی کیلنڈر کے مطابق اس وقت ان کی عمر چودہ سال تھی اور اس حساب سے ان کا سال ولادت ۱۸۷۷ء بنتا ہے۔ اسی طرح اقبال نے ۱۸۹۷ء میں بی۔ اے کی ڈگری لی، اور داخلہ فارم میں جو ۱۸۹۶ء میں دیا گیا، ان کی عمر انیس برس تحریر ہے۔ اس حساب سے بھی ان کا سن ولادت ۱۸۷۷ء بنتا ہے۔ البتہ ۱۸۹۳ء میں ان کے اسکاچ مشن کالج میں داخلے کے فارم میں درج کردہ عمر (اٹھارہ سال) اس سال

ولادت سے مطابقت نہیں رکھتی۔ کیونکہ اس سے سن ولادت ۱۸۷۵ء نکلتا ہے، جو غلط ہے۔

اگر اقبال عام رواج کے مطابق تقریباً ساڑھے چار سال کی عمر میں مکتب نشین ہوئے اور چند سال کی مدت تک مکتبی تعلیم کے حصول کے بعد ۱۸۸۵ء میں انہوں نے اسکول کی پہلی جماعت کا امتحان پاس کیا، لیکن اپنی ذہانت کے سبب دوسری جماعت کی بجائے تیسری جماعت میں چڑھے، تو اس حساب سے ۱۸۹۱ء میں مڈل پاس کرتے وقت ان کی عمر چودہ یا پندرہ سال ہونا بخوبی ممکن ہے۔ اگر اقبال ۱۸۸۴ء میں اسکول کی پہلی جماعت میں داخل ہوئے تو اس وقت ان کی عمر سات سال ہوسکتی ہے۔ یعنی انہوں نے اڑھائی برس تک مکتبی تعلیم حاصل کی۔ لیکن اگر سلطان محمود حسین کی تحقیق کے مطابق ۱۸۸۵ء اور ۱۸۹۱ء کے چھ سالوں میں اقبال نے سات جماعتیں پاس کیں تو ۱۸۹۱ء میں ان کی عمر چودہ برس ہوگی۔

اقبال کے خاندان کے بزرگ اور معتبر افراد کے بیانات بھی اس سلسلے میں قابل توجہ ہیں۔ اقبال کے بیان کردہ ہجری سن میں اپنی تاریخ ولادت کے بارے میں معلومات کا ذریعہ ان کے والدین ہوں گے اور یہ قیاس کرنا ممکن نہیں کہ متذکرہ تاریخ ولادت ان کی خود ساختہ تھی۔ شیخ عطا محمد نے ادارہ انقلاب کو اپنے تخمینے کے مطابق ولادت اقبال کی تاریخ دسمبر ۱۸۷۶ء بتائی تھی۔ شیخ اعجاز احمد بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے والد شیخ عطا محمد سے سن رکھا ہے کہ وہ عمر میں اقبال سے تقریباً اٹھارہ سال بڑے تھے۔ شیخ عطا محمد کی سروس بک میں ان کا سن ولادت ۱۸۵۹ء درج ہے۔ اس حساب سے اقبال کا سن پیدائش ۱۸۷۶ء یا ۱۸۷۷ء بنتا ہے۔ شیخ اعجاز احمد نے اپنی والدہ (اہلیہ شیخ عطا محمد) سے سن رکھا ہے کہ ۱۸۸۸ء میں ان کی شادی کے وقت اقبال پانچویں جماعت میں پڑھتے تھے اور عمر دس بارہ سال تھی۔ اس بیان کی تصدیق اقبال کا تعلیمی ریکارڈ بھی کرتا ہے۔ اقبال کی بہن کریم بی بی نے شیخ اعجاز احمد کے سامنے اس بات کی تصدیق کی کہ انہوں نے اپنی والدہ سے سنا تھا کہ اقبال جمعہ کے دن فجر کے وقت پیدا ہوئے۔ تاریخ ۳ ذیعقد ۱۲۹۴ھ جمعہ کا دن تھا۔ اس تاریخ کے علاوہ اقبال کی کوئی بھی اور تاریخِ ولادت جمعہ کے دن نہیں پڑتی۔

دوسرا اعتراض مصنف اقبال درونِ خانہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

۱۸۷۶ء کی غلط فہمی دراصل اس طرح پیدا ہوئی کہ حضرت علامہ کی دونوں بڑی اور دونوں چھوٹی بہنوں کی عمروں میں تقریباً تین تین سال کا فرق تھا۔ فروری ۱۸۷۳ء میں پیدا ہونے والا لڑکا بھی اپنی بہن مرحومہ طالع بی بی جنت مکانی سے تقریباً تین سال چھوٹا تھا۔ اس پیدائشی قاعدے

کلیے کے پیشِ نظر، مرورِ ایام کے ساتھ، خاندان میں حضرت علامہ کو فروری ۱۸۷۳ء میں پیدا ہونے والے لڑکے کے تین سال بعد ۱۸۷۶ء میں پیدا شدہ سمجھا جانے لگا۔

پہلے تو یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ اقبال نے تعارفی نوٹ میں سن ولادت قوسین میں ۱۸۷۶ء ہی تحریر نہیں کیا بلکہ ہجری سن کی پوری تاریخ ۳ ذیعقد ۱۲۹۴ھ بھی درج کی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اقبال کے خاندان میں اس بات کا کوئی ثبوت موجود نہیں کہ ان کے بچے کسی مخصوص خاندانی فارمولے کے مطابق پیدا ہوئے۔

تیسرا اعتراض بقول مصنف اقبال درون خانہ یہ ہے کہ اقبال کی پہلی بیوی کریم بی بی کی روایت کے مطابق ۱۸۹۳ء میں شادی کے وقت اقبال کی عمر بیس برس سے کچھ کم تھی۔ اقبال کی ابتدائی زندگی اور پہلی شادی کے موضوع پر کرنل خواجہ عبدالرشید کا ایک انگریزی مضمون پاکستان ٹائمز کی ۱۲ جولائی ۱۹۶۴ء کی اشاعت میں چھپا تھا، جس میں انہوں نے اقبال کی پہلی شادی کا نکاح نامہ شائع کیا ہے اور اقبال کی تاریخ پیدائش کے ذکر کے ساتھ یہ بھی تحریر کیا ہے کہ کریم بی بی سے کئی بار اقبال کے بارے میں گفتگو ہوئی۔ بہر حال انہوں نے اس مضمون میں متذکرہ بات کا کوئی حوالہ نہیں دیا، بلکہ تحریر کرتے ہیں:

شائع کردہ نکاح نامے سے ظاہر ہے کہ اقبال کی پہلی شادی ۴ مئی ۱۸۹۳ء کو گجرات میں ہوئی۔ تب انہوں نے ابھی میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا اور ان کی عمر بمشکل سولہ سال تھی۔ کیونکہ ان کی تاریخ پیدائش ۹ نومبر ۱۸۷۷ء ہے۔

شیخ عطا محمد کے ایک خط کے مطابق، جو شیخ اعجاز احمد کو تحریر کیا گیا، شادی کے وقت کریم بی بی اقبال سے عمر میں دو تین سال بڑی تھیں اور اس بات کی تصدیق اقبال کی بہنوں نے بھی کی ہے۔ سید حامد الجلالی کی تصنیف علامہ اقبال اور ان کی پہلی بیوی کے صفحات ۸۳ اور ۱۷۲ پر درج ہے کہ کریم بی بی ۱۹۴۶ء میں فوت ہوئیں۔ اسی کتاب کے صفحہ ۲۶ پر ان کی تصویر کے نیچے تحریر ہے بہ عمر ۷۰ سال، وفات سے چار روز قبل۔ اگر انہوں نے ۱۹۴۶ء میں ستر برس کی عمر میں وفات پائی تو ان کا سن ولادت ۱۸۷۵ء یا ۱۸۷۶ء ہوگا اور اگر اقبال ان سے پانچ سال بڑے تھے تو ان کا سنِ پیدائش ۱۸۷۰ء یا ۱۸۷۱ء بن جاتا ہے، جو کسی لحاظ سے درست نہیں۔ بہر حال مرکزی تاریخِ ولادت کمیٹی نے اپنی تحقیقات کے دوران کریم بی بی کی تاریخ پیدائش معلوم کرنے کے لیے میونسپل کمیٹی گجرات سے رجوع کیا اور رجسٹر پیدائش و اموات میں درج ان کی تاریخ ولادت ۲۲ مارچ

۱۸۷۴ء پائی گئی۔ اس حساب سے اگر اقبال ان سے پانچ سال بڑے تھے تو ان کا سن ولادت ۱۸۶۹ء بن جاتا ہے۔ جو قطعی غلط ہے۔ لیکن اگر تین سال چھوٹے تھے تو سن ولادت ۱۸۷۷ء نکلتا ہے۔

اس ضمن میں ڈاکٹر وحید قریشی کی تحقیق بھی ملاحظہ کے قابل ہے۔ انہوں نے اپنے مضمون کے ساتھ کریم بی بی کے والد ڈاکٹر عطا محمد کی دو لڑکیوں کی پیدائشوں کے میونسپل اندراجات ۲۲ مارچ ۱۸۷۴ء اور ۲۰ اپریل ۱۸۷۷ء کے عکس شائع کیے ہیں اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ۲۲ مارچ ۱۸۷۴ء کا اندراج کریم بی بی سے متعلق نہیں، بلکہ ڈاکٹر عطا محمد کے ہاں پیدا ہونے والی بعد کی کسی لڑکی کا ہے، کیونکہ سید حامد جلالی کے بیان کے مطابق کریم بی بی جدہ میں پیدا ہوئیں، جہاں ان کے والد وائس قونصل کے عہدے پر فائز تھے۔ وہ دس برس جدّہ میں رہیں اور عربی بے تکان بولتی تھیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی کی رائے میں کریم بی کی پیدائش کا امکان ۱۸۷۱ء میں ہے اور اس حساب سے خاندانی روایت کے مطابق اگر وہ اقبال سے دو تین سال بڑی تھیں، تو اقبال کا سنِ ولادت ۱۸۷۳ء شمار ہوگا۔

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اس بارے میں سید حامد الجلالی کی معلومات کا ذریعہ کریم بی بی سے اقبال کے فرزند آفتاب اقبال ہوں گے۔ سید حامد الجلالی نے ڈاکٹر عطا محمد کا سنِ ولادت ۱۸۵۹ء بیان کیا ہے۔ اس حساب سے ڈاکٹر وحید قریشی کے کریم بی بی کے سالِ ولادت سے متعلق مفروضے کے مطابق ان کے والد ڈاکٹر عطا محمد کی عمر ۱۲ سال بنتی ہے۔ گویا وہ ۱۲ برس کی عمر میں جدّہ میں وائس قونصل کے عہدے پر فائز تھے اور اسی عمر میں ان کے ہاں کریم بی بی پیدا ہوئیں۔ یہ استدلال کیونکر قبول کیا جا سکتا ہے۔

بہرکیف بعض اہلِ علم ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو تاریخِ ولادتِ اقبال کے طور پر تسلیم نہیں کرتے۔ ان میں سے ایک کے خیال میں تو اس تاریخِ ولادت کا اعلان سیاسی مصلحت کی بناء پر کیا گیا۔ مگر اقبال کے سال ولادت کو ۱۸۷۳ء کی طرف لے جانے کی خاطر ان کے استدلال کی کڑیاں بظاہر بہت کمزور معلوم ہوتی ہیں، مثلاً ڈاکٹر وحید قریشی میونسپل اندراجات کی خامیوں کو تسلیم کرتے ہوئے اپنے حساب سے ۱۸۷۳ء کی مطابقت اقبال کے تعلیمی ریکارڈ سے پاتے ہیں ان کے نزدیک اقبال کے خاندان کے افراد کے بیانات میں یا تو تناقض ہے یا حافظے کی بنیاد پر دیے گئے ہیں۔

اس لیے اس بارے میں وہ اقبال کے حلقۂ احباب میں سے کسی کرم بی بی

کے حافظے کی بنیاد پر دیے گئے بیان کی تائیدی شہادت کتاب اقبال درونِ خانہ یا کرنل خواجہ عبدالرشید کے مضمون میں پیش کردہ اقبال کی پہلی بیوی کریم بی بی کے مفروضہ بیان کو قرار دیتے ہیں اور پھر کرم بی بی کے ۱۸۷۱ء میں پیدا ہونے کے امکان کو پیش نظر رکھ کر اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اقبال کی ولادت ۱۸۷۳ء میں ہوسکتی ہے، کیونکہ خاندانی روایت کے مطابق وہ اپنی بیوی سے دوتین سال چھوٹے تھے۔

راقم کی رائے میں اقبال کی اپنی بیان کردہ تاریخ ولادت کی مطابقت ان کے تعلیمی ریکارڈ سے ۱۸۷۳ء کے مقابلے میں زیادہ سہولت سے ہوتی ہے۔ مزید برآں واقعاتی شہادت اور خاندان اقبال کے بزرگ اور معتبر افراد کے بیانات بھی بمقابلہ ۱۸۷۳ء اسی سن ولادت کی تائید کرتے ہیں۔ ان شواہد کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اقبال کی تاریخ ولادت ۳ ذیعقد ۱۸۹۴ء ہے جو ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کے برابر ہوتی ہے۔

باب: ۴

بچپن اور لڑکپن

اقبال کی پیدائش سے کچھ دن پہلے ان کے والد شیخ نور محمد نے خواب میں دیکھا کہ ایک سفید کبوتر ان کی جھولی آ کر گرا ہے۔ جس سے انہوں نے یہ تعبیر سمجھی کہ ان کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوگا، جو اسلام کی خدمت کرے گا۔

جمعہ ۳ ذیقعد ۱۲۹۴ھ (بمطابق ۹ نومبر ۱۸۷۷ئ) کے دن شیخ نور محمد کے گھر ایک سرخ وسفید پیارا سا بچہ پیدا ہوا۔ ۴۰ سالہ نور محمد نے خواب کی نسبت سے اس کا نام محمد اقبال رکھا۔ اقبال کی پیدائش کے وقت ان کے بھائی عطا محمد ۱۸ سال کے تھے، بہن فاطمہ بی عطا محمد سے چھوٹی تھیں اور بہن طالع بی ۷ سال کی تھیں۔ گھر میں ان کے ساتھ ان کے چچا غلام محمد بھی اہل وعیال سمیت رہتے تھے۔ اقبال نے اپنا بچپن اپنی والدہ امام بی کے سایۂ شفقت میں گزارا اور یہیں ابتدائی سبق بھی از بر کئے۔ شیخ نور محمد دینی ذوق رکھنے والے انسان تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ اپنے بچوں کو دینی تعلیم دلوائیں۔ سیالکوٹ کے علماء کے ساتھ خصوصاً مولانا ابوعبداللہ غلام حسن کے ساتھ ان کا گہرا تعلق تھا۔ چنانچہ اقبال کو چار سال چار ماہ کی عمر میں شیخ نور محمد حسن محلہ شوالہ کی مسجد میں مولانا ابو عبداللہ غلام حسن کے پاس لے گئے۔ جہاں اقبال نے ابتدائی تعلیم کا آغاز کیا اور یہیں سے قرآن مجید پڑھا۔

ایک دن مولانا سید میر حسن نے اقبال کو جب درسگاہ میں پڑھتے دیکھا تو مولانا غلام حسن سے پوچھا کہ یہ بچہ کس کا ہے؟ جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ یہ بچہ شیخ نور محمد کا ہے تو انہوں نے شیخ نور محمد کو سمجھایا کہ بچے کو صرف دینی تعلیم دلوانا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اسے جدید تعلیم سے بھی آراستہ کیا جائے۔ چنانچہ سید میر حسن کے کہنے پر شیخ نور محمد نے اقبال کو ان کے سپرد کر دیا اور کوچہ میر حسام الدین میں اقبال نے سید میر حسن سے اردو، فارسی اور عربی ادب میں پڑھنا شروع کر دیا۔

اپنی ابتدائی تعلیم کے متعلق اقبال خود بیان کرتے ہیں:
پنجاب میں ان دنوں علم وحکمت کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ میرے والد کی بڑی خواہش تھی کہ مجھے تعلیم دلوائیں۔ انہوں نے اوّل تو مجھے محلے کی مسجد میں بٹھا دیا، پھر شاہ صاحب کی خدمت میں بھیج دیا۔

سید میر حسن نے ڈیڑھ برس تک اقبال کو بڑی توجہ سے پڑھایا۔ اس کے بعد جب انہوں نے اسکاچ مشن اسکول میں پڑھانا شروع کیا تو شیخ نور محمد کی رضامندی سے اقبال کو بھی وہیں داخل کروا دیا۔ اقبال نے تقریباً ۷ برس کی عمر میں ۱۸۸۴ء میں اسکول کی پہلی جماعت میں داخلہ لیا۔ انہوں نے صرف چھ سال کی عمر میں یعنی ۱۸۸۵ء سے ۱۸۹۱ء تک سات جماعتیں پاس کر لیں۔ وہ اساتذہ سے صرف اسکول ہی میں نہ پڑھتے تھے بلکہ بعد میں سید میر حسن کے گھر تعلیم کا سلسلہ جاری رہتا۔

اقبال کے گھر کا ماحول انتہائی سادہ اور پاکیزہ تھا۔ گھر کی آمدنی یا تو شیخ نور محمد کی دوکان تھی یا شیخ غلام محمد کی تنخواہ، جو وہ اہل وعیال کی کفالت کے لئے دیتے تھے۔ گھر کا انتظام امام بی کے ہاتھوں میں تھا۔ دوکان کی آمدنی کم ہونے کے سبب کچھ وقت کے لئے شیخ نور محمد کو سیالکوٹ کے رئیس ڈپٹی وزیر علی بلگرامی کے ہاں پارچہ دوزی کی ملازمت بھی کرنا پڑی مگر اس وجہ سے کہ وہاں پر چونکہ پارچہ دوزی کا کام کم تھا، اور اکثر اوقات شیخ نور محمد بغیر کام کے رہتے، لہٰذا وہ اس آمدنی کو حلال نہیں سمجھتے تھے۔ اس بنیاد پر انہوں نے ملازمت ترک کر دی۔ ڈپٹی صاحب نے ترک ملازمت کا سبب دریافت کیا تو کچھ پس وپیش کے بعد شیخ نور محمد نے اپنی قلبی خلش کا اظہار کیا، جسے سن کر وہ متاثر ہوئے اور شیخ نور محمد کو ترک ملازمت کی اجازت دے دی۔

اس کے بعد انہوں نے اپنے ملازم کو حکم دیا کہ وہ سلائی مشین جو انہوں نے اپنے ہاں سے منگوائی تھی۔ شیخ نور محمد کے ہاں پہنچا دی جائے۔ شیخ نور محمد نے اس کے لئے عذر کیا تو ڈپٹی صاحب نے کہا کہ مجھے تو اس کی ضرورت نہیں یہ آپ کے کام کی چیز ہے، اور اس کے علاوہ ہمارا کام بھی تو آپ کیا ہی کریں گے۔ گو ملازمت کا تعلق تو ڈپٹی صاحب سے ختم ہو گیا مگر شیخ نور محمد کے ڈپٹی صاحب سے دوستانہ روابط ان کی وفات تک قائم رہے۔

شیخ نور محمد ملازمت چھوڑنے کے بعد دکان پر ٹوپیاں، کلاہ سینے اور برقعے بنوا کر فروخت کرنے لگے۔ اسی دوران شیخ عطاء محمد کی شادی کشمیر راٹھور خاندان میں ہوئی، اور ان کی وساطت سے وہ فوج میں بھرتی ہو گئے۔ اس طرح خاندان کے حالات بتدریج بہتر ہوتے چلے گئے۔

اقبال بیان کرتے ہیں:

اس زمانے میں معمولی دھسوں کی قیمت دو روپے فی دُھسّہ سے زیادہ نہ تھی۔ والدِ ماجد نے کوئی دد چار سو دھسے تیار کیے تو قدرت خدا کی ایسی ہوئی کہ سب کے سب اچھے داموں بک گئے۔ پس یہ ابتدا تھی ہمارے دن پھرنے کی۔ پھر بھائی صاحب بھی ملازم ہو گئے۔

شیخ نور محمد تصوف کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ روٹی کمانے کے دھندے سے فراغت کے بعد ان کا بیشتر وقت علمائ، فضلاء کی صحبت میں یا یادِ الٰہی میں گزرتا۔ یہاں تک کہ ان کے گھر فتوحاتِ مکیہ اور فصوص کا درس ہوا کرتا تھا۔ اقبال خود تحریر کرتے ہیں:

شیخ اکبر محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت کوئی بدظنی نہیں۔ چار برس کی عمر سے میرے کانوں میں فتوحات اور فصوص کا نام اور تعلیم پڑنی شروع ہوئی۔ گو بچپن کے دنوں میں مجھے ان مسائل کی سمجھ نہ تھی، تاہم محفل درس میں ہر روز شریک ہوتا۔ بعد میں جب عربی سیکھی تو کچھ کچھ خود بھی پڑھنے لگا اور جوں جوں علم اور تجربہ بڑھتا گیا، میرا شوق اور واقفیت زیادہ ہوتی گئی۔

شیخ نور محمد پر ابن عربی کی تعلیمات اور وجودی تصوف کے اثر کا اظہار کرتے ہوئے اقبال نے یوں لکھا ہے:

ہزار کتب خانہ ایک طرف اور باپ کی نگاہ شفقت ایک طرف اسی واسطے تو جب کبھی موقع ملتا ہے ان کی گرمیِ صحبت سے مستفید ہوتا ہوں۔ پرسوں شام کسی عزیز کا ذکر کر رہے تھے جس کا حال ہی میں انتقال ہو گیا تھا۔ کہنے لگے، معلوم نہیں بندہ اپنے رب سے کب کا بچھڑا ہوا ہے، اس خیال سے اس قدر متاثر ہوئے کہ تقریباً بے ہوش ہو گئے اور رات کے دس گیارہ بجے تک یہی حالت رہی۔ یہ خاموش لیکچر ہیں جو پیرانِ مشرق سے ہی مل سکتے ہیں۔ یورپ کی درسگاہوں میں ان کا نشان نہیں۔

سید میر حسن کو اس زمانے میں جدید تعلیم عام کرنے کا گہرا احساس تھا۔ وہ سرسید احمد کو ۱۸۷۳ء سے جانتے تھے۔ اور مسلم ایجوکیشن کانفرنس کے اجلاسوں میں باقاعدہ شریک ہوتے تھے۔ تاآنکہ ۱۸۷۷ء میں علیگڑھ کالج کے سنگ بنیاد رکھنے کے موقع پر بھی وہ اس تقریب میں شریک تھے۔

اس مرحلے میں مسلمانوں میں جدید تعلیم کے فروغ کے سلسلے میں سرسیّد احمد خان (۱۸۱۷ء تا ۱۸۹۸ئ) کی تحریک اور خدمات کا ذکر کرنا اشد ضروری ہے۔ سرسید کی سعی و کوشش سے

مسلمانوں کے ساتھ سرکار برطانیہ کا رویہ رفتہ رفتہ بدلنا شروع ہوا۔ سرسید نے انگریز حاکموں کو یقین دلایا کہ مسلمان حکومت کے وفادار ہیں اور ساتھ ہی مسلمانوں کو یہ احساس دلانے کی کوشش کی کہ بدلتے ہوئے حالات میں جب تک وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے اپنا زاویہ نگاہ نہ بدلیں گے ان کی من حیث الملت مکمل تباہی لازمی ہے۔

سرسیّد نے ۱۸۵۸ء میں اپنا کتابچہ اسباب بغاوتِ ہند تحریر کیا۔ ۱۸۶۰ء اور ۱۸۶۱ء میں انہوں نے ''ہند کے وفادار مسلمان'' کے موضوع پر تحریروں کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ ۱۸۶۳ء میں انہوں نے تبیین الکلام (نامکمل تفسیر انجیل) شائع کی۔ ۱۸۶۸ء میں احکام طعام اهل کتاب (یعنی اہل کتاب کے ساتھ بیٹھ کر کھانے کے اصول) لکھی گئی۔ ۱۸۷۲ء میں ڈاکٹر ہنٹر کی انگریزی کتاب ھندی مسلمان پر ایک تبصرہ شائع کیا۔ ۱۸۷۰ء میں خطبات الاحمدیه (سیرتِ طیبہ پر مضامین کا مجموعہ) شائع کی۔ تفسیر قرآن موسومہ تفسیر احمد (نامکمل) کی چھ جلدیں ۱۸۸۰ء اور ۱۸۹۵ء کے درمیان طبع کرائیں۔ ان کی تقاریر، مقالات اور مضامین کی اشاعت بھی جاری رہی۔

انہوں نے تجویز پیش کی کہ وائسرائے کی قانون ساز کونسل میں ہندوستانیوں کو شریک کیا جائے نیز انہیں اعلیٰ انتظامی اور عدالتی عہدوں پر فائز کیا جائے۔

''ہند کے وفادار مسلمان'' سلسلۂ تحریر میں انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ انگریز عیسائی ہونے کے بنا پر اہل کتاب ہیں، اس لیے مسلمان ان کے مخالف نہیں ہو سکتے۔ سرسیّد نے جہاد کے موضوع پر بھی بہت کچھ لکھا۔ ان کی نگاہ میں جہاد مسلمانوں پر جارحیت کے لیے نہیں بلکہ صرف مدافعانہ صورت میں فرض ہے۔

سرسیّد نے ترکی (یورپین) لباس اختیار کیا اور انگریزوں سے میل جول بڑھایا۔ ۱۸۶۹ء میں انگلستان گئے اور یورپ کی سیر بھی کی۔ آپ یورپی تمدن سے بڑے متاثر ہوئے۔ ۱۸۸۰ء میں واپس آ کر انہوں نے مسلمانوں کی دینی، اخلاقی، معاشرتی، ادبی، تعلیمی، اقتصادی اور سیاسی حالت کی اصلاح کے لیے اپنی تحریک شروع کی۔ اس اصلاحی تحریک کا سبب دراصل وہ تغیر تھا جو برصغیر میں انگریزی حکومت کے استحکام سے وقوع پذیر ہوا اور جس میں سے مسلمان ابھی ابھی گزر رہے تھے۔

دینیات کے میدان میں سرسید کی خاص طور پر قابل توجہ کتب ۱۸۷۰ء اور ۱۸۹۸ء کے

درمیان شائع ہوئیں۔ ان میں تقلید کی بجائے تحقیق پر زور دیا گیا ہے۔ الطاف حسین حالیؔ حیاتِ جاوید میں لکھتے ہیں کہ سرسید کی ابتدائی دینی تعلیم نامکمل رہی اور اسی طرح انگریزی تعلیم سے بھی وہ پوری طرح آشنا نہ تھے، جس کے سبب مغربی تمدن کو صحیح طور پر سمجھنا ان کے لیے آسان نہ تھا۔

حالیؔ کے نزدیک سرسید کی ابتدائی دینی تعلیم کا نامکمل رہ جانا اور انگریزی تعلیم سے پوری طرح آشنا نہ ہونا روایتی تقلید سے آزادی اور مغرب سے مرعوب نہ ہونے کے لیے بالکل مناسب تھا۔

سرسیّد کو غالباً احساس تھا کہ جدید سائنس اسلام کے لیے بہت بڑا خطرہ ہے، لیکن جدید سائنس کا مطالعہ وہ مسلمانوں کے لیے از حد ضروری خیال کرتے تھے۔ سرسید کی رائے میں جدید سائنس چونکہ تجربہ و مشاہدہ پر مبنی ہے، اس لیے دہریت کی طرف لیے جاتی ہے لیکن اگر جدید سائنس کی تحقیقات کو مدنظر رکھتے ہوئے اسلام کی تشریح سے متعلق نیا علم الکلام ترتیب دیا جائے تو مسلمان اسلام کو زندگی کے جدید تقاضوں کے عین مطابق پائیں گے اور اسلام پر ان کا ایمان مضبوط ہوگا، ان کے نزدیک اسلام ایک فطری یا نیچری مذہب تھا، کیونکہ جدید سائنس جن نتائج پر پہنچی تھی، وہ قرآنی تعلیمات سے ہم آہنگ تھے۔

یہ محض سرسید کے زاویہ نگاہ کی تبدیلی تھی۔ ان کے افکار میں کوئی جدت یا نئی بات نہ تھی۔ ان کی رائے میں جب تک تحقیق کا جذبہ مسلمانوں میں زندہ رہا، ان کا عمل تخلیقی تھا اور سائنس یا ترقی اسلام سے متصادم نہ ہوئے، مگر جونہی تحقیق کی جگہ تقلید نے لی اسلام متحرک، فعال اور تخلیقی مذہب ہونے کی بجائے ایک جامد مذہب بنا دیا گیا اور اس کی دینیات میں یہودی، عیسائی اور ہندو نظریات یا مقامی رسوم و رواج خلط ملط ہو گئے۔

سرسیّد کے مذہبی نظریات کی نوعیت ذاتی تھی ۔ اس لیے دینیات کے شعبے میں ان کی تحریک بے جان ثابت ہوئی۔ اس دور کے دیگر مصلحین مثلاً جسٹس سید امیر علی، مولوی خدا بخش اور مولوی چراغ علی نے بھی اپنے اپنے انداز میں اسلام کی تشریح کے لیے کتب تحریر کیں۔ مگر ان کی نوعیت مدافعانہ اور معذرت خواہانہ تھی۔

علماء نے سرسید کے مذہبی نظریات کی شدید مخالفت کی۔ کیونکہ عام طور پر شبہ ہونے لگا کہ مسلمانوں کی نئی نسل میں جدید تعلیم کے ذریعے سرسید اپنے مذہبی نظریات پھیلانا چاہتے ہیں لہٰذا مکہ کے مفتیوں سے ان کے خلاف کفر کے فتوے حاصل کر کے شائع کیے گئے۔ انہیں کافر اور دجال کے

القاب سے پکارا گیا۔ ایک مرتبہ جان لینے کی بھی کوشش کی گئی، لیکن سرسید اپنے مذہبی نظریات پر قائم رہے۔ غالباً اسی بنا پر علماء نے ۱۸۹۰ء میں لکھنؤ میں ندوۃ العلماء اور بعد میں دارالعلوم کی بنیاد رکھی۔

سرسید کی اخلاقی اور معاشرتی اصلاح کے لیے تحریک بھی برصغیر میں سیاسی تغیر کا نتیجہ تھی۔ راجہ رام موہن رائے، جیسے مصلحین نے نصف صدی پیشتر اپنے ہم مذہبوں کو مغربی تمدن کی اہمیت کا احساس دلایا تھا اور ہندو اپنے معاشرے کی تعمیر نو میں مسلمانوں سے تقریباً پچاس سال آگے نکل چکے تھے۔

سرسید نے انگلستان سے واپسی کے فوراً بعد اپنا رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا جس میں مضامین کے ذریعے وہ اور ان کے حامی، پڑھے لکھے مسلمانوں کو تبدیلی کا احساس دلانے یا اپنا زاویۂ نگاہ بدلنے کی ترغیب دینے لگے۔

تہذیب الاخلاق، وسیع النظری، عدل وانصاف، اپنی مدد آپ اور ترقی کے اصولوں کی تشہیر کرتا تھا۔ مسلمانوں میں اخوت کے جذبے کے فروغ کا حامی تھا، ان میں جدید تعلیم اور بالخصوص سائنس کی تعلیم کی تحصیل کی ضرورت پر زور دیتا تھا۔ وہ قدامت پسندی، غفلت، بیکاری، بداخلاقی، ضعیف الاعتقادی، غیر اسلامی رسوم ورواجات کی پابندی اور ہر اس بات کے خلاف تھا جو مسلمانوں کو متمدن دنیا کی نگاہوں میں رسوا کرنے والی ہو۔ تہذیب الاخلاق بارہ سال تک جاری رہا۔

سرسید کی کوشش سے مسلمانوں میں ایک نیا ادبی ذوق پیدا ہوا۔ ابھی تک شعرائے اردو نے شاعری میں فارسی لہجہ اور انداز اپنا رکھا تھا اور ان کے موضوع محدود تھے۔ لیکن نئے شاعروں نے ملت کی فلاح وبہبود اور ترقی کی خاطر بامقصد شاعری کی بنیاد رکھی۔ اسی طرح اردو نثر میں بھی تغیر آیا۔ ۱۸۶۳ء میں سرسید نے غازی پور میں پریس قائم کیا اور تب سے مسلمانوں میں طباعت واشاعت کا سلسلہ وسیع ہوتا چلا گیا۔

جدید تعلیم کے فروغ کے سلسلے میں سرسید نے جو خدمات انجام دیں وہ بے حد عظیم تھیں۔ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کی مخالفت کے کئی اسباب میں سے ایک سبب یہ تھا کہ مسلمان اپنے تعلیمی نظام کو اسلام کا جزو سمجھتے تھے۔ وہ اپنے تعلیمی نظام پر ہمیشہ فخر کرتے تھے اور اسے دوسرے نظاموں سے افضل خیال کرتے تھے۔ اس لیے ۱۸۳۵ء میں جب سرکارِ برطانیہ نے ان کا نظام معطل کر کے انگریزی نظام تعلیم نافذ کیا تو مسلمان نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ مسلمانوں کو شبہ تھا کہ نئی تعلیم ان کے بچوں کو اسلام سے منحرف کرنے کی خاطر رائج کی گئی

ہے لہٰذا ہندو بچے کے برعکس، مسلم بچے کو انگریزی اسکول میں داخلے سے پہلے دینی تعلیم کی تکمیل کے لیے درس گاہ یا مکتب بھیجا جاتا اور وہ انگریزی اسکول میں ہندو بچے کی نسبت زیادہ عمر میں داخل ہوتا۔ مسلمان، ہندوؤں کے مقابلے میں معاشی طور پر زیادہ پسماندہ تھے اور ان کے لیے نئی تعلیم کی تحصیل ممکن نہ تھی۔ حالی تحریر کرتے ہیں کہ کلکتہ، مدراس، بمبئی اور برصغیر کے دیگر بڑے شہروں کی یونیورسٹیوں میں، جنہیں سرکاری امداد حاصل تھی، ۱۸۵۸ء سے ۱۸۷۵ء تک مسلم گریجوایٹس کی کل تعداد بیس تھی اور ان کے مقابلے میں ہندو گریجوایٹس کی تعداد آٹھ سو چھیالیس تھی۔

نئے تعلیمی نظام پر مسلمانوں کا بڑا اعتراض یہ تھا کہ وہ سیکولر یا لادین تھا۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ نیا تعلیمی نظام ایک غیر ملکی اور غیر مسلم قوم کا نظام تھا جو مسلمانوں کی تمدنی اور معاشرتی روایات کا قلع قمع کر کے ان پر ایک اجنبی تمدن کی اقدار ٹھونسنے کے درپے تھا۔ بہر حال ۱۸۷۰ء میں سرکارِ برطانیہ کو فارسی اور عربی زبانوں کی اہمیت کا احساس ہوا، اور تعلیمی اداروں میں ان زبانوں کو انگریزی زبان کے ساتھ پڑھائے جانے کا اہتمام کیا گیا۔ مسلم تعلیمی اداروں کو دیگر غیر سرکاری تعلیمی اداروں کی طرح مالی امداد دی گئی اور مسلم طلبہ کے لیے وظائف کا انتظام کیا گیا۔ ۱۸۸۲ء میں تعلیمی کمیشن نے اپنی رپورٹ میں مسلمانوں سے ہمدردی کا اظہار کیا اور سفارش کی کہ ان کی تمدنی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے نئے نظام میں مناسب ترامیم کی جائیں۔

سر سیّد ۱۸۵۸ء سے انگریزی زبان سیکھنے کے حامی تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ۱۸۶۳ء میں غازی پور میں سائنٹیفک سوسائٹی قائم کی اور انگریزی سائنسی کتب کا اردو میں ترجمے کا کام شروع ہوا۔ ۱۸۶۴ء میں یہ سوسائٹی غازی پور سے علی گڑھ منتقل ہوئی اور اس سوسائٹی کی طرف سے ایک انگریزی رسالہ علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ بھی ۱۸۶۶ء میں شائع کیا گیا جو ۱۸۹۵ء تک جاری رہا۔

انگلستان میں قیام کے دوران جدید یونیورسٹیوں کے انتظام کو سمجھنے کی خاطر سر سید کیمبرج یونیورسٹی گئے۔ واپسی پر انہوں نے مسلم ایجوکیشن کانفرنس قائم کی۔ اس کے بعد روپیہ فراہم کرنے کی خاطر فنڈ کمیٹی قائم ہوئی تاکہ ایک مسلم کالج تعمیر کیا جا سکے۔ علماء کی مخالفت کے باوجود خاصا روپیہ اکٹھا ہوا۔ بالآخر ۱۸۷۷ء میں وائسرائے لارڈ لٹن نے علی گڑھ میں اینگلو اورینٹل کالج کی بنیاد رکھی، جسے ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بنا دیا گیا۔

کالج کے نصاب میں مشرقی علوم کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان وادب، جدید سائنس اور نئے علوم کے مطالعہ کے لیے بھی انتظام کیا گیا تھا۔ آرٹ اور سائنس کی تعلیم کے ساتھ دینیات کی تعلیم بھی لازمی تھی۔ کالج میں کھیلوں اور دیگر ادبی، معاشرتی اور ثقافتی تفریحوں کا انتظام بھی کیا گیا تھا۔ ہندو طلبہ بھی کالج میں داخل ہو سکتے تھے۔ ان کے لیے دینیات کا مطالعہ لازمی نہ تھا۔ کالج میں گائے کا ذبیحہ ممنوع تھا۔

سرسید مسلمانوں کی انگریزی حاکموں کے خلاف محاذ آرائی کے مخالف تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ مسلمان اپنے آپ کو تعلیمی اور معاشی طور پر مضبوط کریں۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے ۱۸۶۶ء میں ایک نیم سیاسی تنظیم برٹش انڈیا ایسوسی ایشن قائم کی۔

۱۸۷۸ء سے لے کر ۱۸۸۲ء تک وہ وائسرائے کی قانون ساز کونسل کے ممبر رہے۔ سرسید کی رائے میں مسلمانوں کی عزبت وافلاس کا اصل سبب ان میں اخوت کے جذبے کا فقدان اور بحیثیت مجموعی اپنی معاشی حالت سدھارنے کی طرف بے حسی یا بے پرواہی تھا۔

۱۸۸۲ء میں لدھیانے کے مسلم طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ اس ملک میں تمام وہ افراد جو مسلمان ہیں، ان کا تعلق ایک مخصوص قوم یا ملت سے ہے۔ ۱۸۸۳ء میں انہوں نے سی پی کے لوکل سلیف گورنمنٹ بل کی مخالفت کی۔ ان کا موقف یہ تھا کہ یہاں کسی بھی قسم کی نمایندہ حکومت کا قیام کئی سیاسی اور معاشی مسائل کھڑے کر دے گا۔ ان کی رائے میں جب تک ہندوستان میں مذہبی اختلافات اور معاشی تضادات ختم نہیں ہو جاتے، یہاں نمایندہ حکومت کے قیام کا مطلب یہ ہوگا کہ اکثریت ہمیشہ اقلیت کو سرنگوں رکھے گی۔

۱۸۸۵ء میں بمبئی میں آل انڈیا کانگرس کی بنیاد رکھی گئی۔ اس کے ایک سال بعد یعنی ۱۸۸۶ء میں سرسید نے علی گڑھ میں محمڈن ایجوکیشنل کانگرس قائم کی۔ ۱۸۸۷ء میں انہوں نے لکھنؤ میں اپنی مشہور تقریر میں مسلمانوں کو کانگرس میں شامل ہونے سے منع کیا۔ ہندو تعلیمی اور معاشی طور پر مسلمانوں سے بہت آگے نکل چکے تھے۔ اس زمانے میں ملک کی انتظامیہ یا عدلیہ کے محکموں میں جو بھی آسامیاں ہندوستانیوں کے لیے مخصوص تھیں، ان میں سے اکثر پر ہندو فائز تھے۔ سرسید نے مسلمانوں پر واضح کیا کہ تعداد میں وہ ہندوؤں سے بہت کم ہیں۔ نیز تعلیمی اور معاشی اعتبار سے بھی وہ ان کا مقابلہ کرنے سے قاصر ہیں، اس لیے اگر ہندوستان میں نمائندہ حکومت قائم ہو گئی تو تعلیمی اور معاشی طور پر پسماندہ مسلم اقلیت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہندو اکثریت کی دست نگر ہو جائے گی۔

ہندوستان میں ہندو متوسط طبقے کے لیے زیادہ تعداد میں سرکاری ملازمتوں کی فراہمی کی خاطر احتجاج ۱۸۷۶ء سے شروع ہوا، جب کلکتہ میں سریندر ناتھ بینرجی نے انڈین ایسوسی ایشن قائم کی۔ بنگال کے ہندو پریس نے سرسیّد اور مسلمانوں کے خلاف زہر اگلنا شروع کیا۔

۱۸۸۵ء میں کانگرس کے قیام کے کچھ عرصہ بعد یہ تنظیم بی۔ جی۔ تلک کے زیر قیادت آ گئی۔ ان کی تقریریں مسلمانوں کے خلاف زہر سے بھری ہوئی ہوتیں۔ انہوں نے ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکانے کے لیے شیوا جی کو خراج عقیدت پیش کرنے کی مرہٹوں کی ایک پرانی رسم از سرنو رائج کی، گائے کے ذبیحے کے امتناع کے لیے سوسائٹی قائم کی اور حکومت کے نافذ کردہ اس قانون کے خلاف منظم مظاہرہ کیا کہ بوقت نماز مساجد کے سامنے ڈھول ڈھمکا نہ بجایا جائے۔ نتیجتاً ۱۸۹۳ء میں بمبئی میں ہندو مسلم فساد ہو گیا گویا کانگرس ابتداء ہی سے سوراج (آزادی) سے مراد ہندو راج لینے لگی۔ ان حالات میں ہندو اکثریت کے مقابلے میں مسلمانوں کے لیے مدافعانہ رویہ اختیار کرنے کے سوا کوئی اور چارہ نہ تھا۔

اس زمانے میں مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے ۱۸۶۳ء میں نواب عبداللطیف نے محمڈن سوسائٹی، ۱۸۷۷ء میں سید امیر علی نے کلکتہ میں سنٹرل نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن اور سرسید نے کانگرس کے مقابلہ میں علی گڑھ میں ۱۸۸۸ء میں یونائیٹڈ انڈیا پیٹر یاٹک ایسوسی ایشن بھی قائم کی۔ لیکن ۱۸۹۳ء میں بمبئی کے ہندو مسلم فساد کے بعد انہوں نے اس تنظیم کو توڑ کر اس کی جگہ محمڈن اینگلو اورینٹل ڈیفنس ایسوسی ایشن آف اپر انڈیا قائم کی۔

سرسید ۱۸۶۷ء کے اردو ہندی تنازع سے بھی بے حد متاثر ہوئے۔ ہندوستان میں فارسی اور عربی زبانوں کی معطلی کے بعد ۱۸۳۵ء سے اردو، عدالتوں کی زبان کے طور پر رائج تھی۔ ۱۸۶۷ء میں بنارس کے متعصب ہندوؤں کی اردو کے خلاف تحریک سے، کہ اس مسلم زبان کا خاتمہ کر کے ہندی زبان رائج کی جائے، سرسید بے حد رنجیدہ ہوئے اور اس کے بعد خصوصاً مسلمانوں کے ملّی مستقبل کی طرز پر سوچنے لگے۔ انہوں نے شکسپئر کمشنر بنارس سے پیش گوئی کے طور پر کہا کہ اب ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہو گا۔ بہار میں اردو کی بجائے بہاری رائج کر دی گئی۔ لیکن سرسید تا دم مرگ اردو زبان کی حمایت میں لکھتے رہے۔

۱۸۸۴ء میں سرسید نے پنجاب کا دورہ کیا اور مسلمانوں کو نئی تعلیم کے حصول کی اہمیت کا

احساس دلانے کے لیے کئی تقریریں کیں۔ سرسید کو پنجاب میں جن افراد پر اعتماد تھا اور جن کا وہ احترام کرتے تھے، ان میں اقبال کے استاد سید میر حسن بھی تھے۔ ۱۸۹۵ء میں جب مسلم ایجوکیشن کانفرنس کا اجلاس لاہور میں ہوا تو اس میں انہوں نے شرکت کی۔

اقبال کی ابتدائی زندگی پر سید میر حسن کا اثر غالب تھا۔ میر حسن دین اور دنیا کے تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر اپنے شاگردوں کی تربیت کرتے تھے۔ وہ علوم اسلامی، عرفان وتصوف، جدید علوم، ادب، لسانیات اور ریاضیات کے ماہر بھی تھے۔ ان کا طریقۂ تدریس اتنا جامع تھا کہ وہ اپنے شاگردوں میں اردو، فارسی اور عربی کا صحیح لسانی اسلوب پیدا کردیتے تھے۔ وہ ایک کثیر المطالعہ شخصیت تھے۔ راس العقیدہ، عبادت گزار اور مجسم اخلاق تھے۔

ان کی شخصیت اعلیٰ مومنانہ صفات کا مجسمہ تھی۔ شاگرد انہیں شاہ صاحب کہہ کر بلاتے تھے۔ ان کا معمول یہ تھا کہ نماز تہجد یا نماز فجر کے بعد ہر روز قبرستان جاتے جہاں مرحوم اعزاء و اقارب کی قبروں پر فاتحہ پڑھتے۔ شاگرد یہیں ان سے آ ملتے۔ اور وہ راستہ بھر ان سے سبق لیتے، گھر پہنچ کر پھر تدریس میں مصروف رہتے۔ دن بھر اسکول میں، شام کو گھر آتے ہی رات دیر تک تدریس کا سلسلہ جاری رہتا۔ میر حسن کی زندگی انتہائی سادہ تھی اسکاچ مشن اسکول کے ساتھ ان کی عمر بھر وابستگی رہی، یہاں ان کی تنخواہ وفات تک ۱۲۰ روپے ماہانہ رہی۔

اقبال کی شخصیت میں عربی، فارسی، اردو ادبیات، علم وحکمت، تصوف سے وابستگی اور طبیعت میں سادگی، قناعت و استغنائ، ظرافت، بذلہ سنجی سید میر حسن کے مزاج کا عکس تھا۔ زندگی بھر وہ میر حسن سے علمی مسائل میں رہنمائی لیتے رہے۔ بلکہ اقبال کو ان کی مجلس میں بیٹھ کر اطمینان خاطر نصیب ہوتا۔ اقبال ان کا اتنا احترام کرتے کہ کبھی ان کے روبرو انہوں نے شعر نہ کہا۔

پوری زندگی میں صرف ایک مرتبہ شاہ صاحب کے سامنے اقبال کی زبان سے ایک مصرعہ نکل گیا۔ وہ بھی اتفاقاً، شاہ صاحب گھر سے کسی کام کے لئے نکلے ایک بچہ احسان بھی ان کے ہمراہ تھا راستے میں اقبال ملے۔ شاہ صاحب نے فرمایا اقبال اسے گود میں اٹھا لو، تھوڑی دور چل کر اقبال تھک کر بیٹھ گئے۔ اور احسان کو کھڑا کر دیا، شاہ صاحب بہت آگے نکل چکے تھے۔ اقبال کو نہ پا کر واپس آئے اور فرمایا، اس کی برداشت بھی دشواری ہے۔ اقبال کی زبان سے بے اختیار نکلا، تیرا احسان بہت بھاری ہے۔

سرسید اور علی گڑھ کی تحریک کا احساس اقبال کو سید میر حسن سے ہی ملا۔ یہی سبب تھا کہ بعد میں سرسید کے پوتے سر راس مسعود اقبال کے گہرے دوست بن گئے۔ ۱۸۹۸ء میں جب سرسید کا انتقال ہوا تو علامہ سیالکوٹ میں ہی موجود تھے۔ سید میر حسن نے انہیں مادۂ تاریخ نکالنے کا کہا، اقبال نے تھوڑی ہی دیر میں مادۂ تاریخ نکال دیا۔ انی متوفیک و رافعک الی و مطھرک۔
سید میر حسن نے یہ سنا تو اس کی تعریف کی اور فرمایا کہ میں نے بھی ایک مادہ نکالا ہے۔ غَفَرَ لَہٗ۔
۱۹۰۵ء میں اقبال نے انگلستان جاتے ہوئے دہلی میں جو نظم، التجائے مسافر، پڑھی اس میں بھی سید میر حسن سے متعلق اشعار ہیں:

وہ شمعِ بارگہِ خاندانِ مرتضوی
رہے گا مثلِ حرم، جس کا آستاں مجکو
نفس سے جس کے، کھلی میری آرزو کی کلی
بنایا جس کی مروت نے نکتہ داں مجکو
دعا یہ کر کہ خداوندِ آسمان و زمین
کرے پھر اس کی زیارت سے شادماں مجکو

اقبال کو ۱۹۲۳ء میں جب سر کے خطاب کی پیش کش کی گئی تو انہوں نے گورنر پنجاب سے سید میر حسن کی تعلیمی خدمات کے اعتراف کا تقاضا کیا۔ گورنر کے استفسار پر کہ کیا میر حسن کی کوئی تصنیف ہے؟ اقبال نے جواب دیا میں خود ان کی تصنیف ہوں۔ چنانچہ سید میر حسن کو بھی، شمس العلمائ، کا خطاب دیا گیا۔ سید میر حسن کی تاریخ وفات پر اقبال نے ان کا مادۂ تاریخ نکالا، ما اَرْسَلْنٰکَ اِلاَّ رَحْمَۃً لِلعٰلَمِیْن۔

اقبال نے سیّد میر حسن کے متعلق اپنے جذبات کا اظہار یوں بھی کیا ہے ؎

مجھے اقبال اس سیّد کے گھر سے فیض پہنچا ہے
پلے جو اس کے دامن میں، وہی کچھ بن کے نکلے ہیں

سیالکوٹ میں اقبال کی زندگی کے ملنے والے مواد سے بھی حیاتِ اقبال کے ابتدائی دور کا تعین ہوتا ہے۔ شیخ عطاء محمد کی دوسری شادی کے وقت اقبال پانچویں میں پڑھتے تھے۔ اور اقبال کو شعروں سے بہت دلچسپی تھی۔ وہ بازار سے منظوم قصے لے آتے اور گھر لا کر انتہائی خوش الحانی سے پڑھا کرتے۔ ایک دفعہ نصف شب کے قریب جب ان کی والدہ کی آنکھ کھلی تو انہوں

نے دیکھا کہ اقبال آدھی رات کو لیمپ کے پاس بیٹھے اسکول کا کام کر رہے ہیں۔ جب والدہ نے دو تین دفعہ بلایا اور انہوں نے جواب نہ دیا تو انہوں نے دیکھا کہ وہ پڑھتے پڑھتے ہی سو گئے تھے۔

اقبال بچپن سے ہی ذہانت میں اپنے ہم عمروں سے بہت آگے تھے۔ لیکن پڑھنے کے ساتھ ساتھ انہیں کھیل کود کا شوق بھی تھا۔ کبوتر پالنے، پتنگیں اڑانے اور اکھاڑے میں ورزش کرنے کے شوق سے متعلق شہادتیں موجود ہیں۔ اقبال کے مشاغل میں میر حسن کے صاحبزادے سید محمد تقی اور لالو پہلوان بھی شریک ہوئے۔ اقبال گھنٹوں کبوتروں کی پرواز سے بھی لطف اندوز ہوتے۔ اقبال کے لڑکپن کے زمانے میں ان کے بڑے بھائی شیخ عطاء محمد سیالکوٹ سے باہر تعینات تھے۔ شیخ نور محمد کے خاندان میں دو بچیاں یعنی کریم بی اور زینت بی کا اضافہ ہو گیا تھا۔ گھر میں اقبال والدین کی توجہ کا مرکز تھے۔ والدین میں خصوصاً والد سے انہیں جس طرح کی تربیت ملی اس بارے میں دو طرح کے واقعات کی تفصیل اقبال کے الفاظ میں ہم تک پہنچی ہے۔ پہلے واقعے کا ذکر عبدالمجید سالک اور عطیہ فیضی کی کتب میں موجود ہے۔ جبکہ دوسرا واقعہ خود اقبال نے رموزِ خودی میں بیان کیا ہے۔ ذکرِ اقبال میں سالک لکھتے ہیں کہ انہیں اقبال نے بتایا:

جب میری عمر کوئی گیارہ سال تھی، ایک رات میں اپنے گھر میں کسی آہٹ کے باعث سوتے سے بیدار ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ میری والدہ کمرے کی سیڑھیوں سے نیچے اتر رہی ہیں۔ میں نے آگے بڑھ کر دیکھا کہ والد کھلے صحن میں بیٹھے ہیں اور ایک نور کا حلقہ ان کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ میں نے والد کے پاس جانا چاہا لیکن والدہ نے مجھے روکا اور سمجھا بجھا کر پھر سلا دیا۔ صبح ہوئی تو میں والد صاحب کے پاس پہنچا والد اپنا ایک رویا سنا رہے تھے، جو رات انہوں نے بحالتِ بیداری دیکھا تھا، کہ کابل سے ایک قافلہ آیا ہے جو مجبوراً ہمارے شہر سے کوئی پچیس میل کے فاصلہ پر مقیم ہوا ہے اس قافلے میں ایک شخص بے حد بیمار ہے اور اس کی نازک حالت ہی کی وجہ سے قافلہ ٹھہر گیا ہے۔ لہٰذا مجھے ان لوگوں کی مدد کے لیے فوراً پہنچنا چاہیے۔ والد نے کچھ ضروری چیزیں فراہم کر کے تانگا منگایا۔ مجھے بھی ساتھ بٹھا لیا اور چل دیے۔ ہم نے دیکھا کہ وہ قافلہ ایک دولت مند اور بااثر خاندان پر مشتمل ہے، جس کے افراد اپنے ایک فرد کا علاج کرانے پنجاب آئے تھے۔ والد نے تانگے سے اترتے ہی دریافت کیا کہ اس قافلے کا سالار کون ہے؟ جب وہ صاحب سامنے آئے تو والد نے کہا کہ مجھے فوراً مریض کے پاس لے چلو۔ سالار

مرعوبیت کے عالم میں والد کو اپنے ساتھ لے گیا۔ جب والد مریض کے بستر کے پاس پہنچے تو کیا دیکھا کہ مریض کے بعض اعضاء مرض کی وجہ سے ہولناک طور پر متاثر ہو چکے ہیں۔ والد نے ایک چیز نکالی جو بظاہر راکھ نظر آتی تھی۔ وہ راکھ مریض کے گلے سڑے اعضا پر مل دی اور کہا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے مریض کو شفا حاصل ہو گی۔ چوبیس ہی گھنٹے گزرے تھے کہ مریض کو نمایاں افاقہ ہو گیا۔ ان لوگوں نے والد کی خدمت میں ایک اچھی خاصی رقم فیس کے طور پر پیش کی۔ جس کو والد نے قبول نہ کیا اور ہم لوگ واپس سیالکوٹ پہنچ گئے۔ چند روز بعد وہ قافلہ سیالکوٹ میں وارد ہو گیا اور معلوم ہوا کہ وہ مایوس العلاج مریض شفایاب ہو چکا ہے۔

عطیہ فیضی نے اپنی انگریزی تصنیف اقبال میں بھی اس واقعہ کو بعینہٖ بیان کیا ہے۔ وہ بیان کرتی ہیں کہ اقبال کے والد نے کسی ولی کی رہنمائی میں کئی ماہ تنہائی میں گزارے تھے اور انہیں جو کچھ حاصل ہوا وہ انہوں نے اپنے بیٹے کو منتقل کیا۔

شیخ نور محمد، سلطان العارفین حضرت قاضی سلطان محمود دربار اعوان کے مرید تھے جو سلسلہ قادریہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لئے اقبال بچپن میں سلسلہ قادریہ میں بیعت ہوئے تھے۔ شیخ نور محمد نے چلہ کشی اور ریاضت بھی کی تھی۔ خود اقبال بھی باری کے بخار کے مریضوں کو پیپل کے پتوں پر قرآنی آیات قلم سے لکھ کر دیتے تھے جنہیں چاٹنے سے مریض کا بخار اتر جاتا تھا۔ تاہم شیخ نور محمد باقاعدہ بیعت لے کر کسی کو باقاعدہ مرید نہ بناتے تھے۔ ان کی لوح پر اقبال کی تحریر کردہ تاریخ وفات میں انہیں اقبال کا پیرومرشد کہا گیا ہے۔

سالک کے مطابق شیخ نور محمد کی ان ہی کیفیات کا اثر تھا کہ اقبال کا ذہن وجدانی کیفیات کے لئے سازگار رہا اور انہوں نے علمی تحقیق کے لئے مابعد الطبیعیات کا موضوع چنا۔

خلیفہ عبدالحکیم نے اپنی کتاب میں اقبال کی شخصیت پر شیخ نور محمد کے غیر معمولی مشاہدات کے اثر کا بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اقبال اپنی آخری عمر میں کہا کرتے تھے کہ میں نے اپنا زاویۂ حیات فلسفیانہ جستجو سے ہی نہیں بلکہ ورثے میں حاصل کیا۔ تاہم بعد میں، میں نے عقل و استدلال کے ذریعے اس کا ثبوت فراہم کیا۔

دوسرا واقعہ اقبال نے اپنے والد کی شخصیت کے متعلق رموز بے خودی میں نظم کیا ہے۔ ایک دفعہ کوئی سائل بھیک مانگتا ہوا ان کے گھر کے دروازے پر آ کھڑا ہوا اور اس کے بار بار صدا لگانے پر اقبال کو طیش آ گیا اور اسے دو تین تھپڑ دے مارے۔ جس کی وجہ سے جو کچھ اس کی

جھولی میں تھا، زمین پر گر کر منتشر ہو گیا۔ والد ان کی اس حرکت پر بے حد آزردہ ہوئے اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ فرمایا: قیامت کے دن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے گرد غازیانِ اسلام، حکمائ، شہدا، زہاد، صوفیہ، علماء اور عاصیانِ شرمسار جمع ہوں گے تو اس مجمع میں اس مظلوم گدا کی فریاد آنحضورؐ کی نگاہِ مبارک کو اپنی طرف مرتکز کر لے گی اور آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مجھ سے پوچھیں گے کہ تو نے اپنے بیٹے کی کیا تربیت کی؟ تو میں اپنے آقا و مولا کو کیا جواب دوں گا؟ بیٹا! اس مجمع کا خیال کر اور میری سفید داڑھی دیکھ اور دیکھ، میں خوف اور امید سے کس طرح کانپ رہا ہوں، باپ پر اتنا ظلم نہ کر اور خدارا میرے مولاؐ کے سامنے مجھے یوں ذلیل نہ کر۔ تو تو چمن محمدیؐ کی ایک کلی ہے، اس لیے اسی چمن کی بہار سے رنگ و بو پکڑ، تاکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اخلاق کی خوشبو تجھ سے آ سکے۔

شیخ نور محمد کا معمول تھا جب اقبال کو کوئی بات سمجھاتے تو قرآن مجید کی آیۂ مبارکہ یا اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سند کے ساتھ سمجھاتے۔ نتیجتاً اقبال بغیر کسی ناگواری کے اسے قبول کر لیتے۔ خود اقبال بیان کرتے ہیں کہ جب وہ سیالکوٹ میں پڑھتے تھے تو روزانہ صبح تلاوت کیا کرتے تھے ان کے والد گرامی اوراد وظائف سے فراغت کے بعد انہیں دیکھ کر خاموشی سے گزر جاتے۔ ایک دن صبح سویرے جب ان کے قریب سے گزرے تو فرمایا کہ کبھی فرصت ہوئی تو تمہیں ایک بات بتاؤں گا۔ آخر اقبال کے اصرار پر بتایا، جب اقبال حسب معمول قرآن کی تلاوت کر رہے تھے۔ فرمایا بیٹا، مجھے تم سے یہ کہنا تھا کہ جب تم قرآن مجید پڑھو تو یہ سمجھ کر پڑھو کہ قرآن تم پر ہی اترا ہے۔ اور تم سے ہی اللہ کلام کر رہا ہے۔

غالباً اقبال نے ایک شعر میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہیں نہ رازی، نہ صاحبِ کشاف

اقبال مزید بیان کرتے ہیں:

ایک دن والد مرحوم نے مجھ سے کہا کہ میں تمہاری تربیت کا تم سے اس کا معاوضہ چاہتا ہوں۔ میں نے بڑے شوق سے پوچھا کہ وہ کیا ہے؟ والد مرحوم نے کہا، کسی موقع پر بتاؤں گا چنانچہ انہوں نے ایک دفعہ کہا کہ بیٹا میری محنت کا معاوضہ یہ ہے کہ تم اسلام کی خدمت کرنا۔ اس کے بعد میں نے امتحان وغیرہ دے کر اور کامیاب ہو کر لاہور کام شروع کر دیا۔ ساتھ ہی میری

شاعری کا چرچا پھیلا۔ نوجوانوں کے لیے اسلام کا ترانہ بنایا اور دوسری نظمیں لکھیں، ان ہی دنوں میرے والد مرض الموت میں بیمار ہوئے۔ میں انہیں دیکھنے کو لاہور سے آیا کرتا تھا۔ ایک دن میں نے پوچھا کہ آپ سے میں نے جو اسلام کی خدمت کا عہد کیا تھا، وہ پورا کیا یا نہیں؟ انہوں نے بسترِ مرگ پر شہادت دی کہ تم نے میری محنت کا معاوضہ ادا کر دیا۔

اسی سلسلے میں چند واقعات شیخ اعجاز احمد کے حوالے سے روزگار فقیر جلد دوم میں درج کیے گئے ہیں۔ اقبال کی بہنوں کی ازدواجی زندگی پریشانیوں ہی میں گزری۔ فاطمہ بی کے اپنے شوہر سے تعلقات اچھے نہ تھے۔ طالع بی جواں عمری ہی میں فوت ہوگئیں۔ کریم بی بھی اپنے شوہر کی دوسری شادی کے سبب عرصے تک اپنے بھائیوں کے پاس رہیں۔ زینب بی کی شادی وزیر آباد کے ایک گھرانے میں ہوئی تھی لیکن غالباً بے اولاد ہونے کے باعث ان کی خوش دامن نے سسرال میں اُنہیں رہنے نہ دیا اور وہ مجبوراً میکے چلی آئیں۔ کئی سال وہیں رہیں۔ اس دوران ان کی ساس نے بیٹے کی دوسری شادی کر دی اور بعد میں وہ اپنی اس دوسری بہو پر بھی سوتن لے آئیں۔ ماں کی وفات کے بعد انہوں نے اپنی پہلی بیوی کو بسانا چاہا، مصالحت کی کوششیں ہونے لگیں۔ اقبال کے والدین بالآخر رضامند ہو گئے۔ اتفاق سے ان دنوں اقبال بھی سیالکوٹ میں موجود تھے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ بہنوئی مصالحت کی غرض سے آئے ہوئے ہیں تو بہت برہم ہوئے۔ والد نے جب دیکھا کہ وہ کسی طرح بھی رضامند نہیں تو انہوں نے اپنے مخصوص نرم انداز میں کہا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں والصلح خیر کہا ہے۔ اتنا سننا تھا کہ اقبال خاموش ہو گئے اور کہا، وہی فیصلہ کریں جو قرآن کہتا ہے، چنانچہ مصالحت ہوگئی اور یہ صلح خیر ہی ثابت ہوئی۔ پہلی بیوی ہونے کی حیثیت سے گھر کا پورا اختیار زینب بی کے ہاتھ میں رہا۔ مصالحت کے چند دن بعد ہی اقبال کو بہنوئی پر اس قدر اعتماد ہو گیا تھا کہ اپنے نجی معاملات میں ان کے مشورے پر عمل کرتے اور ان کی خیرخواہی کی قدر کرتے۔

ایک مرتبہ اعجاز احمد کو ان کی پھوپھی کریم بی نے بتایا کہ میاں جی کو اسم اعظم معلوم ہے جسے وہ بھائی صاحب (اقبال) کو سکھا چکے ہیں۔ چنانچہ اعجاز احمد نے میاں جی سے اسم اعظم کے متعلق دریافت کیا، وہ کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ سے دعا مشکلوں کو حل کرتی ہے۔ اس لیے دعا ہی اسمِ اعظم ہے۔ قبول دعا کا ایک نسخہ جو یاد رکھنے کے قابل ہے، وہ یہ ہے کہ ہر دعا سے قبل اور بعد میں آنحضورؐ پر درود بھیجا جائے، کیونکہ درود سے بڑھ کر اور کوئی اسمِ اعظم نہیں اور میں نے یہی اسمِ اعظم تمہارے

چچا کو سکھایا ہے۔ کسی اور موقع پر فرمایا کہ اسماء الٰہی میں یا حَیُّ یا قیّوم کا ورد بکثرت کرنا چاہیے۔

راقم نے شیخ نور محمد کو بہت ضعیف عمر میں دیکھا ہے، جب ان کی بصارت جواب دے چکی تھی اور وہ کمرے کی تنہائی میں اپنے پلنگ پر گم صم بیٹھے رہتے تھے۔ بے جی کی وفات کا صدمہ ان کی قوت برداشت سے باہر تھا۔ وہ شاعر تو نہ تھے، مگر اس صدمہ کے زیرِ اثر انہوں نے ایک دن اعجاز احمد سے کاغذ اور قلم دوات لانے کے لیے کہا۔ میاں جی سوچ سوچ کر شعر لکھواتے جاتے تھے چنانچہ دو تین نشستوں میں انہوں نے دس بارہ شعر قلمبند کروائے۔ ان اشعار میں سے ایک شعر شیخ اعجاز احمد نے لکھوایا ہے: ؎

یہ تنہا، زندگی پیری میں، نصف الموت ہوتی ہے
نہ کوئی ہم سخن اپنا، نہ کوئی راز داں اپنا

اشعار اقبال کو بھیج دیئے گئے، جنہوں نے کچھ عرصہ بعد اپنی نظم ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' کاتب سے خوشخط لکھوا کر میاں جی کو ارسال کر دی۔

اقبال کی والدہ نے بھی ان کی تربیت میں نمایاں حصہ لیا۔ گھر میں ان کی موجودگی اقبال کے سیالکوٹ آنے کے لیے باعث کشش تھی۔ ان کی وفات پر اقبال نے جو مرثیہ کہا، اس میں ایک جگہ کہتے ہیں ؎

خاکِ مرقد پر تری لے کر یہ فریاد آؤں گا
اب دعائے نیم شب میں، کس کو میں یاد آؤں گا
تربیت سے میں تری، انجم کا ہم قسمت ہوا
گھر مرے اجداد کا، سرمایۂ عزت ہوا
دفترِ ہستی میں تھی زریں ورق، تیری حیات
تھی سراپا دین و دنیا کا سبق، تیری حیات

اسی طرح انہیں اپنے بڑے بھائی سے بھی بے حد محبت تھی۔ شیخ عطا محمد قد آور، مضبوط جسم اور بارُعب شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ہمیشہ مغربی لباس زیب تن کرتے۔ لیکن سر پر موتیے یا سیاہ رنگ کی لنگی باندھتے، ہاتھ میں ہنٹر رکھتے۔ بہت خوش پوش تھے اور گھر میں ان کا بڑا دبدبہ تھا۔ اقبال، ''التجائے مسافر'' میں ان کے متعلق ارشاد کرتے ہیں ؎

وہ میرا یوسفِ ثانی، وہ شمعِ محفلِ عشق

ہوئی ہے جس کی اخوت قرار جاں مجکو
جلا کے جس کی محبت نے دفتر من و تو
ہوائے عیش میں پالا، کیا جواں مجکو
ریاضِ دہر میں مانند گل رہے خنداں
کہ ہے عزیز تر از جاں، وہ جانِ جاں مجکو

والدہ کی وفات پر مرثیے میں اقبال ان الفاظ میں شیخ عطا محمد کے غم واندوہ کا نقشہ کھینچتے ہیں ؎

وہ جواں، قامت میں ہے جو صورتِ سرو بلند
تیری خدمت سے ہوا جو مجھ سے بڑھ کر بہرہ مند
کاروبارِ زندگانی میں وہ ہم پہلو مرا
وہ محبت میں تری تصویر، وہ بازو مرا
تجھ کو مثلِ طفلکِ بے دست و پا روتا ہے وہ
صبر سے نا آشنا صبح و مسا روتا ہے وہ

انسان کے اصل اساتذہ تو اس کے والدین ہی ہوتے ہیں۔ جن سے جو کچھ شعوری یا غیر شعوری طور پر حاصل کیا جاتا ہے، اس کے نقوش نہایت گہرے اور انمٹ ہوتے ہیں۔ ان واقعات کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ اقبال کے گھر کا ماحول ایک ایسا دیندارانہ اور درویشانہ ماحول تھا جس میں محبت وشفقت کے ساتھ عزت واحترام کا بڑا دخل تھا۔ اقبال گو لطائف وجدانی کو تسلیم کرتے تھے اور ان کے ورود کا ذاتی تجربہ بھی کسی حد تک رکھتے تھے۔

بہرحال ۱۸۹۱ء میں اقبال نے مڈل کا امتحان پاس کیا اور نویں جماعت میں داخل ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر چودہ پندرہ سال تھی۔ شعروں سے مناسبت تو انہیں بچپن ہی سے تھی۔ یکتا حقانی امروہوی اپنی کتاب سیرتِ اقبال میں تحریر کرتے ہیں کہ اقبال کی طبیعت کا رجحان نو عمری ہی سے شعر وشاعری کی طرف تھا۔ اس کے بعد جوں جوں ان کی سید میر حسن سے وابستگی بڑھی، تو باقاعدہ شاعری کی تحریک سید میر حسن ہی کے فیضانِ صحبت سے ہوئی اور انہوں نے ابتدائی زمانہ میں ان ہی سے اصلاح لی۔ یہ بات سید میر حسن کے چھوٹے بیٹے اور اقبال کے ہمجولی، سید ذکی شاہ بھی بیان کرتے ہیں کہ اقبال نے اپنی ابتدائی مشق میں غزلوں کی اصلاح

میں میرے والد سے فیض حاصل کیا جس کا وہ اکثر ذکر کیا کرتے تھے۔ اس بات کا بھی کوئی ثبوت نہیں کہ اقبال نے سید میر حسن کے مشورہ سے داغ کی شاگردی اختیار کی۔

اقبال نے ۱۸۹۳ء میں میٹرک کے امتحان میں فسٹ ڈویژن لے کر کامیابی حاصل کی اور تمغے اور وظیفے سے سرفراز ہوئے۔ تب ان کی عمر سولہ برس تھی۔ میٹرک کا نتیجہ ۴ مئی ۱۸۹۳ء کو نکلا اور وہ ۵ مئی ۱۸۹۳ء کو اسکاچ مشن کالج میں داخل ہو گئے۔ اس وقت تک اسکاچ مشن اسکول میں انٹرمیڈیٹ کی کلاسیں جاری ہو چکی تھیں اور اسی بنا پر اس کا نام اسکاچ مشن کالج رکھ دیا گیا تھا۔ اس لیے اقبال نے میٹرک پاس کرنے کے بعد ایف۔ اے کی تعلیم وہیں جاری رکھی۔

اقبال کی چند پرانی غزلوں سے جو رسالہ زبان دہلی کے شمارہ نومبر ۱۸۹۳ء اور بعد کے شماروں میں شائع ہوئیں۔ ان کی جو غزل زبان دہلی کے شمارہ فروری ۱۸۹۴ء میں شائع ہوئی، اس کا مقطع ہے ؎

گرم ہم پر جو کبھی ہوتا ہے وہ بت اقبال
حضرتِ داغؔ کے اشعار سنا دیتے ہیں

زبان دہلی کے شمارہ نومبر ۱۸۹۳ء میں پروفیسر حمید احمد خان کے حوالے سے اقبال کو بلبلِ ہند حضرت داغؔ دہلوی کا تلمیذ لکھا گیا ہے۔ ۱۹۰۹ء میں فوقؔ نے اقبال کے جو مختصر حالاتِ زندگی تحریر کیے ہیں ان میں درج ہے کہ اقبال نے ایف۔ اے کی طالب علمی کے دنوں میں داغؔ سے اصلاح لینی شروع کی۔ سری رام نے اپنی تصنیف میں لکھا ہے کہ اقبال نے ابتداء میں چند غزلیں میرزا ارشد گورگانی کو دکھائیں اور پھر داغؔ سے بذریعہ خط و کتابت تلمذ اختیار کیا۔ مگر یہ درست نہیں کیونکہ ارشد گورگانی سے اقبال کی پہلی ملاقات بھاٹی دروازہ لاہور کے ایک مشاعرہ میں ۱۸۹۵ء کے بعد ہوئی۔ سر عبدالقادر بانگ درا کے دیباچہ میں تحریر کرتے ہیں:

اقبال ابھی اسکول ہی میں پڑھتے تھے کہ کلام موزوں زبان سے نکلنے لگا۔ سیالکوٹ میں بھی شیخ محمد اقبال کی طالب علمی کے دنوں میں ایک چھوٹا سا مشاعرہ ہوتا تھا۔ اس کے لیے اقبال نے کبھی کبھی غزل لکھنی شروع کر دی۔ شعرائے اردو میں ان دنوں نواب میرزا خان صاحب داغ دہلوی کا بہت شہرہ تھا۔ پچھلے زمانے میں جب ڈاک کا یہ انتظام نہ تھا، کسی شاعر کو اتنے شاگرد کیسے میسر آ سکتے تھے۔ اب اس سہولت کی وجہ سے یہ حال تھا کہ سیکڑوں آدمی ان سے غائبانہ تلمذ رکھتے تھے

اور انہیں اس کام کے لیے ایک عملہ اور محکمہ رکھنا پڑتا تھا۔ شیخ محمد اقبال نے بھی انہیں خط لکھا اور چند غزلیں اصلاح کے لیے بھیجیں۔ گو اس ابتدائی غزل گوئی میں وہ باتیں تو موجود نہ تھیں، جن سے بعد ازاں کلام اقبال نے شہرت پائی، مگر جناب داغؔ پہچان گئے کہ پنجاب کے ایک دور افتادہ ضلع کا طالبِ علم کوئی معمولی غزل گو نہیں، انہوں نے جلد کہہ دیا کہ کلام میں اصلاح کی گنجائش بہت کم ہے اور یہ سلسلہ تلمذ کا بہت دیر قائم نہیں رہا۔ البتہ اس کی یاد دونوں طرف رہ گئی۔ اقبال نے داغ کی زندگی ہی میں قبول عام کا وہ درجہ حاصل کر لیا تھا کہ داغ مرحوم اس بات پر فخر کرتے تھے کہ اقبال بھی ان لوگوں میں شامل ہے، جن کے کلام کی انہوں نے اصلاح کی۔ مجھے خود دکن میں ان سے ملنے کا اتفاق ہوا اور میں نے خود ایسے فخریہ کلمات ان کی زبان سے سنے۔

اس تحریر سے ظاہر ہے کہ اقبال نویں یا دسویں جماعت سے باقاعدہ غزلیں لکھنے لگے تھے۔ یوں ایف۔ اے کے سال اول میں داغؔ کی شاگردی اختیار کر لی۔ اقبال کی لاہور آمد تک یا بقول فوق قیام لاہور کے ابتدائی ایام تک۔ وہ گاہے بگاہے خط و کتابت کے ذریعہ کلام پر اصلاح لیتے رہے۔ اقبال کی داغ کے ساتھ بالمشافہ ملاقات کبھی نہیں ہوئی۔ البتہ اس خواہش کی طرف اشارہ ان کے ایک شعر میں موجود ہے۔

یہی ہے جو شوقِ ملاقاتِ حضرت
تو دیکھیں گے اک بار ملکِ دکن بھی

بعد میں اگرچہ اقبال نے اصلاح لینا ترک کر دیا تاہم اعزاز یا احترام کے طور پر شاگردی داغؔ کی نسبت قائم رہی۔ یہ تعلق ان کے قیام لاہور کے ابتدائی زمانے کی چند غزلوں سے عیاں ہے۔ مثلاً شور محشر کے شمارہ دسمبر ۱۸۹۶ء میں شائع شدہ ان کی غزل کا مقطع ہے:

نسیمؔ و تشنہؔ ہی اقبالؔ کچھ نازاں نہیں ان پر
مجھے بھی فخر ہے شاگردیِ داغِ سخنداں کا

اسی دور کی ایک اور غزل کا مقطع ہے ؎

جنابِ داغؔ کی اقبال یہ ساری کرامت ہے
ترے جیسے کو کر ڈالا سخنداں بھی سخنور بھی

۱۸۹۸ء میں وجاہت حسین جھنجھانوی کے ''قومی ماتم'' میں بھی انہیں تلمیذ حضرت داغؔ کہا

گیا، پھر ۲۸ فروری ۱۸۹۹ء کے ایک خط بنامِ مولانا احسن مارہروی میں اقبال نے انہیں داغؔ کی تصویر ارسال کرنے کی فرمائش کی۔ ۱۹۰۵ء میں وفاتِ داغؔ پر لکھی گئی نظم میں بھی، جو بانگ درا میں شامل ہے اور جو دراصل مخزن کے اپریل ۱۹۰۵ء کے شمارہ یادگارِ داغؔ نمبر میں ایک بند کے اضافے کے ساتھ چھپی تھی، اس تعلق کا واضح ذکر ہے۔ علاوہ اس کے اقبال نے داغؔ کی وفات پر ''نواب میرزا داغ'' کے الفاظ سے ان کی تاریخ وفات نکالی۔ سو داغ سے اصلاح کا زمانہ مختصر تھا اور اس کا تعین ۱۸۹۳ء اور ۱۸۹۶ء کے درمیانی عرصے میں کیا جا سکتا ہے۔ بہرحال داغؔ کی شاگردی کا اعتراف اقبال کو عمر بھر رہا۔

اقبال کی اسکول اور ایف اے کے زمانے میں استعمال کردہ چند کتابیں [illegible]ط ہیں۔ ان میں سے ایک کتاب کے کسی صفحے پر، راگ کے الاپ تحریر کیے ہیں، جن کے نیچے غالبؔ، بیدلؔ، ناسخؔ اور واقفؔ کے مختلف اشعار پنسل سے تحریر کردہ ہیں۔ دو ایک کتب میں اپنا تخلص ''اقبالؔ'' درج کیا ہے، ان تحریروں سے دو باتوں کا پتا چلتا ہے۔ پہلی یہ کہ وہ راگوں کے الاپ یا فنِ موسیقی کے تکنیکی پہلو سے آگاہ تھے اور شعر کا جو تعلق صوت یا موسیقی سے ہے، اسے سمجھتے تھے اور دوسری یہ کہ انہوں نے لفظ ''اقبالؔ'' بطورِ تخلص ایف اے کے سالِ اوّل میں اختیار کیا تھا۔

۴ مئی ۱۸۹۳ء کو جب میٹرک کے نتیجے کی خبر اقبال کو ملی اسی روز ان کی شادی گجرات کے ایک متمول کشمیری گھرانہ میں ہوگئی۔ ان کی بیوی کا نام کریم بی تھا۔ شادی کے وقت اقبال کی عمر سولہ اور کریم بی کی انیس برس تھی۔ اقبال کے خسر ڈاکٹر عطا محمد اس زمانے کے مشہور و معروف سرجن تھے اور کریم بی ان کی سب سے بڑی صاحبزادی تھیں۔

کریم بی سے اقبال کے ہاں دو بچے ہوئے۔ ۱۸۹۶ء میں معراج بیگم پیدا ہوئیں۔ خدا نے انہیں سیرت وصورت سے نوازا تھا، مگر انہیں خنازیر کا مرض لاحق ہوگیا۔ ان کا انتقال 1915ء میں سیالکوٹ میں بعمرِ انیس برس ہوا۔ امام صاحب کے قبرستان میں اپنے دادا اور دادی کی قبروں کے قریب دفن ہوئیں۔ لیکن خواجہ فیروز الدین بیرسٹر کے بیان کے مطابق وہ گجرات میں فوت ہوئیں۔ اس صورت میں ممکن ہے میت کو سیالکوٹ لے جایا گیا ہو۔ وہ فرماتے ہیں:

ڈاکٹر صاحب کی اہلیہ بچوں کو لے کر گجرات چلی گئی تھیں۔ وہاں بچی بیمار ہوگئی۔ ڈاکٹر صاحب کو بے حد خیال تھا کہ بچے اور ان کی والدہ ان کے پاس رہیں تا کہ بچی کا پورا علاج ہو سکے۔ انہیں یہ خیال بھی تھا کہ میری بچی بہت عقلمند ہے، وہ اپنی والدہ کو ضرور راضی کر سکتی ہے، لیکن میرا خیال

ہے کہ یہ آرزو پوری نہ ہوئی اور بچی گجرات میں فوت ہوگئی۔

۱۸۹۸ء میں آفتاب اقبال پیدا ہوئے۔ کریم بی نے اقبال کے انتقال سے تقریباً آٹھ سال بعد ۱۹۴۶ء میں لاہور میں وفات پائی اور باغبان پورہ قبرستان لاہور میں دفن ہوئیں۔

۱۸۹۵ء میں اسکاچ مشن کالج سے اقبال نے ایف۔ اے کا امتحان سکینڈ ڈویژن میں پاس کیا اور انہیں مزید تعلیم کے حصول کے لیے لاہور کا رخ کرنا پڑا، کیونکہ اسکاچ مشن کالج میں ابھی بی۔ اے کی کلاسیں شروع نہ ہوئی تھیں اور وہ مرے کالج کے نام سے موسوم نہ ہوا تھا۔

سیالکوٹ کی محدود فضا میں اقبال کا پنپنا ممکن نہ تھا۔ گھر میں وہ اپنے والدین کے احترام کے سبب ان کے سامنے دم نہ مار سکتے تھے۔ ان کے خاندان میں صرف شیخ عطا محمد ہی کمانے والے تھے۔ اسی بنا پر مالی اعتبار سے اپنا سلسلۂ تعلیم جاری رکھنے کے لیے اقبال، شیخ عطا محمد کے دست نگر تھے۔ علمی اعتبار سے اقبال پر اپنے استاد سید میر حسن اور فن شعر گوئی میں داغ کی شاگردی کے باعث علم اور شاعری کے میدانوں میں ابھی ان میں خود اعتمادی پیدا نہ ہوئی تھی، تاہم قدرت کے بوئے ہوئے بیج کی کلی کا پھول بن کر کھلنا ابھی باقی تھا۔

باب: ۵

گورنمنٹ کالج، لاہور

ستمبر ۱۸۹۵ء کی ایک دوپہر ایک خوبصورت اور خوش لباس نوجوان لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر گاڑی سے اترا یہ جوانِ رعنا اقبال تھے۔انہیں سٹیشن پر لینے کے لیے ان کے دوست شیخ گلاب دین آئے ہوئے تھے۔اقبال نے گورنمنٹ کالج میں بی اے کی کلاس میں داخلہ لیا اور چند ماہ گلاب دین کے مکان پر ٹھہرنے کے بعد کواڈرینگل ہوسٹل کے کمرہ نمبر ایک میں فروکش ہوئے۔اقبال لاہور کے چار سالہ زمانہ طالب علمی کے دوران اسی کمرہ میں مقیم رہے۔

اس زمانے میں گورنمنٹ کالج میں طلبہ کی تعداد دو اڑھائی سو سے زائد نہ تھی۔گورنمنٹ کالج لاہور کی عمارت کے سامنے نچلے قطعہ اراضی میں جسے اب ''اوول'' کہا جاتا ہے۔اساتذہ اور طلبہ کو ایک دوسرے سے ملنے یا قریب سے جاننے کے مواقع اکثر ملتے رہتے۔اس طرح ہونہار طلبہ اساتذہ کی نگاہوں میں رہتے اور اپنے اساتذہ سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے یا ان سے اثر قبول کرتے۔

اقبال کے لیے کالج میں دوست بنانا مشکل نہ تھا۔اُن کے دوست چوہدری جلال الدین ڈسکہ ضلع سیالکوٹ کے رہنے والے تھے اور سیالکوٹ سے انٹرنس پاس کرنے کے بعد لاہور آ کر گورنمنٹ کالج میں داخل ہوئے تھے۔وہ ہوسٹل میں رہتے تھے۔شعر سے خاص ذوق تھا اور ان کے اس ذوق کی پرورش سید میر حسن کی صحبت میں ہوئی تھی۔اقبال کی ملاقات غلام بھیک نیرنگ سے جلال الدین کے ذریعے ہوئی۔ایک شام نیرنگ، جلال الدین کے ہمراہ شہر کو گئے۔بھاٹی دروازے کے قریب پہنچے تو اقبال آتے ہوئے دکھائی دیئے۔جلال الدین نے نیرنگ سے ان کا تعارف کروایا۔ہوسٹل میں اقبال کا کمرہ رفتہ رفتہ ادبی مرکز بن گیا۔ہوسٹل کی صحبتوں کے متعلق نیرنگ لکھتے ہیں:

اقبال سے زیادہ صحبت کا موقع اس وقت ملا جب وہ بھی بورڈنگ ہاؤس میں داخل ہو گئے۔انہیں

نیچے کی منزل میں مغربی قطار کے جنوبی سرے پر کیوبکل ملا تھا۔ میں مشرقی قطار کی ایک ڈارمیٹری میں رہتا تھا۔ ہم دونوں کا وقت زیادہ تر ایک دوسرے کے ساتھ ہی گزرتا تھا اور اوقات مطالعہ کے بعد گرمی کے موسم میں رات کے وقت ان کا پلنگ ہماری ڈارمیٹری کے آگے ہمارے ہی پاس بچھتا تھا۔ اقبال کی طبیعت میں اسی وقت سے ایک گونہ قطبیت تھی اور وہ قطب از جانمی جنبد کا مصداق تھے۔ میں اور بورڈنگ ہاؤس میں جو جو ان کے دوست تھے۔ سب انہی کے کمرے میں ان کے پاس جا بیٹھتے تھے۔ وہ وہیں میر فرش بنے بیٹھے رہتے تھے۔ حقہ جبھی سے ان کا ہمدم و ہم نفس تھا۔ برہنہ سر، بنیان، دربر، ٹخنے تک کا تہبند باندھے ہوئے۔ اور اگر سردیوں کا موسم ہے تو کمبل اوڑھے ہوئے حقہ پیتے رہتے تھے۔ اور ہر قسم کی گپ اڑاتے رہتے تھے۔ طبیعت میں ظرافت بہت تھی۔ پھبتی زبردست کستے تھے۔ ادبی مباحثے بھی ہوتے تھے۔ شعر کہے بھی جاتے تھے اور پڑھے بھی جاتے تھے ...... ہماری ان سہ سالہ صحبتوں میں اقبال اپنی ایک سکیم بار بار پیش کرتے تھے۔ ملٹن کی مشہور نظم ''فردوس گمشدہ'' اور ''تحصیل فردوس'' کا ذکر کرتے کرتے کہا کرتے تھے کہ واقعات کربلا کو ایسے رنگ میں نظم کروں گا کہ ملٹن کی نظم کا جواب ہو جائے، مگر اس تجویز کی تکمیل کبھی نہ ہو سکی۔ میں اتنا اور کہہ دوں کہ اردو شاعری کی اصلاح اور ترقی کا اور اس میں مغربی شاعری کا رنگ پیدا کرنے کا ذکر بار بار آیا کرتا تھا۔

ہوسٹل میں قیام کے دوران بعض اوقات اقبال اپنے احباب کے ہاں بھی جا کر رہا کرتے تھے۔ مثلاً گمٹی بازار سے ذرا آگے سید مٹھا کے کوچہ ہنومان میں مولانا صلاح الدین احمد اور ان کے بڑے بھائی مولوی ضیاء الدین احمد کے والد کا مکان تھا۔ کبھی کبھی اقبال کو شوق چراتا تو وہ لنگوٹ باندھ کر اکھاڑے میں اترتے اور نیرنگ کے ساتھ دنگل کرتے۔

بی اے کی کلاس میں اقبال نے انگریزی، فلسفہ اور عربی کے مضامین لیے۔ اقبال بی اے کے طالبِ علم ہونے کی حیثیت سے انگریزی اور فلسفہ کے مضامین تو گورنمنٹ کالج کی جماعتوں میں پڑھتے اور عربی زبان و ادب کا مطالعہ کالج میں کرتے تھے۔ اس دور کے گورنمنٹ کالج اور اورئینٹل کالج کے اساتذہ میں مولانا فیض الحسن سہارنپوری، مولانا محمد حسین آزاد اور مولوی محمد دین شامل تھے۔

اقبال نے ۱۸۹۷ء میں بی۔اے، عربی و انگریزی میں امتیازی حیثیت کے ساتھ پاس کیا اور تمغے پائے۔ پنجاب یونیورسٹی کے کیلنڈر ۱۹۰۶ء کے مطابق اقبال نے بی اے کا امتحان سیکنڈ

ڈویژن میں پاس کیا۔ ۱۸۹۷ء میں بی اے کے امتحان میں کل ۱۰۵ طالب علم کامیاب ہوئے تھے جن میں سے چار نے فسٹ ڈویژن حاصل کی۔ اقبال اور ان کے ہم جماعت میاں فضل حسین کو سکینڈ ڈویژن ملی۔ مسلمانوں میں اقبال اول تھے اور میاں فضل حسین دوم۔

اقبال نے ایم اے فلسفہ میں داخلہ لے لیا۔ اس زمانے میں بی اے میں فلسفہ کے پروفیسر ڈبلیو۔ بیل تھے، جو ۱۸۹۶ء میں انسپکٹر آف سکولز ہو کر گورنمنٹ کالج سے چلے گئے۔ ان کے بعد کچھ مدت تک تاریخ کے پروفیسر ڈلنگر فلسفہ پڑھاتے رہے پھر پروفیسر اوشر آ گئے۔ وہ ۱۸۹۸ء میں مستعفی ہو گئے اور ان کی جگہ پروفیسر ٹی۔ ڈبلیو۔ آرنلڈ نے لی۔

آرنلڈ علی گڑھ کالج سے قطع تعلق کر کے گورنمنٹ کالج لاہور میں ۱۱ فروری ۱۸۹۸ء کو فلسفہ کے پروفیسر مقرر ہوئے تھے۔ آرنلڈ کی مشفقانہ رہبری نے اقبال کے ذوقِ تحصیلِ فلسفہ کو جلا بخشی۔ جو دوستی اور محبت استاد اور شاگرد میں پہلے دن سے پیدا ہوئی، وہ آخر کار شاگرد کو استاد کے پیچھے پیچھے انگلستان لے گئی۔ آرنلڈ، اقبال کے اس قدر مداح بن گئے کہ ان کے متعلق اپنے احباب سے اکثر کہتے کہ ایسا شاگرد استاد کو محقق اور محقق کو محقق تر بنا دیتا ہے۔
اقبال نے مارچ ۱۸۹۹ء میں ایم اے فلسفہ کا امتحان دیا۔ پنجاب یونیورسٹی کیلنڈر ۱۹۰۶ء کے مطابق انہوں نے ایم اے میں تھرڈ ڈویژن لی، مگر چونکہ یونیورسٹی میں اس مضمون کے واحد کامیاب امیدوار تھے اس لیے پنجاب میں اول بھی وہی رہے اور نقرئی تمغہ بھی حاصل کیا۔
اقبال نے ۱۸۹۸ء میں لاہور لاء اسکول کی جماعتوں میں قانون کے طالب علم کی حیثیت سے بھی پڑھنا شروع کر دیا۔ انہوں نے دسمبر ۱۹۰۰ء کے قانون کے ابتدائی امتحان میں کلاسوں میں شامل ہوئے بغیر بیٹھنے کی اجازت کے لیے درخواست دی، لیکن وہ درخواست نامنظور ہوئی۔ ان کی اس خواہش کی تکمیل بالآخر لندن میں ہوئی۔

آرنلڈ ۱۹۰۴ء میں ملازمت سے سبکدوش ہو کر انگلستان واپس چلے گئے۔ اس موقع پر اقبال نے ایک الوداعی نظم بعنوان ''نالۂ فراق'' تحریر کی، جس میں اس علمی ذوق کا خاص طور پر ذکر ہے جو ان کے فیض صحبت نے اقبال میں پیدا کر دیا تھا۔

اپنے استاد سے گہرے روابط اور تعلق خاطر کے باوجود اقبال آرنلڈ کی شخصیت اور اس کی حدود سے پوری طرح آشنا تھے۔ ۱۹۳۰ء میں جب آرنلڈ کی وفات کی خبر ان تک پہنچی تو اقبال اشکبار ہو گئے۔ مگر جب آرنلڈ کے مرتبہ استشراق اور اسلام سے ان کی عقیدت کا ذکر چھیڑا تو

تعجب سے گویا ہوئے کہ آرنلڈ کا اسلام سے کیا تعلق؟ ''دعوتِ اسلام'' اور اس قسم کی تصانیف پر مت جاؤ۔ آرنلڈ کی وفاداری صرف خاک انگلستان سے تھی۔ انہوں نے جو کچھ کیا، انگلستان کے مفاد کے لیے کیا۔ میں جب انگلستان میں تھا تو انہوں نے مجھے براؤن کی تاریخِ ادبیاتِ ایران پر کچھ لکھنے کی فرمائش کی تھی، لیکن میں نے انکار کر دیا، کیونکہ مجھے اس قسم کی تصنیفات میں انگلستان کا مفاد کام کرتا نظر آتا تھا۔ دراصل یہ بھی ایک کوشش تھی، ایرانی قومیت کو ہوا دینے کی، تاکہ اس طرح ملّتِ اسلامیہ کی وحدت پارہ پارہ ہو جائے۔ تو آرنلڈ کیا ہر مستشرق کا علم و فضل وہی راستہ اختیار کر لیتا ہے جو مغرب کی ہوسِ استعمار اور شہنشاہیت کے مطابق ہو۔ ان حضرات کو بھی شہنشاہیت پسندوں اور سیاست کاروں کا دست و بازو تصور کرنا چاہیے۔

اقبال کی لاہور آمد سے پیشتر بھاٹی دروازے کے اندر بازار حکیماں میں ایک انجمن مشاعرہ قائم تھی، جس کی نشستیں حکیم امین الدین کے مکان میں منعقد ہوا کرتیں۔ امین الدین اسی خاندان حکیماں سے تعلق رکھتے تھے، جس کے نام پر بازار مشہور ہے۔ اس انجمنِ مشاعرہ کی بنیاد حکیم شجاع الدین نے ۱۸۹۰ء میں رکھی تھی۔ حکیم شجاع الدین اپنی زندگی میں میرِ مجلس ہوتے تھے۔ میرزا ارشد گورگانی دہلوی اور ناظر حسین ناظم لکھنوی مشاعرے کی روح رواں تھے۔ کالجوں کے نوجوان طالبِ علم بھی شعر گوئی اور شعر فہمی کے شوق میں کھچے چلے آتے تھے۔

اقبال لاہور کے کسی مشاعرے میں شریک نہ ہوئے تھے، لیکن نومبر ۱۸۹۵ء کی ایک شام ان کے چند ہم جماعت انہیں کھینچ کر حکیم امین الدین کے مکان پر اس مجلس مشاعرہ میں لے گئے۔ یہاں لاہور میں غالباً پہلی مرتبہ اقبال نے مشاعرے میں اپنی غزل پڑھی۔ جب آپ اس شعر پر پہنچے:

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

تو میرزا ارشد گورگانی دہلوی بے اختیار ہو کر داد دینے لگے اور انہیں محبت و قدر دانی کی نگاہ سے دیکھا۔ اسی غزل کا مقطع جو اس وقت اقبال نے پڑھا، دلی اور لکھنؤ کی زبان کے جھگڑوں پر ان کے خیالات کی عکاسی کرتا ہے:

اقبال! لکھنؤ سے نہ دلی سے ہے غرض
ہم تو اسیر ہیں خمِ زلفِ کمال کے

اگلے سال یعنی ۱۸۹۶ء میں محمد دین فوق گھڑتل ضلع سیالکوٹ سے ملازمت کی تلاش میں لاہور آئے اور بھاٹی دروازہ بازار حکیماں کی انجمن مشاعرہ کی دھوم سن کر وہاں پہنچے۔ اس شام محفل میں اقبال بھی موجود تھے۔ دونوں کی ملاقات ہوئی اور دونوں میں ایسی دوستی پیدا ہوگئی جو تاحیاتِ اقبال قائم رہی۔ فوق نے بعد میں شاعر سے بڑھ کر ایک ادیب، مورخ اور اخبار نویس کی حیثیت سے شہرت پائی۔ اقبال نے ابتدا میں کشمیر کے متعلق جو اشعار اور قطعات کہے، وہ اسی انجمن کے اجلاسوں میں پڑھے گئے تھے اور بعد میں فوق کے اخبارات میں ان کی اشاعت ہوئی۔

سر عبدالقادر نے ۱۹۰۱ء سے غالباً دو تین سال پہلے اقبال کو پہلی مرتبہ لاہور کے ایک مشاعرے میں غزل پڑھتے سنا۔ چھوٹی سی غزل تھی۔ سادہ سے الفاظ۔ زمین بھی مشکل نہ تھی مگر کلام میں شوخی اور بے ساختہ پن موجود تھا، بہت پسند کی گئی۔ گویا سر عبدالقادر سے اقبال کا تعارف ۱۸۹۸ء یا ۱۸۹۹ء میں مخزن کے اجراء سے تقریباً دو تین سال قبل ہو چکا تھا۔ انہوں نے اسی ملاقات کا ذکر اپنے ایک بعد کے مضمون ''اقبال کی شاعری کا ابتدائی دور'' میں کیا ہے کہ اقبال نے اس مشاعرے میں جو غزل پڑھی اُس کا مقطع یہ تھا:

شعر کہنا نہیں اقبال کو آتا ، لیکن
آپ کہتے ہیں سخنور ، تو سخنور ہی سہی

اسی غزل میں ایک شعر اور تھا، جس کی سامعین نے بہت داد دی:

خوب سوجھی ہے ، تہِ دام پھڑک جاؤں گا
میں چمن میں نہ رہوں گا تو میرے پر ہی سہی

بقول سر عبدالقادر، اقبال کے باوقار چہرے کو دیکھتے ہی ان کی غیر معمولی شخصیت کا نقش دل پر ثبت ہو جاتا تھا۔

مشاعروں میں سامعین کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔ اقبال، نواب غلام محبوب سبحانی کے مشاعروں میں شریک ہو کر طرحی غزلیں پڑھتے تھے۔ اسی انجمن کے کسی ایک مشاعرے میں جس کے لیے یہ طرح دی گئی تھی:

مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغ ہجراں کا

اقبال نے اپنی وہ غزل پڑھی جس کے مقطع میں داغ کی شاگردی پر فخر کا اظہار

کیا گیا ہے ؎

نسیمؔ و تشنہؔ ہی، اقبالؔ کچھ اس پر نہیں نازاں
مجھے بھی فخر ہے شاگردیِ داغؔ سخنداں کا

اسی انجمن کے کسی اجلاس میں اقبال نے اپنی نظم ''ہمالہ'' بھی پڑھ کر سنائی تھی۔ انجمن کی کوشش تھی کہ غزل کے علاوہ نظم کو بھی رواج دیا جائے۔ اقبال کی یہ نظم نئے رنگ کی نظم تھی۔ جس میں خیالات مغربی تھے اور بندشیں فارسی اور ساتھ ہی حبِ وطن کی چاشنی اس میں موجود تھی۔ اس لحاظ سے غالباً ۱۸۹۸ء یا ۱۸۹۹ء میں اسی بزم کی نشستوں میں اقبال کی نئے انداز کی شاعری کی ابتداء ہوئی۔

انجمن مشاعرہ میں اقبال کی شہرت کے باعث حکیم شہباز الدین اور ان کی جماعت نے فی الفور اقبال کو اپنے دائرہ اثر میں لے لیا اور چند ہی روز میں اقبال اس جماعت کے رکن بن گئے۔ انہیں بالآخر ۱۹۰۰ء میں انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس کے لیے نظم لکھنے پر آمادہ کر لیا۔

۱۸۹۵ء سے لے کر ۱۸۹۹ء تک اقبال کو لاہور کی مختلف انجمنوں نے اپنی طرف کھینچا اور یہاں کے ایک مخصوص باذوق طبقہ سے ان کی شناسائی ہوگئی۔ وہ انجمنِ مشاعرہ، ادبی انجمن اور انجمنِ کشمیری مسلمانان لاہور سے بھی وابستہ تھے۔ یہ انجمن فروری ۱۸۹۶ء میں لاہور کی کشمیری برادری کے چند بزرگوں نے قائم کی تھی، جو ۱۸۹۷ء کے وسط میں بند ہوگئی لیکن ۱۹۰۱ء میں دوبارہ زندہ کی گئی۔ اقبال اس کی کارروائیوں میں سرگرم حصہ لیتے اور اس کی مجالس میں پُرجوش نظمیں پڑھتے تھے۔ وہ جلد ہی ایک ملّی اور عوامی شاعر کی حیثیت سے مقبول عام ہوئے۔

بعض بے تکلف دوستوں کے اصرار پر انہوں نے کبھی کبھار اپنا کلام ترنم سے پڑھنا شروع کر دیا۔ سر عبدالقادر اپنے مضمون ''کیفِ غم'' میں تحریر کرتے ہیں:

شعر سے رغبت کے ساتھ اقبال کو موسیقی کا بھی شوق تھا۔ اس لیے کبھی کبھی بے تکلف دوستوں کی صحبت میں اپنا کلام ترنم سے پڑھتے تھے جس سے اشعار کا لطف دوبالا ہو جاتا تھا۔ وہ ہر بحر کے لیے ایسی موزوں لے چن لیتے تھے کہ سننے والے مسحور ہو جاتے۔ اس ترنم کے وقت ان پر اکثر غم کی حالت طاری ہوتی تھی اور سننے والے بھی اس سے اثر پذیر ہونے سے بچ نہیں سکتے تھے۔ لاہور کی مشہور تعلیمی انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس اکثر ان کے کلام سے مستفید ہوتے

تھے۔ میرزا ارشد گورگانی جو ان مجالس میں ہمیشہ تحت اللفظ پڑھتے تھے، انہوں نے اقبال کی روز افزوں قبولیت کو دیکھ کر محسوس کیا کہ اقبال کی خوش آہنگی اس کی نظم کو پر لگا رہی ہے اور اپنی نظم میں اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ مصرع لکھا ؂

نظمِ اقبالی نے ہر اک کو گویّا کر دیا

اقبال کو بچپن ہی سے قرآن مجید کو بھی خوش الحانی سے پڑھنے کی عادت ڈالی گئی تھی جو عمر بھر قائم رہی۔ ذرا بڑے ہوئے تو راگوں کے الاپ سیکھ لیے۔ اس بات کا تو واقعی کوئی ثبوت نہیں کہ انہوں نے علمِ موسیقی میں دسترس حاصل کرنے کے لیے کسی استاد کی طرف رجوع کیا لیکن ان کی آواز بہرطور اچھی تھی۔ کان موسیقی سے آشنا تھے اور طبیعت شاعرانہ تھی۔ غالباً اسی زمانے میں اقبال نے ستار خریدی اور سیکھنے کے لیے باقاعدہ سبق لیے۔ وہ ستار بجانے کی مشق کیا کرتے تھے اور انہیں ستار نوازی کا شوق ایک مدت تک رہا۔ ۱۹۰۵ء میں یورپ جانے سے پیشتر وہ یہ ستار اپنے کسی ہندو دوست کو دے گئے لیکن مضراب کو یادگار کے طور پر محفوظ رکھ لیا۔ یہ مضراب راقم نے ان کی وفات کے بعد دیگر استعمال کی اشیاء کے ساتھ پڑی ہوئی خود دیکھی ہے، مگر بعد میں ڈھونڈنے سے نہ مل سکی۔

گورنمنٹ کالج میں طالب علمی کے زمانے میں اقبال کا یہ معمول رہا کہ گرمی کی چھٹیاں یا دیگر تعطیلات سیالکوٹ میں اپنے والدین اور اہل وعیال کے ساتھ گزارتے تھے۔ اقبال کی اب تک دریافت شدہ تصاویر میں جو تصویر سب سے پرانی ہے وہ ۱۸۹۹ء میں اتروائی گئی جب اقبال ایم۔ اے کے آخری سال میں پڑھتے تھے۔ اس تصویر میں انہوں نے سیاہ اچکن اور سر پر رومی ٹوپی پہن رکھی ہے، گھنی بھوری مونچھیں نیچے کی طرف ترشی ہوئی ہیں اور انہوں نے عینک لگا رکھی ہے۔

اقبال نے شاعری کی ابتداء ایک روایتی غزل گو کی حیثیت سے کی۔ ۱۸۹۳ء سے لے کر ۱۸۹۹ء تک ان کے طالب علمی کے دور کی غزلوں کا جواب تک دریافت ہو سکی ہیں، اُن میں داغؔ کے رنگ کے ساتھ ''اقبالؔ'' کی جھلکیاں بھی دکھائی دیتی تھیں۔ خلیفہ عبدالحکیم تحریر کرتے ہیں:

اس ابتدائی زمانے کی یادگار کچھ غزلیں بانگ درا میں موجود ہیں۔ لیکن اس دور مشق وتقلید میں بھی اس اقبال کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں جس کے آفتابِ کمال نے ابھی طلوع ہونا تھا۔ اس دور کی شاعری کو اقبال کی شاعری کی صبحِ کاذب کہنا چاہیے، جس کی روشنی طلوع آفتاب کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔

اس دور کی دیگر خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ اقبال کی توجہ اپنے گردونواح کی طرف

مبذول ہونے کی بجائے زیادہ تر اپنی ذات پر مرتکز تھی۔ چنانچہ اقبال نے خود ۱۹۱۰ء میں تحریر کیا:

میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے ہیگل، گوئٹے، میرزا غالب، عبدالقادر بیدل اور ورڈز ورتھ سے بہت کچھ استفادہ کیا ہے۔ ہیگل اور گوئٹے نے اشیاء کی باطنی حقیقت تک پہنچنے میں میری رہنمائی کی۔ بیدل اور غالب نے مجھے یہ سکھایا کہ مغربی شاعری کی اقدار اپنے اندر سمو لینے کے باوجود اپنے جذبہ اور اظہار میں مشرقیت کی روح کیسے زندہ رکھوں اور ورڈز ورتھ نے طالب علمی کے زمانے میں مجھے دہریت سے بچا لیا۔

گویا اقبال کے ذہنی تجسّس نے انہیں تلاش حقیقت میں سرگرداں کر رکھا تھا۔ یہ ایک خالصتاً ذاتی اور باطنی نوعیت کی کشمکش تھی۔ دہریت کی عارضی کیفیت غالباً ہیگل کے مطالعہ سے پیدا ہوئی۔ یہ دہریت کسی بھی متجسّس ذہن کے سفر ارتقاء میں ایک عارضی مرحلہ ہے۔

اقبال کی تعلیم و تربیت روایتی اسلامی نہج پر ہونے کے باوجود اگر ان کے متجسّس ذہن اور شاعرانہ قلب نے ورڈز ورتھ کے مطالعہ سے عقلیت کے کھوکھلے پن کا ایک قابل فہم جواب پالیا تو یہ ان کی سلامتی طبع کی دلیل تھی کہ وہ اپنے عہد کے مادہ پرستانہ نظریات سے اثر قبول کرنے کے باوجود ان سے گمراہ نہ ہوئے۔

طالب علمی ہی کے زمانے میں اقبال نے نئے انداز کی شاعری کی ابتدا کی اور روایتی غزل کہنا چھوڑ کر نظم کی طرف متوجہ ہوئے۔ یہ ان پر مغربی افکار کے اثر کا نتیجہ تھا۔ ان کے سامنے اردو اور فارسی شاعری کے علاوہ انگریزی شاعری کے بہترین نمونے موجود تھے۔ اردو اور فارسی میں وطن اور قوم کی محبت کی شاعری مفقود تھی، مگر یہ جذبات انگریزی شاعری میں موجود تھے۔ پس مغربی اثرات نے ابتداء ہی سے اقبال کی شاعری کا رخ بدل دیا۔ انہوں نے چند انگریزی نظموں کا آزاد اردو ترجمہ بھی کیا اور ان کی بعض نظمیں گو ترجمہ تو نہ تھیں، البتہ افکار اور اسلوب بیان کے اعتبار سے مغربی تھیں۔

طالب علمی کے زمانے میں اقبال کی بعض غزلیں چند رسالوں مثلاً زبان، دھلی، شورِ محشر وغیرہ میں شائع ہوئیں۔ اقبال کی طالب علمی کے دور کی شاعری کے مطالعے سے عیاں ہے کہ اس عہد میں وہ مجموعۂ اضداد تھے۔ زندگی ان کے لیے ابھی تک ایک معما تھی۔ وہ کسی پختہ یقین تک نہ پہنچے تھے بلکہ ان کا ذہن مختلف افکار، نظریات اور جذبات کی پائیداری یا ناپائیداری

کو پرکھنے کے لیے ایک تجربہ گاہ تھا اور یہ کیفیت خاصی مدت تک طاری رہی۔

باب:٦

تدریس و تحقیق

اقبال ۱۳ مئی ۱۸۹۹ء کو اورینٹل کالج میں بہتّر روپے چودہ آنے ماہوار تنخواہ پر میکلوڈ عربک ریڈر کی حیثیت سے ملازم ہو گئے۔ میکلوڈ عربک ریڈر کی حیثیت سے اقبال تقریباً چار سال یعنی مئی ۱۹۰۳ء تک اورینٹل کالج میں کام کرتے رہے۔ اسی دوران انہوں نے یکم جنوری ۱۹۰۱ء سے چھ ماہ کی بلاتنخواہ رخصت لی اور گورنمنٹ کالج میں انگریزی کے اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے کام کیا۔ اسی سال یعنی ۱۹۰۱ء میں اقبال ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنری کے امتحان مقابلہ میں بھی کامیاب ہوئے مگر میڈیکل بورڈ نے طبی نقطہ نظر سے ان کی دائیں آنکھ کی بینائی کی کمزوری کے باعث انہیں ان فٹ قرار دیا۔ اقبال کی دائیں آنکھ کی بینائی بچپن ہی سے بہت کمزور تھی۔ اقبال کو ان کی والدہ نے بتایا تھا کہ دو سال کی عمر میں انہیں جونکیں لگوائی گئی تھیں۔

اورینٹل کالج کے کینیڈین نژاد پرنسپل سٹراٹن کی وفات پر ۱۹۰۲ء میں آرنلڈ دوبارہ اورینٹل کالج کے قائم مقام پرنسپل مقرر ہوئے۔ اقبال نے سٹراٹن کی تحریک پر امریکن یونیورسٹیوں میں داخلے وغیرہ کے قواعد معلوم کرنے کی کوشش کی، لیکن یہ خواہش بارآور نہ ہو سکی۔ آرنلڈ نے بالآخر انہیں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے انگلستان اور جرمنی جانے پر رضامند کر لیا۔

میکلوڈ عربک ریڈر کی حیثیت سے اقبال اورینٹل کالج بی او ایل اور انٹرمیڈیٹ کی جماعتوں کو تاریخ، اقتصادیات اور فلسفہ پڑھاتے تھے۔ اقبال کے ذمہ ہر ہفتہ اٹھارہ پیریڈ درس و تدریس کے لیے وقف تھے۔ ہر پیریڈ پچاس منٹ کا ہوتا تھا۔ وہ بی او ایل کی جماعتوں کو تاریخ اور اقتصادیات کے مضامین چھ پیریڈز میں پڑھاتے تھے اور بارہ پیریڈز میں انٹرمیڈیٹ کی سال اوّل اور دوم کی جماعتوں کو فلسفہ کا درس دیتے تھے۔ اس چار سال کے عرصے میں انہوں نے مندرجہ ذیل تراجم و تالیفات مرتب کیں:

۱۔ نظریہ توحیدِ مطلق، پیش کردہ شیخ عبدالکریم الجیلی (انگریزی)۔

۲۔ اسٹبس کی تصنیف ارلی پلانیجنٹس کی اردو میں تلخیص و ترجمہ۔

۳۔ واکر کی تصنیف، پولیٹکل اکانومی کی اردو میں تلخیص و ترجمہ۔

۴۔ علم الاقتصاد۔

پہلی تحریر تو انگریزی میں ایک تحقیقی مقالہ تھا، جس میں الجیلی کی تصنیف انسان کامل پر بحث کی گئی تھی۔ دوسری تحریر برطانیہ کی ابتدائی تاریخ سے متعلق تھی، جس میں ہنری دوم سے لے کر رچرڈ سوم کے عہد کا ذکر تھا۔ تیسری تحریر کا تعلق واکر کے معاشیات کے اصولوں سے تھا، البتہ چوتھی تحریر اقبال کی اپنی تصنیف تھی۔

اقبال کی تصنیف علم الاقتصاد، پیسہ اخبار کے خادم التعلیم سٹیم پریس لاہور میں منشی محمد عبدالعزیز منیجر کے زیر اہتمام چھپی اور ڈبلیو۔ بیل، ڈائریکٹر محکمۂ تعلیم پنجاب کے نام سے منسوب ہے جو آرنلڈ کی گورنمنٹ کالج میں آمد سے قبل اقبال کے استاد فلسفہ تھے۔ اورینٹل کالج میں بطورِ میکلوڈ عربک ریڈر اپنی مدت ملازمت کے اختتام کے بعد اقبال جون ۱۹۰۳ء سے دوبارہ گورنمنٹ کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر مقرر کیے گئے، اس لیے یہ کتاب ۱۹۰۴ء میں شائع ہوئی۔

علم الاقتصاد پر کتاب تحریر کرنے کی ضرورت کے بارے میں اقبال نے لکھا:

علم الاقتصاد انسانی زندگی کے معمولی کاروبار پر بحث کرتا ہے۔ یہ امر مسلم ہے کہ انسان کا معمولی کام کاج، اس کے اوضاع و اطوار اور اس کے طرز زندگی پر بڑا اثر رکھتا ہے بلکہ اس کے دماغی قویٰ بھی اس اثر سے کامل طور پر آزاد نہیں رہ سکتے۔ ذرا خیال کرو کہ غریبی یا یوں کہو کہ ضروریاتِ زندگی کے کامل طور پر پورا نہ ہونے سے انسانی طرزِ عمل کہاں تک متاثر ہوتا ہے۔ غریبی قوائے انسانی پر بہت بُرا اثر ڈالتی ہے، بلکہ بسا اوقات انسانی روح کے مجلّا آئینے کو اس قدر زنگ آلود کر دیتی ہے کہ اخلاقی اور تمدنی لحاظ سے اس کا وجود و عدم برابر ہو جاتا ہے۔ اس زمانے میں یہ سوال پیدا ہوا کہ آیا مفلسی بھی نظم عالم میں ایک ضروری جزو ہے؟ کیا ممکن نہیں کہ ہر فرد مفلسی کے دکھ سے آزاد ہو؟ اس سوال کا شافی جواب دینا علم اقتصاد کا کام نہیں۔ مگر چونکہ اس جواب کا انحصار زیادہ تر ان واقعات اور نتائج پر بھی ہے جو علم الاقتصاد کے دائرۂ تحقیق میں داخل ہیں، اس واسطے یہ علم انسان کے لیے انتہا درجے کی دلچسپی رکھتا ہے۔ اس کا مطالعہ اہل

ہندوستان کے لیے نہایت ضروری ہے، کیونکہ یہاں مفلسی کی عام شکایت ہو رہی ہے۔ انسان کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ جو قومیں اپنے تمدنی اور اقتصادی حالات سے غافل رہی ہیں، ان کا حشر کیا ہوا ہے...... پس اگر اہل ہندوستان دفترِ اقوام میں اپنا نام قائم رکھنا چاہتے ہوں تو ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس اہم علم کے اصولوں سے آگاہی حاصل کر کے معلوم کریں کہ وہ کون سے اسباب ہیں جو ملکی عروج کے مانع ہو رہے ہیں۔ اگر ان سطور سے کسی فردِ واحد کو بھی ان معلومات پر غور کرنے کی تحریک ہوگئی تو میں سمجھوں گا کہ میری دماغ سوزی اکارت نہیں گئی۔

کتاب کے مختلف ابواب میں جن موضوعات پر بحث کی گئی ہے، وہ یہ ہیں، علم الاقتصاد کی ماہیئت اور اس کا طریق تحقیق، پیدائش دولت (زمین، محنت اور سرمایہ، کسی قوم کی قابلیت پیدائش دولت کے لحاظ سے) تبادلہ دولت (مسئلہ قدر تجارت بین الاقوام، زرِ نقد کی ماہیئت اور اس کی قدر، حق الضرب، زر کاغذی، اعتبار اور اس کی ماہیئت) پیداوار دولت کے حصے دار لگان، ساہوکار کا حصہ یا سود، مالک یا کارخانہ دار کا حصہ یا منافع محنتی کا حصہ یا اجرت، مقابلہ نا کامل دستکاروں کی حالت پر کیا اثر کرتا ہے، سرکار کا حصہ یا مالگزاری، آبادی (وجہِ معیشت، جدید ضروریات کا پیدا ہونا، صرف دولت)۔

اقبال نے اس کتاب کو معاشیات کے تغیر پذیر نظریات کے پیشِ نظر دوبارہ اشاعت کے قابل نہ سمجھا۔ بہر حال اس کے بعض پہلو ایسے ہیں جن سے اقبال کے خیالات کا پتا چلتا ہے۔ مثلاً خاندانی منصوبہ بندی کے متعلق تحریر کرتے ہیں:

جب یہ حال ہو تو جس ملک میں آبادی بلا قید بڑھ رہی ہو، وہاں کے لوگوں کو چاہیے کہ انجام بینی سے کام لیں اور ان وسائل کو اختیار کریں جو آبادی کو روکتے ہیں۔ مفلسی تمام جرائم کا منبع ہے، اگر ایسی بلائے بے درماں کا قلع قمع ہو جائے تو دنیا جنت کا نمونہ نظر آئے گی ...... مگر موجودہ حالت کی رو سے اس کالی بلا کے پنجے سے رہائی پانے کی یہی صورت ہے کہ نوع انسان کی آبادی کم ہو تا کہ موجودہ سامانِ معیشت کفالت کر سکے...... لہٰذا ہمارا فرض ہے کہ ہم کمی آبادی کے ان اسباب کو عمل میں لائیں جو ہمارے اختیار میں ہیں، تا کہ ان اسباب کا عمل قدرتی اسباب کے عمل سے متحد ہو کر آبادیِ انسان کو کم کرے اور دنیا مفلسی کے دکھ سے آزاد ہو کر عیش و آرام کا ایک دلفریب نظارہ پیش کرے۔ ہمارے ملک میں سامانِ معیشت کم ہے اور آبادی روز بروز بڑھ رہی ہے۔ قدرت قحط اور وبا سے اس کا علاج کرتی ہے مگر ہم کو بھی چاہیے کہ بچپن کی شادی اور کثرتِ ازدواج کے دستور کی پابندیوں سے آزاد ہو جائیں۔ اپنے قلیل سرمائے کو زیادہ دور

اندیشی سے صرف کریں۔ ہمارا مقصد صرف اس قدر ہے کہ بچوں کی کم سے کم مقدار پیدا ہو اور بی بی کی خواہش ایک فطری تقاضا ہے، اس کو بالکل دبائے رکھنا بھی صحت کے خلاف ہے۔ یہ مطلب بڑی عمر میں شادی کرنے یا بالفاظ دیگر شرحِ پیدائش کو کم کرنے اور نفسانی تقاضوں کو بالعموم ضبط کرنے سے حاصل ہو سکتا ہے۔

اقبال اورینٹل کالج میں پڑھانے کے ساتھ ساتھ گورنمنٹ کالج میں بھی پڑھاتے تھے۔ ۴/جنوری ۱۹۰۱ء کو انہوں نے لالہ جیا رام کی جگہ گورنمنٹ کالج میں عارضی طور پر اسسٹنٹ پروفیسر انگریزی کی خدمات انجام دینا شروع کیں۔ اقبال کی انجمنِ حمایتِ اسلام کے ساتھ کچھ نہ کچھ وابستگی تو ۱۸۹۹ء ہی سے ہو چکی تھی؛ سر عبدالقادر ان دنوں اسلامیہ کالج میں انگریزی پڑھاتے تھے۔ انہیں کچھ عرصے کے لیے رخصت لینا پڑی اور اس دوران میں ان کی جگہ اقبال اسلامیہ کالج میں انگریزی پڑھانے کے فرائض انجام دیتے رہے۔ بعد میں گورنمنٹ کالج میں اسی منصب پر ان کا تقرر ۳۱ مارچ ۱۹۰۳ء تک رہا، جس کا چارج انہوں نے ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۲ء کو لیا تنخواہ دو سو روپے ماہوار مقرر ہوئی۔ جب اورینٹل کالج میں بطور میکلوڈ عربک ریڈر ان کی مدت ملازمت ختم ہوئی تو ان کا تقرر دوبارہ گورنمنٹ کالج میں بحیثیت اسسٹنٹ پروفیسر انگریزی ہوا، جس کا چارج انہوں نے ۳ جون ۱۹۰۳ء کو لیا۔ مدتِ ملازمت ۳۰ ستمبر ۱۹۰۳ء تک تھی۔ لیکن ختم ہونے سے پیشتر ہی اس میں چھ ماہ یعنی ۳۱ مارچ ۱۹۰۴ء تک توسیع کر دی گئی۔ اس مدت کے اختتام پر انہیں مزید توسیع دی گئی اور وہ فلسفہ پڑھانے پر مامور ہوئے۔ تنخواہ بھی دو سو روپے سے دو سو پچاس روپے ہو گئی۔ آپ اسی منصب پر فائز تھے جب یورپ میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے انہوں نے یکم اکتوبر ۱۹۰۵ء سے تین سال کی بلا تنخواہ رخصت لی۔ اس دور میں اقبال نے تدریس کے ساتھ فلسفہ، تاریخ اور معاشیات کے موضوعات پر تصنیف و تالیف کا کام کیا۔

گورنمنٹ کالج میں تعلیم کے خاتمے کے بعد اقبال کواڈرینگل ہوسٹل سے بھاٹی دروازے منتقل ہو گئے۔ مراجعت انگلستان سے قبل اقبال نے معلم کی حیثیت سے ملازمت اختیار کرنے پر سب سے پہلے ۱۹۰۰ء میں بھاٹی دروازے کے اندر ایک مکان کرایہ پر لیا، جو میاں احمد بخش کی ملکیت تھا۔ اسی علاقے میں مولوی محمد باقر پروفیسر فارسی، شمس العلما مولوی محمد حسین، پروفیسر عربی مشن کالج، مولوی حاکم علی، پروفیسر اسلامیہ کالج اور مفتی عبداللہ ٹونکی کا قیام بھی تھا۔ اس

مکان کا تعین ممکن نہیں۔ البتہ کچھ عرصہ کے بعد اقبال جس دوسرے مکان میں منتقل ہوئے، وہ بھاٹی دروازہ میں کوچہ جلوٹیاں کے نکڑ پر تھا۔ کوچے کے موڑ پر ایک کنواں ہے جس کے ساتھ ایک سیڑھی اوپر جاتی ہے۔ اسی کی بالائی منزل پر اقبال چند ماہ رہے۔ اس کے بعد اس مکان میں اٹھ آئے جو لالہ رام سرن داس کی ملکیت تھا اور اس کا موجودہ نمبر ۵۹۷ - بی ہے۔ یہاں اقبال کا قیام انگلستان جانے یعنی وسط ۱۹۰۵ء تک رہا۔ اقبال سے پہلے اس مکان میں مولوی حاکم علی رہا کرتے تھے۔ مکان کا دروازہ گلی کے اندر تھا۔ اوپر کی منزل میں بازار کے رخ تین کھڑکیاں اور تین بخارچے تھے۔ اسی مکان میں ۱۹۰۵ء کا مشہور زلزلہ آیا تھا۔ اقبال اس دوران بخارچے کے قریب پلنگ پر لیٹے اطمینان سے مطالعہ کرتے رہے۔ حالانکہ زلزلہ اس قدر شدید تھا کہ اس کے اثر سے دوسرا بخارچہ ٹوٹ گیا تھا۔

بازار حکیماں کی نکڑ پر موجود اقبال کے مسکن کے بارے میں سر عبدالقادر تحریر کرتے ہیں:

میں شام کو ان کے ہاں بیٹھتا، ان کے دو تین اور دوست عموماً وہاں موجود ہوتے تھے۔ میں جاتا تو سلسلہ شعر وسخن شروع ہو جاتا۔ میں کوئی شعر یا مصرع اقبال کو سنانے کے لیے ڈھونڈ رکھتا جو طرح کا کام دیتا۔ وہ حقہ پیتے اور شعر کہتے جاتے۔ ابو صاحب کاغذ اور پنسل لے کر لکھنا شروع کر دیتے۔ اقبال کے ابتدائی کلام کا بیشتر حصہ اسی طرح لکھا گیا۔ ابو صاحب ایک مجلد بیاض میں اپنی پنسلی یادداشتیں صاف کر کے لکھ لیتے تھے۔ اگر ابو صاحب کا تیار کیا ہوا مسالہ موجود نہ ہوتا تو ہمارے مرحوم دوست کا بہت سا کلام چھپنے سے رہ جاتا، کیونکہ وہ اس زمانے میں اپنے پاس کوئی مسودہ نہ رکھتے تھے۔

اسی دور میں علی بخش اقبال کے پاس ملازم ہوا۔ وسط ۱۹۰۵ء میں جب اقبال انگلستان جانے لگے تو علی بخش کو اپنے بڑے بھائی شیخ عطا محمد کے پاس ہنگو (کوہاٹ) بھیج دیا۔ لیکن وہاں اس کا دل نہ لگا اور وہ واپس لاہور آ گیا۔ پہلے اسلامیہ کالج اور پھر مشن کالج میں نوکر ہو گیا۔ اسی دوران علی بخش کی چوری ہوگئی اور اس نے اقبال کو انگلستان میں ایک خط تحریر کرایا۔ اقبال نے انگلستان سے واپسی سے کچھ ماہ پیشتر اسے جواب دیا۔ ۱۹۰۸ء میں انگلستان سے اقبال کی واپسی پر علی بخش نوکری چھوڑ کر دوبارہ ان کے پاس آ گیا۔ علی بخش کی بیوی کے فوت ہونے پر اُس کی دوبارہ شادی کی نوبت ہی نہ آئی۔ اس کے بعد علی بخش آخری دم تک اقبال کے پاس رہا۔ بلکہ ان کے انتقال کے بعد بھی بچوں کی خدمت کرتا رہا۔ علی بخش کی وفات ۲ جنوری ۱۹۶۹ء کو

چک نمبر ۱۸۸-آر بی فیصل آباد میں ہوئی۔

اقبال کی زندگی کے اس دور میں ان پر ایک افتاد بھی پڑی۔ مئی ۱۹۰۳ء میں شیخ عطا محمد بلوچستان کی سرحد پر سب ڈویژنل آفیسر ملٹری ورکس تھے۔ ان کے بعض مخالفین نے سازش کر کے ان کے خلاف ایک جھوٹا فوجداری مقدمہ کھڑا کر دیا۔ اس مقدمے کی ساری بنا عداوت پر تھی۔ شیخ عطا محمد کو اندیشہ تھا کہ ان کے مخالفین گواہوں کو متاثر کرنے کی کوشش کریں گے اور عدالت پر بھی اثر انداز ہوں گے۔ اقبال نے وائسرائے ہند لارڈ کرزن کو تمام حالات سے مطلع کیا، جس نے واقعات کی تحقیق کرانے کے بعد ان افسروں کا تبادلہ کر دیا۔ اور شیخ عطا محمد با عزت بری ہوئے۔ ابتلا کے اس دور میں اقبال نے ایک نظم (برگِ گل) لکھ کر خواجہ حسن نظامی کے پاس بھیجی کہ خواجہ نظام الدین اولیاء کے مزار پر پڑھی جائے۔ چنانچہ یہ نظم مزار پر پڑھی گئی اور اس کا یہ شعر علیحدہ تحریر کرا کے مزار کے دروازے پر لٹکا دیا گیا:

ہند کا داتا ہے تو، تیرا بڑا دربار ہے
کچھ ملے مجھ کو بھی اس دربار گوہر بار سے

اقبال اگست ۱۹۰۴ء میں کچھ مدت کے لیے شیخ عطا محمد کے پاس ایبٹ آباد بھی گئے۔ وہاں احباب کے اصرار پر ایک لیکچر قومی زندگی پر دیا۔ بانگِ درا کی نظم ''ابر'' قیامِ ایبٹ آباد کے دوران تحریر کی گئی۔ مراجعت انگلستان سے قبل ان کا بھاٹی دروازے میں قیام تقریباً پانچ ساڑھے پانچ سال تک رہا، لیکن اس عرصے میں بیوی بچوں کو اپنے ساتھ نہ رکھا۔ وہ بھاٹی دروازے والے مکان میں اکیلے رہتے تھے۔ علی بخش ان کا کھانا پکاتا اور وہی ان کی خدمت کرتا تھا۔

لاہور میں ان دنوں دو تین اردو اخبار تھے اخبارِ عام، وطن اور پیسہ اخبار لیکن ان کی اشاعت محدود تھی۔ اپریل ۱۹۰۱ء میں شیخ عبدالقادر نے مشہور ادبی ماہنامہ مخزن جاری کیا۔ اسی سال فوق نے ہفتہ وار اخبار پنجۂ فولاد نکالا اور اس کے بند ہونے پر ۱۹۰۶ء میں ماہنامہ کشمیری میگزین جاری کیا، جو ۱۹۱۲ء میں ہفتہ وار اخبار کشمیری کی صورت اختیار کر گیا۔ فوق کی زیرِ ادارت کچھ مدت اخبار کوہ نور، رسالہ طریقت اور نظام وغیرہ بھی شائع ہوئے۔ اقبال کی اکثر نظمیں اور مضامین مخزن کی زینت بنتے تھے۔ ان کی نظم ''ہمالہ'' دراصل مخزن کے پہلے شمارے میں شائع ہوئی۔ اسی طرح پیسہ اخبار کے علاوہ فوق کے

اخبار کے صفحات بھی کلام اقبال کی نشر و اشاعت کے لیے وقف تھے۔ ان کی نظموں میں مناظر فطرت حسن و جمال اور وطنی قومیت کے موضوعات کو خصوصی اہمیت حاصل تھی۔ مزاج میں اضطراب تھا۔ جو بات بھی ان کی دلچسپی کا باعث بنتی، اس پر شعر کہہ لیتے تھے، مگر کلام میں بحیثیت مجموعی افکار کی وسعت، گہرائی اور تنوع موجود تھا۔

اقبال اپنے دور کے سیاسی حالات سے بھی لاتعلق نہ تھے۔ ۱۹۱۱ء میں شاہ جارج پنجم کے دہلی آنے پر تقسیم بنگال کی تنسیخ ہوئی اور کلکتے کی بجائے دہلی دارالحکومت بنایا گیا۔ اس موقع پر اقبال نے لکھا:

مندمل، زخم دلِ بنگال، آخر ہو گیا
وہ جو تھی پہلے تمیزِ کافر و مومن گئی
تاجِ شاہی یعنی کلکتہ سے دہلی آ گیا
مل گئی بابو کو دھوتی اور پگڑی چھن گئی

اقبال نوجوان تھے اور ان کا تعلق نئے تعلیم یافتہ طبقے سے تھا۔ اس لیے معاصر وطنی قومیت کی زد میں بہ گئے۔

اقبال وہ پہلے شاعر تھے جنہوں نے ہندوستان میں وطنیت کے جذبے کو فروغ دیا۔ خلیفہ عبدالحکیم تحریر کرتے ہیں:

چونکہ ہندو قوم کا وطن اور اس کا مذہب گونا گونی کے باوجود باہم وابستہ ہیں اس لیے وطن پرستی کی تحریک ہندوؤں میں مسلمانوں سے قبل پیدا ہوئی۔ لیکن ہندو قوم کوئی ایسا شاعر پیدا نہ کر سکی جو اس کے اس جذبے کو ابھار سکے اور اس کے قلوب کو گرما سکے۔ ہندو قوم کے پاس وطنیت کا کوئی ترانہ موجود نہ تھا۔ اقبال نے جب اپنے شاعرانہ کمال کو وطنیت کے لیے وقف کیا تو مسلمانوں کے علاوہ بلکہ ان سے زیادہ ہندو اس سے متاثر ہوئے ؎

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

ملک کے طول و عرض میں گونجنے لگا۔ بعض ہندو مدارس میں مدرسہ شروع ہونے سے قبل تمام طالب علم اس کو ایک کورس میں گاتے تھے۔

اسی دور میں اقبال نے سنسکرت سے شناسائی پیدا کی۔ اس بارے میں مخزن میں شائع شدہ نظم ''آفتاب'' کے ساتھ اقبال کا تعارفی نوٹ ملاحظہ ہو۔ روحانیتِ ہند نے جو برگزیدہ

ہستیاں پیدا کیں، اقبال نے انہیں خلوص اور فراخ دلی سے خراج تحسین ادا کیا۔ پنجاب کے معروف ہندو صوفی سوامی رام تیرتھ، اقبال کے ہم عصر تھے اور اقبال کے ان سے گہرے مراسم تھے۔ اس لیے ان کی وفات پر اقبال نے نہایت اچھے اشعار کہے، جو بانگِ درا کی زینت ہیں۔ ان کے نزدیک دوسری ملتوں کے مذہبی پیشواؤں کی تذلیل کرنا یا تعصب کی بنا پر ان کے مذہبی اور تمدنی کارہائے نمایاں کی تعریف نہ کرنا ایک اخلاقی جرم تھا جو بلند پایہ شخصیتوں کو زیب نہ دیتا تھا۔

اقبال کی اس دور کی شاعری میں بہت کچھ تھا، عشق مجازی کی گونج تھی، روایتی تصوف تھا، مناظرِ فطرت کی عکاسی تھی، بچوں کے لیے نظمیں تھیں، مغربی شاعری کے آزاد تراجم تھے، ہنگامہ کائنات، حسن و جمال اور وطنی قومیت کے احساسات تھے اور اسلامیات کا عنصر بھی موجود تھا مگر سب کچھ وسیع المشربی کے ہمہ اوست میں غرق تھا:

میں خود بھی نہیں اپنی حقیقت کا شناسا
گہرا ہے میرے بحرِ خیالات کا پانی

اہل زبان نے اقبال کی زبان اور فن پر اعتراضات اٹھائے تھے۔ اقبال نے جواب میں ''اردو زبان پنجاب میں'' کے زیر عنوان ایک مضمون تحریر کیا جو مخزن میں شائع ہوا۔ اس جوابی مضمون کے کچھ حصے ذکرِ اقبال میں دیئے گئے ہیں۔ سالک کا تجزیہ ہے کہ گو ابھی ان کی عمر پچیس اور تیس سال کے درمیان تھی، وہ علومِ مغربی کا بحر بے پایاں ہونے کے باوجود فارسی اور اردو شاعری اور ان دونوں زبانوں کے غوامض کے ماہر تھے۔

لاہور میں اقبال کا حلقۂ احباب خاصا وسیع ہو گیا تھا۔ محمد دین تاثیر کے بیان کے مطابق ابتدائی دور کے دوستوں، غلام بھیک نیرنگ، میر اعجاز حسین، سر عبدالقادر وغیرہ کے علاوہ جسٹس شاہ دین اور میاں شاہ نواز بھی ان کے دوست بن گئے تھے۔ اس حلقے میں میاں فضل حسین، سر محمد شفیع، چوہدری سر شہاب الدین، میاں احمد یار دولتانہ، سوامی رام تیرتھ، شیو نرائن شمیم، فقیر سید افتخار الدین، فقیر سید نجم الدین، خواجہ عبدالصمد ککڑ و رئیس بارہ مولا، میاں نظام الدین بارود خانہ والے، خواجہ حسن نظامی اور مولانا غلام قادر گرامی شامل تھے۔

کشمیری مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے بنائی جانے والی انجمن کشمیری مسلمانان سے وابستگی کے سبب اقبال کا تعارف لاہور کی کشمیری برادری کے معززین سے ہوا۔ اقبال ۱۸۹۶ء

ہی سے اس انجمن کی کارروائیوں میں حصہ لینے لگے تھے اوراس کے اجلاسوں میں اشعار پڑھتے تھے۔ اقبال اس انجمن کے سیکرٹری بنے اور انگلستان سے واپسی پر جنرل سیکرٹری بنا دیے گئے۔ آپ کشمیریوں کی فلاح و بہبود کے لیے انجمن کی کارروائیوں میں سرگرم حصہ لیتے رہے، بالآخر اسی انجمن کی بنیادوں پر آل انڈیا مسلم کشمیری کانفرنس لاہور عالم وجود میں آئی۔ بہرحال 1918ء میں جب اقبال نے محسوس کیا کہ مسلمان عالمی اخوت کے نصب العین کو پیچھے دھکیل کر برادریوں کے فریب میں مبتلا ہو گئے ہیں اوران کی اس فریب خوردگی سے ملّی سیاست بری طرح متاثر ہو رہی ہے تو انہوں نے کانفرنس سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔

اقبال ۱۲ نومبر ۱۸۹۹ء کو انجمنِ حمایتِ اسلام کی مجلسِ منتظمہ کے رکن منتخب کیے گئے اور یوں ان کے انجمن کے ساتھ تعلقات کی، جو انہوں نے آخری دم تک قائم رکھے، ابتدا ہوئی۔

انجمنِ حمایتِ اسلام نے یتامیٰ کے لیے مردانہ، زنانہ دارالشفقت، دارالاطفال اور دارالامان بھی جاری کیے اور پیشہ ورانہ تربیت کا مرکز، کتب خانہ، چھاپہ خانہ وغیرہ کے قیام کا اہتمام بھی کیا۔ انجمن ملّی چندہ کے ذریعے چلتی تھی۔ اس لیے اسے چندہ جمع کرنے کے لیے وسائل کی تلاش رہتی تھی۔ سالانہ اجلاسوں کا اہتمام بھی چندہ کی فراہمی کا ایک ذریعہ تھا۔ اس زمانے کے جلسوں میں شریک ہونے والی اہم شخصیات میں سے کچھ یہ تھیں: حالی، شبلی، اکبرالہ آبادی، سیماب اکبرآبادی، سائل دہلوی، ارشد گورگانی، خوشی محمد ناظر، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا ابوالکلام آزاد، گرامی، خواجہ حسن نظامی، مولانا عبداللہ ٹونکی، سرعبدالقادر، سرفضل حسین، سرمحمد شفیع، نواب ذوالفقار علی خان، مولانا سلیمان پھلواروی، مولانا اصغر علی روحی، مولانا ابراہیم میر سیالکوٹی، مولانا ثناء اللہ، مولانا نذیر احمد دہلوی وغیرہ۔

اقبال نے پہلی مرتبہ انجمن کے اسٹیج پر ۲۴ فروری ۱۹۰۰ء کے سالانہ جلسے میں اپنی نظم ''نالہ یتیم'' پڑھی۔ صدارت کے فرائض شمس العلماء مولانا نذیر احمد انجام دے رہے تھے۔ اقبال نے اس سوز وگداز سے یتیموں کی بے کسی کا نقشہ کھینچا، کہ تمام آنکھیں اشکبار ہوگئیں۔ اس کے بعد جب یتیم کو دربار نبویؐ میں لے گئے، تو لوگوں کی چیخیں نکل گئیں۔ پھر جب رسالت مآبؐ نے یتیم کی معرفت امت کو ان کی امداد کا پیغام دیا تو لوگوں نے جیبیں الٹ دیں۔ ان کی آواز کی ساحری نے ہُو کا عالم طاری کر دیا تھا۔

اس موقع پر نظم کی مطبوعہ کاپیاں جن کی تعداد کئی صد تھی، فروخت ہوئیں۔ قیمت فی جلد چار

روپے تھی۔ تمام کاپیاں فروخت ہونے کے باوجود مانگ بدستور رہی۔ چنانچہ بعض حضرات نے خرید کردہ جلدیں اس شرط پر انجمن کو مکرر عطیہ میں دے دیں کہ کوئی جلد پچاس روپے سے کم فروخت نہ ہو۔ چند لمحوں بعد وہ بھی بک گئیں۔ اقبال کے والد نے جو اس وقت گیلری میں بیٹھے تھے، سولہ روپے میں ایک جلد خریدی۔ نظم کے خاتمے پر صاحب صدر نے کہا کہ میں نے اپنے کانوں سے انیسؔ و دبیرؔ کے مرثیے سنے مگر جس پائے کی نظم آج سننے میں آئی اور جو اثر اس نے میرے دل پر کیا، وہ اس سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ لوگوں نے اقبال کو مجبور کر کے نظم دوبارہ پڑھوائی۔

اس کے بعد اقبال کی نظمیں انجمن کے سالانہ جلسوں کی ایک امتیازی خصوصیت بن گئیں۔ چنانچہ ۱۹۰۱ء میں انجمن کے اجلاس میں اقبال نے اپنی نظم ''ایک یتیم کا خطاب ہلال عید سے'' پڑھی۔ ۱۹۰۲ء کے اجلاس میں ''خیر مقدم''، ''دین و دنیا'' اور ''اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب کے مسلمانوں سے'' پڑھیں۔ ۱۹۰۳ء کے اجلاس میں ''فریاد امت'' پڑھی۔ اس موقع پر سر عبدالقادر، سر محمد شفیع، سر فضل حسین، نواب ذوالفقار علی خان، شاہ سلیمان پھلواروی، عبداللہ ٹونکی، نثار اللہ، خوشی محمد ناظر اور ارشد گورگانی ایسی ہستیاں موجود تھیں۔ یہ نظم لوگوں کے اصرار پر غالباً ترنم سے پڑھی گئی۔ کیونکہ اس اجلاس کی روداد میں درج ہے کہ قدرت نے اقبال کو گلا بھی عطا کیا ہے اور ایسی بلند، شیریں اور پُر درد آواز کی نعمت مرحمت کی ہے جو انہی کا حصہ ہے نظم کے اختتام پر خواجہ عبدالصمد ککڑو نے اقبال کو ایک نقرئی تمغہ پہنایا جو وہ کشمیر سے بنوا کر لائے تھے۔

۱۹۰۴ء کے اجلاس میں انہوں نے نظم ''تصویر درد'' پڑھی۔ اس موقع پر دیگر شخصیات کے علاوہ حالی، ارشد گورگانی، سر محمد شفیع، سر عبدالقادر، سر فضل حسین، مولانا ابوالکلام آزاد اور خواجہ حسن نظامی موجود تھے۔ نظم ترنم سے پڑھی گئی اور نہایت توجہ سے سنی گئی۔ ایک شعر سے متاثر ہو کر حالی نے بے اختیار دس روپے کا نوٹ پیش کیا جو انجمن کے چندہ میں جمع ہو گیا۔ نظم کے اختتام پر خواجہ حسن نظامی اس قدر متاثر ہوئے کہ اپنا عمامہ اتار کر اقبال کے سر پر رکھ دیا۔ میاں بشیر احمد پر جو اس اجلاس میں موجود تھے، بیان کرتے ہیں:

ایک حسین نوجوان ناک پکڑ عینک لگائے، شلوار اور چاندنی جوتے پہنے، سر گریبان کا بٹن کُھلا، اسٹیج پر کھڑا خوش الحانی سے ایک مخصوص لے میں پڑھ رہا تھا، یہاں تک کہ ایک ایک شعر بکنے لگا۔ اقبال اس وقت گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفے کے اسسٹنٹ پروفیسر تھے۔ ایک نوجوان نے

بڑھ کر شاید پندرہ روپے میں ایک شعر خرید لیا۔ معلوم ہوا کہ یہ اقبال کے گورنمنٹ کالج کا ایک ہندو شاگرد ہے۔ یہ قیمتیں سب انجمنِ حمایتِ اسلام کے چندہ میں ادا ہوتی تھیں۔

اس اجلاس کے دوسرے روز کی نشست میں حالی کی پیرانہ سالی کے باعث اُن کا کلام سنانے کے لئے اقبال سٹیج پر آئے اور حالی کی نظم سنانے سے قبل ایک فی البدیہہ رباعی نہایت خوش الحانی سے پیش کی:

مشہور زمانے میں ہے نامِ حالی
معمور مے حق سے ہے جامِ حالی
میں کشورِ شعر کا نبی ہوں گویا
نازل ہے مرے لب پہ کلامِ حالی

اس کے بعد انہوں نے اپنی دلکش اور شیریں آواز میں حالی کی پوری نظم ''مادرِ پنجابِ انجمن'' حاضرین کو سنائی۔

اس عہد میں اقبال نے وطنی قومیّت اور وسیع المشربی کا حامی ہوتے ہوئے اپنے موضوعات میں اسلام کا عنصر شامل کیا۔ اس کا سبب اُس زمانے کے حالات اور عالم اسلام کی صورت حال تھی۔ عالم اسلام یورپ کی سازشوں کا شکار اور اپنے عمومی انحطاط سے گزر رہا تھا۔ روس اور یورپ کی نوآبادیاتی طاقتوں کی استعماری توسیع کے سبب دنیائے اسلام کے مختلف علاقوں پر ان کا قبضہ ہو گیا تھا۔ مسلمانان وسطی ایشیا، ہندوستان، ملایا، جزائر شرق الہند، چین اور شمالی افریقہ نے ان کا مقابلہ تو کیا مگر ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کمزور مسلم سلطنتِ عثمانیہ کے مقابلے میں استعمار پرست روس اور یورپی طاقتوں کے اقتدار کے زیر اثر دنیائے اسلام کا اخلاقی، سیاسی اور معاشی زوال انتہا تک پہنچ گیا۔ اس عمومی انحطاط کے باعث عرب، شمالی افریقہ، وسطی ایشیا اور ہندوستان میں ''وہابی'' قسم کی کئی اصلاحی تحریکیں وجود میں آئیں۔ جن کا مقصد عالمِ اسلام میں ان تمام خرابیوں کی بیخ کنی تھا جو مسلمانوں کے زوال کا سبب تھیں۔

مغرب سے براہِ راست تعلق کے باعث نئے نظریات مثلاً دستور پسندی، سیکولر ازم، نیشنلزم وغیرہ دنیائے اسلام میں در آئے۔ ''وہابیت'' جیسی تحریکوں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں وسیع النظری یا لبرل ازم کی تحریک بھی عالم وجود میں آئی۔ یہاں تک کہ گمان ہونے لگا کہ مصلحین کے دو گروہ یعنی قدامت پسند اور اعتدال پسند ایک دوسرے کے خلاف ہمیشہ صف آرا

ہی رہیں گے۔ جدید اسلام میں قدامت پسندی اور اعتدال پسندی کے ان دو بظاہر مخالفانہ رجحانات کے درمیان مصالحت کرانے کے بارے میں عموماً جمال الدین افغانی (۱۸۳۸ء تا ۱۸۹۷ئ) کا نام لیا جاتا ہے۔ انہوں نے یورپ کی ترقی کی تکنیک کو سمجھنے پر زور دیا اور مسلمانوں کو مغربی طاقتوں کے استعمار کا مقابلہ کرنے کے لیے ان کی قوت کے اصل راز یعنی سائنس اور ٹکنالوجی اور تنظیم کو اپنانے کی تلقین کی۔

اس زمانے میں دنیائے اسلام کسمپرسی کی حالت میں تھی۔ سلطنتِ عثمانیہ محض نام کی اسلامی سلطنت رہ گئی تھی۔ مشرقی یورپ، تیونس، جبل الطارق و مصر، وسطی ایشیا کی مسلم ریاستوں، شمالی اور جنوب مغربی چین، مراکش، ایران اور جزائرِ شرق الہند میں مسلمانوں کی حالت قابلِ رحم تھی۔ برصغیر ہند میں بھی ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد اسلام کے جھنڈے سرنگوں ہو چکے تھے۔ ملایا پر انگریز قابض تھے اور افغانستان کے خارجی امور کا کنٹرول بھی ۱۸۷۹ء سے انگریزوں کے ہاتھ میں چلا گیا تھا۔

گو اس بے بسی کے عالم میں مسلمانوں کا مرکز امید سلطنت عثمانیہ تھی۔ لیکن برصغیر کے مخصوص حالات کے سبب سرسید کی خواہش تھی کہ مسلمان نہ صرف سیاسیات ہند سے الگ تھلگ رہیں بلکہ انہیں دنیائے اسلام کی سیاسی کشمکش میں بھی دلچسپی لینے سے باز رکھا جائے۔ اسی خیال کے پیشِ نظر سرسید نے خلافتِ عثمانیہ کی تردید میں چند مضمون بھی تحریر کیے۔

سلطان عبدالحمید کے عہد میں داخلی اعتبار سے سلطنت عثمانیہ مطلق العنانیت اور دستوریت کی کشمکش میں مبتلا تھی۔ ترکی کی تاریخ جدید میں اس دور کو دورِ استبداد کا نام دیا گیا ہے۔ ۱۹۰۸ء میں انور پاشا اور طلعت پاشا کی قیادت میں نوجوان ترکوں کے انقلاب کے سبب دوبارہ دستور کے نفاذ پر مجبور ہوئے مگر ۱۹۰۹ء میں تقابلی انقلاب کی ناکامی پر انہیں معزول کر دیا گیا۔

جمال الدین افغانی عثمانی سلطان خلیفہ کی سربراہی میں جمہوریت کی بنیادوں پر ایک دستوری وفاق کی صورت میں ممالک اسلامیہ کے اتحاد کے داعی تھے۔ اس لحاظ سے انہیں تحریک اتحادِ اسلام (یا پین اسلام ازم) کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ انہوں نے عالم اسلام کے اتحاد و احیاء اور انگریزوں کی قبضہ کے خاتمے کے لئے وسیع سفر کئے۔ اپنے اسی مشن کے سبب انہیں کثیر ابتلاؤں کا سامنا بھی کرنا پڑا مگر مسلم حکمرانوں کی مفاد پرستی کے سبب ان کی جدوجہد بارور نہ ہو سکی حتیٰ کہ سلطان عبدالحمید نے بھی انہیں اپنی اغراض کے حصول کے لیے استعمال کرنا چاہا لیکن اُسے

کامیابی نہ ہوئی، کیوں کہ جمال الدین افغانی ترکی میں بھی دستوری تحریک کے حامی تھے۔ ۱۸۹۷ء میں ان کی وفات استنبول میں ہوئی۔ بعض محققین کی رائے میں انہیں سلطان عبدالحمید کی ہدایت پر زہر دیا گیا تھا۔

ای جی براؤن کے نزدیک اس عظیم ہستی نے بیس سال کی مدت میں عالم اسلام کے حالات کو اپنی کسی بھی ہم عصر شخصیت سے زیادہ متاثر کیا۔ وہ مصر کی قومی آزادی کی تحریک کے اصل محرّک تھے۔ ایران میں دستوری تحریک انہی کی ایما پر منظم ہوئی۔ نیز ترکی کے دستور پسندوں کو بھی ان کی حمایت حاصل تھی۔ ان سب باتوں کے ساتھ وہ مسلم ریاستوں کے اتحاد کے داعی تھے تاکہ مسلمانانِ عالم کو روس اور یورپ کے استعمار و استحصال سے بچایا جا سکے۔ انہوں نے مسلمانوں میں سنی اور شیعہ تفرقہ مٹانے کے لیے شاہِ ایران کو رضامند کیا کہ عثمانی سلطان کے خلافت کے دعوے کو تسلیم کر لیا جائے اور عثمانی سلطان کو مشورہ دیا کہ وہ شاہِ ایران کو بطور سربراہ مسلمانانِ شیعہ قبول کر لیں۔

جمال الدین افغانی کی تحریک کے دو نمایاں پہلو تھے۔ سلاطین کی مطلق العنانیت کی بجائے دستوری حکومت کا نفاذ و قانون کی بالا دستی اور عثمانی سلطان خلیفہ کی آئینی سربراہی میں آزاد مسلم ریاستوں کے وفاق کا قیام۔ لیکن بدقسمتی سے زوال پذیر مسلم سلطنتیں جمال الدین افغانی کے افکار و نظریات قبول کرنے کے لیے ابھی تیار نہ تھیں۔ جبکہ یورپی پریس نے جمال الدین افغانی اور تحریکِ اتحادِ اسلام کے خلاف زہر اگلنا شروع کر دیا کہ یہ تحریک روس اور یورپ کی عیسائی اقوام کے خلاف جارحانہ اتحاد ہے۔ جمال الدین افغانی کے ہندوستان میں بھی اثرات مرتب ہوئے۔ سید امیر علی نے جمال الدین افغانی سے متاثر ہو کر خلافت عثمانیہ کی سربراہی میں اتحاد اسلام کی حمایت میں بہت کچھ لکھا۔ البتہ ان کی ان تحریروں سے قبل روس اور ایران کے شیعہ مجتہدین نے اس سیاسی ضرورت پر کئی فتوے دے رکھے تھے۔ جمال الدین افغانی نے ہندوستان میں قیام کے دوران سرسیّد کے مذہبی نظریات کی تردید میں اپنا رسالہ ردِّ نیچریہ تحریر کیا اور بعد میں پیرس سے اپنے ہفت روزہ میں ان کے خلاف لکھتے رہے۔

مولانا شبلی نعمانی (۱۸۵۷ء تا ۱۹۱۴ئ) نے تحریک اتحاد اسلام میں گہری دلچسپی لی۔ وہ سولہ سال تک علی گڑھ کالج میں سرسید کے ساتھ کام کرتے رہے اور سرسید کے زیر اثر سلطان عبدالحمید کے دعویٰ خلافت اسلامیہ کی تردید میں ایک مضمون بھی تحریر کیا، لیکن بقول ان کے یہ

مضمون انہوں نے اپنی مرضی کے خلاف لکھا تھا۔ دراصل وہ سرسیّد کے مذہبی اور سیاسی نظریات کے مخالف تھے۔ انہوں نے بالآخر ۱۹۰۵ء میں علی گڑھ کالج چھوڑ کر لکھنؤ میں ندوۃ العلماء سے تعلق استوار کرلیا۔ ۱۸۷۷ء میں، جب ترک روسیوں کے خلاف جنگ لڑ رہے تھے اور انہیں انگریزوں کی حمایت حاصل تھی تو شبلی نے معذور ترک عسکریوں کے لیے چندہ جمع کرنے کی مہم شروع کی۔ یہ چندہ بعد میں ترکی بھجوادیا گیا۔ ۱۸۹۲ء میں شبلی استنبول گئے اور تین ماہ تک وہاں ٹھہرے۔ سلطان عبدالحمید نے انہیں مجیدی تمغہ سے نوازا، لیکن بعد میں جب انگریزوں کے ترکوں کے ساتھ تعلقات خراب ہو گئے تو حکومت ہند نے شبلی کو ہندوستان میں سلطان عبدالحمید کا ایجنٹ سمجھ کر انہیں تمغہ پہننے سے روک دیا۔ وہ تمغہ بھی آخر کار چوری ہو گیا۔ شبلی نے اپنے سفرِ ترکی کی روداد قلم بند کی، ترکوں کے متعلق بہت کچھ لکھا نیز اپنی نظموں میں بھی ان کی مصیبتوں کا ذکر بار بار کیا۔

اقبال کو حصول علم کے لئے یورپ جانے کی تحریک ۱۹۰۴ء میں شیخ عبدالقادر کے جانے سے ہوئی۔ اقبال کا سفر یورپ ان کی اپنی بچت اور شیخ عطا محمد کی امداد سے ممکن ہوا۔ انگلستان جانے سے کچھ عرصہ قبل اقبال، مرزا جلال الدین کے پاس گئے۔ یہ دونوں کی پہلی ملاقات تھی، دوستانہ مراسم اقبال کی انگلستان سے واپسی کے بعد قائم ہوئے۔ اقبال انگلستان جانے سے قبل ہمیشہ قومی لباس زیب تن کرتے تھے۔ لیکن یورپ میں پہننے کے لیے انہوں نے خاص طور پر انگریزی لباس یعنی سوٹ سلوائے اور جب لندن پہنچے تو سوٹ ہی زیب تن کر رکھا تھا۔ علی بخش نے ایک بار راقم کو بتایا تھا کہ اقبال نے فیلٹ ہیٹ صرف یورپ میں طالب علمی کے زمانے میں پہنا۔ بعد میں اسے کبھی استعمال نہ کیا۔

اقبال کے لاہور سے لندن تک سفر کی تفصیل ان کی اپنی تحریروں اور احباب کے مضامین میں ملتی ہے۔ وہ یکم ستمبر ۱۹۰۵ء کی رات کو لاہور سے دہلی روانہ ہوئے۔ احباب میں سے نیرنگ اور شیخ محمد اکرام انہیں رخصت کرنے کے لیے دہلی تک ساتھ گئے۔ گاڑی ۲ ستمبر ۱۹۰۵ء کی صبح دہلی پہنچی۔ وہاں پہنچ کر مزارِ نظام الدین اولیاء پر حاضر ہوئے۔ اقبال نے عالم تنہائی میں تربت کے سرہانے بیٹھ کر اپنی نظم ''التجائے مسافر'' پڑھی۔

اقبال میرزا اسد اللہ خان غالب کی تربت پر حاضر ہوئے۔ نیرنگ، تربت کے سرہانے لوح تربت پر ہاتھ رکھے ہوئے تھے، ان کے دائیں اقبال عالمِ محویت میں بیٹھے اور

باقی لوگ تربت کے اردگرد حلقہ باندھے کھڑے تھے۔ دوپہر دو بجے کا وقت، تیز دھوپ اور ہوا میں گھمس، لیکن کسی کو گرمی کا ذرا بھی احساس نہ ہوا۔ قوال زادے کو عجیب بروقت سوجھی کہ ان سے اجازت لے کر غزل گانے لگا:

دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

ذیل کے دو شعروں پر عجیب کیفیت رہی:

اڑتی پھرے ہے خاک مری کوئے یار میں
بارے اب اے ہوا ہوسِ بال و پر گئی
وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اٹھیے! بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

غزل کے اختتام پر جب کچھ لمحوں بعد ذرا ہوش بحال ہوئے اور سب چلنے کا سوچنے لگے۔ اقبال نے جوشِ محویت میں غالب کی تربت کو بوسہ دیا اور شہر کو روانہ ہوئے۔ اقبال نے رات منشی نذر محمد کے ہاں گزاری۔

اقبال خود تحریر کرتے ہیں:

۳ ستمبر کی صبح کو میر نیرنگ اور شیخ محمد اکرام اور باقی دوستوں سے دہلی میں رخصت ہو کر بمبئی کو روانہ ہوا اور ۴ کو خدا خدا کر کے اپنے سفر کی پہلی منزل پر پہنچا۔ یہاں انگلش ہوٹل کا منتظم ایک پارسی پیر مرد ہے جس کی شکل سے اس قدر تقدس ظاہر ہوتا ہے کہ دیکھنے والے کو ایران کے پرانے خشور (نبی) یاد آ جاتے ہیں۔ دکانداری نے اس کو ایسا عجز سکھا دیا ہے کہ ہمارے بعض علما میں باوجود عبادت اور مرشدِ کامل کی صحبت میں بیٹھنے کے بھی ویسا انکسار پیدا نہیں ہوتا۔ اس ہوٹل میں یونانی اور چینی لوگوں کے احوال جان کر اپنی قوم کے احوال بد پر بہت دکھ ہوا کیونکہ ہم متفق ہو کر کام کرنا نہیں جانتے۔ ہمارے ملک میں محبت اور مروت کی بو باقی نہیں رہی۔ کاش خلیج بنگالہ کی موجیں ہمیں غرق کر ڈالیں۔ ایک شب کھانے کے کمرے میں ایک ترک سے ملاقات ہوئی۔ یہ نوجوان ترک ینگ پارٹی سے تعلق رکھتا ہے اور سلطان عبدالحمید کا سخت مخالف ہے۔ باتوں باتوں میں مجھے معلوم ہوا کہ شاعر بھی ہے۔ میں نے درخواست کی کہ اپنے شعر سناؤ کہنے لگا، میں کمال بے (ترکی کا سب سے مشہور زندہ شاعر) کا شاگرد ہوں۔ کمال بے کے جو اشعار اس نے

سنائے وہ سب کے سب نہایت عمدہ تھے لیکن جو شعرا اپنے سنائے وہ سب کے سب سلطان کی ہجو میں تھے۔ ایک شام ہم بمبئی دیکھنے گئے یہاں پارسیوں کی آبادی اسّی نوے ہزار کے قریب ہے، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام شہر ہی پارسیوں کا ہے۔ اس قوم کی صلاحیت نہایت قابل تعریف ہے اور ان کی دولت وعظمت بے اندازہ۔ مگر اس قوم کے لیے کسی اچھے فیوچر کی پیش گوئی نہیں کر سکتا۔ یہ لوگ عام طور پر سب کے سب دولت کمانے کی فکر میں ہیں اور کسی چیز پر اقتصادی پہلو کے سوا کسی اور پہلو سے نگاہ ہی نہیں ڈال سکتے۔ اس شہر کی تعلیمی حالت عام طور پر نہایت عمدہ معلوم ہوتی ہے۔ ہمارے ہوٹل کا حجام ہندوستان کی تاریخ کے بڑے بڑے واقعات جانتا تھا۔ گجراتی کا اخبار ہر روز پڑھتا تھا اور جاپان اور روس کی لڑائی سے پورا باخبر تھا۔ نوروز جی دادا بھائی کا نام بڑی عزت سے لیتا تھا...... ہوٹل کے نیچے مسلمان دکاندار ہیں۔ میں نے دیکھا ہر روز گجراتی اخبار پڑھتے تھے۔

اقبال تین روز بمبئی میں ٹھہرنے کے بعد ۷ ستمبر ۱۹۰۵ء کو دو بجے دوپہر جہاز پر سوار ہوئے۔ اقبال لکھتے ہیں:

فرانسیسی قوم کا مذاق اس جہاز کی عمدگی اور نفاست سے ظاہر ہے...... ملازموں میں مصر کے چند حبشی بھی ہیں جو مسلمان ہیں اور عربی بولتے ہیں۔ جہاز کے فرانسیسی افسر نہایت خوش خلق ہیں اور ان کے تکلفات کو دیکھ کر لکھنؤ یاد آ جاتا ہے۔ سمندر میں اتنی اونچی اونچی موجیں اٹھتی تھیں کہ خدا کی پناہ! دیکھ کر دہشت آتی تھی۔ جہاز کے سفر میں دل پر سب سے زیادہ اثر ڈالنے والی چیز سمندر کا نظارہ ہے۔ باری تعالیٰ کی قوتِ لامتناہی کا جو اثر سمندر دیکھ کر ہوتا ہے، شاید ہی کسی اور چیز سے ہوتا ہو۔ حج بیت اللہ میں جو تمدنی اور روحانی فوائد ہیں، ان سے قطع نظر کر کے ایک بڑا اخلاقی فائدہ سمندر کی ہیبت ناک موجوں اور اس کی خوفناک وسعت کا دیکھنا ہے جس سے مغرور انسان کو اپنے ہیچ محض ہونے کا پورا پورا یقین ہو جاتا ہے۔ آج ۱۲ ستمبر کی صبح ہے۔ صبح کے وقت طلوعِ آفتاب کا نظارہ ایک دردمند دل کے لیے تلاوت کا حکم رکھتا ہے۔ اب ساحل قریب آتا جاتا ہے اور چند گھنٹوں میں ہمارا جہاز عدن جا پہنچے گا۔ ساحلِ عرب کے تصور نے جو ذوق وشوق اس وقت دل میں پیدا کر دیا ہے، اس کی داستان کیا عرض کروں۔ بس دل یہی چاہتا ہے کہ زیارت سے اپنی آنکھوں کو منور کروں:

اللہ رے خاکِ پاکِ مدینہ کی آبرو
خورشید بھی گیا تو ادھر سر کے بل گیا

اے عرب کی مقدس سرزمین! تجھ کو مبارک ہو! تو ایک پتھر تھی جس کو دنیا کے معماروں نے رد کر دیا تھا مگر ایک یتیمؐ بچے نے خدا جانے تجھ پر کیا افسوں پڑھ دیا کہ موجودہ دنیا کی تہذیب وتمدن کی بنیاد تجھ پر رکھی گئی ...... اے پاک سرزمین! ...... تیرے ریگستانوں نے ہزاروں مقدس نقشِ قدم دیکھے ہیں اور تیری کھجوروں کے سائے نے ہزاروں ولیوں اور سلیمانوں کو تمازتِ آفتاب سے [illegible]ط رکھا ہے۔ کاش میرے بدکردار جسم کی خاک تیرے ریت کے ذروں میں مل کر تیرے بیابانوں میں اڑتی پھرے اور یہی آوارگی میری زندگی کے تاریک دنوں کا کفّارہ ہو۔ کاش! میں تیرے صحراؤں میں لٹ جاؤں اور دنیا کے تمام سامانوں سے آزاد ہو کر تیری تیز دھوپ میں جلتا ہوا اور پاؤں کے آبلوں کی پروانہ کرتا ہوا اس پاک سرزمین میں جا پہنچوں جہاں کی گلیوں میں اذانِ بلال کی عاشقانہ آواز گونجتی تھی۔

اقبال قرنطینہ کے سبب اور گرمی کے باعث عدن کی سیر نہ کر سکے اور جہاز ہی میں رہے۔ کچھ گھنٹوں بعد جہاز نے لنگر اٹھایا اور بحر قلزم میں سے گزرتا ہوا سویز پہنچا۔ اقبال تحریر کرتے ہیں:

جب ہم سویز پہنچے تو مسلمان دکانداروں کی ایک کثیر تعداد ہمارے جہاز پر آموجود ہوئی۔ ان میں سے ایک نے میرے سر پر انگریزی ٹوپی دیکھ کر مجھے مسلمان ماننے میں تامل کیا اور مجھ سے کہا کہ تم ہیٹ کیوں پہنتے ہو؟ میں نے اسے جواب دیا کہ ہیٹ پہننے سے کیا اسلام تشریف لے جاتا ہے؟ کہنے لگا کہ اگر مسلمان کی ڈاڑھی منڈی ہو تو اس کو ترکی ٹوپی یعنی طربوش ضرور پہننا چاہیے ورنہ پھر اسلام کی علامت کیا ہوگی۔ خیر آخر یہ شخص میرے اسلام کا قائل ہوا اور چونکہ حافظِ قرآن تھا، اس واسطے میں نے چند آیات قرآن شریف کی پڑھیں تو نہایت خوش ہوا اور میرے ہاتھ چومنے لگا۔ آخر مسلمانوں کے اس گروہ کو چھوڑ کر ہمارا جہاز رخصت ہوا اور آہستہ آہستہ سویز کینال میں جا داخل ہوا۔ یہ کینال جسے ایک فرانسیسی انجنیئر نے تعمیر کیا تھا۔ دنیا کے عجائبات میں سے ایک ہے۔ دنیا کی روحانی زندگی پر مہاتما بدھ نے بھی اس قدر اثر نہیں کیا، جس قدر اس مغربی دماغ نے زمانہ حال کی تجارت پر اثر کیا ہے۔ سیکڑوں آدمی ہر وقت کام کرتے رہتے ہیں جب ٹھیک رہتی ہے اور اس کا ہمیشہ خیال رکھنا پڑتا ہے کہ دونوں جانب سے جو ریگ ہوا سے اڑ کر اس میں گرتی رہتی ہے، اس کا انتظام ہوتا رہے۔ کنارے پر جو مزدور کام کرتے ہیں، بعض نہایت شریر ہوتے ہیں۔ جب ہمارا جہاز آہستہ آہستہ جا رہا تھا اور جہاز کی چند انگریز بیبیاں کھڑی ساحل کی سیر کر رہی تھیں تو ان میں سے ایک مزدور از سرتا پا برہنہ ہو کر ناچنے لگا۔ یہ

بے چاری دوڑ کر اپنے اپنے کمروں میں چلی گئیں۔ پورٹ سعید پہنچ کر پھر مسلمان تاجروں کی دکانیں تختۂ جہاز پر لگ گئیں۔ میں ایک کشتی پر بیٹھ کر مع پارسی ہم سفر کے بندرگاہ کی سیر کو چلا گیا۔ مدرسہ دیکھا، مسجدوں کی سیر کی۔ اسلامی گورنر کا مکان دیکھا۔ موجدِ سویز کینال کا مجسمہ دیکھا۔ جب میں واپس پہنچا تو ایک اور نظارہ دیکھنے میں آیا۔ تختہ جہاز پر تین اطالین عورتیں اور دو مرد وائلن بجا رہے تھے اور خوب رقص و سرود ہو رہا تھا۔ ان عورتوں میں ایک لڑکی جس کی عمر تیرہ چودہ سال کی ہوگی۔ نہایت حسین تھی۔ جب اس نے ایک چھوٹی سی تھالی میں مسافروں سے انعام مانگنا شروع کیا تو وہ تمام اثر زائل ہو گیا، کیونکہ میری نگاہ میں وہ حسن جس پر استغنا کا غازہ نہ ہو بدصورتی سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ بحیرۂ روم کے ابتدائی حصے میں سمندر کا نظارہ بہت دلچسپ تھا، اور ہوا میں ایسا اثر تھا کہ غیر موزوں طبع آدمی بھی موزوں ہو جائے۔ میری طبیعت قدرتاً شعر کی طرف مائل ہو گئی اور میں نے چند اشعار کی غزل لکھی ۶۰ مارسیلز تک پہنچنے میں چھ روز صرف ہوئے۔ ۲۳ کی صبح مارسیلز یعنی فرانس کی ایک مشہور تاریخی بندرگاہ پر پہنچے اور چونکہ ہمیں آٹھ دس گھنٹے کا وقفہ مل گیا تھا، اس واسطے بندرگاہ کی خوب سیر کی۔ مارسیلز کا نوٹر ڈام گرجا نہایت اونچی جگہ پر تعمیر ہوا ہے اور اس کی عمارت کو دیکھ کر دل پر یہ بات منقوش ہو جاتی ہے کہ دنیا میں مذہبی تاثیر ہی حقیقت میں تمام علوم و فنون کی متحرک ہوئی ہے۔ مارسیلز سے گاڑی پر سوار ہوئے اور فرانس کی سیر بھی، حسن رہگزرے کے طریق پر ہو گئی کھیتیاں جو گاڑی کے ادھر ادھر آتی ہیں، ان سے فرانسیسی لوگوں کا نفیس مذاق مترشح ہوتا ہے۔ ایک رات گاڑی میں کٹی اور دوسری شام کو ہم لوگ برٹش چینال کو کراس کر کے ڈوور اور ڈوور سے لندن پہنچے۔ شیخ عبدالقادر کی باریک نگاہ نے باوجود میرے انگریزی لباس کے مجھے دور سے پہچان لیا اور دوڑ کر بغل گیر ہو گئے۔

اقبال ۲۴ ستمبر ۱۹۰۵ء کو لندن پہنچے اور ایک رات شیخ عبدالقادر کے ساتھ گزارنے کے بعد ۲۵ ستمبر کو کیمبرج روانہ ہو گئے۔

باب: ۷

یورپ

اقبال کے قیامِ یورپ کے دوران ان کی تعلیمی سرگرمیوں کے بارے میں تاریخوں کا تعین قدرے مشکل ہے۔ قیام کی کل مدت تقریباً تین سال تھی۔ اقبال ۲۵ ستمبر ۱۹۰۵ء کو کیمبرج پہنچے۔ کیمبرج میں اقبال نے ۱۷- پرتگال پیلس پر سکونت اختیار کی اور ٹرینٹی کالج میں داخلہ لیا۔ کیمبرج یونیورسٹی کا اکادمی سال مائیکلمس ٹرم یعنی یکم اکتوبر سے شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ اقبال کا یونیورسٹی میں رہائشی سال اسی ٹرم سے شروع ہوا۔

مغربی یونیورسٹیوں میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری کی تحصیل کے لیے طریق کار کے مطابق اقبال نے کیمبرج میں رہائش اختیار کرنے کے فوراً بعد اپنے موضوع تحقیق کے متعلق ضروری رجسٹریشن میونخ یونیورسٹی میں کروادی تھی۔ اس ضمن میں وہ خود تحریر کرتے ہیں:

میں نے اپنا مقالہ میونخ یونیورسٹی میں پیش کیا، جس کے ارباب اختیار نے مجھے یونیورسٹی میں قیام کی شرط سے مستثنیٰ کر دیا اور مجھے اپنا مقالہ انگریزی میں لکھنے کی اجازت بھی مرحمت فرمائی۔ جرمن یونیورسٹیاں بالعموم تین سال یا ڈیڑھ سال کے لیے لیکچروں میں حاضری پر اصرار کرتی ہیں۔ حاضری کی مدت کا تعین امیدوار کی اہلیت پر ہوتا ہے اور عام طور پر مقالہ جرمن زبان میں مرتب کرنے پر اصرار کیا جاتا ہے، لیکن مجھے اپنے کیمبرج کے استادوں کی سفارش کی بنا پر اس سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا۔ پی ایچ ڈی کا امتحان زبانی جرمن زبان میں ہوا، جو میں نے دوران قیام میں تھوڑی بہت سیکھ لی تھی۔

بیرسٹری کے امتحانوں کے لیے کسی نہ کسی ''ان'' میں ٹرمیں پوری کرنے کی خاطر اقبال نے چھ نومبر ۱۹۰۵ء کو لنکنز ان میں داخلہ لیا اور کیمبرج سے لندن جا کر ٹرمیں پوری کرنا شروع کر دیں۔ سر عبدالقادر تحریر کرتے ہیں کہ جب اقبال لندن آتے تو بیرسٹری کے لیکچروں اور عشائیوں کے لیے ہم مل کر جاتے۔ اقبال کو بار ایٹ لاء کی ڈگری یکم جولائی ۱۹۰۸ء کو ملی۔ قیاس کیا جا سکتا

ہے کہ انہوں نے امتحانات کے پہلے حصے کی تکمیل کیمبرج میں اپنے قیام کے دوران کر لی ہوگی مگر دوسرے حصے کی تیاری اور تکمیل لندن میں رہائش کے دوران کی ہوگی۔

اقبال نے کیمبرج سے بی اے کی ڈگری بھی لی۔ اقبال نے یونیورسٹی کی اجازت سے یورپی فلسفہ کے مطالعے کے لیے میک ٹیگرٹ، وائیٹ ہیڈ، وارڈ اور شاید براؤن یا نکلسن کے لیکچروں میں شمولیت اختیار کی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ میونخ یونیورسٹی کی شرائط کے پیشِ نظر اس کے ارباب اختیار کے اطمینان کے لیے انہوں نے فلسفے، عربی یا فارسی کے خصوصی امتحان پاس کیے ہوں۔ معاشیات میں ذاتی دلچسپی کے سبب وہ کیمبرج میں اس موضوع پر لیکچر بھی بڑے اہتمام سے سنتے تھے۔ بہر حال ۷ مارچ ۱۹۰۷ء کو انہوں نے اپنا ایک تحقیقی مقالہ فلسفے اور اخلاقیات کے شعبے میں داخل کیا، جس پر انہیں ۱۳ جون ۱۹۰۷ء کو کیمبرج یونیورسٹی کی طرف سے بی اے کی ڈگری ملی۔

اس زمانے میں میک ٹیگرٹ کیمبرج میں کانٹ اور ہیگل کے فلسفے پر لیکچر دیتے تھے اور ان کا تعلق ٹرینٹی کالج سے تھا۔ وارڈ اور وائیٹ ہیڈ بھی میک ٹیگرٹ کی طرح انگلستان کے معروف فلسفی تھے۔ براؤن اور نکلسن فارسی اور عربی زبانوں کے ماہر تھے۔ اور ان کا شمار مستشرقین میں ہوتا تھا۔ بعد میں نکلسن نے اقبال کی تصنیف اسرار خودی کا ترجمہ انگریزی میں کیا۔ میک ٹیگرٹ صوفی منش بزرگ تھے۔ اقبال نہ صرف ان کے لیکچر باقاعدگی سے سنتے تھے بلکہ تصوف کے مسائل پر ان سے طویل بحث و مباحثے بھی کرتے تھے۔ انگلستان سے واپسی کے بعد میک ٹیگرٹ اور نکلسن کے ساتھ ان کی خط و کتابت بھی رہی۔ میک ٹیگرٹ نے جب اسرار خودی کا انگریزی ترجمہ پڑھا تو اقبال سے بذریعہ خط پوچھا کیا آپ نے اپنی پوزیشن تبدیل نہیں کر لی؟ کیونکہ کیمبرج میں قیام کے دوران تو آپ وجودی تصوف کے قائل معلوم ہوتے تھے۔ اقبال نے میک ٹیگرٹ کے فلسفے پر ایک مقالہ بھی تحریر کیا۔

کیمبرج میں رہائش کے سلسلے میں اقبال کا ایک بڑا مسئلہ ذبیحہ گوشت کا انتظام تھا۔ اس معاملے میں آرنلڈ نے ان کی مدد کی۔ اقبال بیان کرتے ہیں:

جب میں انگلستان گیا تو ایک اچھے یہودی کے گھر میں میری رہائش کا انتظام کروا دیا گیا۔ ان لوگوں میں بہت سی خوبیاں تھیں۔ اپنی نماز باقاعدہ پڑھتے تھے۔ لیکن جب مجھے معلوم ہوا کہ ہر اس چیز میں جس کی مجھے ضرورت ہوتی تھی اور جس کو میں ان کے ذریعے منگواتا تھا، یہ لوگ

دکانداروں سے کمیشن لیا کرتے تھے۔ ان کی اسی ایک عادت نے ان کی تمام خوبیوں پر پانی پھیر دیا۔

اسی طرح طہارت کے لیے پانی استعمال کرنے کی خاطر وہ لوٹا بھی اپنے ساتھ رکھتے چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں:

میں جب طالب علمی کے سلسلے میں انگلستان گیا تو میرا لوٹا میرے ساتھ تھا۔ میری مالکہ مکان نے پوچھا تم یہ چیز غسل خانے میں کیوں لے جاتے ہو؟ میں نے کہا، اسلامی طہارت کا ایک قاعدہ یہ ہے کہ قضائے حاجت کے بعد صرف کاغذ یا مٹی کے ڈھیلے کا استعمال کافی نہیں ہے بلکہ پانی سے استنجا کرنا ضروری ہے، چنانچہ اس موضوع پر گفتگو شروع ہوئی، میں نے اس کے سامنے طہارت اور غسل کے اسلامی اصول بیان کیے۔

اقبال نے کیمبرج پہنچتے ہی تحقیق کے کام کا آغاز اتنے اہتمام سے کیا گویا وہ عبادت ہو۔ اس عرصے میں اقبال کبھی کبھی شعر لکھ لیتے جو وہ شیخ عبدالقادر کے لیے لندن لے جاتے۔ اقبال نے تحقیق کے لیے موضوع چونکہ ''ایران میں فلسفۂ مابعد الطبیعیات کا ارتقا'' منتخب کیا تھا، اس لیے ابتدا ہی سے انہیں تصوف کے بارے میں قرآنی شواہد کی ضرورت تھی۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایک خط ۸/ اکتوبر، ۱۹۰۵ء کو خواجہ حسن نظامی کے نام تحریر کیا:

قرآن شریف میں جس قدر آیات صریحاً تصوف کے متعلق ہوں ان کا پتا دیجیے۔ اس بارے میں آپ قاری شاہ سلیمان صاحب یا کسی اور صاحب سے مشورہ کر کے مجھے بہت جلد مفصل جواب دیں۔ اس مضمون کی سخت ضرورت ہے اور یہ گویا آپ کا کام ہے۔۔۔۔ اگر قاری صاحب موصوف کو یہ ثابت کرنا ہو کہ مسئلۂ وحدت الوجود یعنی تصوف کا اصل مسئلہ قرآن کی آیات سے نکلتا ہے تو وہ کون کونسی آیات پیش کر سکتے ہیں اور ان کی کیا تفسیر کرتے ہیں؟ کیا وہ ثابت کر سکتے ہیں کہ تاریخی طور پر اسلام کو تصوف سے تعلق ہے؟ کیا حضرت علی المرتضیٰ کو کوئی خاص پوشیدہ تعلیم دی گئی تھی؟ غرضیکہ اس امر کا جواب معقولی اور منقولی اور تاریخی طور پر مفصل چاہتا ہوں۔ میرے پاس کچھ ذخیرہ اس امر کے متعلق موجود ہے مگر آپ سے اور قاری صاحب سے استصواب ضروری ہے۔

تحقیق کے ساتھ ساتھ قانون کے امتحانات کی تیاری بھی شروع ہوگئی۔

ان دنوں کیمبرج میں حیدرآباد دکن کے سید علی بلگرامی مرہٹی زبان کے استاد تھے۔ آپ معروف تصانیف، تمدن عرب اور تمدن ھند کے تراجم کے سبب مشہور تھے۔ اقبال کے ان

کے ساتھ دوستانہ مراسم تھے بلکہ کیمبرج میں ان کا مکان برصغیر سے آنے والے طالب علموں کی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ اقبال اپنا فارغ وقت بلگرامی اور ان کی ذہین اہلیہ یا اپنے ایک انگریز دوست کے ساتھ گزارتے تھے۔ اس بارے میں اقبال بیان کرتے ہیں:

جب میں کیمبرج میں پڑھتا تھا تو تعطیلات کے زمانے میں کچھ دنوں کے لیے میں اپنے ایک ہم سبق انگریز دوست کے ہمراہ اس کے وطن چلا گیا۔ اس کا گھر سکاٹ لینڈ کے ایک دور افتادہ قصبے میں تھا۔ مجھے وہاں گئے چند روز ہوئے تھے کہ معلوم ہوا کہ ایک مشنری جو ہندوستان سے آئے ہیں آج شام کو قصبے کے اسکول میں لیکچر دیں گے کہ ہندوستان میں عیسائیت کو کس قدر فروغ ہو رہا ہے۔ میں اور میرے میزبان دونوں لیکچر سننے کے لیے پہنچے، سامعین میں عورتیں اور مرد کافی تعداد میں تھے۔ مشنری نے بتایا کہ ہندوستان میں تیس کروڑ انسان آباد ہیں، لیکن ان لوگوں کو انسان کہنا جائز نہیں۔ مشنری نے ہندوستان کی حالت زار کا نقشہ کھینچ کر حاضرین سے چندہ طلب کیا۔ لیکن مشنری کا بیان انتہائی اہانت آمیز تھا۔ جب مشنری کا لیکچر ختم ہو گیا تو میں نے صدر جلسہ کی اجازت سے مشنری کی غلط بیانیوں کا پردہ چاک کیا اور حاضرین کو بتایا کہ ہندوستان مشرقی دنیا کا ایک متمدن و مہذب ملک ہے، جس نے صدیوں تک تہذیب اور علم کی شمع بلند رکھی ہے۔ اگرچہ ہم سیاسی طور پر انگلستان کے غلام ہو گئے ہیں لیکن ہمارا اپنا ادب ہے، اپنا تمدن ہے، اپنی قومی روایات ہیں جو کسی طرح مغربی قوموں کی روایات سے کم شاندار نہیں ہیں۔ مشنری صاحب نے محض آپ کے جذبات کو برانگیختہ کر کے آپ کی جیبیں خالی کرنے کے لیے ہندوستانیوں کی یہ گھناؤنی اور خوفناک تصویر پیش کی ہے...... جونہی میری تقریر ختم ہوئی، جلسے کا رنگ بالکل بدل گیا۔ سب لوگ میرے ہم خیال ہو گئے اور مشنری صاحب کو حد درجہ مایوس ہو کر وہاں سے خالی ہاتھ نکلنا پڑا۔

کیمبرج میں رہائش کے دوران کبھی کبھی اشعار کہنے کے علاوہ اقبال نے ہندوستان میں سودیشی تحریک کے متعلق چند سوالات کا جواب بھی ایک مضمون کی صورت میں مدیر ماہنامہ زمانہ کانپور کو بھیجا، جو زمانہ کے شمارہ اپریل ۱۹۰۶ء میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں اقبال نے تحریر کیا:

سیاسی حقوق کے حصول کی شرط کسی ملک کے افراد کے اغراض کا متحد ہونا ہے۔ اگر اتحادِ اغراض نہ ہو گا تو قومیت پیدا نہ ہو گی۔ آج ہم کو قال کی ضرورت نہیں ہے، خدا کے واسطے حال پیدا کرنے کی کوشش کرو۔ مذہب دنیا میں صلح کے لیے آیا ہے نہ کہ جنگ کی غرض سے۔ اگر اس

تحریک سے ہندو اور مسلمانوں میں اتحادِ اغراض پیدا ہو جائے اور رفتہ رفتہ قوی ہوتا جائے تو سبحان اللہ! اور کیا چاہیے۔

حالات سے ظاہر ہے کہ اقبال جون ۱۹۰۷ء تک کیمبرج میں رہے۔ جب وہ لندن آتے تو سر عبدالقادر کے ہاں ٹھہرتے یا ان کے گھر کے قریب کسی مکان میں فروکش ہوتے۔ اسی طرح لندن کے کسی دورے میں، یکم اپریل ۱۹۰۷ء کو مس بیک کے ہاں ان کی ملاقات عطیہ فیضی سے ہوئی۔ اقبال نے سید اور بیگم بلگرامی کی طرف سے عطیہ فیضی کو کیمبرج آنے کی دعوت دی اور طے پایا کہ وہ ۲۲ اپریل کو کیمبرج پہنچیں گی۔

چند روز بعد اقبال نے لندن میں عطیہ فیضی کو فراس کاتی ریستوران میں عشائیہ پر مدعو کیا۔ دوران گفتگو اقبال نے کہا کہ میری شخصیت کے دو پہلو ہیں۔ باطنی طور پر عالمِ خواب میں بسنے والا فلسفی اور صوفی ہوں، مگر ظاہری طور پر ایک عملی اور کاروباری قسم کا انسان ہوں۔ کچھ دنوں بعد عطیہ فیضی کی طرف سے اقبال کے لیے کی جانے والی ایک چائے پارٹی جس میں موسیقی کا اہتمام بھی تھا اقبال نے فی البدیہہ مزاحیہ شعار سنا کر محفل کو زعفرانِ زار بنا دیا۔ جب عطیہ فیضی نے وہ اشعار قلمبند کرنے کی خواہش ظاہر کی تو اقبال نے یہ کہہ کر انہیں روک دیا کہ اشعار کا تعلق صرف اس مخصوص موقع سے تھا اور ان کو قلمبند کرنا غیر ضروری ہے۔

اقبال دو ہفتے لندن ٹھہرنے کے بعد کیمبرج واپس چلے گئے۔ اس کے بعد وہ عطیہ فیضی کو کیمبرج لے جانے کے لیے پھر لندن پہنچے، چنانچہ ۲۲ اپریل کو اقبال، سر عبدالقادر اور عطیہ فیضی لندن سے کیمبرج روانہ ہوئے۔ عطیہ فیضی اسی رات واپس لندن چلی گئیں۔ یکم جون ۱۹۰۷ء کو آرنلڈ نے کیمبرج میں دریائے کیم کے کنارے ایک پکنک کا اہتمام کیا اور عطیہ فیضی کو شرکت کے لیے دعوت بھیجی۔ حیات و موت کے مسئلہ پر بحث کے دوران اقبال نے کہا کہ حیات، موت کی ابتداء ہے اور موت، حیات کی ابتداء۔ اس فقرہ پر بحث ختم ہو گئی۔

غالباً انہی دنوں سر عبدالقادر بھی اقبال کو ملنے آخری مرتبہ کیمبرج گئے۔ جب ایک خاتون کے کیمرے سے سب کی تصویر کھینچنے کی تیاری ہونے لگی تو آفتاب بادلوں کی اوٹ میں چھپ گیا اور سب اس کے بادلوں کے پیچھے سے نکلنے کا انتظار کرنے لگے۔ آفتاب کو منہ چھپاتے دیکھ کر اقبال نے فی البدیہہ دو مصرعے موزوں کیے:

ماہ روے بر لبِ جوے کشد تصویر ما
منتظر باشیم ماتا آفتاب آید بروں

جون ۱۹۰۷ء میں سرعبدالقادر وطن واپس چلے گئے۔ لندن میں اقبال مس شولی نامی ایک جرمن لینڈ لیڈی کے مکان میں فروکش تھے اور دیسی کھانا نہ صرف خود پکاتے تھے بلکہ مس شولی کو بھی پکانا سکھا رکھا تھا۔ اقبال تقریباً ایک ماہ لندن میں مقیم رہے اور پھر غالباً جولائی کے تیسرے ہفتے میں ہائیڈل برگ چلے گئے۔

لندن میں ان کے قیام کے دوران ۱۹ جون ۱۹۰۷ء کو آرنلڈ نے اقبال اور عطیہ فیضی کو اپنے گھر عشائیے پر مدعو کیا۔ اثنائے گفتگو میں آرنلڈ نے بتایا کہ وہ اقبال کو جرمنی بھیجنا چاہتے ہیں کیونکہ وہاں بعض ایسے نایاب عربی مسودات دریافت ہوئے ہیں، جن کو پڑھ کر سمجھنے کی ضرورت ہے اور وہ اس کام کے لیے موزوں ہیں۔

۲۳ جون کو عطیہ فیضی کے ہاں پھر محفل جمی، ڈاکٹر انصاری نے گانا سنایا۔ ۲۷ جون کو اقبال عطیہ فیضی کو اپنی رہائش گاہ پر لے گئے۔ ان کی لینڈ لیڈی مس شولی نے نہایت عمدہ دیسی کھانے پکا رکھے تھے۔ بعد میں عطیہ فیضی انہیں امپیریل انسٹی ٹیوٹ کی سالانہ تقریب پر لے گئیں، جہاں شاہی خاندان کے افراد موجود تھے اس پُرتکلف اجتماع سے اقبال سخت بیزار ہوئے اور حسب عادت طنز بھرے فقرے کسنے لگے۔ عطیہ فیضی کے بیان کے مطابق، سوسائٹی میں اقبال کے متعلق یہ مشہور تھا کہ وہ لندن میں سب سے تیز طبیعت رکھنے والے ہندوستانی ہیں۔ اقبال زیادہ دوست بنانے کے قائل نہ تھے۔ اجنبیوں میں کم آمیز ہو جاتے۔ وہ چلنے پھرنے یا باہر جانے سے گریز کیا کرتے تھے۔ سرعبدالقادر تحریر کرتے ہیں:

اقبال کی طبیعت کی دو عادتیں وہاں (لندن میں) زیادہ نمایاں ہوتی جاتی تھیں، ایک تو ان کی کم آمیزی، جس کا اشارہ انہوں نے اپنے اشعار میں بھی کیا ہے۔ بہت سے دوست نہیں بناتے تھے۔ دوسری عادت نقل و حرکت میں تساہل و تکاہل تھی۔ وہ کئی دفعہ کسی جگہ جانے کا وعدہ کرتے تھے اور پھر کہتے تھے، بھئی کون جائے۔ اس وقت تو کپڑے پہننے اور باہر جانے کو جی نہیں چاہتا۔

۲۹ جون کو لیڈی ایلیٹ کی پرتکلف ایٹ ہوم پارٹی پر عطیہ فیضی اور اقبال موجود تھے۔ اتنے میں زرق برق لباس پہنے مس سروجنی داس اقبال تک جا پہنچیں اور کہا کہ میں صرف آپ سے ملنے یہاں آئی ہوں۔ اقبال کا برجستہ جواب تھا، یہ دھچکا اتنا اچانک ہے کہ میرے لیے تعجب

کا باعث ہوگا، اگر میں اس کمرے سے زندہ وسلامت باہر نکل سکوں۔

اقبال نے جرمن زبان سیکھنے کی تیاری کیمبرج ہی سے شروع کر دی تھی۔عطیہ فیضی کے بیان کے مطابق اقبال اب تاریخ میں دلچسپی لینے کے علاوہ جرمن فلسفے اور شاعری کی طرف زیادہ مائل ہو گئے تھے۔

اقبال جولائی ۱۹۰۷ء کے تیسرے ہفتے میں ہائیڈل برگ چلے گئے۔غالباً وہ ڈوور سے کیلے یا بالون کے رستے فرانس کے شمال مشرقی حصے کو طے کرتے ہوئے جرمنی میں داخل ہوئے۔ ہائیڈل برگ جا کر وہ جرمن زبان سیکھنا چاہتے تھے تاکہ میونخ یونیورسٹی میں اپنے تحقیقی مقالے کے بارے میں زبانی امتحان جرمن زبان میں دے سکیں۔

اقبال نے یونیورسٹی شہر ہائیڈل برگ میں تقریباً چار ماہ یعنی ۲۰ جولائی سے لے کر ۵ نومبر ۱۹۰۷ء تک قیام کیا اور اس دوران میں پرائیویٹ طور پر جرمن زبان اور ادب کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ ان کی استانیاں دو پروفیسر لڑکیاں فراؤلین ویگے ناسٹ اور فراؤلین سینے شل تھیں۔وہ دریائے نیکر کے قریب ہوسٹل میں رہتے تھے۔اقبال کا تعلق میونخ یونیورسٹی سے بھی تھا، کیونکہ انہوں نے اس یونیورسٹی میں اپنا تحقیقی مقالہ پیش کر رکھا تھا اور پی ایچ ڈی کے زبانی امتحان کے لیے انہیں یہیں آنا تھا۔میونخ میں وہ پروفیسر ران اور ان کی بیٹی فراؤلین ران سے بھی جرمن زبان، ادب اور فلسفے سے شناسائی کے سلسلے میں رہبری لیتے تھے۔ممکن ہے، آرنلڈ کے بتائے ہوئے نایاب عربی مسودات کی تشریح اقبال نے میونخ میں کی ہو مگر اس کا کوئی ثبوت موجود نہیں۔

اقبال نے ہائیڈل برگ میں سکونت اختیار کرنے کے کچھ عرصے بعد عطیہ فیضی کو وہاں آنے کی دعوت دی اور ساتھ کچھ کتابیں لانے کو بھی کہا۔عطیہ فیضی پانچ چھ اشخاص کے ہمراہ ۲۰ اگست ۱۹۰۷ء کی شام کو پانچ بجے ہائیڈل برگ پہنچیں۔اقبال نے ان کا استقبال کیا۔دوسرے روز لیکچروں سے فراغت کے بعد سب دریا کے کنارے قہوہ خانے میں اکٹھے ہوئے۔ یونانی، فرانسیسی اور جرمن فلسفے پر بحث ہونے لگی۔فراؤلین ویگے ناسٹ اور فراؤلین سینے شل، یہ تینوں زبانیں بخوبی جانتی تھیں اور اقبال ان کی باتیں سننے میں اس قدر محو یا پھر اپنے خیالات میں اتنے مستغرق تھے کہ جب جانے کا وقت آیا تو یوں محسوس ہوا گویا ابھی خواب سے بیدار ہوئے ہیں۔

تیسرے روز پکنک کے لیے نائن ہائیم جانا طے پایا۔ جب سب لوگ تیار ہو کر نکلے تو اقبال کو نہ پا کر ان کی تلاش شروع کی۔وہ اپنے کمرے میں دنیا و مافیہا سے بے خبر سکتے کے عالم

میں بیٹھے خلا میں گھور رہے تھے۔ عطیہ فیضی کے آنے پر اقبال نے بتایا کہ میں رات دیر تک کچھ کتابیں پڑھتا رہا اور اسی اثناء میں مجھے محسوس ہوا کہ میرا شعور میرے جسم سے الگ ہو گیا ہے۔ شعور کے یوں بلا جسم بھٹکنے سے میں سخت پریشانی کے عالم میں تھا لیکن آپ نے مجھے جگا دیا۔

چوتھے روز بجلی کی ریل میں بیٹھ کر سب پہاڑ کی چوٹی پر واقع کونگ اشٹال پہنچے اقبال ہر ایک پر مزاحیہ اشعار موزوں کرنے لگے۔ پورا دن کو ہلوٹ کے باغات میں گزارنے کے بعد شام ڈھلے تھکے ہارے ہائیڈل برگ واپس پہنچے۔

پانچویں روز ریل میں سوار ہو کر شال کی سمت نکل گئے اور ایک گھنٹے کے سفر کے بعد اس مقام پر پہنچے جہاں کوئی تاریخی باغ ہے، جس میں ہر مذہب کی عبادت گاہیں موجود ہیں، یونانی مجسمے ہیں، آبشاریں، تالاب، پھل دار درخت اور انواع واقسام کے پرندے ہیں۔ اسی باغ میں ایک دلکش مسجد بھی تھی، جس کی دیواروں پر شاید چند آیات کندہ تھیں۔ اقبال نے سب کے استفسار پر ان عربی عبارتوں کی وضاحت میں کسی بادشاہ کا ایسا افسانہ تراش کر سنایا کہ سب اس کو حقیقت سمجھے۔

چھٹے روز پھر سب ہنستے ہنساتے، گاتے، کھاتے ریل میں بیٹھ کر کسی پہاڑ کی چوٹی پر جرمن دیہاتیوں کے لوک ناچ دیکھنے پہنچ گئے۔ اس چوٹی پر پھلوں کے باغ میں کسی پرانے قلعے کے کھنڈر تھے۔ سارا دن رنگ برنگے لباس پہنے دیہاتیوں کے رقص دیکھنے گزرا۔

ساتویں روز عطیہ فیضی، اقبال کے ساتھ میونخ گئیں۔ میونخ اقبال کو بے حد پسند تھا اور وہ اسے جزیرہ مسرت کہتے تھے۔ شام کو پروفیسر ران کے گھر پہنچے اور کھانا وہیں کھایا۔ فراؤلین ران نے انہیں پیانو پر جرمن کلاسیکی موسیقی کے کچھ ٹکڑے سنائے۔ فراؤلین ران نے عطیہ فیضی کو بتایا کہ چند ماہ کی قلیل مدت میں جتنی جلد اقبال نے جرمن زبان سیکھی ہے، اتنی جلدی کوئی نہیں سیکھ سکتا۔ بالآخر دونوں ہائیڈل برگ واپس پہنچے۔

۳۰ اگست کا دن دریا میں کشتیوں کی ریس کے لیے مقرر تھا۔ جب طلبہ اقبال کے کمرے میں پہنچے تو وہ کتابوں میں مستغرق تھے۔ فراؤلین ویگے ناسٹ نے کہا کہ آج کشتیوں کی ریس مقرر ہے اور آپ کو چلنا ہوگا۔ اقبال نے پس و پیش کیا مگر سب مل کر انہیں گھسیٹ کر لے گئے۔ اقبال بوٹ ریس میں شریک ہوئے لیکن ان کی کشتی سب سے آخر میں آئی۔

اگلے چند روز ہائیڈل برگ کے ارد گرد مشہور شلوس نیکر بائن شٹائن اور آئر باخ میں

پہاڑیوں اور باغات کی سیر کرتے، لوک ناچ میں حصہ لیتے، اوپن ائیر ریستورانوں میں کھانا کھاتے یا نیچرل ہسٹری اور اسلحے کے عجائب گھر دیکھتے گزر گئے۔ اقبال کی رگ ظرافت پھڑکنے سے باز نہ رہتی تھی۔ ایک شب ہوسٹل میں رات کے کھانے پر کسی لڑکی کو دیکھ کر عطیہ فیضی کے سامنے یہ شعر فی البدیہہ موزوں کر کے انہیں خوب ہنسایا:

اس کے عارض پہ سنہری بال ہیں
ہو طلائی استرا اس کے لیے

عطیہ فیضی کو بروز ۴ ستمبر ۱۹۰۷ء اپنے ہمراہیوں سمیت لندن واپس جانا تھا۔ جب عطیہ فیضی کے رخصت ہونے کا وقت آیا تو سب لوگ ایک صف میں کھڑے ہو گئے عطیہ فیضی کو سامنے کھڑا کر لیا اور بینڈ کے ساتھ، اقبال کی رہنمائی میں جرمن زبان میں تحریر کردہ یہ الوداعی نظم کورس میں گائی گئی:

آخر کار ہندوستان کے اس نہایت درخشاں ہیرے کو
خدا حافظ کہنے کا وقت آ ہی گیا
تمہارے دوست بہت بڑی تعداد میں منتظر ہیں
لہٰذا اس وقت تک کے لیے ہم کہتے ہیں
خدا حافظ! الوداع!!

تحقیقی مقالے کے بارے میں میونخ یونیورسٹی میں اقبال کا زبانی امتحان ۴ نومبر ۱۹۰۷ء کو پروفیسر ایف۔ ہومل کی زیر صدارت ایک بورڈ نے لیا۔ ان دنوں وہ غالباً پانسی یاں تھرنر، ۴۱۔شیلنگ سٹراسے میونخ میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ان کا تحقیقی مقالہ بعنوان ایران میں فلسفہ مابعد الطبیعیات کا ارتقا (انگریزی) پہلی بار ۱۹۰۸ء میں لندن سے شائع ہوا اور آرنلڈ کے نام سے منسوب کیا گیا۔

اقبال نے ۵ نومبر ۱۹۰۷ء کو لندن واپس پہنچ کر بیرسٹری کے فائنل امتحانوں کی تیاری شروع کر دی۔ لندن میں وہ جولائی ۱۹۰۸ء تک رہے۔ غالباً بیرسٹری کے فائنل امتحانات انہوں نے مئی ۱۹۰۸ء میں دیئے ہوں گے یکم جولائی کو نتیجہ نکلنے کے چند ہی روز بعد وطن واپس روانہ ہو گئے۔

جرمنی میں اقبال کا قیام اگرچہ مختصر تھا، لیکن اس کے باوجود اس سرزمین، جرمن شعر و ادب

اور فلسفے سے انہیں گہری جذباتی اور روحانی وابستگی پیدا ہو گئی تھی۔ اس وابستگی کے پیدا کرنے میں ایما ویگے ناست کا بڑا ہاتھ تھا۔ ایما ویگے ناست ایک ذہین اور حسین خاتون تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان دونوں کے دل و دماغ کے فاصلے بتدریج کم ہوتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ اقبال جب اوائل اکتوبر ۱۹۰۷ء میں ہائیڈل برگ سے میونخ گئے تو وہاں کے تقریباً ایک ماہ کے قیام کے دوران انہیں یکے بعد دیگرے تین خط لکھے۔ پہلا خط ۱۱۶ اکتوبر ۱۹۰۷ء کو تحریر کیا گیا:

افسوس کہ جرمن زبان سے میری محدود واقفیت ہمارے درمیان ایک دیوار کی طرح حائل ہے ...... ہائیڈل برگ میں قیام کے دوران میں نے جرمن لکھنے کی مشق نہ کی، یہ پہلی تحریر ہے جو میں اس زبان میں لکھ رہا ہوں، خزاں کی دھیمی اور نم آلود ہوا بڑی خوشگوار ہے۔ موسم بڑا خوبصورت ہے۔ لیکن افسوس کہ ہر حسین شے کی طرح یہ بھی بے دوام ہے:

دوسرا خط ۱۲۳ اکتوبر ۱۹۰۷ء کو تحریر کیا گیا:

یہ آپ کا بڑا کرم تھا کہ آپ نے خط لکھا لیکن نہایت مختصر میں اس وقت تک آپ کو بالکل نہیں لکھوں گا جب تک آپ مجھے وہ خط نہیں بھیجتیں جو آپ نے لکھ کر پھاڑ ڈالا۔ یہ بڑی بے رحمی ہے۔ آپ ہائیڈل برگ میں تو ایسی نہ تھیں۔ شاید ہائیل برون کی آب و ہوا نے آپ کو بے مہر بنا دیا ہے۔ میں زیادہ لکھنا چاہتا ہوں، مگر وہ خط: آپ کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ میرا خط پھاڑ ڈالیں۔

اور تیسرا خط ۱۲۷ اکتوبر ۱۹۰۷ء کو تحریر کیا گیا۔ لکھتے ہیں:

آج میں باہر نہیں نکل سکا۔ موسم خوشگوار نہیں ہے۔ براہ کرم میری بھدی جرمن زبان کا برا مت منایئے اور نہ اس کا جو میں نے اپنے پچھلے خط میں لکھا تھا۔

اقبال کی لندن روانگی سے قبل ایما ویگے ناست اپنے آبائی شہر ہائیل برون چلی گئیں اور کچھ مدت تک نا مساعد حالات کا شکار رہیں۔ اقبال لندن واپس تو آ گئے لیکن دل ابھی تک ہائیڈل برگ ہی میں تھا۔ لندن میں تقریباً نو ماہ قیام کے دوران انہوں نے ایما ویگے ناست کو کئی خط لکھے۔ مثلاً ۲ دسمبر ۱۹۰۷ء کو تحریر کرتے ہیں:

میرا خیال تھا کہ ہائیل برون کے رستے سفر کروں گا لیکن یہ ممکن نہ ہوا میرے لیے یہ قطعی لازم تھا کہ میں ۵ نومبر کو لندن میں ہوں۔ پروفیسر آرنلڈ مصر گئے ہیں اور میں عربی کا پروفیسر مقرر ہوا ہوں۔ میرے ذمے ہفتے میں دو لیکچر ہیں۔ میں زیادہ لکھ یا کہہ نہیں سکتا، لیکن آپ تصور کر سکتی

ہیں کہ میری روح میں کیا ہے۔ میری بہت بڑی خواہش یہ ہے کہ میں دوبارہ آپ سے بات کر سکوں اور آپ کو دیکھ سکوں، لیکن میں نہیں جانتا کہ کیا کروں۔ جو شخص آپ سے دوستی کر چکا ہو، اس کے لیے ممکن نہیں کہ آپ کے بغیر جی سکے۔ براہ کرم میں نے جو لکھا ہے، اس کے لیے مجھے معاف کر دیجیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ اس قسم کے اظہار جذبات کو پسند نہیں کرتیں۔ براہ کرم جلد لکھیے اور سب کچھ یہ اچھا نہیں کہ کسی شخص کا کچھ بگاڑا جائے، جو آپ کا کچھ نہیں بگاڑتا۔

۳۰ جنوری ۱۹۰۸ء کو تحریر کیا:

میں آپ کی تصاویر کے لیے ہزار گونہ شکریہ ادا کرتا ہوں جو کل شام مجھے موصول ہوئیں ...... دونوں تصویریں بہت خوبصورت ہیں اور وہ ہمیشہ میرے مطالعے کے کمرے میں میری میز پر رہیں گی۔ لیکن مت باور کیجیے کہ وہ صرف کاغذ ہی پر نقش ہیں بلکہ وہ میرے دل میں بھی جا پذیر ہیں اور تا دوام وہیں رہیں گی۔ شاید میرے لیے یہ ممکن نہ ہوگا کہ میں دوبارہ آپ کو دیکھ سکوں ......مگر میں یہ ضرور تسلیم کرتا ہوں کہ آپ میری زندگی میں ایک حقیقی قوت بن چکی ہیں۔ میں آپ کو کبھی فراموش نہ کروں گا اور ہمیشہ ہمیشہ آپ کے لطف و کرم کو یاد رکھوں گا۔

۲۱ جنوری ۱۹۰۸ء کو تحریر کیا:

جب آپ کا پچھلا خط پہنچا تو میں بڑا بیمار تھا اور اس نے مجھے اور بھی بیمار کر ڈالا۔ کیونکہ آپ نے لکھا تھا کہ آپ نے بڑے طوفان میں سے گزرنے کے بعد اپنی آزادی دوبارہ حاصل کی ہے، میں یہ سمجھا کہ آپ میرے ساتھ مزید خط و کتابت نہیں کرنا چاہتیں اور اس بات سے مجھے بڑا دکھ ہوا۔ اب مجھے پھر آپ کا خط موصول ہوا ہے اور اس سے مجھے بڑی مسرت ہوئی ہے۔ میں اکثر آپ کے بارے میں سوچتا ہوں اور آپ کے لیے میرا دل ہمیشہ بڑے حسین خیالات سے معمور رہتا ہے، ایک شرارے سے شعلہ اٹھتا ہے اور شعلے سے بڑا الاؤ روشن ہو جاتا ہے، لیکن آپ غیر جانبدار ہیں، غفلت شعار ہیں، آپ جو جی میں آئے کیجیے، میں بالکل کچھ نہ کہوں گا اور ہمیشہ صابر و شاکر رہوں گا۔ شاید جب میں ہندوستان روانہ ہوں گا تو آپ سے ملاقات کر سکوں گا۔

۲۶ فروری ۱۹۰۸ء کو تحریر کیا:

میں ہر چیز کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ مجھے اس قدر مصروفیت رہی کہ آپ کو خط نہ لکھ سکا، مگر آپ چونکہ فرشتہ خصلت ہیں، اس لیے امید رکھتا ہوں کہ آپ مجھے معاف کر دیں گی۔ آج شام بھی مجھے ایک لیکچر دینا ہے، تصوف پر ...... مجھے آپ کے کانوں کو اپنی بھونڈی جرمن سے مورد

توہین بنانے پر شرم آتی ہے...... میں جولائی کے اوائل میں ہندوستان لوٹ رہا ہوں اور میری تمنا ہے کہ اپنے سفر سے پیشتر آپ سے ملاقات کا موقع مجھے مل جائے۔ میں پوری کوشش کروں گا کہ چندروز کے لیے ہائیڈل برگ آ سکوں، لیکن اگر ممکن ہوتو کیا آپ پیرس میں مجھ سے مل سکتی ہیں؟ ...... آپ تمام دن کیا کرتی ہیں؟ کیا آپ مطالعہ کرتی ہیں یا دوستوں کے ساتھ وقت گزارتی ہیں ؟ آپ کی تصویر میری میز پر رکھی ہے اور ہمیشہ مجھے ان سہانے وقتوں کی یاد دلاتی ہے جو میں نے آپ کے ساتھ گزارے تھے۔ ایک تسبیح خیالاتِ خوش آیند کے ساتھ۔

۳ جون ۱۹۰۸ء کو تحریر کیا:

براہِ کرم جلد لکھیے اور مجھے بتائیے کہ آپ کیا کر رہی ہیں اور کیا سوچ رہی ہیں۔ آپ میرے خط کا انتظار کیوں کرتی ہیں؟ میں ہر روز آپ سے اطلاع پانے کی آرزو رکھتا ہوں ...... میں بہت مصروف ہوں، جلد انگلستان سے رخصت ہو رہا ہوں، آغاز جولائی میں مجھے معلوم نہیں کہ آیا میرا جرمنی کے رستے سفر کرنا ممکن ہوگا کہ نہیں، یہ میری بڑی تمنا ہے کہ میں ہندوستان لوٹنے سے پہلے آپ سے ملاقات کرسکوں، بے رحم نہ بنیے، براہ کرم جلد خط لکھیے اور تمام احوال بتائیے۔ میرا جسم یہاں ہے، میرے خیالات جرمنی میں ہیں آج کل بہار کا موسم ہے، سورج مسکرا رہا ہے لیکن میرا دل غمگین ہے۔ مجھے کچھ سطریں لکھیے اور آپ کا خط میری بہار ہوگا۔ میرے دلِ غمگین میں آپ کے لیے بڑے خوبصورت خیالات ہیں اور یہ خوموشی سے یکے بعد دیگرے آپ کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔

۱۰ جون ۱۹۰۸ء کو تحریر کیا:

میں آپ کو پہلے خط لکھ چکا ہوں اور آپ کے خط کا منتظر ہوں۔ میں اپنی ایک تصویر لف کر رہا ہوں۔ شاید میں ایک اور تصویر آپ کو بھیجوں۔ میں ۲ جولائی کو ہندوستان روانہ ہو رہا ہوں اور وہاں سے خط لکھوں گا۔

لندن سے آخری خط ۲۷ جون ۱۹۰۸ء کو تحریر کیا۔ لکھتے ہیں:

میں نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی ہے کہ جرمنی کے رستے سفر کرسکوں لیکن یہ ممکن نہیں ہے۔ میں ۳ جولائی کو انگلستان سے روانہ ہوں گا اور چندروز پیرس میں رکوں گا۔ جہاں مجھے کچھ کام ہے۔ براہ کرم فوراً لکھیے۔ میں ہندوستان روانہ ہونے سے پیشتر آپ کا خط پانے کا متمنی ہوں۔ میں اگلے سال یورپ آنے اور آپ سے ملنے کی امید رکھتا ہوں۔ مت کہیے گا کہ کئی ملک اور سمندر ہمیں ایک دوسرے سے جدا کریں گے، پھر بھی ہمارے درمیان ایک غیر مرئی رشتہ قائم

ہے۔ میرے خیالات ایک مقناطیسی قوت کے ساتھ آپ کی سمت دوڑیں گے اور اس بندھن کو مضبوط بنائیں گے۔ ہمیشہ مجھے لکھتے رہیے گا اور یاد رکھیے گا کہ آپ کا ایک سچا دوست ہے، اگرچہ وہ فاصلہ دراز پر ہے۔ جب دل ایک دوسرے کے قریب ہوں تو فاصلہ کچھ معنی نہیں رکھتا۔

اقبال کی ایما ویگے ناست کے ساتھ مراسلت جاری رہی، لیکن وہ پھر ایک دوسرے سے کبھی نہ مل سکے۔ اب تک دریافت شدہ خطوط کی تعداد ستائیس ہے۔ پہلا ۱۶/ا کتوبر ۱۹۰۷ء کو اور آخری خط ۲۱/جنوری ۱۹۳۳ء کو لکھا گیا۔ سترہ خط جرمن زبان میں ہیں اور دس انگریزی میں۔

لندن میں قیام کے دوران اقبال نے اسلامی دین وتمدن پر لیکچروں کا ایک سلسلہ شروع کیا، جس کے موضوعات تھے۔ اسلامی تصوف، مسلمانوں کا اثر تہذیبِ یورپ پر، اسلامی جمہوریت، اسلام اور عقل انسانی وغیرہ ،خواجہ حسن نظامی کے نام اقبال کے ایک خط محررہ ۱۰ فروری ۱۹۰۸ء سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت تک اس سلسلے کا ایک لیکچر اقبال دے چکے تھے اور دوسرا لیکچر اسلامی تصوف پر انہوں فروری کے تیسرے ہفتہ میں ابھی دینا تھا۔ یہ لیکچر کن کن تاریخوں پر لندن میں کسی جگہ دیے گئے؟ اس کا جواب وثوق سے نہیں دیا جا سکتا۔ غالباً ان میں سے ایک لیکچر کیکسٹن ہال میں دیا گیا۔

اقبال لندن یونیورسٹی میں چھ ماہ کے لیے عارضی طور پر عربی کے پروفیسر مقرر کیے گئے۔ یہ تقرر لندن کے اسی قیام کے دوران ہوا جب آرنلڈ چھ ماہ کے لیے رخصت پر گئے اور اقبال نے ان کے قائم مقام کی حیثیت سے تدریس کے فرائض سنبھالے۔

اقبال نے لندن کے اپنے تقریباً ۹ ماہ کے اس قیام میں مسلم طلبہ کی اجتماعی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیا۔ مرزا جلال الدین کے بیان کے مطابق انہوں نے اپنے قیام لندن کے دوران وہاں پین اسلامک سوسائٹی کے نام سے ایک نیم سیاسی انجمن قائم کر رکھی تھی، سر عبداللہ سہروردی جس کے جنرل سیکرٹری اور سر سلطان احمد اور مرزا جلال الدین دونوں جائنٹ سیکرٹری تھے۔ جب اقبال انگلستان پہنچے تو یہ سوسائٹی موجود تھی۔ سر عبدالقادر بیان کرتے ہیں کہ اقبال جب کیمبرج سے لندن آتے تو بعض اوقات وہ دونوں علمی مجالس میں اکھٹے شریک ہوتے تھے۔ لندن میں نئے آنے والے مسلم طلبہ کے معاشرتی مسائل حل کرنے کے لیے مسلمانوں کی ایک انجمن حافظ محمود شیرانی نے قائم کر رکھی تھی۔ اس انجمن کے نام کے لئے پین اسلامک سوسائٹی یا اسلامک

سوسائٹی زیر غور تھے۔ بالآخر اقبال نے پین اسلامک نام رکھنے والوں کی حمایت کی۔ چنانچہ سوسائٹی کا یہی نام رکھا گیا۔

آل انڈیا مسلم لیگ کی برٹش کمیٹی کا افتتاح لندن میں مئی ۱۹۰۸ء میں کیا گیا۔ اقبال کو مجلس عاملہ کا رکن منتخب کیا گیا۔ قواعد وضوابط وضع کرنے کے لیے جو سب کمیٹی مقرر ہوئی، اس میں بھی سید امیر علی، میجر سید حسن بلگرامی اور اقبال شامل تھے۔

لندن میں اقبال کا معمول تھا کہ وہ شہر سے اپنی رہائش گاہ تک پہنچنے کے لیے ریل استعمال کرتے تھے۔ اس قسم کے ایک سفر کے متعلق وہ بیان کرتے ہیں:

انگلستان میں طالب علمی کے زمانے میں مجھے ہر روز شام کے وقت اپنی قیام گاہ کی طرف ریل گاڑی میں سفر کرنا پڑتا تھا۔ یہ گاڑی ایک جگہ ختم ہوتی تھی اور سب مسافروں کو سامنے والے پلیٹ فارم پر دوسری گاڑی میں سوار ہونا پڑتا تھا۔ گاڑی جب اسٹیشن پر پہنچتی تو گارڈ بلند آواز سے پکارتا ''آل چینج'' یعنی سب بدلو۔ ایک روز میں حسب معمول گاڑی میں بیٹھا تھا کہ میرے اردگرد اخبار بین مسافر آپس میں بدھ مذہب کے متعلق باتیں کرنے لگے۔ ایک صاحب نے میری طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ صاحب غالباً ایشیائی ہیں، ان سے بدھ مذہب کے متعلق پوچھنا چاہیے۔ چنانچہ مجھ سے پوچھا گیا میں نے کہا، ابھی جواب دیتا ہوں۔ یہ کہہ کر میں چپ رہا۔ چند منٹوں کے بعد انہوں نے مجھ سے دوبارہ پوچھا۔ میں نے پھر کہا، ابھی جواب دیتا ہوں۔ وہ کہنے لگے، شاید آپ جواب سوچ رہے ہیں۔ میں نے کہا، ہاں۔ اس دوران میں اسٹیشن آ گیا۔ گارڈ ''آل چینج'' پکارنے لگا۔ میں نے کہا، بس یہی بدھ مذہب ہے۔

اقبال اپنے یورپ میں تعلیم اور رہائش کے اخراجات کے حوالے سے بیان کرتے ہیں:

جب میں ولایت گیا تو اپنا کچھ روپیہ میرے پاس موجود تھا لیکن زیادہ تر رقم میرے بھائی صاحب نے مجھ کو دی تھی۔ ولایت کے قیام کے دوران بھی وقتاً فوقتاً مجھ کو روپے بھیجتے رہتے تھے۔ جب میں نے کیمبرج سے بی اے کر لیا تو انہوں نے لکھا کہ اب بیرسٹری کا کورس پورا کر کے واپس آ جاؤ، لیکن میرا ارادہ پی ایچ ڈی کی ڈگری لینے کا تھا۔ اس لیے میں نے جواب دیا کہ کچھ رقم بھیجئے تا کہ جرمنی جا کر ڈاکٹری کی سند لے لوں۔ انہوں نے مجھے مطلوبہ رقم بھیج دی۔ انہی دنوں میں وہ ایک روز سیالکوٹ میں اپنے بے تکلف دوستوں کی صحبت میں بیٹھے تھے کہ کسی شخص نے پوچھا، کیوں شیخ صاحب! سنا ہے اقبال نے ایک اور ڈگری لی ہے؟ بھائی صاحب نے جواب دیا، بھئی کیا بتلاؤں، ابھی تو وہ ڈگریوں پر ڈگریاں لیے جا رہا ہے۔ خدا جانے ان

ڈگریوں کا اجرا کب ہوگا۔

اس دور میں مشرقی شاعری کی بے مقصدیت کے سبب سے اقبال شاعری کو ترک کرنے کا سوچ رہے تھے مگر سرعبدالقادر اور آرنلڈ نے یہ فیصلہ دیا کہ اقبال کے لیے شاعری چھوڑنا جائز نہیں۔

دوسرا تغیر سرعبدالقادر کے بیان کے مطابق ایک چھوٹے سے آغاز سے ایک بڑے انجام تک پہنچا۔ سرعبدالقادر لکھتے ہیں:

> بظاہر جس چھوٹے سے واقعے سے ان کی فارسی گوئی کی ابتدا ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ وہ ایک دوست کے ہاں مدعو تھے۔ جہاں ان سے فارسی اشعار سنانے کی فرمائش ہوئی اور پوچھا گیا کہ وہ فارسی میں بھی شعر کہتے ہیں یا نہیں؟ اس فرمائش نے ایسی تحریک ان کے دل میں پیدا کی کہ دعوت سے واپس آ کر بستر پر لیٹے ہوئے باقی وقت وہ شاید فارسی اشعار کہتے رہے اس کے بعد ولایت سے واپس آنے پر گو کبھی کبھی اردو کی نظمیں بھی کہتے تھے مگر طبیعت کا رخ فارسی کی طرف ہوگیا۔

انگریزی ادب سے شناسائی کے سبب اقبال شکسپیئر کے علاوہ ملٹن، ورڈز ورتھ، شیلے، بائرن، براؤننگ، میتھو آرنلڈ، ٹینی سن، ایمرسن، گرے، لانگ فیلو وغیرہ سے متاثر تھے، ہوسکتا ہے، فرانسیسی ادب کے کچھ شہ پارے بھی ان کی نظروں سے گزرے ہوں۔ لیکن جرمن زبان سے دلچسپی کے باعث وہ جرمن ادب سے متعارف ہوئے اور ہائیڈل برگ میں قیام کے دوران انہوں نے اس کا خصوصی طور پر مطالعہ کیا۔ گوئٹے کے مغربی مشرقی دیوان کی اشاعت سے جرمن ادب میں مشرقی تحریک مزید مستحکم ہوگئی بعد میں روکرٹ، پلاٹن، بوڈن اشٹیٹ، شلر اور ہائینے نے اسے کمال تک پہنچا دیا اور حافظ کے تتبع میں اشعار کہنا جرمن ادب میں بجائے خود ایک تحریک بن گیا۔ یوں مشرق کی روح، جرمن ادب میں داخل ہوئی۔ اقبال جرمن شعرا سے بحیثیت مجموعی متاثر تھے مگر گوئٹے کا اثر ان پر بہت گہرا اور دیرپا ثابت ہوا۔

اقبال نے اس دور میں کل چوبیس نظمیں اور سات غزلیں کہیں، جو بانگ درا کے حصہ دوم کی زینت ہیں۔ ان نظموں میں تین تو کسی نہ کسی طرح کے پیام سے متعلق ہیں، مثلاً ''پیام طلبہ علی گڑھ کے نام''، ''پیام عشق'' اور ''پیام''۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال میں یہ احساس فروغ پا رہا تھا کہ بامقصد شاعری کو پیغامبری کا جزو ہونا چاہیے۔ ایک غزل اور ایک نظم تو خاص

طور پر توجہ کے قابل ہے۔ غزل مارچ ۱۹۰۷ء میں لکھی گئی اور مغرب و مشرق کے لیے پیش گوئیوں سے لبریز ہے۔

قیام یورپ کے دوران اقبال میں جو سب سے بڑا انقلاب آیا، وہ ان کا وطنی قومیت اور فلسفہ و تصوف سے متنفر ہو کر ذہنی اور قلبی طور پر اسلامی تعلیمات کی طرف رجوع کرنا تھا۔ اقبال کو جب مغربی معاشرت کے نقائص قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تو تہذیب یورپ کی زر پرستی اور کم ظرفی نے ان کی طبیعت کو متنفر کر دیا۔

اقبال اپنے دل و دماغ کی سرگزشت لکھنا چاہتے تھے۔ اس بات کا ذکر انہوں نے اپنے کئی خطوط میں کیا ہے۔ سید سلیمان ندوی کے نام اپنے ایک خط محررہ ۱۰/۱کتوبر ۱۹۱۹ء میں لکھتے ہیں کہ میں اپنے دل و دماغ کی سرگزشت لکھنا چاہتا ہوں اور یہ سرگزشت کلام پر روشنی ڈالنے کے لیے نہایت ضروری ہے۔ عشرت رحمانی کے نام خط محررہ ۲۷/اکتوبر ۱۹۱۹ء میں رقم طراز ہیں کہ میری زندگی میں کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں جو اوروں کے لیے سبق آموز ہو سکے، البتہ میرے خیالات کا تدریجی انقلاب سبق آموز ہو سکتا ہے، اگر فرصت ملی تو اسے قلمبند کروں گا اور یہ کہ فی الحال اس کا وجود محض عزائم کی فہرست میں ہے۔ ممتاز حسن سے ایک ملاقات میں فرمایا کہ جب میں کیمبرج میں تھا تو فلسفے کے ساتھ ساتھ اس غرض سے معاشیات کا مطالعہ کیا کرتا تھا اور اس موضوع پر لیکچر سنا کرتا تھا کہ مسلسل فلسفہ پڑھنے اور سوچنے سے ذہن میں یک طرفہ پن پیدا نہ ہو اور طبیعت کا توازن قائم رہے۔ وحید احمد مدیر ''نقیب'' بدایوں کو اپنے خط محررہ ۷/ستمبر ۱۹۲۱ء میں تحریر کرتے ہیں:

> اس زمانے میں سب سے بڑا دشمن اسلام اور اسلامیوں کا، نسلی امتیاز اور ملکی قومیت کا خیال ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یورپ کی آب و ہوا نے مجھے مسلمان کر دیا۔ یہ ایک طویل داستان ہے۔ کبھی فرصت ہوئی تو اپنے قلب کی تمام سرگزشت قلمبند کروں گا۔ جس سے مجھے یقین ہے بہت لوگوں کو فائدہ ہوگا۔

اقبال میں مغرب زدگی یورپ جانے سے قبل تھی نہ قیامِ یورپ کے دوران آئی۔ ان کی نظر محققانہ تھی۔ اس لیے ان میں مغرب کی کورانہ تقلید کا شائبہ تک پیدا نہ ہوا۔ انہوں نے یورپ کے ظاہری حسن کا تماشا ضرور کیا لیکن ساتھ ہی اس کے باطن پر بھی گہری نگاہ ڈالی۔ ان کی مشرقی بصیرت نے بھانپ لیا کہ یورپ کی تہذیب میں خرابی کی صورت مضمر ہے اور اس کی تجلی

عارضی نوعیت کی ہے۔

اقبال اپنے دل و دماغ کی سرگزشت یا اپنے خیالات کے تدریجی تغیر کے متعلق اگر خود تحریر کرتے تو ان کے ذاتی تجربے اور مشاہدے کی بنا پر ممکن ہے بہت سے دلچسپ انکشافات ہوتے، لیکن اب تو اس عظیم انقلاب کا جائزہ صرف خارجی طور پر ہی لیا جا سکتا ہے۔

اقبال یورپ جاتے وقت وطنی قومیت کے نشے سے سرشار تھے۔ جب ان کا جہاز اٹلی کے ساحل کے قریب سے گزرا تو انہوں نے تعظیماً ارشاد کیا:

ہرے رہو! وطنِ مازنی کے میدانو!
جہاز پر سے تمہیں ہم سلام کرتے ہیں

مگر انگلستان میں ابھی ڈیڑھ سال ہی گزرا تھا کہ انہیں احساس ہوا کہ وطنی قومیت، نسلی، لسانی یا گروہی بنیاد پر کسی قوم کو کم تر سمجھنا درست نہیں کیونکہ ان کے پیش نظر وطنیت کا مغربی تصور، انسان دوستی یا احترامِ آدمیت کے آفاقی اصولوں کے سراسر منافی تھا۔ ۱۹۰۷ء میں انہوں نے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا کہ یورپی قوموں کے گروہ عسکری طاقت کے بل بوتے پر ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو گئے ہیں۔ ان کی نگاہ میں یہ محاذ آرائی ڈاکوؤں کے گروہوں کی محاذ آرائی تھی جو غاصبانہ تجارت کو وسعت دینے یا کمزوروں کی غارت گری کی خاطر کی گئی تھی۔ پس اقبال کے دل میں نہ صرف مغربی استعمار اور ملوکیت کے خلاف شدید نفرت کا جذبہ پیدا ہوا بلکہ وہ وطنی قومیت کے جذبے کو بھی حقارت کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ یہ نفرت و حقارت اس قدر عمیق تھی کہ بعد میں اپنی وطنی قومیت کی شاعری پر بھی نادم تھے اور بسا اوقات کہا کرتے تھے کہ قیام یورپ سے قبل کا کلام میرے زمانۂ جاہلیت کا کلام ہے۔

بہرحال اقبال کے ۷ ستمبر ۱۹۲۱ء کے خط اور مارچ ۱۹۰۷ء کی تحریر کردہ غزل سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے دل میں یہ احساس کہ نسلی امتیاز و ملکی قومیت، اسلام اور مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن ہے، قیام کیمبرج کے آخری ایاّم میں ''ٹرپل دطانت'' معاہدے کی تشہیر کے وقت پیدا ہوا اور متذکرہ غزل ملوکیت یا وطنیت کے یورپی تصور کے خلاف ردعمل کے برملا اظہار کی صورت تھی:

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو، وہ اب زرِ کم عیار ہو گا

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ، ناپایدار ہو گا

اس مرحلے پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس زمانے میں ملوکیت، استعمار اور وطنی قومیّت کی مخالفت میں یورپ میں بعض تصورات مثلاً بین الاقوامیّت (کازموپالی ٹینزم)، انسان دوستی (ہیومنزم)، اشتراکیت، ریڈیکل ازم، سوشلزم وغیرہ موجود تھے جو احترام آدمیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے عالمی اخوت کی بنیادوں پر ایک نئی دنیا وجود میں لانے کی ترغیب دیتے تھے، اور روس میں کئی خفیہ سوسائٹیاں عملی طور پر ملوکیت کے خلاف برسرِ عمل تھیں اقبال نے اگر ملوکیت، استعمار یا وطنی قومیّت کو رد کیا تو ان تصورات میں سے کسی ایک کو قبول کرنے کی بجاے اسلام کے بنیادی اصولوں کی طرف رجوع کیوں کیا؟ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ تمام متذکرہ تصورات ونظریات یورپ کے فلسفہ عقلیت کی پیداوار تھے۔ ان کی بنیاد مادہ پرستی پر رکھی گئی تھی۔ اقبال پر یہ حقیقت واضح ہو چکی تھی کہ فلسفہ محض بے کار ذہنی مشق اور تصوف وجودی کی حیثیت افیونی نشے کی سی ہے۔

قرآنِ مجید میں لفظ قوم، ایک گروہ یا قبیلہ کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ لیکن قرآنِ مجید کے مطابق قبیلوں اور ذاتوں کی تقسیم شناخت کے لئے ہے۔ جب کہ اللہ کی نگاہ میں تم میں سب سے بہتر وہی ہے، جس کی زندگی پاکیزہ ہے۔ بہرکیف اسلام پر ایمان لانے کے سلسلہ میں قرآن مجید کسی قبیلے یا قوم میں شامل ہونے کا ذکر نہیں کرتا بلکہ 'اُمّت' یا 'ملّت' میں داخل ہونے کی دعوت دیتا ہے۔ پس اُمّت یا ملّت سے مراد انسانوں کی ایسی جماعت ہے جس کے اتحاد کی بنا فقط ایمان یا عقیدے کا اشتراک ہے اور اس اشتراک میں مختلف قومیں و قبیلے اور ذاتیں سما سکتی ہیں۔ اسلام میں اشتراک ایمان پر اتحاد کی بنیاد پر اتحادِ انسانی کا تصور جس طرح نسل، رنگ یا زبان کی عصبیتوں کو مٹاتا ہے، اسی طرح علاقے یا وطن کی قید سے آزاد ہے۔ حیات طیبہ سے ظاہر ہے کہ آنحضورؐ نے اپنے آبائی وطن یعنی مکہ سے اپنے ایمان کے تحفظ کی خاطر ہجرت کی اور مدینے پہنچ کر مہاجرین اور انصار کو ایمان کے اشتراک کی بنا پر ایک دوسرے کے ساتھ اخوت کے رشتے میں منسلک کیا۔ گویا مدینے میں قائم کردہ ملّت اسلامیہ کا انحصار اتحاد وطن پر نہیں بلکہ اشتراک ایمان کے اصول پر تھا۔ پس اس لحاظ سے ملّت اسلامیہ کا کوئی آبائی وطن نہیں بلکہ ہر وہ سرزمین اس کا وطن ہے، جس میں مسلمان اشتراک ایمان کی بنیاد پر متحد ہو کر اسلامی معاشرہ قائم

کریں۔ انگلستان میں غالباً اسلامی تعلیمات کا یہی پہلو اقبال کے پیشِ نظر تھا جب انہوں نے اسی دور کی ایک اور نظم میں فرمایا:

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمارؐ نے بنایا
بنا ہمارے حصارِ ملّت کی ، اتحادِ وطن نہیں ہے

کہاں کا آنا، کہاں کا جانا، فریب ہے امتیازِ عقبیٰ
نمود ہر شے میں ہے ہماری، کہیں ہمارا وطن نہیں ہے

اقبال نے مشاہدہ کیا کہ روس اور یورپ کی نو آبادتی طاقتیں اپنی اپنی اغراض کے حصول کی خاطر دنیائے اسلام کو مستقل طور پر پارہ پارہ یا منتشر رکھنا چاہتی ہیں۔ اُس دور کی وطنیت کے یورپی تصور کے زیر اثر قومی تحریکوں کو بھی اقبال اسلام کے مقصود کے خلاف سمجھتے تھے۔ اس لیے وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمانانِ عالم کی طاقت برقرار رکھنے اور ان کی بقا کی خاطر ضروری ہے کہ وہ اشتراک ایمان کے اصول پر متحد ہو کر ملّت اسلامیہ یا اتحاد اقوام اسلامیہ کو وجود میں لائیں۔ پس مازنی اور بسمارک تو اطالوی اور المانوی قوموں کا اتحاد ملکی وطنیت کے اصول پر وجود میں لائے، لیکن اقبال اشتراک ایمان کے جذبے پر مسلم اقوام کے اتحاد کا خواب دیکھنے لگے۔

۱۹۰۷ء میں اقبال کے قلبی اور ذہنی انقلاب کا ایک لازمی نتیجہ یہ بھی نکلا کہ انہوں نے برصغیر ہند میں ملکی قومیت کی بنیاد پر ''ہندو مسلم'' اتحاد کے خیال سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اس کا ثبوت بھی ان کی ایک تحریر میں موجود ہے۔ اقبال جولائی ۱۹۰۸ء میں لاہور واپس پہنچے۔ آٹھ ماہ بعد انہیں منشی غلام قادر فرخ نے امرتسر میں قائم شدہ ایک ہندو مسلم اور سکھوں کی انجمن منروالاج کے سالانہ جلسے میں شرکت کی لیے مدعو کیا۔ آپ نے انہیں اپنے خط محررہ ۲۸ مارچ ۱۹۰۹ء میں تحریر کیا:

میرا یہ نظریہ رہا ہے کہ اس ملک (ہندوستان) سے مذہبی اختلافات اٹھ جانے چاہییں اور میں اب بھی اپنی نجی زندگی میں اسی اصول پر کاربند ہوں، مگر اب میں سوچتا ہوں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ اپنا اپنا قومی تشخص ایک دوسرے سے الگ برقرار رکھیں۔ ہندوستان کے لیے ایک مشترک قومیت کا تصور بجائے خود نہایت حسین اور شاعرانہ کشش کا حامل ہے، تاہم موجودہ حالات اور دونوں قوموں کے نادانستہ رجحانات کے پیش نظر وہ ناقابل عمل ہے۔

اقبال ۸ جولائی ۱۹۰۸ء کو انگلستان سے وطن روانہ ہوئے۔ واپسی پر جب ان کا جہاز اٹلی

کے جزیرۂ سسلی کے ساحل کے قریب سے گزرا تو ان کے دل میں کچھ اور ہی جذبات موج زن تھے۔ وہ سسلی کو مازنی کی سرزمین کے طور پر نہیں بلکہ تہذیبِ حجازی کے مزار کی صورت میں دیکھ کر رو دیے تھے:

ہے، ترے آثار میں پوشیدہ، کس کی داستان
تیرے ساحل کی خموشی میں ہے اندازِ بیاں

دردِ اپنا مجھ سے کہہ، میں بھی سراپا درد ہوں
جس کی تُو منزل تھا، میں اس کارواں کی گرد ہوں
رنگ تصویرِ کہن میں، بھر کے دکھلا دے مجھے!
قصّہ ایّامِ سلف کا، کہہ کے تڑپا دے مجھے!

میں ترا تحفہ، سوئے ہندوستاں لے جاؤں گا
خود یہاں روتا ہوں، اوروں کو وہاں رلواؤں گا

اقبال بمبئی سے ہوتے ہوئے ۲۵ جولائی کی رات کو دہلی پہنچے۔ احباب اسٹیشن پر ان کا استقبال کرنے کی خاطر آئے ہوئے تھے۔ اگلے روز احباب سمیت نظام الدین اولیاؒ کی درگاہ پر پہنچے اور مزار کے پہلو میں کھڑے ہو کر دیر تک دست بدعا رہے۔ سارا دن درگاہ ہی میں گزارا۔ احباب میں نیرنگ اور مقبول احمد نظامی نے ان کی آمد کی خوشی میں نظمیں پڑھیں، قوالی کا لطف بھی اٹھایا۔ خواجہ حسن نظامی میرِ مجلس تھے شام کو غالب کی قبر پر گئے اور فاتحہ پڑھی۔

۲۷ جولائی ۱۹۰۸ء کو دوپہر کی گاڑی سے لاہور پہنچے۔ اسٹیشن پر احباب نے گرمجوشی سے استقبال کیا۔ وہاں سے بھاٹی دروازے کے باہر بلدیہ کے باغ میں آئے، جہاں شیخ گلاب دین نے ان کے اعزاز میں ایک دعوت دے رکھی تھی۔ اس تقریب میں کوئی ڈیڑھ سو کے قریب احباب شریک ہوئے۔ سر محمد شفیع نے ان کی شخصیت اور شاعری کے بارے میں تقریر کی۔ مولانا حامد حسن قادری، اللہ یار جوگی، منشی غلام علی خان غلامی، منشی نذر محمد اور بدرالدین قیصری نے ان کی آمد کی خوشی میں نظمیں پڑھیں۔

اس تقریب سے فراغت کے بعد اسی دن شام کی گاڑی سے سیالکوٹ روانہ ہو گئے۔ سیالکوٹ میں بھی ان کا پرجوش خیر مقدم کیا گیا۔ پلیٹ فارم استقبال کرنے والوں سے کھچا کھچ

بھرا ہوا تھا۔ اقبال کے والد، بھائی اور دیگر اعزہ و احباب موجود تھے۔ شیخ اعجاز احمد، اس وقت ساڑھے نو برس کے تھے اور اپنے والد کے ساتھ وہاں گئے ہوئے تھے۔ ہار اتنی کثیر تعداد میں پہنائے گئے کہ اقبال کا چہرہ پھولوں میں چھپ گیا۔ بڑی مشکل سے اسٹیشن سے نکل کر گھر پہنچے اور اپنی ماں سے، جو گذشتہ تین سال سے ان کے لیے چشم براہ تھیں، لپٹ گئے۔

وسطی دور

(حصہ دوم)

باب:۸

فکرِ معاش

یورپ سے واپسی کے بعد اقبال کے لیے سب سے اہم مسئلہ فراہمی روزگار تھا۔ انہوں نے اپنی تعلیم کی تکمیل بڑے بھائی شیخ عطا محمد کی مالی امداد سے کی تھی اور اب شیخ عطا محمد کی فوج سے ریٹائرمنٹ میں چند سال باقی رہ گئے تھے۔ اقبال نے قیام یورپ کے دوران غالباً ۱۹۰۸ء کے ابتدائی حصّے میں گورنمنٹ کالج لاہور کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا تھا، لہٰذا اب اقبال کے لیے وکالت کا پیشہ اختیار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

اگست ۱۹۰۸ء میں شیخ عطا محمد لاہور آئے اور مرزا جلال الدین کی وساطت سے موہن لال روڈ (جسے آج کل اردو بازار کہا جاتا ہے) پر منشی گلاب سنگھ کے مطبع مفید عام کے قریب اقبال کی رہائش اور دفتر کے لیے ایک مکان کرایہ پر لیا۔ چند دنوں کے بعد اقبال لاہور پہنچ کر اسی مکان میں فروکش ہوئے۔ دفتر کے لیے قانونی کتب کی ایک معمولی سی لائبریری خرید کی اور ہندو منشی کاہن چند رکھا۔ علی بخش کو بھی بلوا لیا گیا۔ اقبال نے پریکٹس کی ابتداء نچلی عدالتوں سے کی اور چند ماہ انہی عدالتوں میں کام کرتے رہے۔

۳۰ اکتوبر ۱۹۰۸ء سے اقبال کی بحیثیت ایڈووکیٹ انرولمنٹ ہوگئی اور اس حکمنامے کے تحت انہیں چیف کورٹ پنجاب میں پریکٹس کرنے کی اجازت مل گئی۔ اور وہ لاہور کے بارروم میں داخل ہوئے، جو میاں شاہ دین، سر فضل حسین، سر محمد شفیع، سر شہاب الدین، سر شادی لعل، لالہ لاجپت رائے، پنڈت شیو نارائن شمیم، پیر تاج الدین غلام رسول بیرسٹر، مرزا جلال الدین وغیرہ جیسی مقتدر ہستیوں کے سبب مشہور تھا۔ چیف کورٹ پنجاب میں اپنے مقدمات کی پیروی کے لیے اقبال سخت محنت کرتے تھے، یہاں تک کہ شعر و شاعری کے شغل سے بھی کچھ مدت تک دور رہے۔

اقبال نے صرف کچھ عرصے تک موہن لعل روڈ والے مکان میں قیام کیا۔ اکتوبر ۱۹۰۸ء

میں وہ انارکلی کے اس مکان میں اٹھ آئے،

جس میں ان سے پیشتر سر فضل حسین اور پھر سر محمد شفیع مقیم رہ چکے تھے۔ یہ مکان پہلے مکان سے کشادہ تھا۔ اسی مکان میں آپ کی سکونت تھی اور اسی میں دفتر بھی تھا۔ کاہن چند کی جگہ، سر محمد شفیع کے منشی طاہرالدین کی خدمات حاصل کی گئیں۔ منشی طاہرالدین بھی اس مکان کے عقب میں رہائش پذیر ہو گئے۔

اقبال کو بچپن سے کبوتر پالنے کا شوق تھا۔ لاہور میں موہن لعل روڈ والے مکان اور پھر انارکلی والے مکان میں بھی کوٹھے پر کبوتروں کے رکھنے کا بندوبست بھی کیا گیا۔ اقبال ۱۹۲۲ء تک اسی مکان میں فروکش رہے۔

مرزا جلال الدین ان ایّام میں اقبال کی زندگی کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں:

ڈاکٹر صاحب کی طبیعت میں ظرافت کو بہت دخل تھا۔ ہندوؤں میں پنڈت شیونا رائن شمیم کو اقبال سے خاص انس تھا اور وہ ڈاکٹر صاحب کی باتوں میں خاص دلچسپی لیتے۔ اس دوران میں میرے اور ڈاکٹر صاحب کے تعلقات بہت گہرے ہو چکے تھے۔ منشی طاہرالدین کی جیب میں قینچی کے سگریٹوں کی ڈبیا پڑی رہتی۔ ڈاکٹر صاحب سگریٹ سلگا کر کرسی پر بیٹھ جاتے اور لطائف و پر مذاق باتوں سے وقت کاٹتے۔ انہی ایّام میں ڈاکٹر صاحب کی ملاقات نواب سر ذوالفقار علی خان مرحوم کے ساتھ بھی ہو گئی اور اسی طرح سر جوگندر سنگھ جوگی سے مراسم قائم ہو گئے۔ ذوالفقار مرحوم، اقبال اور میں، کبھی نواب صاحب کے دولت خانے پر اور کبھی میرے دفتر، قریباً بلا ناغہ ملا کرتے۔ ہمارے باہمی تعلقات ایسے گہرے تھے کہ سر میاں محمد شفیع مرحوم و فضل حسین مرحوم ہمیں ٹرایو یا اصحاب ثلاثہ کے نام سے یاد کرتے''۔

ابھی وکالت کا پیشہ اختیار کیے دو ایک ماہ ہی گزرے ہوں گے کہ اقبال کو ایم اے او کالج علی گڑھ میں فلسفے کی پروفیسری کی پیشکش ہوئی لیکن انہوں نے اسے قبول نہ کیا۔ اسی طرح اپریل ۱۹۰۹ء میں گورنمنٹ کالج لاہور میں تاریخ کی پروفیسری بھی ٹھکرا دی۔

یکم اکتوبر ۱۹۰۸ء سے بریٹ، صدر شعبہ فلسفہ گورنمنٹ کالج لاہور کے ایک سال کی رخصت پر جانے اور یکم مئی ۱۹۰۹ء کو آسٹن وائٹ جیمز اچانک فوت ہونے پر پرنسپل کی درخواست پر حکومت پنجاب نے اقبال سے استدعا کی کہ عارضی طور فلسفے کی پروفیسری قبول کر لیں۔ کالج اور کورٹ کے اوقات میں تصادم ختم کرنے کے لئے اقبال اور گاڈلے، انڈر سیکرٹری

تعلیم حکومت پنجاب نے کورٹ کے چیف جج و جج صاحبان کو تحریر کیا کہ اقبال کے مقدمات ایسے اوقات میں پیش ہوا کریں جب وہ اپنے تدریسی فرائض سے فارغ ہو جائیں۔ اس زمانے میں اقبال کی پریکٹس ابتدائی مراحل میں ہونے کے سبب برائے نام تھی، اس لیے اجازت مل گئی۔ چنانچہ انہوں نے ۱۰ مئی ۱۹۰۹ء سے گورنمنٹ کالج میں عارضی طور پر فلسفہ پڑھانا شروع کر دیا۔ ۱۲/اکتوبر ۱۹۰۹ء سے ان کی بنیادی تنخواہ پانچ سو روپے ماہوار مقرر ہوئی۔ کالج میں وہ اپنے شاگردوں میں بڑے ہردلعزیز تھے اور پڑھانے کا انداز سیّد میر حسن جیسا تھا۔

رفتہ رفتہ اقبال کی مصروفیات بڑھتی جا رہی تھیں۔ ۱۹۰۹ء میں آپ لاء پبلشنگ پریس لاہور کے شائع کردہ ایک قانونی رسالہ انڈین کیسنر لاء رپورٹس کے حلقۂ ادارت میں بطور جائنٹ ایڈیٹر شامل ہو گئے۔ ''انجمنِ حمایتِ اسلام'' اور ''انجمنِ کشمیری مسلمانانِ پنجاب'' سے تعلق کے علاوہ انہیں ۲۶ مارچ ۱۹۰۹ء کو ''انجمنِ اسلامیہ پنجاب'' کا رکن بھی منتخب کرلیا گیا۔ انجمن اسلامیہ پنجاب ۱۸۶۹ء سے قائم تھی اور بادشاہی مسجد و دیگر اہم مساجد کی نگرانی یہی انجمن کرتی تھی۔ برکت علی محمڈن ہال کا انتظام بھی اسی کے سپرد تھا۔ اس انجمن سے اقبال کا تعلق آخری دم تک قائم رہا۔

۲۸ دسمبر ۱۹۰۸ء کو آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس کی صدارت کے سلسلے میں خواجہ سلیم اللہ خان، نواب آف ڈھاکا، امرتسر آئے ہوئے تھے؛ انجمنِ کشمیری مسلمانانِ پنجاب کا ایک وفد، جس میں اقبال بھی شامل تھے ان سے ملا۔ انجمن کشمیریوں کے حقوق کے لئے جدوجہد کر رہی تھی۔ ۱۹۰۹ء میں اقبال ہی کی تحریک پر خواجہ سلیم اللہ خان نے کشمیریوں کے مسائل کو وائسرائیگل قانون ساز کونسل کے اجلاسوں میں اٹھایا۔ اس سلسلہ میں اقبال کے چند مراسلے بھی اخباروں میں شائع ہوئے، جن کے ذریعے فوجی بھرتی اور حصول اراضی کی ضرورت کشمیریوں اور حکام دونوں پر واضح کرنے کی کوشش کی۔

۱۹۰۹ء یا ۱۹۱۰ء میں اقبال کے دوست انہیں کشمیر کے مہاراجہ پرتاب سنگھ کے پاس لے ہی گئے۔ مہاراجہ نے اقبال کی علمی شہرت اور شاعرانہ عظمت کے متعلق کچھ نہ کچھ سن رکھا تھا۔ جب تعارف ہوا تو اقبال سے پوچھا: ڈاک دار صاحب! سنا ہے آپ بیت بناتے ہیں؟ اقبال نے جواب دیا: سرکار! بیت نہ کبھی میں نے بنائے ہیں، نہ میرے باپ دادا نے اس کے علاوہ میں ڈاک دار بھی نہیں، نہ میں نے کبھی ڈاک کا کام کیا ہے، نہ میرے بزرگوں نے مہاراجہ حیرانی

سے اقبال کے دوستوں کا منہ تکنے لگے۔ دوستوں میں سے کسی نے کہا کہ حضور یہ شاعر ہیں اور شعر تحریر کرتے ہیں۔ شعر کو بیت بھی کہتے ہیں، مگر انہوں نے بیت کو وہ بید سمجھا، جس سے کرسیاں بنائی جاتی ہیں۔ مہاراجہ نے اقبال سے کوئی شعر سنانے کی فرمایش کی۔ جب اقبال شعر پڑھنے لگے تو مہاراجہ بولے: یوں نہیں! گا کر پڑھیے۔ اقبال نے فوق کی طرف دیکھا اور دبی زبان میں کہا: جی تو یہی چاہتا ہے کہ کہوں کہ میرے دوستوں کے پاؤں میں گھنگرو باندھیے تو میں گاؤں۔ پھر چند شعر ترنم سے پڑھے اور انہیں مہاراجہ نے خود بھی کچھ شعر فارسی کے سنائے۔

اس زمانے میں معلمی اور وکالت جیسے دو مصروف ترین پیشوں کے سبب اقبال کے پاس شعر کہنے کی فرصت بہت کم تھی۔ فوق کہتے ہیں کہ مئی ۱۹۱۰ء کی کسی شام کو وہ اور وجاہت حسین جھنجھانوی ان کے ہاں گئے اور ان کو اپنا کلام سنانے لگے۔ اقبال سننے میں منہمک تھے کہ اسی اثنا میں منشی طاہر الدین کمرے میں داخل ہوئے اور کہا کہ ایک مؤکل آیا ہے اور ملنا چاہتا ہے۔ اقبال نے جواب دیا کہ اس کو بٹھایئے، یہاں سے فارغ ہو کر بلاؤں گا۔ فوق نے کہا: بابا پہلے پیٹ کی فکر کرنی چاہیے، یہ شغل تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ بولے: یہی شغل تو غذائے روح ہے اور روح ہے تو سب کچھ ہے۔ مؤکل اگر میرا نام سن کر آیا ہے تو وہ کہیں بھاگ نہیں جائے گا۔ چنانچہ ان دونوں کا کلام سننے کے بعد اقبال نے اپنا تازہ کلام سنایا اور پھر مجلس برخاست ہوئی۔

اقبال معقول آمدنی کے ساتھ ساتھ اپنی فکر کو تخلیق کی طرف موڑنے کی جدوجہد میں تھے۔ اقبال کی روح کی گہرائیوں میں یہ احساس تڑپ رہا تھا کہ ان کا اصل مقدر شعر کے ذریعے ایک نیا پیغام عالم اسلام تک پہنچانا ہے۔ اقبال اس ''گدھے پیٹ'' کی خاطر جو لاؤ چارہ لاؤ چارہ کا ورد کرتے ہوئے انہیں دم بھر کے لیے بھی مہلت نہ دیتا تھا، اپنی تقدیر معطل کرنے پر رضا مند نہ تھے۔ اسی بنا پر وہ اپنے مزاج کے موافق کسی ملازمت کے اختیار کرنے کو خارج از بحث قرار نہ دیتے تھے۔

اس مرحلے پر ان کی توجہ حیدر آباد دکن کی طرف مبذول ہوئی۔ حیدر آباد کی بعض علم دوست شخصیات مثلاً سر اکبر حیدری، مہاراجہ کشن پرشاد وغیرہ سے ان کا غیبی تعارف یا غالباً خط و کتابت تھی۔ نیز اقبال کے دوست غلام قادر گرامی بھی شاعر خاص نظام کی حیثیت سے وہاں مقیم تھے۔ ان اسباب کے باعث اقبال کو حیدر آباد سے کچھ اُمید تھی۔

چنانچہ وہ کالج سے دس دن کی رخصت لے کر ۱۸ مارچ ۱۹۱۰ء کی رات کو حیدر آباد روانہ ہو

گئے۔ عطیہ فیضی تحریر کرتی ہیں کہ انہوں نے اقبال کی خواہش پر اپنے عزیز سر اکبر حیدری کے نام، جو ان دنوں نظام کے معتمد فنانس تھے، اقبال کے لئے تعارفی خط ارسال کیا۔ مگر یہ بات درست معلوم نہیں ہوتی۔ عطیہ فیضی کی کتاب میں اقبال کا کوئی ایسا خط شامل نہیں۔ عطیہ فیضی کے نام خط محررہ ۳۰ مارچ ۱۹۱۰ء میں اقبال لاہور سے اپنے دورۂ حیدر آباد کی تفصیل بیان کرتے ہوئے انہیں تحریر کرتے ہیں:

اگر میں حیدر آباد میں مزید کچھ عرصہ قیام کر سکتا تو مجھے یقین ہے کہ ہز ہائی نس نظام مجھ سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کرتے۔ صرف سر اکبر و لیڈی حیدری سے ملنا میری سیاحت کا مقصد نہ تھا۔ شاید آپ انہیں جانتی ہوں۔ حیدر آباد میں ملاقات سے پیشتر مجھے ان سے واقفیت کی مسرت حاصل نہ تھی۔ ان کے ہاں میرا قیام نہایت پر لطف رہا۔

اگر اقبال عطیہ فیضی کی وساطت سے سر اکبر حیدری اور ان کی اہلیہ سے ملے ہوتے تو یہ تحریر نہ کرتے کہ شاید آپ انہیں جانتی ہوں، بلکہ متذکرہ خط میں عطیہ فیضی کی تعارفی چٹھی کا حوالہ دے کر ان کا شکریہ ادا کرتے۔

اقبال کی کسی تحریر سے پتا نہیں چلتا کہ ان کے حیدر آباد جانے کا مقصد کیا تھا۔ بہر حال غالب امکان یہ ہے کہ اگر انہیں دربار دکن میں باریابی حاصل ہو جاتی تو وہ نظام کو تصنیف و تالیف کے سلسلے میں اپنے مستقبل کے عزائم کی اہمیت سے روشناس کرانا چاہتے تھے۔

حیدر آباد میں اقبال نے سر اکبر حیدری کے ہاں قیام کیا۔ کیونکہ حیدر آباد جانے سے چند روز قبل اقبال نے اپنے ایک خط، محررہ ۱۱ مارچ ۱۹۱۰ء بنام گرامی، میں تحریر کیا:

خط لکھے ہوئے کئی دن گزر گئے، حیدری صاحب کے متعلق استفسار کیا تھا، جواب ندارد۔ دو خطوں کے جواب آپ کے ذمے ہیں۔ آپ کس عالمِ غفلت میں قیام پذیر یا تشریف فرما ہیں۔

سر اکبر حیدری اور ان کی اہلیہ علم و ادب کا نہایت عمدہ ذوق رکھتے تھے۔ انہوں نے نہ صرف اقبال کی خاطر تواضع کی بلکہ حیدر آباد کی مقتدر ہستیوں سے انہیں متعارف کرایا۔ ان میں نظم طباطبائی جو نظام کالج میں فارسی کے پروفیسر تھے، بھی شامل تھے۔ اقبال کی فرمائش پر نظم نے اپنے ایک نعتیہ قصیدے کی تشبیب کے اشعار سنائے:

پردۂ ظلمت سے نکلا روئے سلمائے سحر
ناقۂ گردوں سے کھینچی لیلیٰ شب نے مہار

اشعار سن کر اقبال نے نظم کو ان کی قادر الکلامی پر بے انتہا داد دی اور بعد میں انہوں نے نظم ہی کی زمین میں مدحیہ قصیدہ ''شکریہ'' تحریر کیا، جو مہاراجہ کشن پرشاد سے منسوب ہے۔

اقبال حیدرآباد میں گرامی کی صحبتوں سے مستفید ہوئے۔ علاوہ اس کے وہاں کے تمام اہل کمال سے ملے۔ حافظ جلیل حسن جلیل مانک پوری نے، جو داغ کے بعد استاد نظام مقرر ہوئے تھے، اقبال کے اعزاز میں ایک عشائیہ دیا، جس میں حیدرآباد کے متعدد شاعروں اور ادیبوں کو مدعو کیا گیا۔ اس تقریب میں ظہیر دہلوی بھی نقاہت اور بڑھاپے کے باوجود شامل ہوئے۔ اقبال کا اپنا بیان ہے:

میں گزشتہ سال حیدرآباد گیا تو یہ ضروری بات تھی کہ میں وہاں کے اہلِ کمال سے ملوں۔ چنانچہ حافظ جلیل حسن صاحب جلیل مانک پوری کے ہاں میری دعوت ہوئی۔ وہیں مولانا ظہیر بھی تشریف رکھتے تھے۔ مولانا نے مجھ سے شعر پڑھنے کی فرمائش کی، مگر سنانے سے زیادہ مجھے خود یہ شوق تھا کہ مولانا کی زبان سے کوئی شعر سنوں، چنانچہ میں نے عرض کیا کہ حضرت! جب تک میں پہلے آپ کی زبان سے شعر نہ سن لوں گا، اپنا شعر ہرگز نہ سناؤں گا۔ مولانا نے اس درخواست کو منظور فرمایا اور یہ شعر سنایا:

وہ جھوٹا عشق ہے، جس میں فغاں ہو
وہ کچی آگ ہے، جس میں دھواں ہو

ایک آدھ شعر اور بھی سنایا تھا مگر وہ یاد نہیں رہا۔ مولانا ظہیر اس وقت بہت ضعیف و ناتواں تھے اور اونچا سنتے تھے۔

اقبال نے حیدرآباد میں ایک نظم ''گورستانِ شاہی'' کے عنوان سے گولکنڈہ کے قطب شاہی بادشاہوں کے مقبروں سے متاثر ہو کر لکھی۔ یہ نظم ان کے حیدرآباد سے لاہور واپس آنے پر مخزن میں اقبال کے اس نوٹ کے ساتھ شائع ہوئی:

حیدرآباد دکن کے مختصر قیام کے دنوں میں میرے عنایت فرما مسٹر نذر علی بی اے، معتمدِ محکمۂ فنانس ...... مجھے ایک دن ان شاندار مگر حسرت ناک گنبدوں کی زیارت کے لیے لے گئے، جن میں سلاطینِ قطب شاہی سو رہے تھے۔ رات کی خاموشی، ابر آلود آسمان اور بادلوں سے چھن کر آتی ہوئی چاندنی نے اس پر حسرت منظر کے ساتھ مل کر میرے دل پر ایسا اثر کیا جو کبھی فراموش نہ ہو گا۔ ذیل کی نظم ان ہی بے شمار تاثرات کا اظہار ہے۔ اس کو میں اپنے سفر حیدرآباد کی یادگار میں

مسٹر حیدری اور ان کی لئیق بیگم صاحبہ مسز حیدری کے نام سے منسوب کرتا ہوں، جنھوں نے میری مہمان نوازی اور میرے قیام حیدر آباد کو دلچسپ ترین بنانے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا۔

حیدر آباد میں اقبال، مہاراجہ کشن پرشاد سے بھی ملے، جو ان دنوں ریاست کے صدر المہام تھے۔ مہاراجہ کشن پرشاد، راجا ٹوڈر مَل کی اولاد سے تھے۔ راجا صاحب کی تعلیم و تربیت اسلامی طریقے پر ہوئی تھی، لہٰذا قرآنِ مجید کی کئی سورتیں اور احادیث انھیں زبانی یاد تھیں۔ مندروں میں قشقہ لگاتے اور مسجدوں میں نماز پڑھتے تھے۔ انھوں نے اپنا موحدانہ مسلک اپنے اشعار میں یوں بیان کیا ہے:

میں ہوں ہندوٗ، میں ہوں مسلماں
ہر مذہب ہے میرا ایماں
شاد کا مذہب شاد ہی جانے
آزادی، آزاد ہی جانے

ان کے شعر و نثر کے کئی مجموعے مختلف ناموں سے شائع ہوئے اور ایک نعت کو تو یہ شرف حاصل ہوا کہ مدینہ منورہ میں مسجد نبویؐ کے پیچھے کتب خانۂ شیخ الاسلام کی ایک دیوار پر آویزاں کی گئی۔ مئی ۱۹۴۰ء میں انتقال کیا۔

حیدر آباد کے اس ہندو جاگیر دار کی فقیرانہ عادات، موروثی عجز و انکسار، نوازش کریمانہ اور وسعت اخلاق نے اقبال کا دل ہمیشہ کے لیے جیت لیا۔ دونوں کے درمیان بہت گہرے تعلقات قائم ہوئے۔ اقبال نے مہاراجہ کشن پرشاد کی تعریف میں ایک مدحیہ قصیدہ ''شکریہ'' کے عنوان سے تحریر کیا، جو مخزن میں اقبال کے نوٹ کے ساتھ شائع ہوا:

''گذشتہ مارچ میں مجھے حیدر آباد دکن جانے کا اتفاق ہوا اور وہاں آستانۂ وزارت پر حاضر ہونے ...... کا فخر بھی حاصل ہوا۔ ہز ایکسیلنسی کی نوازشِ کریمانہ اور وسعتِ اخلاق نے جو نقش میرے دل پر چھوڑا، وہ میری لوح دل سے کبھی نہیں مٹے گا۔ مزید الطاف یہ کہ جنابِ ممدوح نے میری روانگی حیدر آباد سے پہلے ایک نہایت تلطف آمیز خط لکھا اور اپنے کلام شیریں سے بھی شیریں کام فرمایا۔ ذیل کے اشعار اس عنایت بے غایت کے شکریے میں دل سے زبان پر بے اختیار آ گئے۔

اقبال ۲۳ مارچ ۱۹۱۰ء کو حیدرآباد سے واپس لاہور روانہ ہوئے۔ رستے میں اورنگ زیب عالمگیر کے مقبرے کی زیارت کی۔ مزار اورنگ زیب عالمگیر کی زیارت کے وقت اقبال کے ساتھ بڑے بھائی شیخ عطا محمد بھی تھے، لیکن وہ تعظیماً مزار پر آویزاں قنات کے اندر داخل نہ ہوئے کیونکہ بقول ان کے ان کی داڑھی غیر مشروع تھی۔

اقبال ۲۸ مارچ ۱۹۱۰ء کو لاہور پہنچے۔ اقبال کے سفر حیدرآباد کے بارے میں عطیہ فیضی کا خیال تھا کہ اس کا سبب حیدرآباد کی مالی کشش ہے۔ اس پر اقبال نے انہیں چڑ کر جواب دیا:

> میں نے کب کہا تھا کہ نظام کی قدر شناسی میرے لیے باعثِ عزت ہے۔ آپ جانتی ہیں کہ میں ایسی باتوں کی مطلق پروا نہیں کرتا۔ میں نہیں چاہتا کہ بحیثیتِ شاعر پہچانا جاؤں۔ اگرچہ بدقسمتی سے لوگ مجھے اس حیثیت سے جانتے ہیں، ابھی اگلے روز ہی مجھے نیپلز سے ایک اطالوی بیرونس کا خط موصول ہوا۔ جس نے مجھ سے میری چند نظمیں مع انگریزی ترجمہ طلب کی تھیں، لیکن شاعری کے لیے میرے دل میں کوئی ولولہ موجود نہیں اور اس کی ذمہ دار بھی آپ ہیں۔ میں کسی دیسی والی ریاست کی قدر دانی کی کیا پروا کرتا ہوں، جب کہ غیر ممالک کے باذوق اشخاص کی قدر دانی مجھے میسر ہے۔

اقبال لاہور واپس پہنچ کر حسب معمول اپنی تگ و دو میں مصروف ہو گئے۔ گزشتہ دو سالوں میں انہوں نے انجمنِ حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسوں میں کوئی نظم نہ سنائی تھی، البتہ انگریزی میں لیکچر دیے تھے۔ انجمن کے سالانہ اجلاسوں میں شرکت نہ کرنے کا سبب انجمن کی دھڑے بندیاں تھیں۔ تاہم ایک ثالثی مجلس جس کے اقبال بھی رکن تھے کی کوششوں سے انجمن کے خلاف مقدمات واپس لے لیے گئے۔

اقبال کا یہ دور بے حد مصروفیت کا دور تھا۔ اس لیے ۱۹۰۸ء سے لے کر ۱۹۱۰ء تک جو معروف نظمیں مخزن میں شائع ہوئیں وہ چھ سے زاید نہ تھیں "پیامِ عشق" (اکتوبر ۱۹۰۸ئ) "عبدالقادر کے نام" (دسمبر ۱۹۰۸ئ) "بلادِ اسلامیہ" (اپریل ۱۹۰۹ئ) "شکریہ" (جون ۱۹۱۰ئ) "گورستان شاہی" (جون ۱۹۱۰ئ) اور "فلسفہ غم" (جولائی ۱۹۱۰ئ) اسی عہد میں چھپیں، گو "پیامِ عشق" اور "عبدالقادر کے نام" قیامِ یورپ کے آخری ایام میں تحریر کی گئی تھیں۔ اس دور میں اقبال نے چند انگریزی مقالات بھی تحریر کیے جن کا جائزہ مناسب مقام پر لیا جائے گا۔ علاوہ ازیں انہوں نے اپنے افکار ایک بیاض میں نوٹس کی صورت میں جمع کرنے شروع

کیے۔

اقبال کی مشکل یہ تھی کہ معلمی اور وکالت کے دو پیشے بیک وقت اختیار کرنے سے وہ کوئی کام بھی یکسوئی سے نہ کر سکتے تھے۔ شاعری کی طرف توجہ دینے کا وقت تو نکلتا ہی نہ تھا۔ ۱۹۱۰ء میں انہیں یہ پیشکش بھی ہوئی کہ گورنمنٹ کالج میں مستقل طور پر شعبۂ فلسفہ کی صدارت قبول کر لیں۔ لیکن یہ اسی صورت ممکن تھا جب کہ آپ وکالت کے پیشے کو خیر باد کہہ دیتے۔ احباب سے مشورہ کیا گیا۔ مرزا جلال الدین تحریر کرتے ہیں:

ہم سب نے یہی رائے دی کہ سرکاری ملازمت میں اوّل تو قوت عمل کے سلب ہونے کا احتمال ہے، دوسرے محکمہ تعلیم میں وسعت کے امکانات بہت محدود ہیں۔ چنانچہ اگر سرکاری ملازمت پر ہی نگاہ ہو تو وکالت ہی کیوں نہ رکھی جائے، جس میں ترقی کے جملہ مدارج میں جج کا عہدہ بھی ہے۔ اسی پر انہوں نے کالج سے تعلقات منقطع کر لیے اور وکالت پر اکتفا کی۔

گورنمنٹ کالج کی ملازمت سے اقبال ۳۱ دسمبر ۱۹۱۰ء کو سبکدوش ہو گئے۔ سبکدوشی کے متعلق وہ کافی عرصہ پہلے ہی سے سوچ رہے تھے۔ چنانچہ عطیہ فیضی کے نام اپنے ایک خط محررہ ۱۷ جولائی ۱۹۰۹ء میں تحریر کرتے ہیں:

حالات نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ میں مختلف امور پر مالی نقطہ نظر سے غور کروں اور یہ نقطہ نظر وہ ہے، جس سے چند برس پیشتر مجھے دلی کراہت تھی۔ میں نے طے کر لیا ہے کہ خدائی امداد پر بھروسا کرتے ہوئے اپنے قانونی پیشے کو جاری رکھوں گا۔

سبکدوشی کے موقع پر کالج کی طرف سے انہیں ایک الوداعی پارٹی دی گئی اور انہوں نے طلبہ کو ''رابرٹ براؤننگ کی شاعری'' کے موضوع پر اپنا آخری لیکچر دیا۔ اس کے بعد بھی اقبال کالج کے مشاعروں میں منصف کے فرائض انجام دیتے۔

اسی طرح پنجاب یونیورسٹی اور دیگر یونیورسٹیوں سے بھی ان کا تعلق قائم رہا۔ انہوں نے ۱۹۰۰ء سے لے کر ۱۹۳۷ء تک مڈل، انٹرنس، ایف اے، بی اے، ایم اے، بی او ایل، ایم او ایل، ایف ای ایل، ایل ایل بی وغیرہ، حتیٰ کہ ای، ایس۔ سی اور سول سروس کے امتحانات کے پرچے مرتب کیے۔ اس کے علاوہ پنجاب، علی گڑھ، الہ آباد، ناگپور اور دہلی یونیورسٹیوں کے ممتحن رہے، بیت العلوم حیدر آباد دکن کے لیے بھی تاریخ اسلام کے پرچے مرتب کرتے رہے، وہ عموماً تاریخ، فلسفہ، انگریزی، اردو، فارسی، عربی اور قانون کے پرچے بناتے تھے۔ بعض

اوقات زبانی امتحان کے لیے لاہور سے باہر یعنی علی گڑھ، الہ آباد، ناگپور وغیرہ بھی جاتے۔ ممتحن یا ممتحن اعلیٰ کی حیثیت سے کبھی سفارش قبول نہ کرتے اور اگر کوئی عزیز سے عزیز تر دوست بھی سفارش کرنے کی جسارت کرتا تو ناراض ہو جاتے۔ اقبال کے گوشوارہ آمدنی کی پڑتال سے ظاہر ہوتا ہے کہ ممتحن کی حیثیت سے مختلف یونیورسٹیوں کے لیے پرچے ترتیب دینا ان کی آمدنی کا ایک ذریعہ تھا۔

پنجاب یونیورسٹی کے ریکارڈ سے عیاں ہے کہ انہیں ۲ مارچ ۱۹۱۰ء کو یونیورسٹی کا فیلو نامزد کیا گیا۔ تب اقبال کا تعلق ابھی گورنمنٹ کالج سے قائم تھا۔ انہوں نے لالہ رام پرشاد پروفیسر تاریخ گورنمنٹ کالج لاہور کے اشتراک سے نصابی کتاب تاریخ ہند مرتب کی، جو ۱۹۱۳ء میں شائع ہوئی۔ رفتہ رفتہ انہیں ممبر اورینٹل و آرٹس فیکلٹی، ممبر سینٹ اور ممبر سنڈیکیٹ بنا دیا گیا۔ کنوینر بورڈ آف سٹڈیز کی حیثیت سے وہ فلسفہ، عربی اور فارسی کے شعبوں سے متعلق بورڈ کے اجلاسوں میں بھی شریک ہوتے تھے۔ بورڈ کا کام ان مضامین کے نصاب تیار کرنا، ماہرین کی خدمات حاصل کرنا، طلبہ کے مسائل اور ان کا حل تلاش کرنا اور اپنی سفارشات یونیورسٹی سنڈیکیٹ کو پیش کرنا تھا۔ ۱۹۱۹ء میں اقبال اورینٹل فیکلٹی کے ڈین منتخب کیے گئے۔ ۱۹۲۳ء میں یونیورسٹی کی اکیڈیمک کونسل کے رکن چنے گئے۔ اسی سال وہ پروفیسر شپ کمیٹی کے رکن بھی مقرر ہوئے۔ اس کمیٹی کا تعلق یونیورسٹی کے لیے لیکچراروں اور پروفیسروں کی تقرری سے تھا، یونیورسٹی کے کام کی زیادتی اور اپنی عدیم الفرصتی کے پیش نظر انہوں نے اسی سال اکیڈیمک کونسل سے استعفا دینا چاہا، لیکن سر جان مینارڈ وائس چانسلر کی درخواست پر واپس لے لیا۔ ۱۹۲۴ء میں اقبال یونیورسٹی کی اس کمیٹی کے ممبر نامزد کیے گئے، جس کا تعلق یونیورسٹی کی انتظامیہ، مشاورتی کمیٹیوں اور انتخابات وغیرہ کی کارکردگی کو بہتر بنانے کے لیے تجاویز پیش کرنا تھا۔ ۱۹۲۵ء میں اقبال کی زیرنگرانی حکیم احمد شجاع نے ان کے نظریات و رجحانات کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے سلسلۂ ادبیہ کے نام سے چھٹی، ساتویں اور آٹھویں جماعتوں کے لیے اردو کورس کی تین کتابیں مرتب کیں، جنہیں ٹیکسٹ بک کمیٹی نے اپنے اجلاس بتاریخ ۱۲ جنوری ۱۹۲۵ء کو نصاب میں شامل کرنے کی منظوری دے دی۔ اقبال پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کے رکن بھی رہے۔ میٹرک کے طلبہ کے لیے انہوں نے ایک فارسی کتاب آئینہ عجم بھی مرتب کی، جسے میسرز عطر چند کپور انارکلی بازار لاہور نے ۱۹۲۷ء میں شائع کیا۔

پنجاب یونیورسٹی سے اقبال کا عملی تعلق ۱۹۲۳ء تک رہا۔ اس کے بعد دیگر قسم کی مصروفیات یا علالت کے باعث انہوں نے یونیورسٹی کے امور میں دلچسپی لینا چھوڑ دی۔ ۲۳ نومبر ۱۹۲۹ء میں علی گڑھ انٹر میڈیٹ کالج یونین کی اعزازی لائف ممبر شپ بھی انہیں دی گئی۔ تقریب میں شرکت کے لیے اقبال علی گڑھ گئے۔ ۲۳ر دسمبر ۱۹۳۴ء کو انہیں علی گڑھ یونیورسٹی کی طرف سے ڈی لٹ کی ڈگری پیش کی گئی۔ پنجاب یونیورسٹی نے بھی اقبال کی علمی، ادبی، تدریسی اور تعلیمی خدمات کے اعتراف کے طور پر ۴ دسمبر ۱۹۳۳ء کو انہیں ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی۔ ۱۹۳۷ء میں الہ آباد یونیورسٹی نے اپنی جوبلی کے موقع پر اقبال کو ڈی لٹ کی ڈگری سے نوازا اور اسی سال عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن سے بھی انہیں ڈی لٹ کی ڈگری موصول ہوئی۔

اب اقبال کے بے تکلف احباب میں مرزا جلال الدین، نواب سر ذوالفقار علی خان، سر جوگندر سنگھ کے علاوہ سردار امراؤ سنگھ شیر گل (مشہور آرٹسٹ امرتا شیر گل کے والد) بھی شامل ہو گئے تھے۔ ان کا معمول تھا کہ شام کی چائے نواب سر ذوالفقار علی خان کے ہاں پیتے، اور زیادہ وقت انہی کے ساتھ گزارتے۔

مرزا جلال الدین کے ہاں بعض اوقات رات کو محفل رقص و سرود بھی برپا ہوا کرتی تھی۔ ان محافل میں اقبال کی موجودگی سے ان کی ظرافت سے بھرپور طبیعت اور ذوق شعری کے باعث رونقیں رہتیں۔

۱۹۱۲ء کی ایک شام سر جوگندر سنگھ، اقبال اور مرزا جلال الدین کو مہاراجہ رنجیت سنگھ کی پوتی راجکماری صوفیہ جنداں بمبا کے ہاں لے گئے۔ دوران گفتگو شعر و سخن بھی موضوع رہے۔ راجکماری نے اقبال کی بہت قدردانی کی۔

بمبا نے اقبال کو ایک آدھ بار پھر اپنے ہاں چائے پر بلایا، کیونکہ ان کی ایک آسٹرین سہیلی فراؤلین گوٹسمین اقبال سے ملنے کی آرزومند تھیں۔ چند دنوں بعد ایک شام بمبا نے فراؤلین گوٹسمین اور اپنی ایک اور یورپین سہیلی کے لیے شالا مار باغ میں چائے کا انتظام کیا، جس میں اقبال بھی مدعو تھے۔ فراؤلین گوٹسمین نے باغ میں سے ایک پھول توڑ کر اقبال کی خدمت میں پیش کیا، جس سے متاثر ہو کر وہ نظم لکھی گئی جو بانگِ درا میں ''پھول کا تحفہ عطا ہونے پر'' کے عنوان سے شامل ہے۔ دوسری سہیلی نے ایک خوبصورت بلی پال رکھی تھی جو اس کی گود میں بیٹھی ہوئی تھی۔

اقبال نے اس پر بھی نظم ''......کی گود میں بلی دیکھ کر'' کہی، جو بانگِ درا میں موجود ہے۔

اس زمانے میں پنجاب میں سیاست برائے نام تھی، پھر بھی لاہور میں دو سیاسی دھڑے موجود تھے، ایک کی قیادت سر محمد شفیع کے ہاتھ میں اور دوسرے کی سر فضل حسین کے ہاتھ میں تھی۔

اقبال کے میاں شاہ دین، سر محمد شفیع اور سر فضل حسین سب سے دوستانہ مراسم تھے۔ اس کے علاوہ ابھی تک انہوں نے پنجاب کی عملی سیاست میں حصہ لینا شروع ہی نہیں کیا تھا۔ اس لیے انہوں نے سیاسی پارٹی بازی سے اپنے آپ کو، جہاں تک ممکن ہو سکا، الگ تھلگ رکھا۔ اقبال نے پنجاب کی عملی سیاست میں ۱۹۲۶ء سے دلچسپی لینا شروع کی تھی ہو سکتا ہے وہ سر فضل حسین کے اصرار پر یونینسٹ پارٹی میں شامل ہو گئے ہوں۔ بعد میں سیاست کے میدان میں سر فضل حسین اور اقبال میں شدید اختلافات رونما ہوئے اور سر عبدالقادر کے ساتھ دوستی میں بھی وہ گرم جوشی نہ رہی۔

۱۹۱۱ء تک برصغیر کے بیشتر مسلم قائدین سر سید احمد خان کے بتائے ہوئے رستے پر چلتے ہوئے انگریزی حکومت سے وفاداری کا دم بھرتے تھے، مگر ۱۹۱۱ء اور ۱۹۱۴ء کے درمیانی عرصے میں بعض ایسے حالات پیدا ہوئے کہ اس اندازِ فکر میں تبدیلی آ گئی۔ ۱۹۱۱ء میں اقبال بھی اپنے گردونواح سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، اور اپنی ذاتی محرومیوں، مسلمانانِ ہند کی مایوسیوں اور دنیائے اسلام پر پے درپے نازل ہوتی ہوئی مصیبتوں کے ردِّعمل کے طور پر ان کا جذبِ اندروں ''شکوہ'' جیسی معرکۃ الآرا نظم کی صورت میں پھوٹ نکلا۔

نظم ''شکوہ'' ریواز ہوسٹل اسلامیہ کالج کے صحن میں منعقدہ انجمنِ حمایتِ اسلام کے اپریل ۱۹۱۱ء والے سالانہ اجلاس میں پڑھی گئی۔ انجمن کے جلسوں میں پڑھی جانے والی اقبال کی نظمیں عموماً چھپوا کر لائی جاتی تھیں، مگر اس مرتبہ نظم کے متعلق پردہ داری سے کام لیا گیا۔ مرزا جلال الدین تحریر کرتے ہیں:

ڈاکٹر صاحب اپنے خاص دوستوں کی صحبت میں عموماً تازہ اشعار بلا کسی فرمائش کے خود بخود سنا دیا کرتے، مگر جس زمانے میں وہ ''شکوہ'' لکھ رہے تھے، انہوں نے حد درجہ خاموشی سے کام لیا۔ جس شام انجمنِ حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسے میں فقیر سید افتخار الدین مرحوم کی صدارت میں آپ یہ نظم سنانے والے تھے، اسی شام آپ اپنے والد صاحب کے ہمراہ میرے ہاں مدعو

تھے۔ ہم کھانا ختم کر رہے تھے کہ انجمن کے سیکرٹری صاحب مع چند اراکین کے ہانپتے ہوئے تشریف لائے اور پریشانی کے عالم میں کہا کہ نظم کا وقت شروع ہونے والا ہے اور سامعین شدت سے انتظار کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب فی الفور اٹھ کھڑے ہوئے اور ہم سمجھ گئے کہ اس مرتبہ کوئی معرکۃ الآرا نظم ہوگی، جس کے لیے اس قدر پردہ داری سے کام لیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب پنڈال میں داخل ہوئے تو ہمیشہ کی طرح اللہ اکبر کے فلک شگاف نعروں سے ان کا استقبال کیا گیا۔ اس کے بعد تالیوں کے شور میں ڈاکٹر صاحب نظم سنانے کے لیے اٹھے۔

اقبال نے شلوار اور چھوٹا کوٹ پہن رکھا تھا۔ سر پر ترکی ٹوپی تھی۔ سب سے پہلے انہوں نے ایک قطعہ تحت اللفظ پڑھا، جس کے دو مصرعے یہ تھے:

ڈھب مجھے، قوم فروشی کا نہیں یاد کوئی
اور پنجاب میں ملتا نہیں استاد کوئی

جب نظم پڑھنے لگے تو مختلف اطراف سے صدائیں بلند ہونے لگیں کہ ترنم سے پڑھیے۔ کیونکہ انجمن کے جلسوں میں اقبال عموماً اپنی نظمیں ترنم سے پڑھا کرتے تھے، سو ''شکوہ'' ترنم سے پڑھی گئی۔ سر عبدالقادر جو جلسے میں موجود تھے، رقم طراز ہیں:

اقبال نے اپنی مشہور نظم ''شکوہ'' اپنے خاص انداز میں پڑھی۔ بہت لوگوں کو یاد ہوگا، جب کیف غم کا سماں جلسے پر چھایا ہوا تھا۔ ان کے بہت سے مداح پھولوں سے جھولیاں بھر کر لائے تھے اور جب وہ پڑھ رہے تھے تو ان پر پھول برسا رہے تھے۔ اس وقت کی ایک اور بات خاص طور پر قابل دید تھی کہ اقبال کا معمر باپ اس نظم کے سننے والوں میں موجود تھا۔ باپ کی آنکھوں میں بیٹے کی کامیابی دیکھ کر خوشی کے آنسو تھے مگر لبوں پر تاثیر کلام سے وہی علامات غم تھیں جو بیٹے کے چہرے پر تھیں۔ درحقیقت یہ خصوصیت بیٹے نے باپ سے ورثے میں پائی تھی۔ اقبال کے والد ایک صوفی منش بزرگ تھے، مگر ان کا رنگ تصوف ایسا نہ تھا کہ ان کو زندگی کے روزمرہ فرائض سے بے پروا کر دے۔ ساری عمر اپنی دس انگلیوں کی محنت سے روزی کمائی۔ 'دل بہ یار دست بکار' پر ان کا عمل تھا۔ دل خدا کی طرف اور ہاتھ کام پر لگے رہتے تھے۔

اقبال جب نظم پڑھ چکے تو ان کے مداح خواجہ عبدالصمد ککڑو رئیسِ بارہ مولا آگے بڑھے اور جوشِ مسرت میں اپنا قیمتی دوشالہ اقبال کے شانوں پر ڈال دیا۔ اقبال نے یہ دوشالہ انجمن کے منتظمین کو دے دیا۔ دوشالہ مجمع عام میں نیلام ہوا اور سب سے بڑی بولی ختم ہونے پر جو رقم

وصول ہوئی، انجمن کی تحویل میں دے دی گئی۔

۱۹۱۱ء کے سال میں اقبال نے کئی معروف نظمیں کہیں۔ ''ترانہ ملی'' اسی دور کی پیداوار ہے۔ ۶ اکتوبر ۱۹۱۱ء کو انہوں نے بادشاہی مسجد لاہور میں مسلمانوں کے مجمع عام میں اپنی نظم ''حضور رسالت مآب میں'' پڑھی یہ نظم ان نظموں میں سے ایک ہے جو جنگِ طرابلس سے متاثر ہوکر لکھی گئیں۔ جنگِ طرابلس میں ترکوں کی فتح کے بارے میں اکبرالٰہ آبادی کے نام اپنے خط محررہ ۹ نومبر ۱۹۱۱ء میں تحریر کرتے ہیں:

ترکوں کی فتح کا مژدۂ جاں فزا پہنچا، مگر اس کا کیا علاج کہ دل کو پھر بھی اطمینان نہیں ہوتا۔ معلوم نہیں روح کیا چاہتی ہے اور آنکھوں کو کس نظارے کی ہوس ہے۔ میں ایک زبردست تمنا کا احساس اپنے دل میں کرتا ہوں۔ گو اس تمنا کا موضوع مجھے اچھی طرح سے معلوم نہیں۔ ایسی حالت میں مجھے مسرت بھی ہو تو اس میں اضطراب کا عنصر غالب رہتا ہے۔

دسمبر ۱۹۱۱ء میں اقبال کو آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی صدارت اور انہیں خراج تحسین پیش کرنے کے لئے دعوت دی گئی۔ اجلاس میں مولانا شبلی، مولانا شاہ سلیمان پھلواروی، سیّد سجاد حیدر یلدرم اور خواجہ کمال الدین کے علاوہ، سر آغا خان، سید حسین بلگرامی، اعیان وارکان حکومت، رہبران وفرمان روایان ریاستہائے ہند اور برصغیر کی دیگر مسلم برگزیدہ ہستیاں موجود تھیں۔ اقبال نے کانفرنس کے اجلاس کی تیسری نشست کی صدارت کی مگر جس نشست میں ان کے گلے میں ہار پہنانے کی رسم ادا کی جانے والی تھی، اس کی صدارت مولانا شاہ سلیمان پھلواروی نے کی۔ اس اجلاس میں خواجہ کمال الدین نے ''اسلام اور علومِ جدیدہ'' کے موضوع پر لیکچر دیا اور اپنی تقریر کے اختتام پر اقبال کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

کہاں ہے تو ڈاکٹر اقبال! خدائے تعالیٰ تجھے دین و دنیا میں با اقبال کرے۔ تیرے نادر قوائے ذہنی ابھی دنیا کی نظروں سے چھپے ہوئے ہیں۔ تجھ میں وہ ذہنی قابلیتیں اور استعدادیں ہیں کہ ان کا ٹھیک استعمال بقائے دوام کا تاج تیرے سر پر رکھ سکتا ہے، لیکن یہ خاص الخاص قویٰ تجھے اس لیے عطا نہیں ہوئے کہ تو فی کل وادیھیمون کا مصداق بن کر ایک بے ثمر باغ میں جس کا نام مشاعرہ ہے، گلگشت کرے۔ اب وقت ہے، اٹھ! اور حقیقی تلمیذ الرحمن بن! عالم سفلی کو چھوڑ اور طائرِ قدس ہو جا! تجھے اگر مغربی حکمت و فلسفہ انہوں نے سکھا کر ڈاکٹر کا خطاب دیا تو یہ قرضہ ترانوں اور نغموں سے ادا نہیں ہوسکتا۔ اس کا معاوضہ یہ ہے کہ تو قرآن کو کھولے اور اس کے

دریائے حقیقت میں غوطہ لگائے اور اس سے حکمت و فلسفہ حقّہ کے دُرِّ شہوار نکالے......قوم تجھے ملک الشعراء بنانا چاہتی ہے اور وہ ایسا کرنے میں غلطی پر ہے اور تو پست ہمت ہوگا اگر اس پر قانع ہوا میں تجھ میں رازی اور غزالی کا بروز دیکھنا چاہتا ہوں۔

خواجہ کمال الدین کے جواب میں اقبال نے اپنی تقریر میں کہا:

خواجہ صاحب نے جو تقریر اس وقت کی ہے، وہ نہایت دلچسپ اور معنی خیز ہے......اس زمانے میں مسلمانوں نے اس مبحث پر بہت کچھ لکھا ہے کہ اسلام اور علوم جدیدہ کے مابین کیا تعلق ہے؟ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اسلام مغربی تہذیب کے تمام عمدہ اصولوں کا سرچشمہ ہے۔ پندرہویں صدی عیسوی میں جب سے کہ یورپ کی ترقی کا آغاز ہوا، یورپ میں علم کا چرچا مسلمانوں ہی کی یونیورسٹیوں سے ہوا تھا۔......غرض یہ کہ تمام وہ اصول جن پر علومِ جدیدہ کی بنیاد ہے، مسلمانوں کے فیض کا نتیجہ ہیں، بلکہ میرا دعویٰ ہے کہ نہ صرف علومِ جدیدہ کے لحاظ سے بلکہ انسان کی زندگی کا کوئی پہلو اور اچھا پہلو ایسا نہیں ہے کہ جس پر اسلام نے بے انتہا روح پرور اثر نہ ڈالا ہو۔

اس کے بعد سجاد حیدر یلدرم نے مولانا شبلی سے درخواست کی کہ وہ اقبال کو پھولوں کے ہار پہنائیں۔ مولانا شبلی نے اپنی مختصر سی تقریر میں اس تقریب کی اہمیت اور اقبال کی عزت افزائی کے حوالے سے گفتگو کی۔ اس کے بعد انہوں نے اقبال کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈالا۔ اقبال نے اس عزت افزائی کے لیے قوم کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا:

میری نظموں کے متعلق بعض ناخدا ترس لوگوں نے غلط باتیں مشہور کر رکھی ہیں اور مجھ کو پان اسلام ازم کی تحریک پھیلانے والا بتایا جاتا ہے۔ مجھ کو پان اسلامسٹ ہونے کا اقرار ہے اور میرا یہ اعتقاد ہے کہ ہماری قوم ایک شاندار مستقبل رکھتی ہے اور جو مشن اسلام کا اور ہماری قوم کا ہے، وہ ضرور پورا ہو کر رہے گا شرک اور باطل پرستی دنیا سے ضرور مٹ کر رہے گی اور اسلامی روح آخر کار غالب آئے گی۔......جس قوم اور جس مذہب کا اصول الملک اللہ ہو، اس کے مستقبل سے ناامیدی نہیں ہوسکتی اور یہی وہ پان اسلام ازم ہے، جس کا شائع کرنا ہمارا فرض ہے اور اسی قسم کے خیالات کو میں اپنی نظموں میں ظاہر کرتا ہوں۔

جلسے کے اختتام پر صاحبِ صدر مولانا شاہ سلیمان پھلواروی نے اپنے خطبۂ صدارت میں اقبال کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا:

ایک اور قابلِ ذکر امر میرے عزیز دوست، فخرِ قوم، پروفیسر اقبال صاحب کو ان کی قومی شاعری

کی سند میں پھولوں کے ہار پہنائے جانے کا بھی ہے۔...... ڈاکٹر اقبال ان شاعروں میں ہیں، جن کو قرآن حکیم میں الا الذین امنوا سے مستثنیٰ کر دیا گیا۔ یہ ان لوگوں میں ہیں، جن کی شان یہ بتائی گئی کہ **فبشر عبادی الذین یسمعون القول فیتبعون احسنہٗ** مسٹر اقبال تو احسن القول والے ممدوح شاعر ہیں۔ ان کی قومی شاعری اب اس عام مقبولیت کو پہنچ گئی ہے کہ قومی جلسوں میں، مولود اور وعظ کی محفلوں میں ان کے قومی ترانے اور ان کی نعتیہ نظمیں پڑھی جاتی ہیں...... ان کا ترانہ یہ ہے کہ زمین ہماری، آسمان ہمارا، چین ہمارا، ہندوستان ہمارا، یہاں تک کہ مسلم ہیں ہم وطن ہیں سارا جہاں ہمارا۔ خیر ہم بھی کہتے ہیں کہ خدا کرے سارا جہاں تمہارا ہو جائے اور کوئی نہ ہو تو ہم تمہارے ہیں۔

ہندوؤں کے دباؤ کے تحت تقسیمِ بنگال کی تنسیخ مسلمانوں کے لیے بلاشبہ ایک اہم سبق تھا۔ قیصر ہند جارج پنجم کی رخصتی کے بعد اس سلسلے میں یکم فروری ۱۹۱۲ء کو باغِ بیرونِ موچی دروازہ مسلمانوں کا ایک جلسۂ عام ہوا، جس میں اقبال نے تقریر کرتے ہوئے کہا:

مسلمانوں کو اپنی ترقی کے لیے خود ہاتھ پاؤں مارنے چاہییں۔ ہندوؤں کو اب تک جو کچھ ملا ہے، محض اپنی کوششوں سے ملا ہے۔ اسلام کی تاریخ کو دیکھو، وہ کیا کہتی ہے۔ عرب کے خطے کو یورپین معماروں نے ردی اور بیکار پتھر کا خطاب دے کر یہ کہہ دیا تھا کہ اس پتھر پر کوئی بنیاد کھڑی نہیں ہو سکتی۔ ایشیاء اور یورپ کی قومیں عرب سے نفرت کرتی تھیں، مگر عربوں نے جب ہوش سنبھالا اور اپنے کس بل سے کام لیا تو یہی پتھر دنیا کے ایوان تمدن کی محراب کی کلید بن گیا اور خدا کی قسم روما جیسی باجبروت سلطنت عربوں کے سیلاب کے آگے نہ ٹھہر سکی۔ یہ اس قوم کی حالت ہے جو اپنے بل پر کھڑی ہوئی۔

۱۶ اپریل ۱۹۱۲ء کو انجمنِ حمایتِ اسلام کے سالانہ اجلاس میں اقبال نے اپنی مشہور نظم ''شمع و شاعر'' پڑھ کر سنائی۔ نظم چونکہ طویل تھی، اس لیے دو نشستوں میں سنائی گئی۔ سامعین کی تعداد دس ہزار کے لگ بھگ تھی۔ نظم پڑھنے سے پہلے انہوں نے اپنی تقریر میں کہا:

میں اپنی نظم کی طرف خاص توجہ انگریزی تعلیم یافتہ نوجوانوں کو دلاتا ہوں۔ میرا شعر لکھنا خاص خاص احساس کا ایک نمونہ ہے۔ میری آج کی نظم ایسی جامع ہے، جس میں مشکلات کی تصویر اور ان کے حل کرنے کا نسخہ درج ہوگا۔ یہ زمانہ اہل اسلام کی تاریخ میں سخت پولیٹیکل ٹائم ہے۔ خدا کے واسطے تم توجہ کرو اور اسلام کی عزت بڑھانے کے لیے پوری سرگرمی سے کام لو۔ میری نظم کا عنوان ''شمع و شاعر'' کا مناظرہ ہے۔

اس سال برصغیر کے لیے لازمی تعلیم کا بل امپیریل قانون ساز کونسل میں پیش ہوا۔ اس کی حمایت میں ایک جلسہ لاہور میں بھی ہوا، جس کی صدارت اقبال نے کی۔ انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا:

لفظ جبر سے کسی کو کھٹکنا نہیں چاہیے۔ جس طرح چیچک کا ٹیکا لازمی اور جبری قرار دیا گیا ہے اور یہ لزوم و جبر اس شخص کے حق میں کسی طرح مضر نہیں ہوسکتا جس کے ٹیکا لگایا جاتا ہے، اسی طرح جبر یہ تعلیم بھی قابلِ اعتراض متصور نہیں ہوسکتی۔ جبر یہ تعلیم بھی گویا روحانی چیچک کا ٹیکا ہے۔ اسلام میں جبر کی تعلیم موجود ہے۔ مسلمانوں کو حکم ہے کہ اپنے بچوں کو زبردستی نماز پڑھائیں۔

''شکوہ'' پر بعض علماء نے اعتراض کیا تھا کہ نظم کا لب ولہجہ گستاخانہ ہے۔ اقبال نے اس کی تلافی ''جوابِ شکوہ'' میں کی جو نومبر ۱۹۱۲ء میں موچی دروازے کے باہر باغ میں ایک بہت عظیم الشان جلسے میں عوام کے جمِ غفیر کے سامنے جنگِ بلقان کے ترک مجاہدین کے لیے چندہ جمع کرنے کی خاطر پڑھی گئی۔ اس نظم کا ایک ایک شعر نیلام ہوا اور ایک بھاری رقم بلقان فنڈ کے لیے جمع ہوگئی۔

سرسید کی طے کردہ حکمت عملی کے تحت مسلمان ابھی تک عملی سیاست سے لاتعلق تھے مگر ۱۹۱۲ء میں مولانا شبلی نے مسلمانوں کو ''پولیٹیکل کروٹ'' کے زیرِ عنوان سیاسی مضامین میں عملی کردار کی طرف بلایا۔ انہوں نے لکھا کہ آئیڈیل ہی ایک ایسی شے ہے جو دنیا میں انسانوں کو عمل پر اکساتی ہے۔ مسلمانوں کا آئیڈیل کیا ہے؟ ان کا نصب العین کیا ہے؟ یونیورسٹیوں سے ڈگریاں حاصل کر کے انگریزی حکومت کی ملازمت اختیار کرنا۔ کیا یہ آئیڈیل ان میں بلند اور ارفع جذبات پیدا کرسکتا ہے؟ کیا یہ نصب العین ان کے دلوں میں اعلیٰ مقاصد کی تحصیل کے لیے تمنا پیدا کرسکتا ہے؟ مسلمانوں کے پست نظریات نے انہیں بے حد نقصان پہنچایا ہے۔ ان میں سیاسی شعور کی نشوونما روک دی گئی ہے۔ اسی سبب ان کی سیاسی لغت میں آزادی کے لیے جدوجہد کرنے کے معنی بغاوت ہیں۔ بہرحال غفلت کا دور گزر چکا۔ اب مسلمانوں میں سیاسی شعور پیدا ہوگیا ہے اور یہ فیصلہ کرنا باقی ہے کہ اس نئی زندگی میں انہیں کیا لائحۂ عمل اختیار کرنا چاہیے؟ مسلمانوں کو اب سرسید کا بتایا ہوا مصلحت پر مبنی راستہ چھوڑ کر اپنے قدموں پر کھڑا ہونا چاہیے کیونکہ مسلم لیگ کی موجودہ پالیٹکس اور نظام ترکیب کسی صورت بھی مسلمانوں کے قومی مقاصد سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ مسلم لیگ ایسے اہل ثروت کے دست کرم کی رہین منت ہے جو کسی قومی تحریک کے لئے کوئی قربانی نہیں دے سکتی۔ لہٰذا وقت کا تقاضا یہ ہے کہ مسلم لیگ کا مسلم

عوام سے رابطہ بحال کیا جائے اور اس کے رکن ایسے لوگ ہو جو اپنی رائے کا آزادی سے اظہار کرے۔ مسلمانوں کے مسائل کے حل کے لئے مسلم لیگ عوامی سطح پر شعور بیدار کرے اور ہندو مسلم اتحاد کے لئے کوشش کرے۔

ان خیالات کے اظہار سے مسلم لیگ کی اصلاح کی کوششیں شروع ہوگئیں جس کا ایک اظہار ۱۹۱۳ء کے اجلاس میں لیگ کے آئین میں ترمیم تھا۔ اب رفتہ رفتہ لیگ کی قیادت پر نوجوان مسلم رہنما چھانے لگے۔ اس زمانے میں اقبال کی شاعری میں مغربی تصور وطنیت کی نفی اور اسلام کے تصور ملت کی وضاحت کا رنگ ملتا ہے۔ ۱۹۱۳ء میں خواجہ حسن نظامی کے نام اپنے ایک خط میں تحریر کرتے ہیں:

> مسلمانان ہندوستان کی بیداری کے پانچ اسباب جو آپ نے اس ہفتے کے توحید میں ارقام فرمائے ہیں۔ بالکل بجا ہیں۔ لیکن آپ نے یہ نہیں لکھا کہ اقبال، جس نے اسلامی قومیت کی حقیقت کا راز اس وقت منکشف کیا جب ہندوستان والے اس سے غافل تھے، اور جس کے اشعار کی تاریخ زمیندار، کامریڈ، بلقان، طرابلس اور نواب وقارالملک کی حق گوئی کی تاریخ سے پہلے کی ہے، کس کا خوشہ چیں ہے؟ شاعروں کی بدنصیبی ہے کہ ان کا کام برا بھلا جو کچھ بھی ہو، غیر محسوس ہوتا ہے۔

اس زمانے میں، ان پر یاسیت کا عالم طاری رہا۔ وہ بظاہر اپنے احباب میں اپنے آپ کو خوش رکھنے کی کوشش کرتے اور اپنے باطنی اضطراب کا اظہار کسی پر بھی نہ کرتے تھے۔ اس پریشانی کی طرف اشارہ ان کے ایک خط میں موجود ہے جو ۶ اکتوبر ۱۹۱۱ء کو اکبرالہ آبادی کے نام لکھا گیا۔ فرماتے ہیں:

> لاہور ایک بہت بڑا شہر ہے لیکن میں اس ہجوم میں تنہا ہوں۔ ایک فرد واحد بھی ایسا نہیں، جس سے دل کھول کر اپنے جذبات کا اظہار کیا جا سکے:
>
> طعنہ زن ہے ضبط، اور لذت بڑی، افشا میں ہے
> ہے کوئی مشکل سے مشکل رازداں کے واسطے
>
> لارڈ بیکن کہتے ہیں جتنا بڑا شہر ہو، اتنی ہی بڑی تنہائی ہوتی ہے۔ سو یہی حال میرا لاہور میں ہے۔ اس کے علاوہ گذشتہ چند ماہ میں بعض معاملات کی وجہ سے سخت پریشانی رہی اور مجھے بعض کام اپنی فطرت اور طبیعت کے خلاف کرنے پڑے۔

اقبال یورپ سے واپس آ جانے کے باوجود نفسیاتی طور پر ابھی تک ایک لحاظ سے یورپ ہی میں تھے۔ عملی زندگی کی تلخیوں، مالی مشکلات، ازدواجی زندگی کی بے سکونی اور ذہنی کرب و اضطراب کے اس دور میں جرمنی میں ان کی خط و کتابت فراؤلین ایما ویگے ناست سے جاری تھی، جسے وہ ایک اچھی اور سچی لڑکی سمجھ کر پسند کرتے تھے۔

چنانچہ یورپ سے واپس آ کر انہیں پہلا خط سیالکوٹ سے ۳ ستمبر ۱۹۰۸ء کو لکھا۔ فرماتے ہیں:

میں یہاں پہنچ گیا ہوں۔ یہ بہت ہی افسوس کی بات ہے کہ میں انگلستان سے رخصت ہونے سے پیشتر آپ سے مل نہ سکا۔ براہ کرم مجھے جلد لکھیے کہ آپ ان دنوں کیا کر رہی ہیں۔...... میں اپنی ساری جرمن بھول چکا ہوں، لیکن مجھے صرف ایک لفظ یاد ہے۔ ایما!

۱۱ جنوری ۱۹۰۹ء کو تحریر کرتے ہیں:

میں اب لاہور میں ہوں اور یہاں ایڈووکیٹ کے طور پر کام کر رہا ہوں۔ یہ میرے لیے ممکن نہیں کہ میں کبھی بھی آپ کے خوبصورت وطن کو بھول سکوں،...... براہ کرم اپنے اس دوست کو مت بھولیے جو آپ کو ہمیشہ اپنے دل میں رکھتا ہے اور جو آپ کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ ہائیڈل برگ میں میرا قیام مجھے ایک خوبصورت خواب سا لگتا ہے اور میں اس خواب کو دہرانا چاہتا ہوں۔ کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے؟ آپ بہتر جانتی ہیں۔

۲۰ جولائی ۱۹۰۹ء کو تحریر کیا:

میں بڑی بے تابی سے اس وقت کا منتظر ہوں، جب میں دوبارہ آپ کے وطن میں آپ سے مل سکوں گا...... مجھے جرمنی بہت پسند ہے۔...... آہ! وہ دن جب میں جرمنی میں تھا...... براہ کرم مجھے اپنے دل اور یادوں میں ایک چھوٹی سے جگہ دیجیئے گا!

۲۲ ستمبر ۱۹۱۰ء کو ایک تحفہ ارسال کرتے ہوئے انہیں تحریر کیا:

یہ پوستین ایک تبتی بھیڑ کی ہے۔ دراصل اسے اوورکوٹ کے کالر اور بازوؤں پر لگایا جا سکتا ہے۔

۱۱ مئی ۱۹۱۱ء کو لکھا:

میری بڑی تمنا ہے کہ جرمنی کا دوبارہ سفر کروں تا کہ آپ سے مل سکوں۔ میں نہیں جانتا کہ یہ کس دن ممکن ہو سکے گا...... وہ خوبصورت ٹائیاں مجھے مل گئی تھیں، لیکن میں بے حد شرمندہ ہوں کہ اپنی مصروفیت کے سبب جلد شکریہ ادا نہ کر سکا۔

۳۰ جولائی ۱۹۱۳ء کو ایما ویگے ناست کے والد کی وفات کے موقع پر تعزیت کرتے ہوئے انہوں نے تحریر کیا:

آپ کو یاد ہو گا کہ گوئٹے نے اپنی موت کے لمحے پر کہا تھا ''مزید روشنی''، گویا موت ہمیں ان مقامات تک لے جاتی ہے جہاں ہم ابدی حسن وصداقت کے روبرو کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور میں تو محسوس کرتا ہوں کہ ہم اب بھی ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں، کیونکہ میں روحانی اعتبار سے آپ کا شریکِ غم ہوں......۔

پہلی جنگ عظیم کے دوران خط و کتابت بند ہو گئی، البتہ جنگ کے خاتمے پر چار سال کی طویل خاموشی کے بعد ان کی اور ان کے خاندان کی خیر و عافیت کے بارے میں خط لکھ کر پوچھا۔

اسی طرح ۱۹۰۹ء سے لے کر ۱۹۱۱ء تک عطیہ فیضی کے نام تحریر کردہ خطوط ان کے جذبات کی عکاسی کرتے ہیں۔ اقبال کو اپنی بے چینیوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے ان نہایت ہی حساس، باذوق اور صاحبِ علم خواتین سے قلمی تعلق نے انہیں ایک سہارا مہیا کر دیا۔ اس دور کے اقبال کی ذہنی کیفیت کو پوری طرح سمجھنے کے لیے عطیہ فیضی کو لکھے ہوئے ان کے خطوط کے درج ذیل اقتباسات کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے۔ فرماتے ہیں:

کل رات میں آسمان پر پہنچا اور دوزخ کے دروازوں میں سے گزرنے کا اتفاق ہوا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ خوفناک طور پر سرد ہے۔ مجھے متعجب دیکھ کر انہوں نے بتایا کہ یہ جگہ اپنی فطرت کے اعتبار سے سرد ہے لیکن تپش سے سخت گرم ہو جاتی ہے، کیونکہ دنیا سے ہر کوئی اپنی آگ اپنے ساتھ لے کر آتا ہے۔ میرا بدبخت نفس خود ہی شامت زدہ خیالات کا معدن بنا ہوا ہے، جو میری روح کے تاریک و تار گوشوں سے سانپوں کی طرح نکلتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ غم بجائے خود ایک لذت ہے۔ میں تو اپنی محرومیوں سے لطف اندوز ہوتا ہوں اور ان لوگوں پر ہنستا ہوں جو اپنے تئیں سمجھتے ہیں کہ وہ خوش ہیں۔ دیکھا، میں اپنی مسرت کیسے چُرا لیتا ہوں۔

ایک اور خط میں تحریر کرتے ہیں:

بعض اوقات میں کوئی کام کرنے کا ارادہ کرتا ہوں اور پھر اپنے آپ کو حالات پر چھوڑ دیتا ہوں تاکہ وہ مجھے جس طرف چاہیں، لے جائیں ...... بے شک ہر انسان اپنی آخری آرامگاہ تک پہنچنے کا صابرانہ انتظار کرتا ہے۔ اس پر کہ شمالی ہندوستان کے لوگ میرا کما حقہ، احترام اور تعریف نہیں کرتے آپ پریشان نہ ہوں، آپ اس کی پروا نہ کیجیے، میں دوسروں کی باتوں پر زندگی بسر نہیں کرنا چاہتا۔ میں ایک سیدھی سادی دیانتدارانہ زندگی بسر کرتا ہوں، میرے دل اور زبان

کے درمیان پوری موافقت ہے، لوگ منافقت کی مدح وثنا کرتے ہیں۔ بائرن، گوئٹے اور شیلے کے معاصرین ان کی عزت نہیں کرتے تھے۔ میں اگرچہ ان کے مقابلے میں قوت شعری کے اعتبار سے کمتر ہوں، پھر بھی مجھے فخر ہے کہ کم ازکم اس معاملے میں تو ان کا ہمسفر ضرور ہوں...... دنیا میری پرستش نہیں کرسکتی اور نہ میں اپنے آپ کو پرستش کے قابل سمجھتا ہوں لیکن مجھے یقین ہے کہ دنیا میری موت کے بعد ایک نہ ایک دن ضرور میری پرستش کرے گی۔ لوگ میری کوتاہیوں کو بھول جائیں گے اور آنسوؤں کی صورت میں مجھے خراج عقیدت پیش کریں گے۔

باب:۹

ازدواجی زندگی کا بحران

۱۸۹۳ء میں اقبال کی کریم بی کے ساتھ شادی ہوئی۔ شادی کے پہلے دو سال سیالکوٹ میں گذارے۔ اس دوران میں انہوں نے ایف۔ اے کا امتحان پاس کیا اور مزید تعلیم کی تحصیل کی خاطر ۱۸۹۵ء میں لاہور آ گئے۔ کریم بی بیشتر وقت اپنے والدین کے ساتھ یا اپنے میکے گجرات میں بسر کرتی تھیں اور بعض اوقات چند ماہ کے لیے سیالکوٹ آ جاتیں۔ اس دوران معراج بیگم ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئیں اور آفتاب اقبال ۱۸۹۸ء میں۔

۱۹۰۰ء سے لے کر ۱۹۰۵ء تک کی پانچ سالہ ملازمت کے دوران جب اقبال بھاٹی دروازے والے مکان میں رہائش پذیر تھے، کریم بی نے ان کے ساتھ اس مکان میں قیام نہ کیا۔ ۱۹۰۵ء سے لے کر ۱۹۰۸ء تک کے تین سال اقبال نے یورپ میں گزارے۔ ان کی واپسی پر معراج بیگم بارہ برس کی اور آفتاب اقبال دس برس کے تھے۔ نذیر نیازی تحریر کرتے ہیں:

> یورپ سے واپسی کے بعد ایک دوسرے سے کشیدگی بڑھتی چلی گئی۔ تا آنکہ باپ اور بھائی کی کوششوں کے باوجود مکمل علیحدگی کی نوبت آ گئی۔ بغیر طلاق کے چارہ نہ تھا لیکن والدۂ آفتاب کی عزتِ نفس نے گوارا نہ کیا۔ محمد اقبال کفالت کے ذمے دار ٹھہرے۔ والدۂ آفتاب طلاق پر راضی نہ ہوئیں۔ اقبال نے بخوشی کفاف کی ذمہ داری قبول کر لی۔ چنانچہ ایک مقررہ رقم ہر مہینے بھیج دیتے۔ رقم کی ترسیل میں کوئی فرق نہ آیا۔ آخری منی آرڈر میرے ہاتھوں سے ہوا، میں نے تعمیل ارشاد کر دی۔

گورنمنٹ کالج لاہور میں تعلیم کی تکمیل کے بعد جب اقبال اپنے قدموں پر کھڑے ہوئے، ملازمت اختیار کر کے بھاٹی دروازے والے مکان میں انہوں نے رہائش اختیار کی تو اس وقت بھی کریم بی ان کے ساتھ لاہور نہ آئیں۔ ممکن ہے اس کا سبب اقبال کی کم تنخواہ ہو، جو

ابتدا میں بہتّر روپے چودہ آنے ماہوار مقرر ہوئی تھی۔ دو سال بعد دو سو روپے اور چار سال بعد دو سو پچاس روپے ماہوار تک پہنچی۔ پھر اقبال تین سال کے لیے یورپ چلے گئے۔ یورپ سے واپسی کے بعد اقبال کے لیے سب سے بڑا مسئلہ فراہمی روزگار تھا اور یہ زمانہ ان کے لیے بلاشبہ شدید تذبذب اور اضطراب کا تھا، مگر اس زمانے میں باپ اور بھائی کی کوششوں کے باوجود اقبال اور کریم بی ایک دوسرے کے قریب نہ آ سکے۔ کریم بی بچوں سمیت اپنے والدین کے ساتھ رہنا پسند کرتی تھیں اور اس سلسلے میں اقبال کی جو ذہنی کیفیت تھی وہ عطیہ فیضی کے نام ان کے خط محررہ ۱۹ اپریل ۱۹۰۹ء سے ظاہر ہے۔ لکھتے ہیں:

> میں اپنے بھائی کا ایک قسم کا اخلاقی قرضدار ہوں اور صرف اسی چیز نے مجھے ملک سے بھاگ جانے سے روک رکھا ہے۔ میری زندگی نہایت مصیبت ناک ہے۔ یہ لوگ میری بیوی کو زبردستی مجھ پر منڈھ دینا چاہتے ہیں۔ میں اس کی کفالت کرنے پر آمادہ ہوں، لیکن اسے اپنے پاس رکھ کر اپنی زندگی کو عذاب بنانے کے لیے ہرگز تیار نہیں۔ ایک انسان ہونے کی حیثیت سے مجھے مسرت کے حصول کا حق ہے۔ کتابوں کے یہ بے جان اور بنجر اوراق مسرت نہیں دے سکتے اور میری روح کے اندر اس قدر آگ بھری ہوئی ہے کہ میں ان کتابوں کو اور ان کے ساتھ ہی معاشرتی رسوم و روایات کو بھی جلا کر خاکستر بنا سکتا ہوں۔ ذہنی طور پر ایک اچھے خدا کی بجائے کسی قادر مطلق شیطان پر یقین لے آنا زیادہ آسان ہے۔ مہربانی کر کے ایسے خیالات کے اظہار کے لیے مجھے معاف کیجیے گا۔ میں ہمدردی کا خواستگار نہیں ہوں۔ میں تو صرف اپنی روح کا بوجھ اتارنا چاہتا تھا۔

اقبال کی اس شادی کی ناکامی کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ ان کے دونوں بچے شفقتِ پدری سے محروم رہ گئے۔ معراج بیگم اور آفتاب اقبال کے بچپن اور جوانی کا بیشتر زمانہ ماں کے ساتھ ننھیال میں گزرا۔ جب دونوں کچھ بڑے ہو گئے تو دادا اور دادی کے پاس سیالکوٹ میں رہنے لگے۔ اس کے باوجود اقبال معراج بیگم سے بڑی محبت کرتے تھے۔ معراج بیگم انیس برس کی عمر میں ۱۷/اکتوبر ۱۹۱۵ء کو وفات پا گئیں۔ آفتاب اقبال اپنے دادا کے منظور نظر تھے۔ ان کا نام بھی شیخ نور محمد ہی نے رکھا تھا۔ آفتاب اقبال کے دل میں یہ بات ہمیشہ کے لیے بیٹھ گئی کہ ان کی ماں کے ساتھ باپ نے ناانصافی کی ہے۔ نتیجتاً باپ بیٹے کے اختلافات بڑھتے چلے گئے۔ تا آنکہ اقبال کی زندگی ہی میں باپ بیٹے میں قطع تعلقی ہو گئی۔ نذیر نیازی تحریر کرتے ہیں:

بے شک یہ شادی ناکام رہی، لیکن اس کی ایک ہی وجہ تھی اور وہ طبائع کی عدم مناسبت، علیٰ ہذا، خاندانی حالات میں تفاوت۔ میں سمجھتا ہوں۔ محمد اقبال نے لاکھ کوشش کی کہ نباہ کی کوئی صورت نکل آئے مگر بات نہ بنی۔ ایک تو والدۂ آفتاب کا اندازِ طبیعت، دوسرے آفتاب اقبال کی روش، حالات بگڑتے چلے گئے۔ محمد اقبال کی اس شادی کے بارے میں بھی اکثر ایسی باتیں کہی گئیں جو سرتا سر بے بنیاد ہیں۔ جہاں تک راقم الحروف کی ذاتی معلومات کا تعلق ہے، اسے یہ کہنے میں باک نہیں کہ عمداً نہ سہی، بہ سببِ نامناسبتِ مزاج اور افتادِ طبیعت ''گجرات'' نے اس معاملے میں جو روش اختیار کی سرتا سر غلط تھی۔ آفتاب اقبال بھی بہک گئے۔ باپ کے خلاف ایک محاذ قائم کرلیا۔ الزام تراشیوں سے کام لیا گیا۔

عطیہ فیضی کی رائے میں شادی کی ناکامی کے سبب اقبال کی خداداد غیر معمولی قابلیت نشوونما پانے کے بجائے گھٹ کر رہ گئی اور اپنے علم کو وسیع کرنے کے باوجود اقبال وہ نہ بن سکے جو بن سکتے تھے اقبال کی مثال ایک ایسا المیہ ہے، جو اسی قسم کی خاندانی ضد کا نتیجہ تھا۔ عطیہ فیضی تحریر کرتی ہیں:

جیسا کہ میں اقبال کو یورپ میں جانتی تھی، ہندوستان میں ان کی شخصیت ویسی نہ رہی ہندوستان آ کران کی ذکاوت، طباعی اور آب و تاب کو گھن سا لگ گیا تھا اور جوں جوں وقت گزرتا گیا یہ گھن ان کی ساری شعوری قوت پر چھا گیا تھا۔ وہ اپنے خیال میں چندھیائی ہوئی زندگی بسر کرتے تھے اور پستی سی محسوس کرتے تھے، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ وہ کیا کچھ بن سکتے تھے۔

عطیہ فیضی کا تبصرہ حقائق پر مبنی نہیں ہے، بلاشبہ حیات اقبال کا یہ مختصر سا دور ذہنی اور روحانی کرب کا دور تھا۔ بہرحال ذہنی اور روحانی کرب کی یہ کیفیت محض عارضی تھی اور اقبال کی غیر معمولی قابلیت کو مستقل طور پر مفلوج نہ کرسکتی تھی۔ ان کی تخلیقی قوتوں کی سمت تو پہلے ہی سے متعین تھی۔ اضطراب کی کیفیت کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ اس تجربے نے اقبال کی شخصیت کو جھنجھوڑ کر انہیں جرمن ادب کے مطالعے کے زیر اثر رومانی طرز کی شاعری کی گرفت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آزاد کر دیا؛ اس لیے یہ استدلال کہ اگر اقبال اضطراب کے اس مرحلے سے نہ گزرتے تو بہت کچھ بن سکتے تھے، درست نہیں۔ وہ خواہ اس مرحلے سے گزرتے یا نہ گزرتے، بننا انہوں نے وہی کچھ تھا، جو بالآخر بنے۔

اس دور میں فراہمی روزگار کے ساتھ اقبال ازدواجی سکون کی تلاش میں بھی سرگرداں

تھے۔ اقبال کے سامنے حقیقی ازدواجی سکون کی دو مثالیں موجود تھیں، ایک آرنلڈ کا گھر اور دوسری سر اکبر حیدری اور ان کی اہلیہ کی آپس میں وابستگی۔

اقبال کے احباب کو معلوم تھا کہ وہ دوسری شادی کے خواہاں ہیں اور یہ بات باہر نکل چکی تھی۔ حیرت کا مقام ہے کہ اس قدامت پسندی کے زمانے میں بھی انہیں شادی کے سلسلے میں کئی پڑھی لکھی خواتین کے خطوط آیا کرتے تھے۔ بعض خواتین رشتے کی خاطر اپنے قاصد بھی ان کی طرف بھجواتیں اور چند ایک تو انہیں ملنے بھی آ گئیں۔

دوسری شادی کے سلسلے میں، جو ۱۹۱۰ء میں ہوئی، مرزا جلال الدین کا بیان ہے کہ اقبال کے دوست شیخ گلاب دین وکیل نے موچی دروازے کے ایک کشمیری خاندان کی صاحبزادی کے متعلق تحریک کی جو اس وقت وکٹوریہ گرلز اسکول میں پڑھتی تھی۔ جب بات پکی ہوگئی تو اقبال کے بڑے بھائی سیالکوٹ سے آئے اور مرزا جلال الدین، میاں شاہنواز، مولوی احمد دین اور شیخ گلاب دین کو ساتھ لے کر اقبال کے سسرال پہنچے اور وہاں ان کا نکاح سردار بیگم سے پڑھا گیا۔ اس موقع پر صرف نکاح ہوا، رخصتی عمل میں نہ آئی۔

اس بیان کے مطابق اقبال اپنی بیوی کا انتخاب اولاً خود کرنا چاہتے تھے۔ سردار بیگم کے برادر خواجہ عبدالغنی، منشی طاہر الدین کے احباب میں سے تھے۔ جب سردار بیگم سے رشتے کے متعلق منشی طاہر الدین نے تحریک کی تو اقبال نے صاحبزادی کی تصویر دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ منشی طاہر الدین نے تصویر خواجہ عبدالغنی سے یہ کہہ کر حاصل کی کہ والدۂ اقبال کو دکھانے کے لیے سیالکوٹ بھیجنا ہے۔ اقبال نے سردار بیگم کی تصویر دیکھ کر انہیں پسند فرمایا۔ بعد میں والدۂ اقبال سیالکوٹ سے لاہور آئیں اور سردار بیگم کے گھر جا کر رشتے کی بات کی۔ پھر اقبال اپنے بڑے بھائی، والدہ اور چند احباب سمیت سسرال پہنچے، جہاں ان کا نکاح سردار بیگم سے پڑھا گیا۔

ان کا اقبال سے عقد ۱۹۱۰ء میں ہوا اور اس موقع پر صرف نکاح ہی پڑھا گیا، رخصتی عمل میں نہ آئی۔ راقم کے اندازے کے مطابق اس وقت سردار بیگم کی عمر انیس برس کے لگ بھگ تھی۔ رخصتی کا معاملہ اس لیے التوا میں پڑ گیا کہ نکاح کے فوراً بعد اقبال کو دو ایک گمنام خط موصول ہوئے، جن میں سردار بیگم کے چال چلن پر نکتہ چینی کی گئی تھی۔ اقبال شدید تذبذب میں پڑ گئے۔ بالآخر اقبال کے ایک پرانے دوست سید بشیر حیدر جو اس زمانے میں ایکسائز انسپکٹر

لدھیانہ تھے، لدھیانے کے ایک متمول کشمیری خاندان کی صاحبزادی مختار بیگم کے رشتے کا پیغام لے کر آئے۔ مختار بیگم کا خاندان لدھیانے میں ''نولکھیوں'' کا خاندان کہلاتا تھا۔ چنانچہ جب رشتہ طے ہو گیا تو اقبال کی بارات لاہور سے لدھیانہ گئی۔ مرزا جلال الدین نے اپنے بیان میں اس شادی کی تاریخ کا ذکر نہیں کیا، اسی طرح عبدالمجید سالک نے بھی اقبال کی اس شادی کی تفصیل بیان کرتے وقت سن کا ذکر نہیں کیا۔ لیکن غالب امکان ہے کہ یہ شادی ۱۹۱۳ء کے ابتدائی حصے میں ہوئی۔ اقبال، مختار بیگم کو ساتھ لے کر لاہور پہنچے جہاں انہوں نے انارکلی والے مکان میں قیام کیا۔

اسی اثناء میں سردار بیگم سے متعلق گمنام خطوط کا راز کھلا کہ گمنام خطوط تحریر کرنے والا کوئی وکیل تھا، جو سردار بیگم کی شادی اپنے بیٹے کے ساتھ کرنا چاہتا تھا۔ سردار بیگم نے، خود بھی جرأت کر کے ایک خط اقبال کو بھجوایا، میرا نکاح تو اب آپ سے ہو چکا ہے، اب میں دوسرے نکاح کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ اسی حالت میں پوری زندگی بسر کروں گی اور روزِ قیامت آپ کی دامن گیر ہوں گی۔

اقبال یہ خط پڑھ کر اپنی غلطی پر سخت پشیمان ہوئے۔ اور سردار بیگم کو گھر لانے کے لیے تیار ہو گئے، لیکن چونکہ ایک مرحلے پر دل میں انہیں طلاق دینے کا ارادہ کر چکے تھے اس لیے سردار بیگم سے اگست یا ستمبر ۱۹۱۳ء میں دوبارہ نکاح پڑھوایا گیا۔ ان ایّام میں مختار بیگم اپنے میکے لدھیانے روانہ ہو گئیں اور اقبال سردار بیگم کو ساتھ لے کر سیالکوٹ جا پہنچے۔ چند ہفتوں کے بعد انارکلی والے مکان میں دونوں بیویاں اکٹھی ہو گئیں۔ مختار بیگم اور سردار بیگم قریب قریب ایک ہی عمر کی تھیں اور دونوں میں ایسی محبت پیدا ہو گئی جو بہنوں میں بھی نہیں ہوتی۔ سردار بیگم سے شادی کے متعلق اقبال اپنے ایک خط محررہ ۲۶/اکتوبر ۱۹۱۳ء بنام مہاراجا کشن پرشاد میں تحریر کرتے ہیں:

> تیسری بیوی آپ کے تشریف لے جانے کے کچھ عرصے بعد کی۔ ضرورت نہ تھی، مگر یہ عشق و محبت کی ایک عجیب و غریب داستان ہے۔ اقبال نے گوارا نہ کیا کہ جس عورت نے حیرت انگیز ثابت قدمی کے ساتھ تین سال تک اس کے لیے طرح طرح کے مصائب اٹھائے ہوں، اسے اپنی بیوی نہ بنائے۔ کاش دوسری بیوی کرنے سے پیشتر یہ حال معلوم ہوتا۔

انارکلی والا مکان، جس میں اقبال صرف علی بخش کے ساتھ رہا کرتے تھے، ۱۹۱۳ء میں سیالکوٹ والے گھر کی طرح خاصا آباد ہو گیا۔ مختار بیگم اور سردار بیگم کے علاوہ اقبال کی ایک غیر

آبادبہن کریم بی بھی یہیں رہنے لگیں۔ نیز شیخ عطا محمد کی دو چھوٹی بیٹیوں عنایت بیگم اور وسیمہ بیگم کو سردار بیگم سیالکوٹ سے اپنے ساتھ لے آئیں۔ گھر میں چہل پہل ہوگئی۔ سب کے سب خوشی و مسرت سے دن گزارنے لگے۔

جولائی ۱۹۱۳ء میں اقبال کے دوست مہاراجہ کشن پرشاد لاہور پہنچے۔ ان کے استقبال کے لیے اقبال اسٹیشن پر موجود تھے۔ مہاراجہ کشن پرشاد کے قیام لاہور کے دوران اقبال کا بیشتر وقت ان کے ساتھ گزرا۔ وہ انہیں ساتھ لے کر آغا حشر کاشمیری کے تھیٹر میں بھی گئے۔

سر سید علی امام کے بتانے پر اقبال مہاراجہ الور کے پاس پرائیویٹ سیکرٹری کی ملازمت کے لئے ریاست الور گئے۔ لیکن ۶۰۰ روپے ماہانہ قلیل تنخواہ کے سبب خاموشی سے واپس لاہور آ گئے اس کا ذکر علامہ نے مہاراجہ کشن پرشاد کے نام اپنے خط محررہ یکم اکتوبر ۱۹۱۳ء میں بھی کیا ہے۔

انہی کے نام اپنے ایک اور خط محررہ ۱۲۶ کتوبر ۱۹۱۳ء میں فرماتے ہیں:

الور کی ملازمت نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی تنخواہ قلیل تھی۔ سات آٹھ سو روپے ماہوار تو لاہور میں بھی مل جاتے ہیں۔ بڑے بھائی جان جنہوں نے اپنی ملازمت کا اندوختہ میری تعلیم پر خرچ کر دیا۔ اب پنشن پا گئے، ان کے اور ان کی اولاد کے اخراجات بھی میرے ذمے ہیں اور ہونے چاہئیں، خود تین بیویاں رکھتا ہوں اور دو اولادیں......غرض کہ مختصر طور پر یہ حالات ہیں، جو مجھے بسا اوقات مزید دوڑ دھوپ کرنے پر مائل کر دیتے ہیں۔

مہاراجہ کشن پرشاد اقبال سے لاہور میں مل کر ان کے اتنے گرویدہ ہوئے کہ حیدرآباد واپس پہنچتے ہی انہیں فکر معاش سے نجات دلانے کے لیے ان کے شایانِ شان وظیفے کی پیشکش کی، لیکن اقبال نے نہایت خوبصورتی سے ان کی پیشکش ٹال دی اور انہیں متذکرہ بالا خط ہی میں تحریر کیا:

جو عنایت آپ اقبال کے حال پر فرماتے ہیں، اس کا شکریہ کس زبان سے ادا ہو۔ دوست پروری اور غربت نوازی آپ کے گھرانے کا خاصہ ہے۔ آپ کی فیاضی کہ زمان و مکان کی قیود سے آشنا نہیں ہے، مجھ کو ہر شے سے مستغنی کر سکتی ہے، مگر یہ بات مروّت و دیانت سے دور ہے کہ اقبال آپ سے ایک بیش قرار تنخواہ پائے اور اس کے عوض میں کوئی ایسی خدمت نہ کرے، جس کی اہمیت بقدر اس مشاہرے کے ہو۔

اقبال کی ذات کے متعلق ان کی زندگی میں مخالفین مختلف قسم کے بہتان تراشنے لگے تھے، گو انہوں نے ایسے لوگوں کی باتوں کی پروانہ کی اور انہیں کبھی درخور اعتنا نہ سمجھا۔ ان کی زندگی ہی

میں ان پر شراب نوشی کا الزام لگا، انہیں عیاش ظاہر کیا گیا اور یہ من گھڑت قصہ بھی مشہور کیا گیا کہ ایام جوانی میں وہ ایک طوائف کے قتل کے مرتکب ہوئے تھے اس سے پیشتر کہ اقبال پر عائد کردہ ان الزامات کی تردید میں کچھ کہا جائے، چند سوالات کا جواب دینا ضروری ہے۔ اوّل یہ کہ اقبال کے مخالفین کون تھے؟ دوم یہ کہ اقبال کی کردار کشی کی مہم کا آغاز کب ہوا؟ اور سوم یہ کہ اقبال خود کس حد تک ایسے بے بنیاد الزامات کی تشہیر کے ذمے دار تھے؟

اقبال ایک ایسی ہستی تھے، جس نے جواں عمری ہی میں اپنے کس بل پر شہرت حاصل کی۔ ایسی ہستیاں عموماً جاننے والوں کے لیے حسد کا سبب بنتی ہیں۔ پس جوں جوں اقبال کے حامیوں اور عقیدت مندوں میں اضافہ ہوتا گیا، ان کے مخالفین کی تعداد بھی بڑھتی چلی گئی۔

اقبال کے مخالفین میں پہلا گروہ تو دہلی اور لکھنؤ کے اہل زبان کا تھا۔ ان لوگوں میں سے اکثر نے لسانی تعصب کی بنا پر اقبال کے جدید اسالیب بیان میں کیڑے نکالے۔ اس سلسلے میں پنڈت شیو نارائن شمیم کا بیان غور طلب ہے۔ تحریر کرتے ہیں:

> اسٹیشن پر ایک شاعر جلال صاحب بقول خود تلمیذ امیر مینائی مل گئے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا حضرت اقبال کا کیا حال ہے؟ میں نے عرض کیا کہ میں گاہے گاہے نظم کی اصلاح ان سے لیا کرتا ہوں۔ کہتے تھے کہ وہ اور ہم خوب ایک دوسرے سے واقف ہیں۔ آگرے میں ان سے خوب اختلاط رہا ہے۔ وہ مجھے رنگین مزاج معلوم ہوئے ...... میں نے انہیں بتلایا کہ آپ کو کسی نے غلط بتلایا ہے۔ حضرت اقبال روزمرہ کچہری آتے ہیں اور وکالت کرتے ہیں۔ نظم نگاری ان کا شغل ثانی ہے۔ اب فارسی میں زیادہ لکھتے ہیں۔ میں نے ان سے یہ بھی کہا کہ اقبال دراصل ہندوؤں کی دولت تھی جو آپ کے قبضے میں چلی گئی ......شاعر صاحب قدرے متحیر ہوئے۔

اقبال کے مخالفین میں دوسرا گروہ، جو رفتہ رفتہ تعداد میں بڑھتا چلا گیا، کم علم یا تنگ نظر علماء کا تھا۔ اقبال، اسلام سے متعلق سرسید احمد خان کی انقلاب انگیز تحریروں سے آشنا تھے، اور ان کے مداح بھی تھے، لیکن جہاں تک سرسید احمد خان کے مذہبی اور سیاسی افکار کا تعلق ہے، وہ سمجھتے تھے کہ ان میں اصلاح کی گنجائش ہے۔ سرسید کے لئے نرم گوشہ رکھنے، علم کلام اور فقہ کی تعبیر نو کا ذکر کرنے اور تحریک خلافت سے اختلاف کی وجہ سے علماء اقبال کے مخالف تھے۔ لیکن جب اقبال نے تطہیر حجاز کے معاملے میں سلطان ابن سعود کے حق میں بیان دیا تو مولوی ابو محمد دیدار علی خطیب مسجد وزیر خان لاہور نے اقبال کے خلاف کفر کا فتویٰ صادر کر دیا۔ عبدالمجید سالک تحریر کرتے

ہیں:

اس فتویٰ پر ملک بھر میں شور مچ گیا، مولوی دیدار علی پر ہر طرف سے طعن و ملامت کی بوچھاڑ ہوئی۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے زمیندار میں اس جاہلانہ فتویٰ کی چھتاڑ کر دی۔ خود زمیندار نے فتویٰ پر تبصرہ کیا...... مولوی دیدار علی کی اس حرکت سے علمائے اسلام کے اجتماعی وقار کو سخت صدمہ پہنچا، کہ اگر علماء کے نزدیک اقبال جیسا مسلمان بھی کافر ہے تو پھر مسلمان کون ہے۔

بہر حال کانگرسی ذہنیت رکھنے والے علماء کا اقبال سے تنازع ختم نہ ہوا۔ ان کی زندگی کے آخری چند ماہ میں جب قوم و ملت کی توضیح کے مسئلے پر ان کا مولانا حسین احمد مدنی سے اختلاف ہوا تو مولانا حسین احمد مدنی کے حامیوں نے گمنام خطوط کے ذریعے ایسے ہی الزامات اقبال پر لگائے۔ بعد میں جب مولانا حسین احمد مدنی نے ایک اخباری مضمون میں اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے تسلیم کر لیا کہ انہوں نے مسلمانانِ ہند کو جدید نظریہ قومیت کے اختیار کرنے کا مشورہ نہیں دیا تھا، تو اقبال نے اعلان کیا کہ انہیں مولانا حسین احمد مدنی کے اس اعتراف کے بعد کسی قسم کا حق ان پر اعتراض کرنے کا نہیں رہتا۔ اقبال نے اپنے اعلان میں مزید کہا:

میں مولانا کے عقیدت مندوں کے جوشِ عقیدت کی قدر کرتا ہوں، جنہوں نے ایک دینی امر کی توضیح کے صلے میں پرائیویٹ خطوط اور پبلک تحریروں میں مجھے گالیاں دیں۔ خدا تعالیٰ ان کو مولانا کی صحبت سے زیادہ مستفید کرے۔

اس معاصرانہ چشمک کے نتیجے میں مجلس احرار کے قائد عطا اللہ شاہ بخاری نے بھی اقبال کے متعلق فیصلہ دے دیا کہ اقبال کا قلم تو تمام عمر صحیح رہا لیکن قدم اکثر و بیشتر غلط۔

اقبال کے مخالفین میں تیسرا گروہ احمدی عقیدہ رکھنے والوں کا تھا۔ اقبال کی یورپ سے واپسی پر پنجاب میں احمدی تحریک کا چرچا تھا۔ انہوں نے احمدی تحریک کا مطالعہ کیا، لیکن اس مطالعے کے باوجود شروع شروع میں اس تحریک سے اپنی بیزاری کا وہ اظہار نہیں کیا جو بعد میں انہوں نے نظم و نثر دونوں میں شدت کے ساتھ کیا۔ جب اقبال نے احمدی تحریک سے بیزاری کا اظہار کھل کر کیا، احمدیوں کے عقائد کو اسلام کے منافی ثابت کر کے انہیں ملت اسلامیہ سے خارج گردانا اور انگریزی حکومت سے مطالبہ کیا کہ انہیں ایک علیحدہ اقلیت قرار دیا جائے، تو وہ ان کے دشمن ہو گئے اور انہوں نے اقبال کی کردار کشی کو اپنا شعار بنا لیا۔

اقبال کے مخالفین میں چوتھا گروہ مشائخ کا تھا۔ اقبال ماضی کے صوفیائے کرام کی بڑی

عزت کرتے تھے اوران کی روحانی تعلیمات، نیز ہندوستان میں اشاعت وتبلیغ اسلام کے سلسلے میں ان کی خدمات کی عظمت کے معترف تھے۔ وہ اکثر روحانی فیض کے حصول کی خاطر بعض درگاہوں پر بھی جاتے۔لیکن جب اقبال نے ہم عصر پیروں کی نا اہلی، بدعملی اور برے اطوار کو تنقید کا نشانہ بنایا توخصوصاً اسرار خودی کی اشاعت کے بعد اقبال پر اعتراضات کی بوچھاڑ ہونے لگی اورانہیں تصوف کا مخالف اورصوفیائے کرام کی روحانی تعلیمات کا دشمن قرار دیا گیا۔

اقبال کے مخالفین میں پانچواں گروہ بالشویک، کمیونسٹ یا سوشلسٹ خیالات رکھنے والوں کا تھا۔اس گروہ کی ایک شاخ نے بعد میں ترقی پسند مصنفین کی صورت اختیار کر لی،اس گروہ نے ''خضرِ راہ'' اور پیام مشرق کی اشاعت کے بعدلکھا کہ اقبال اشترا کی خیالات کے مبلغ ہیں۔ اس کی تردید میں اقبال نے کہا اُن کا عقیدہ ہے کہ انسانی جماعتوں کے اقتصادی امراض کا بہترین علاج قرآن نے تجویز کیا ہے اوران کے نزدیک اشترا کی خیالات رکھنا دائرۂ اسلام سے خارج ہونے کے مترادف ہے۔لہٰذا ہندوستان کے سوشلسٹ اوران کے حامی ترقی پسند مصنفین بھی ان کی ذات پر کیچڑ اچھالنے لگے۔

اقبال کے مخالفین کا چھٹا گروہ مختلف قسم کے افراد پر مشتمل تھا۔ان میں سے بعض تو اقبال کے اپنے احباب تھے، جو بظاہر ان کے عقیدت مند تھے،لیکن حسد کی بنا پر یا اپنے ذاتی اغراض کے حصول کی خاطر انگریز حاکموں سے ان کی شکایتیں کرتے یا ان کے متعلق طرح طرح کے بہتان تراشتے رہتے تھے۔اسی گروہ میں سر شادی لعل جیسے پنجاب کے متعصب ہندو بھی شامل تھے۔

اقبال کے مخالفین کی نشان دہی سے یہ بتلانا مقصود تھا کہ جب دلائل و براہین سے کسی قابل شخصیت کے اقوال کو جھٹلانا مشکل ہوتو انسانی فطرت کے مطابق آسان طریقہ یہی ہے کہ مخالف کی کردارکشی کا راستہ اختیار کیا جائے۔

اقبال کی کردارکشی کی مہم کا آغاز کب ہوا؟ یہ بات طے ہے کہ اقبال کی کردارکشی کی مہم کا آغاز کانگرسی ذہنیت رکھنے والے علماءاوران کے حامیوں نے کیا اور بعد میں کم علم یا تنگ نظر مُلّا، عہدتنزل کی شاعری کے پرستار اہل سخن، احمدی، سوشلسٹ، ترقی پسند مصنفین، مروجہ صوفی سلاسل کے محافظ مشائخ، اقبال کے منافق اوراحکام رس احباب، پنجاب کے بعض متعصب ہندو اور دیگر افراد بقدر ہمت اس مہم میں شامل ہوتے چلے گئے۔

اقبال خود بھی کسی حد تک اپنے متعلق ایسے بے بنیاد الزامات کی تشہیر کے ذمہ دار تھے۔ اقبال کو بچپن ہی سے صوم وصلوٰۃ کے پابند رہنے، قرآن مجید کی تلاوت کرنے، تہجد اور شب کے آخری حصے میں بیدار ہونے کی عادت تھی۔ مہاراجہ کشن پرشاد کو اپنے ایک خط محررہ ۱۳۱/ اکتوبر ۱۹۱۶ء میں اپنی اس عادت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

صبح چار بجے کبھی تین بجے اٹھتا ہوں، پھر اس کے بعد نہیں سوتا۔ سوائے اس کے کہ مصلّٰی پر کبھی اُونگھ جاؤں۔

ان کا بیشتر کلام شب کے آخری حصے کے سکون ہی میں مرتب ہوا۔ مسجد میں عیدین کی نماز پڑھنے ضرور جاتے تھے ورنہ عام نماز پڑھتے تو تخلیے میں۔ اقبال کو جوانی میں کچھ عرصے تک ورزش کرنے یا اکھاڑے میں اُتر کر کشتی لڑنے کا شوق رہا۔ لیکن اقبال کو، شاید ظرافت طبعی کے سبب، پارسائی کے بجائے اپنی زندی کی تشہیر کرنے میں زیادہ لطف آتا تھا۔ مثلاً ایک مرتبہ محمد دین فوق کے پوچھنے پر اقبال نے بتایا کہ وہ کتب کی الماری میں انگوری شراب کی بوتل تلاش کر رہے ہیں۔ اسی طرح میاں شاہ دین کی جب اقبال اور مرزا جلال الدین سے ملاقات ہوئی تو از راہ مذاق کہا کہ تم لوگوں کے لیے الگ انتظام کر رکھا ہے۔ اس پر اقبال برجستہ بول اٹھے: میاں صاحب! ہم نے آپ سے دو باتیں سیکھی ہیں، ایک چھپ کر پینا، دوسرے کسی کو چندہ نہ دینا۔ مہاراجہ کشن پرشاد کے ساتھ اقبال کی خط وکتابت عموماً سنجیدہ امور یا شعر وشاعری کے بارے میں ہوتی تھی، لیکن بعض اوقات وہ اس میں بھی مذاق کا پہلو نکال لیتے۔ ایک مرتبہ مہاراجہ کشن پرشاد نے بحالِ صحت کے لیے انہیں کسی کشتے کا نسخہ تجویز کیا۔ اقبال نے اپنے خط محررہ ۳۰ دسمبر ۱۹۱۵ء میں انہیں جواب دیا:

میری صحت عام طور پر اچھی نہیں رہتی، کوئی نہ کوئی شکایت دامن گیر رہتی ہے۔ سرکار نے جو نسخہ میرے لیے تجویز فرمایا ہے ضرور مفید ہوگا، کیونکہ مجرب ہے اور مجھے اس کے استعمال کی خواہش بھی بہت ہے۔ مگر نری خواہش سے کام نہیں چلتا۔ استعمال کے وسائل ضروری ہیں اور وہ مفقود ...... ایک مطربہ پنجاب میں رہتی ہے۔ میں نے اسے کبھی دیکھا نہیں، مگر سنا جاتا ہے کہ حسن میں لاجواب ہے چند روز ہوئے اس کا خط مجھے موصول ہوا کہ مجھ سے نکاح کر لو۔ تمہاری نظم کی وجہ سے تم سے غائبانہ پیار رکھتی ہوں اور میری توبہ کو ٹھکانے لگا دو۔ دل تو یہی چاہتا ہے کہ اس کارِ خیر میں حصہ لوں، مگر کمر میں طاقت ہی نری کافی نہیں، اس کے لیے دیگر وسائل بھی ضروری ہیں۔

مجبوراً مہذبانہ انکار کرنا پڑا۔اب بتائیے کہ آپ کا نسخہ کیسے استعمال میں آئے۔فی الحال سرکار کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنے ایک مضمون میں، جو ۱۹۳۸ء میں وفات اقبال کے بعد رسالہ جوہر دہلی میں شائع ہوا، اقبال کی شخصیت کے اسی پہلو کے بارے میں تحریر کیا:

اقبال کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ وہ فقط اعتقادی مسلمان تھے، عمل سے ان کو کچھ سروکار نہ تھا۔ اس بدگمانی کے پیدا کرنے میں خود ان کی اُفتادِ طبیعت کا بھی بہت کچھ دخل ہے۔ان میں کچھ فرقۂ ملامتیہ کے سے میلانات تھے، جن کی بنا پر اپنی رندی کے اشتہار دینے میں انہیں کچھ مزہ آتا تھا، ورنہ درحقیقت وہ اتنے بےعمل نہ تھے۔قرآن مجید کی تلاوت سے ان کو خاصا شغف تھا اور صبح کے وقت بڑی خوش الحانی کے ساتھ پڑھا کرتے تھے مگر اخیر زمانے میں طبیعت کی رقت کا یہ حال ہو گیا تھا کہ تلاوت کے دوران میں روتے روتے ہچکیاں بندھ جاتی تھیں اور مسلسل پڑھ ہی نہ سکتے تھے۔نماز بھی بڑے خشوع و خضوع سے پڑھتے تھے مگر چھپ کر ظاہر میں یہی اعلان تھا کہ نرا گفتار کا غازی ہوں۔

اقبال کی طبیعت میں حاضر جوابی، بذلہ سنجی اور ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں، اور ان کی علامات بچپن ہی ظاہر ہو گئی تھیں۔مثلاً اسکول میں دیر سے پہنچے پر استاد نے پوچھا کہ دیر سے کیوں آئے ہو؟ جواب دیا: اقبال دیر ہی سے آتا ہے وغیرہ، کالج کے ایاّم میں بھی پھبتی زبردست کستے تھے۔قیام یورپ کے دوران میں بھی اقبال کی طبیعت پر طنز و مزاح کا عنصر غالب رہا۔وطن واپسی کے بعد ابتدائی دور میں سر شہاب الدین پر ان کی پھبتیاں یا مدیر اخبار وطن اور سر جوگندر سنگھ وغیرہ سے متعلق ان کے لطیفے کئی مصنفین نے اپنی اپنی کتابوں میں نقل کیے ہیں۔ یہ سلسلہ ان کی آخری عمر تک قائم رہا اور اقبال نے مرتے دم تک ظرافت کو نہ چھوڑا۔

بہر حال یورپ اور وہاں سے واپسی کے ابتدائی ایام میں، بالخصوص مولویوں سے متعلق ان کا مذاق بعض اوقات عملی صورت بھی اختیار کر لیتا جو یقینا ان کی اقبال سے شکر رنجی کا سبب بنتا۔طالب علمی کے زمانے میں ایک مولوی صاحب یورپ کی سیاحت کرتے ہوئے لندن پہنچے ۔اقبال مولوی صاحب کو آرنلڈ کی ہدایت پر لندن کے تاریخی مقامات کی سیر کروانے لے گئے۔ اس دوران وہ انہیں ایک ایسے قہوہ خانے میں لے گئے جہاں چند ستم پیشہ لڑکیاں مولوی صاحب کے گرد ہو گئیں اور ان سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگیں۔واپسی پر جب مولوی صاحب نے آرنلڈ سے

اس کی شکایت کی تو اقبال نے کہا قہوہ خانے میں مولوی صاحب کو لے جانے کا مقصد یہ تھا کہ وہ لندن میں تاریخی مقامات کے ساتھ تصویر کا دوسرا رخ بھی دیکھ لیں۔ مرزا جلال الدین اسی سلسلے میں ایک اور واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

ایک مرتبہ ہم مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں شرکت کی غرض سے لکھنؤ گئے۔ ایک شام کو جبکہ ہم فارغ تھے اقبال نے کہا کہ کہیں چل کر گانا سن آئیں۔ جس طوائف کے ہاں وہ گانا سننے گئے وہاں کانفرنس میں مدعو ایک مولوی صاحب پہلے سے موجود تھے۔ لیکن جب وہ محفل سے نکلے تو بوکھلاہٹ میں اپنا دعوتی رقعہ وہیں پھینک آئے۔ اقبال نے وہ دعوتی رقعہ اٹھالیا اور اس کے ساتھ طوائف کی طرف سے نواب وقار الملک بہادر صدر ایجوکیشنل کانفرنس کے نام ایک طویل خط لکھا جس میں مولوی صاحب کے طوائف کے ہاں آنے، گانا سننے اور رقعہ وہاں پھینک جانے کا ذکر کیا۔ جب اس معاملے کی خبر مولوی صاحب کو ہوئی تو وہ سخت سٹپٹائے۔ مولوی صاحب اقبال کے پاس آ کر منت سماجت کرنے لگے کہ وہ رقعہ انہیں دے دیں اور صدر کانفرنس کو نہ بھیجیں۔ مگر اقبال تو گویا اسی وقت کے انتظار میں تھے۔ اب آئے ہو تو جاتے کہاں ہو، کے مصداق انہوں نے حضرت کو وہ رگیدا دیا کہ بس اللہ دے اور بندہ لے۔ نہ جانے آپ نے ناک سے کتنی لکیریں کھینچیں، تب آپ کی جان چھوٹی۔

اقبال کو بچپن ہی سے گانے کا بہت شوق تھا اور راگوں کے الاپ سے شناسا تھے۔ لاہور میں طالب علمی کے زمانے میں مشاعروں میں حصہ لینا شروع کیا۔ پھر ستار خرید لی اور اسے بجانے کی مشق کیا کرتے۔ رفتہ رفتہ جب ان کا تعارف شہر کے باذوق رؤسا سے ہوا تو ان کی رقص وسرود کی محفلوں میں وہ بھی بلائے جانے لگے۔

سو اس زمانے میں راگ رنگ اور بحیثیت شاعر حسن پسندی ان کی فطرت کا حصہ تھی۔ جس طرح مناظر فطرت کی دلکشی ان کی توجہ کا مرکز بنتی، اسی طرح نسوانی حسن سے بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے۔ ۱۹۰۳ء میں ان کے بچپن کے دوست سید تقی شاہ کے نام ایک خط میں ''امیر'' کا ذکر ملتا ہے۔ لکھتے ہیں:

امیر کہاں ہے؟ خدا کے لیے وہاں ضرور جایا کریں۔ مجھے بہت اضطراب ہے۔ خدا جانے اس میں کیا راز ہے، جتنا دور ہو رہا ہوں، اتنا ہی اس سے قریب ہو رہا ہوں۔

راقم کی تحقیق کے مطابق امیر بیگم کا تعلق گو طوائفوں کے ایک گھرانے سے تھا لیکن وہ اور

اس خاندان کی دیگر خواتین تائب ہو چکی تھیں ۔ نہایت فصیح و بلیغ اردو میں بات چیت کرتیں۔ اس وجہ سے اقبال ان سے بے حد متاثر تھے۔

یورپ میں قیام کے دوران یورپ کی مخلوط معاشرت میں انہیں چند ایسی خواتین ملیں، جو جسمانی حسن کے ساتھ ادب و فلسفے سے شناسائی کے سبب اقبال کے لیے اور بھی پر کشش تھیں۔ یورپین خواتین کے علاوہ عطیہ فیضی اور اطالوی بیرونس سے، بھی ملے، جنہوں نے سفر اطالیہ کے دوران اقبال کی ملاقات فاشی آمر مسولینی سے کرائی اور روم میں اقبال کے استقبال کے لیے ایک دعوت کا اہتمام بھی کیا، جس میں اقبال کی خواہش پر انہیں روم کی حسین ترین خواتین سے ملوایا۔

یورپ سے واپسی کے بعد جب تک وہ تنہا رہے، مرزا جلال الدین کی رقص و سرود کی محفلوں میں شریک ہوتے تھے، لیکن اقبال کی یہ زندگی ۱۹۱۳ء میں ختم ہو گئی۔ البتہ گانا سننے کا شوق انہیں آخر عمر تک رہا۔ دہلی جاتے تو خواجہ حسن نظامی ان کے لیے قوالی کی محفل لگاتے جو انہیں بے حد پسند تھی۔

انارکلی والے مکان میں رہائش کے دوران پیش آنے والے ایک واقعہ نے اقبال کو بہت پریشان کیا۔ غالباً ۱۹۱۵ء میں اقبال کا ایک بھانجا انہی کے ساتھ یہاں اقامت پذیر ہوا۔ گرمیوں کی تعطیلات میں جب کہ اقبال یہاں موجود نہ تھے بھانجا بازار حسن سے ایک ہندو لڑکی کو لے آیا اور اس سے نکاح کر لیا۔ بعد میں جب رشتہ داروں کی رپٹ پر لڑکی یہاں سے برآمد ہوئی تو اقبال بہت برہم ہوئے اور بھانجے کو اس کی بیوی سمیت گھر سے نکل جانے کا حکم دے دیا اور پھر ساری عمر اس کی صورت تک دیکھنے کے روادار نہ ہوئے۔

راقم کے خیال میں اس پس منظر کی روشنی میں اقبال کے خلاف الزامات کا جائزہ بہتر طور پر لیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک مے نوشی کی تہمت کا تعلق ہے تحقیق کے باوجود ایسی کوئی مؤثر شہادت نہیں جس سے یہ الزام ثابت ہو سکے۔ ان ایام میں وہ تمام لوگ جن سے اقبال کا تعلق رہا مثلاً سید تقی شاہ، سر عبدالقادر، محمد دین فوق، عطیہ فیضی، مولوی احمد دین، نواب سر ذوالفقار علی خان، مرزا جلال الدین اور سردار امراؤ سنگھ شیر گل وغیرہ جن میں سے اکثر اقبال کے بے تکلف دوست بھی تھے، ان کے ہاں اقبال کی مے نوشی کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ بلکہ اقبال نے خود ایک مجلس میں بتایا کہ انہوں نے یورپ میں بھی شراب کو منہ نہیں لگایا۔ ۱۹۳۸ء کے اوائل میں جب ایک سکھ اقبال سے ملاقات کے لئے آیا اور برآمدے میں شراب پینے لگا تو اقبال نے اسے گریبان

سے پکڑ کر جھنجھوڑا کہ شراب کی بوتل فرش پر گر کر چکنا چور ہوگئی سکھ گھبرا کر بھاگ گیا۔

اقبال کے بعض عقیدت مند، شاید جن میں صوفی غلام مصطفیٰ تبسم اور عبدالمجید سالک بھی تھے، یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ اقبال نے شاید کسی زمانے میں مے پی ہو، بعد میں بہر حال چھوڑ دی۔ اس مفروضے کی تائید میں اقبال کے اپنے اعتراف پر مبنی وہ اشعار پیش کیے جاتے ہیں جو رموز بے خودی کے آخر میں ''حضور رحمۃ للعالمین ﷺ'' میں عرض حال کرتے ہوئے انہوں نے تحریر کیے:

مدتے با لالہ رویاں ساختم عشق با مرغولہ مویاں باختم
بادہ ہا با ماہ سیمایاں زدم بر چراغِ عافیت داماں زدم
برقہا رقصید گردِ حاصلم رہزناں بروند کا لاے دلم
ایں شراب از شیشہ جانم نہ ریخت
ایں زرِ سارا ز دامانم نہ ریخت

تاہم صرف اشعار سے جب کہ واقعاتی شہادت اس کے برعکس ہو شاعر کے معمولات کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا ورنہ حافظ اور ریاض خیر آبادی جیسے شعراء سب سے بڑے مے خوار قرار پائیں گے۔

اقبال سے متعلق دوسرا الزام کہ وہ عیاش تھے، غالباً اس لیے لگایا گیا کہ وہ اپنے ابتدائی زمانے میں رقص و سرود کی محفلوں میں شریک ہوتے تھے، مالی اعتبار سے اقبال کبھی بھی ایسی پوزیشن میں نہ ہوئے کہ عیاشی کر سکیں یا رنگ رلیاں منا سکیں۔ اس زمانے میں بعض طوائفیں شائقین کو اردو اور فارسی اساتذہ کا کلام بھی سنایا کرتی تھیں اور چونکہ ایسی محفلوں میں ثقافتی پہلو نمایاں ہوتا، اس لیے ان میں شرفائ، رؤسا یا اہل ذوق کا شریک ہونا کوئی عار نہ سمجھا جاتا تھا۔ اقبال کی پہلی شادی کے موقع پر گجرات میں بھی اسی قسم کی محفل کا اہتمام کیا گیا تھا اور بزرگوں نے، جن میں سید میر حسن اور اقبال کے والد بھی شامل تھے، ایک بند کمرے میں اساتذہ اور حافظ کا کلام سنا تھا۔ علاوہ ازیں اس زمانے میں تفریح کا کوئی اور سامان نہ تھا۔ بمبئی کی چند تھیٹر کمپنیاں تھیں جو لاہور آ کر آغا حشر کاشمیری کے ڈرامے پیش کرتیں اور اقبال ان کے ڈرامے دیکھنے بھی جاتے۔ لیکن ایسے مواقع کبھی کبھار ملتے تھے۔ مرزا جلال الدین اسی سلسلے میں بیان کرتے ہیں:

سارا دن عدالتوں میں موشگافیوں میں بسر ہو جاتا۔ رات کے وقت دیر گئے تک مقدمات کی تیاری کے مشاغل درپیش رہتے اور دن چڑھتے ہی از سرنو اسی دماغی کاوش میں الجھنا پڑتا۔ چنانچہ طبیعت میں تازہ دم ہونے کی خواہش پیدا ہوتی اور دل فراغت کے لمحات کے لیے بے چین ہو جاتا۔ اس پر ہم چند دوست زندگی کے پریشان کرنے والے ہنگاموں سے ہٹ کر خوش وقتی کے لیے ایک مختصر سی بزم قائم کرتے اور اس کی دلکشیوں میں اپنے تھکے ہوئے دماغوں کو تازہ دم کرتے۔

اقبال کے بعد کے کچھ نقادوں نے اقبال کی شخصیت کا تجزیہ ان کی حیات معاشقہ کے تناظر میں کرنا شروع کر دیا۔ وہ اقبال کی کچھ نظموں مثلاً ''وصال''، ''حسن و عشق''، ''نوائے غم''، ''پھول کا تحفہ عطا ہونے پر'' وغیرہ کو اسی تناظر میں دیکھتے ہیں۔ مزید براں وہ اس بات کی تائید عطیہ فیضی کے نام اقبال کے خطوط سے بھی پاتے ہیں۔

ممکن ہے اقبال کو عطیہ فیضی سے یہ تعلق خاطر پیدا ہوا ہو۔ اس لیے اقبال انہیں اپنی رفیقہ حیات بنانا چاہتے ہوں گے، لیکن ان کے خاندان کے عام اور سادہ رہن سہن میں کسی ایسی خاتون کا کھپ جانا انہیں یقینا ناممکن نظر آتا ہوگا۔ خاندانی، معاشرتی، سماجی اور مالی عدم تفاوت کے باعث یہ بات آگے نہ بڑھی۔ چنانچہ یہ محبت ناکام رہی۔

مسعود الحسن، اقبال پر اپنی تصنیف میں تحریر کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے، اقبال اور عطیہ فیضی کے درمیان ۱۹۰۷ء یا ۱۹۰۸ء میں سمجھوتا ہو چکا تھا کہ وہ آپس میں شادی کریں گے۔

ہندوستان واپس آ کر عطیہ فیضی انہیں اپنے خطوط میں جنجیرہ آنے کے لیے اس لیے بار بار کہتی تھیں کہ رشتے کی بات پکی ہو جائے، مگر اقبال جنجیرہ نہ گئے۔ لہٰذا یہ معاشقہ تھوڑی مدت تک ہی چلا اور دسمبر ۱۹۱۱ء میں ختم ہو گیا۔ ۱۹۱۲ء میں عطیہ فیضی کی شادی فیضی رحمین سے ہو گئی۔ بعد میں ۱۹۳۳ء میں اقبال کی ان سے پھر خط و کتابت ہوئی، لیکن اس کی نوعیت محض رسمی تھی۔

خالد نظیر صوفی کی رائے میں عطیہ فیضی کے ساتھ اقبال کے تعلقات کے بارے میں یہ باتیں صرف مفروضے ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ عطیہ کی طرف سے جنجیرہ آنے کی متعدد دعوتوں کے باوجود وہاں نہ گئے۔ البتہ ۱۹۳۱ء میں عطیہ فیضی کی شادی کے کافی عرصے بعد ان کی دعوت کو انہوں نے شرف قبولیت بخشا اور بمبئی میں ان کے دولت کدہ ایوان رفعت میں ان سے ملنے گئے۔

حقیقت یہ ہے کہ یورپ سے واپسی پر اقبال کو مالی مشکلات اور ازدواجی زندگی کی بے

سکونی کے سبب کرب و اضطراب میں عطیہ فیضی یا ایما ویگے ناست جیسی حساس شخصیت نے جذباتی سہارا مہیا کر دیا۔

جرمن رومانی ادب کے زیر اثر چند ایک نامکمل نظمیں قیامِ یورپ کے زمانے میں ان کی بیاض میں بھی درج ہیں، جو (بیاض) اب علامہ اقبال میوزیم میں [illegible]ط ہے۔ ان میں ایک نامکمل نظم ''گم شدہ دستانہ'' کے عنوان سے ہے۔ جس کے صرف تین مصرعے لکھے گئے:

رکھا تھا میز پر ابھی ہم نے اتار کر — تو نے نظر بچا کے ہماری اڑا لیا
آنکھوں میں ہے تری جو تبسم شریر سا — ....

لیکن اقبال فطرتاً رومانی شاعر نہ تھے، اس لیے انہوں نے سوائے چند کے باقی نظمیں غیر ضروری سمجھ کر تلف کر دیں۔

اقبال سے متعلق یہ الزام کہ وہ ایّام جوانی میں ایک طوائف کے قتل کے مرتکب ہوئے، کسی ایسے ذہن کی اختراع ہے، جو اقبال سے قطعی طور پر ناواقف تھا۔ اقبال کو غصّہ بہت کم آتا تھا۔ اگر کسی سے سخت ناراض ہو جاتے تھے تو عمر بھر کے لیے قطع تعلق کر لیتے، لیکن غصّے کے جذبات سے مغلوب ہو کر انہوں نے نہ تو کبھی کسی سے فحش کلامی کی اور نہ ہاتھا پائی تک نوبت پہنچی۔ علاوہ ازیں طاقت، قوت اور جہاد کے داعی ہونے کے باوجود ان کی رقت قلب کا یہ عالم تھا کہ خون بہتا دیکھ نہ سکتے تھے۔ محمد دین تاثیر لکھتے ہیں:

اقبال کی رندی کوئی راز نہیں، لیکن یہ رندی بیشتر لفظی اور خیالی رندی تھی۔ جوانی کا زور تھا اور بس۔ اقبال پر رندی کبھی غالب نہیں آئی، رندی پر اقبال ہی غالب رہا۔ میں اس وثوق سے اس لیے کہتا ہوں کہ اقبال نے کبھی اپنی پردہ پوشی نہیں کی۔ ہم نے جو سوال کیا، اس کا صاف جواب دیا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ ان کی زندگی میں کوئی چھپانے کے قابل بات ہی نہیں تھی۔ اور وہ جسے رندی کہا جا سکتا ہے، وہ سب اسرارِ خودی سے پہلے کے لطائف ہیں۔ ان لطائف کو سر شادی لعل نے اقبال کو ہائی کورٹ کی ججی سے روکنے کے لیے اور چند ان کے ہم پیشہ مسلمان مشاہیر نے اپنے مطالب کی خاطر خوب بڑھا چڑھا کر شہرت دی۔ اتنی سی بات تھی، جسے افسانہ کر دیا۔ میں اقبال کو ولی نہیں کہتا، لیکن ایسا تہجد خواں، عاشق رسولؐ، اولیاء کا خادم اور عقیدت گزار، خوش عقیدہ، گداز قلب مسلمان، انگریزی دانوں میں کم دیکھا ہے، مگر مزاج میں رندی موجود تھی۔ اچھی شکل کو اچھی شکل ضرور سمجھتے

تھےلیکن عاشقی کے گنہ گار کبھی نہیں ہوئے، عمل میں توازن تھا، طبیعت میں شاعری۔

بہرحال راقم اس پوزیشن میں نہیں کہ اقبال کو قریب سے جاننے والوں کی ان آراء پر کوئی تبصرہ کرے، لیکن اقبال نے اپنا جو تجزیہ خود نظم ''ابر گوہر بار'' میں کیا ہے، وہ اس معاملے میں بہت کافی ہے۔ ارشاد کرتے ہیں:

ہوں وہ مضمون، کہ مشکل ہے سمجھنا میرا
کوئی مائل ہو سمجھنے پہ، تو آساں ہوں میں

رند کہتا ہے ولی مجھ کو، ولی رند مجھے
سن کے ان دونوں کی تقریر کو حیراں ہوں میں

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے، مسلماں ہوں میں

باب:۱۰

ذہنی ارتقا

اقبال دراصل احیائے اسلام کے شاعر و مفکر تھے۔ اس لیے ان کے ذہنی ارتقا کو تحریکِ احیائے اسلام کی روشنی میں سمجھا جا سکتا ہے۔ عہدِ حاضر میں احیائے اسلام کا ظہور اٹھارہویں صدی عیسوی کے وسط میں نجد کی سرزمین میں ابنِ عبدالوہاب (۱۷۰۳ء تا ۱۷۸۷ئ) کی اصلاحی تحریک سے ہوا۔ یہ تحریک مسلمانوں کی دینی، اخلاقی اور سیاسی تنزل اور سلاطین، علماء اور صوفیاء کے مائل بہ زوال کردار کے خلاف ردِعمل تھی۔

برصغیر میں انیسویں صدی میں سید احمد بریلوی، مولوی شریعت اللہ، ودودمیاں اور میر نثار علی کی دعوتِ اصلاح اور تنظیمِ جہاد، اسی قسم کی تحریکیں تھیں، سید احمد بریلوی اور ان کے حامیوں نے شمال مغربی سرحد کو مرکز جہاد بنایا، کیونکہ وہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی، اور پشت پر مسلم ممالک موجود تھے۔ انہوں نے اولاً سکھوں کے خلاف، جو مسلم اکثریتی علاقوں پنجاب اور کشمیر پر قابض تھے، اعلانِ جہاد کیا۔ سید صاحب نے سندھ اور بلوچستان کے مسلم حاکموں کے تعاون سے یہاں اسلامی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی اسی طرح میر نثار علی مشرقی بنگال میں اسلامی حکومت کے قیام کے لئے کوشاں تھے۔

بہرحال ناکامیوں کے باوجود تحریکِ احیاے اسلام جاری رہی۔ مغرب سے براہ راست تعلق کے باعث نئے تصورات دنیاے اسلام میں در آئے۔ دو ایک نسلوں کے بعد اس تحریک میں وسعتِ نظر نے جنم لیا اور عالمِ اسلام میں کچھ ایسے مصلحین بھی پیدا ہو گئے، جنہوں نے جدید نظریات کی مخالفت کی بجاے انہیں اسلامی رنگ دینا شروع کر دیا۔ برصغیر میں سرسید احمد خان اور ان کے معتقدین اسی دور کی پیداوار تھے۔ انہوں نے بھی قومیّتِ اسلام کے اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے ملت کی فلاح و بہبود کی خاطر مسلمانانِ ہند میں جدید تعلیم کے فروغ کے لیے عظیم

خدمات انجام دیں، مگر اب مصلحین دو گروہوں میں بٹ گئے تھے، قدامت پسند اور اعتدال پسند، جو ایک دوسرے کی مخالفت کرنے لگے تھے۔ ان دو گروہ میں مصالحت کے نمائندہ جمال الدین افغانی تھے۔ جن کے زیر اثر دنیائے اسلام میں پان اسلام ازم اور مسلم نیشنل ازم کی تحریکیں رونما ہوئیں۔

اقبال نے شاعری کی ابتداء مسلمانوں کے زمانہ تنزل کے ایک روایتی غزل گو کی حیثیت سے مشاعروں میں کی، مگر انہوں نے عہد تنزل کے بجائے احیاء کے ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں، اس لیے اپنے گرد و نواح سے متاثر ہوئے بغیر کیونکر رہ سکتے تھے۔ قیام یورپ کے دوران میں اقبال ایک عظیم ذہنی اور قلبی انقلاب سے گزرے، جس نے ان کی شاعری کا رخ حتمی طور پر اسلام کی طرف پھیر دیا۔ خلیفہ عبدالحکیم تحریر کرتے ہیں:

> اقبال نے یہ قطعی فیصلہ کر لیا کہ باقی عمر میں شاعری سے اب احیائے ملت کا کام لیا جائے گا۔ فرماتے تھے کہ میرے والد نے مجھ سے یہ خواہش کی تھی اور مجھے نصیحت کی تھی کہ اپنے کمال کو اسلام کی خدمت میں صرف کرنا۔ اقبال میں یہ جذبہ شروع سے موجود تھا، لیکن اس میں شدت اور گرمی مغرب میں پیدا ہوئی۔ اس کی طبیعت میں یہ آفتابِ محشر مغرب میں طلوع ہوا۔

بہرحال وطن اور قوم کی محبت کی شاعری کے دور میں بھی اقبال کے ہاں اسلامیّت کا عنصر موجود تھا، انہیں مسلم قوم کی تعمیرِ نو کی فکر تھی۔ ۱۹۰۴ء میں تحریر کردہ اپنے ایک مضمون بعنوان ''قومی زندگی'' میں دنیا کی دیگر اقوام کی ترقی کا ذکر کرتے ہوئے برصغیر کے مسلم معاشرے کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں:

> مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اگر اس اعتبار سے مسلمانوں کو دیکھا جائے تو ان کی حالت نہایت مخدوش نظر آتی ہے۔ یہ بدقسمت قوم حکومت کھو بیٹھی ہے، صنعت کھو بیٹھی ہے، تجارت کھو بیٹھی ہے، ان فرقہ آرائیوں نے خیر الامم کی جمعیت کو کچھ اس بری طرح منتشر کر دیا ہے کہ اتحاد و یگانگت کی کوئی صورت نظر نہیں آتی ...... مولوی صاحبان کی یہ حالت ہے کہ پرانا علم و فضل جو علمائے اسلام کا خاصہ تھا، نام کو بھی نہیں۔ امراء کی عشرت پسندی کی داستان سب سے نرالی ہے۔ پہلی دو بیویوں سے پوشیدہ کہیں کہیں پیغام بھیجتے رہتے ہیں۔ عوام کی تو کچھ نہ پوچھیے۔ کوئی اپنی عمر کا اندوختہ بچے کے ختنے پر اڑا رہا ہے، کہیں ایک معمولی بات پر مقدمہ بازیاں ہو رہی ہیں، کہیں جائیداد کے جھگڑوں سے جائیدادیں فنا ہو رہی ہیں ...... تمدن کی یہ صورت کہ لڑکیاں ناتعلیم یافتہ،

نوجوان جاہل، روزگار ان کو نہیں ملتا، صنعت سے گھبراتے ہیں، حرفت کو یہ عار سمجھتے ہیں، مقدمات نکاح کی تعداد ان میں روز بروز بڑھ رہی ہے، جرم کی مقدار روز افزوں ہے...... یہ بڑا نازک وقت ہے۔ دنیا میں کوئی بڑا کام سعی بلیغ کے بغیر نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ خدا تعالیٰ بھی کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا، جب تک کہ وہ قوم اپنی حالت خود نہ بدلے۔

اس کے بعد فرد اور قوم کے تعلق کے حوالے سے محنت اور تعلیم کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ عورت کو تعلیم دینا پورے خاندان کو تعلیم دینا ہے۔ پردہ، اور تعدد ازدواج بھی ایسے امور ہیں جو اصلاح کے طلبگار ہیں۔ فرماتے ہیں:

ابتدائے اسلام میں اقتصادی اور سیاسی لحاظ سے اس کی ضرورت بھی تھی، مگر جہاں تک میں سمجھتا ہوں، موجودہ مسلمانوں کو فی الحال اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ موجودہ حالت میں اس پر زور دینا قوم کے اقتصادی حالات سے غافل رہنا ہے اور امرائے قوم کے ہاتھ میں زنا کا ایک شرعی بہانہ دینا ہے۔

بے جا نمود و نمائش پر تنقید کرتے ہوئے اسے قبیح رسم، فضول خرچی اور خاندانی خلفشار کا سبب قرار دیتے ہیں۔ آپ کی رائے میں مسلم قوم کی تعمیرِ نو کے لیے دو چیزوں کی بہت ضرورت ہے۔ اصلاح تمدن اور تعلیم عام۔ فرماتے ہیں:

اگر میرے دل سے پوچھو تو سچ کہتا ہوں کہ میری نگاہ میں اس بڑھئی کے ہاتھ، جو تیشے کے متواتر استعمال سے کھردرے ہو گئے ہیں، ان نرم نرم ہاتھوں کی نسبت بدرجہا خوبصورت اور مفید ہیں، جنھوں نے قلم کے سوا کسی اور چیز کا بوجھ کبھی محسوس نہیں کیا۔

اصلاحِ تمدن کے متعلق اقبال کے نظریات اس زمانے میں بھی وہی تھے، جن کا آپ بعد کی زندگی میں زیادہ تفصیل کے ساتھ اعادہ کرتے رہے۔ ارشاد کرتے ہیں:

مسلمانوں میں اصلاحِ تمدّن کا سوال دراصل ایک مذہبی سوال ہے، کیونکہ اسلامی تمدن اصل میں مذہبِ اسلام کی عملی صورت کا نام ہے اور ہماری تمدنی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو اصول مذہب سے جدا ہوسکتا ہو۔ آج بعض ایسی تمدنی ضروریات پیدا ہوگئی ہیں کہ فقہا کے استدلالات، جن کے مجموعے کو عام طور پر شریعتِ اسلامی کہا جاتا ہے، ایک نظرِ ثانی کے محتاج ہیں۔ اگر موجودہ حالات زندگی پر غور و فکر کیا جائے تو جس طرح اس وقت ہمیں تائید اصول مذہب کے لیے ایک جدید علم کلام کی ضرورت ہے، اسی طرح قانون اسلامی کی جدید تفسیر کے لیے ایک بہت بڑے فقیہ کی ضرورت ہے، جس کے قوائے عقلیہ و متخیلہ کا پیمانہ اس قدر وسیع ہو

کہ وہ مسلمات کی بنا پر قانونِ اسلامی کو نہ صرف ایک جدید پیرائے میں مرتب و منظم کر سکے، بلکہ تخیل کے زور سے اصول کو ایسی وسعت دے سکے جو حال کے تمدنی تقاضوں کی تمام ممکن صورتوں پر حاوی ہو۔

اس مضمون کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال ارتقائے فکر کے اوائلی دور ہی میں ملّتِ اسلامیہ کے تنزل کے اسباب سے باخبر تھے، ان کی نگاہ میں حیات انسانی میں ایک ایسا تغیر آ چکا تھا۔ جس نے زمانہ حال کو زمانہ ماضی سے منقطع کر کے مسلمانوں کو اپنا انداز فکر تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ ملت اسلامیہ کی تعمیر نو کے لئے جدید تقاضوں کے تحت جدید علم کلام اور قانون اسلامی میں اجتہاد پر غور کر رہے تھے جس کے بغیر اسلام کے لئے ایک تمدن یا تحریک زندگی کے طور پر باقی رہنا مشکل تھا۔

اقبال کے قیام انگلستان کے دوران، تقسیمِ بنگال کے خلاف ہندوؤں کے ردعمل، مسلم لیگ کے قیام اور جداگانہ انتخابات کے مطالبے ایسے واقعات تھے جن کے باعث وہ ایک ذہنی انقلاب سے گزرے جس کا اندازہ لندن میں پان اسلامک سوسائٹی، مسلم لیگ کی برٹش کمیٹی اور لاہور واپسی کے بعد انجمن حمایتِ اسلام میں ان کی اسلامی تمدن پر تقاریر سے ہوتا ہے۔ ۱۹۰۹ء تک وہ اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ اپنا اپنا قومی تشخص ایک دوسرے سے الگ برقرار رکھیں۔

۱۹۰۹ء میں اقبال نے اپنے مضمون ''اسلامِ بحیثیت ایک اخلاقی اور سیاسی نصب العین'' میں اسلام کے اخلاقی اصول کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر کیا کہ اسلام انسان کو اس کی شخصیت کا احساس دلاتا ہے، تاکہ وہ اپنے آپ کو طاقت کا سرچشمہ محسوس کرنے لگے۔ انسان کی انفرادیت کا یہ تصور کہ وہ بجائے خود طاقت کا سرچشمہ ہے، اسلامی تعلیمات کے مطابق، اس کے ہر عمل کی قدر و قیمت کا تعین کرتا ہے۔ پس ہر وہ شئے جو انسان میں انفرادیت کے احساس کو قوی کرے، نیکی ہے۔ اگر انسان کی عزت و تکریم اس کی ذاتی شخصیت کی بنا پر ہونے لگے اور اسے خدا کی بنائی ہوئی دنیا کی وسعتوں میں بغیر کسی خوف کے آزادانہ حرکت کی اجازت ہو تو وہ دیگر شخصیتوں کی عزت کرے گا اور مکمل طور پر نیکی کا مظہر بن جائے گا۔

اسی مضمون میں ارشاد کرتے ہیں کہ پیغمبرِ اسلامؐ نے جو دنیائے قدیم اور دنیائے جدید کے درمیان ایک کڑی ہیں، انسانوں میں معاشی مساوات کے اصول کا اعلان کیا۔ اس وقت کے

معاشرتی تقاضوں کے پیش نظر اگرچہ نام کی غلامی جاری رہی، مگر آنحضورؐ نے اس ادارے کی اصل روح کا خاتمہ کر دیا۔ اسلام کے نزدیک غربت ایک قسم کی بدی ہے۔ ایک مضبوط جسم میں ایک مضبوط قوتِ ارادی ہی اسلام کا اخلاقی نصب العین ہے، فرماتے ہیں:

کیا ہندوستان کے مسلمان اس معیار پر پورے اترتے ہیں؟ کیا وہ اپنے اندر اتنی قوت کردار رکھتا ہے کہ ان تمام طاقتوں کا مقابلہ کر سکے جو اس کے معاشرتی نظام کو پارہ پارہ کرنے کے درپے ہیں؟ افسوس ہے کہ مجھے اپنے سوالات کا جواب نفی میں دینا پڑ رہا ہے۔ قارئین جانتے ہیں کہ حیات کی تگ ودو میں افراد کی کثرتِ تعداد ہی وہ عنصر نہیں جو کسی معاشرتی نظام کی بقا کا ضامن ہے بلکہ افراد کی اجتماعی قوت کردار اس کی بقا کے لیے ایک قطعی لازمہ ہے۔

انفرادی قوت کردار کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے ارشاد کرتے ہیں:

میرے دل میں تو شیطان کی بھی کچھ نہ کچھ قدر ومنزلت موجود ہے۔ آدم کو جسے وہ دیانت داری سے اپنے آپ سے کمتر سمجھتا تھا، سجدہ کرنے سے انکار کے ذریعے شیطان نے اپنی نگاہوں میں اپنی عزت کے ایک انتہائی بلند جذبے کا مظاہرہ کیا۔ خدا تعالیٰ نے شیطان کو اس لیے سزا نہیں دی کہ اس نے کمزور انسانیت کے جدِّ اعلیٰ کے سامنے جھکنے سے انکار کیا، بلکہ محض اس لیے کہ اس نے حیات وکائنات کے عظیم خالق ومالک کی رضا کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے سے احتراز کیا تھا۔

پھر تحریر کرتے ہیں کہ مسلمانوں کی تباہ حالی کا سبب تعلیم یافتہ طبقے کا صنعت وحرفت اور تجارت سے احتراز اور سرکاری ملازمت کی طلب ہے۔ ان کی معاشی محتاجی ہی انہیں نجی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں سے تباہی کی طرف لے جارہی ہے۔ نظام تعلیم بھی مسلمانوں کو ان کے ماضی اور قومی نصب العین سے الگ تھلگ کر رہا ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کے لیے ایسے نظامِ تعلیم کی ضرورت ہے جو ان کی معاشرتی اور تاریخی روایات کو زندہ رکھے اور ان میں خالصتاً اسلامی کردار پیدا کرے۔

اس کے بعد اسلام بحیثیت سیاسی نصب العین کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے اسلام کے تصورِ ملّی کی وضاحت کرتے ہیں کہ اسلام صرف مذہب ہی نہیں بلکہ ملت یا قوم بھی ہے، اسلام میں مذہب اور ملت ایک دوسرے سے الگ نہیں کیے جا سکتے۔ اسلامی دستور کے دو بنیادی اصول ہیں۔ اوّل قانون الٰہی کی حاکمیت اور دوم ملت کے تمام افراد میں مساوات۔ اسلام کا سیاسی نصب العین ملت اسلامیہ کے اتحاد کے ذریعے صحیح معنوں میں جمہوریت کا قیام ہے۔ یہ

تمام مسلمانوں کی برابری ہی کا اصول تھا، جس نے انہیں دنیا کی عظیم ترین سیاسی طاقت بنا دیا۔ مگر ہندوستان میں اسلام کی ہیئت اجتماعی کی وحدت اس [redacted] نہیں کہ مسلمانوں میں امتیازات کا دہرا نظام قائم ہے۔ ایک طرف فرقہ بندی کی صورت میں مذہبی فرقوں کی بھر مار ہے اور دوسری طرف معاشرتی طور پر ذات پات کا وہ امتیاز بھی موجود ہے جو انہوں نے ہندوؤں سے ورثے میں حاصل کر رکھا ہے۔ اسلام میں ایسے امتیازات کی کوئی گنجائش نہیں، کیونکہ وہ ایک نا قابل تقسیم وحدت ہے، فرماتے ہیں:

> جب حق بجائے خود خطرے میں ہو تو اس کی تاویلات پر مت لڑو۔ رات کی تاریکی میں چلتے وقت ٹھوکر کھانے کی شکایت کرنا بے معنی ہے آؤ ہم سب مل کر آگے بڑھیں۔ طبقاتی امتیازات اور فرقہ بندی کے بت ہمیشہ کے لیے پاش پاش کر دیں تا کہ اس ملک کے مسلمان ایک بار پھر ایک عظیم با معنی قوت کی صورت میں متحد ہوں۔

اس مضمون کا مطالعہ یہ ثابت کرتا ہے کہ جہاں تک برصغیر میں مسلمانوں کی ہیئت اجتماعی کا تعلق ہے، سر سید کی وفات کے بعد، بالخصوص علم و ثقافت کے میدان میں یہ اقبال ہی تھے جنہوں نے ایک خیال افروز قیادت فراہم کی۔ اس مضمون میں ایسے کئی افکار کے نقوش بھی موجود ہیں، جن کی بنیادوں پر بعد میں اقبال نے اپنے فلسفۂ خودی کی عظیم الشان عمارت تعمیر کی۔

اقبال کی ۱۹۱۰ء کی بھی بعض تحریریں قابل توجہ ہیں۔ اس سال انہوں نے افکارِ پریشاں کے عنوان کے تحت انگریزی میں ایک بیاض ۲۷ اپریل ۱۹۱۰ء سے لکھنا شروع کی۔ اس میں وقتاً فوقتاً ذہن سے گزرتے ہوئے خیالات کا اندراج کرتے تھے۔ اس سال دسمبر میں انہوں نے ایک انگریزی مقالہ بعنوان ''مسلم کمیونٹی'' ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ کے اسٹریچی ہال میں پڑھا۔ بعد میں اس کا ترجمہ مولانا ظفر علی خان نے اردو میں ''ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر'' کے عنوان کے تحت کیا۔ پھر اسی سال انہوں نے ایک انگریزی مضمون بعنوان ''اسلام میں سیاسی فکر'' تحریر کیا، جو ھندوستان ریویو کے دسمبر ۱۹۱۰ء اور جنوری ۱۹۱۱ء کے شماروں میں شائع ہوا۔ اقبال کے ذہنی ارتقاء کے مختلف مراحل سے شناسائی کے لیے ان تحریروں کا علیحدہ علیحدہ تجزیہ کرنا اشد ضروری ہے۔

بیاض افکارِ پریشاں میں اقبال نے متنوع موضوعات مثلاً آرٹ، فلسفہ، ادب، سائنس سیاست اور مذہب کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ بیاض میں اقسام

حکومت کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

میری رائے میں حکومت، خواہ جس قسم کی ہو، وہ بہرصورت قومی کردار کے متعین کرنے والے عوامل میں سے ہے۔ سیاسی اقتدار کا زوال قومی کردار کے حق میں بھی تباہ کن ثابت ہوتا ہے۔ مسلمانانِ ہند اپنے سیاسی زوال کے ساتھ ہی بڑی سرعت سے اخلاقی انحطاط میں مبتلا ہو گئے۔

اتحادِ ملّی کے متعلق فرماتے ہیں:

ہمارے ملّی اتحاد کا انحصار اس بات پر ہے کہ مذہبی اصول پر ہماری گرفت مضبوط ہو۔ جونہی یہ گرفت ڈھیلی پڑی، ہم کہیں کے بھی نہیں رہیں گے اور عین ممکن ہے کہ ہمارا انجام وہی ہو، جو یہودیوں کا ہوا۔

وطنیت کے رد میں تحریر کرتے ہیں:

اسلام کا ظہور بت پرستی کے خلاف ایک احتجاج کی حیثیت رکھتا ہے۔ وطنیت بھی بت پرستی کی ایک لطیف صورت ہے۔ اس لیے اسلام جس چیز کو مٹانے کے لیے آیا، اسے مسلمانوں کی سیاسی تنظیم کا بنیادی اصول قرار نہیں دیا جا سکتا۔ پیغمبر علیہ السلام کا اپنی جاے پیدائش مکّے سے ہجرت فرما کر مدینے میں قیام و وصال غالباً اسی حقیقت کی طرف ایک مخفی اشارہ ہے۔

شذرات میں ایک اندراج تو فقط اس فقرے پر مبنی ہے:

قومیں شاعروں کے دلوں میں جنم لیتی ہیں، لیکن سیاستدانوں کے ہاتھوں نشو و نما پاتی اور مر جاتی ہیں۔

۱۵ مئی ۱۹۱۰ء کا اندراج آسمان پر دُم دار ستارہ دیکھتے وقت اقبال کے ذاتی تاثرات کا غماز ہے:

کل تقریباً چار بجے صبح میں نے کرۂ ارض کے اس عظیم الشان زائر کو دیکھا جو ہیلی کا دُم دار ستارہ کہلاتا ہے۔ فضائے بسیط کا یہ پرشکوہ تیرا ک پچھتّر برس میں ایک بار ہماری فضائے آسمانی پر نمودار ہوتا ہے۔ اب میں دوبارہ اسے صرف اپنے پوتوں کی آنکھوں سے دیکھ سکوں گا۔ میری ذہنی کیفیت عجیب و غریب تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا گویا کوئی چیز اپنی ناقابل بیان وسعتوں سمیت میرے وجود کی تنگ حدود میں سما گئی ہے۔

مقالہ ''مسلم کمیونٹی'' (ملّتِ اسلامیہ) میں قوموں کی حیات و موت پر فلسفیانہ نقطۂ نظر سے مختصر تعارف کے بعد ملّتِ اسلامیہ کی ہیئت ترکیبی، اسلامی تمدن کی یک جہتی اور مسلمانوں کی قومی ہستی کا تسلسل برقرار رکھنے کے لیے ان میں کس قسم کے کردار کی ضرورت ہے، ایسے موضوعات کو زیر بحث لاتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں زمانۂ حال میں وطنیت کا خیال، جو قومیت کے

تصور سے پیدا ہوتا ہے، ملکی ہونے کے سبب مادی ہے۔ اور یہ تصور اصول اسلام کے سراسر خلاف ہے۔ توحید پر اعتقاد کے ہمہ گیر وفاق کا نکتہ جس پر مسلمانوں کی من حیث القوم وحدت کا انحصار ہے، اپنے مفہوم کے لحاظ سے، بقول اقبال، ان کے لیے عقلی نہیں بلکہ قومی ہے۔ پس اسلامی اصول یا روایات کی اصطلاح میں اگر مسلمانوں کے ہاتھ سے خدا کی رسی چھوٹ گئی تو ان کی قوم کا شیرازہ بکھر جائے گا۔

اسلامی تمدن کی یک رنگی کے سلسلے میں ارشاد ہوتا ہے کہ اسلامی تمدن سامی (عربی) تفکر اور آریا (ایرانی) تخیل کے اختلاط کا ماحصل ہے۔ قومی کردار کی تعمیر کے متعلق اورنگ زیب عالمگیر کی مثال پیش کرتے ہیں جو آپ کے نزدیک برصغیر میں مسلم قومیت کا بانی تھا، اور تحریر کرتے ہیں کہ قومی سیرت کا وہ اسلوب جس کا سایہ عالمگیر کی ذات نے ڈالا، خالصتاً اسلامی کردار کا نمونہ ہے۔

اس کے بعد مسلمانوں میں سرکاری ملازمت کے علاوہ تجارت اور صنعت و حرفت کے فروغ کے علاوہ مسلم عوام کی معاشی حالت سدھارنے کے لیے صنعتی تعلیم کو عام کرنے اور مسلم قوم کے اسلامی تشخص کو برقرار رکھنے کے لیے ایک مرکزی اسلامی دارالعلوم کے قیام کی ضرورتوں پر زور دیتے ہیں۔ مرکزی اسلامی دارالعلوم کے قیام کے سلسلے میں فرماتے ہیں:

> ہندوستان میں اسلامی یونیورسٹی کا قیام ایک اور لحاظ سے بھی نہایت ضروری ہے۔ کون نہیں جانتا کہ ہماری قوم کے عوام کی اخلاقی تربیت کا کام ایسے علماء اور واعظ انجام دے رہے ہیں جو اس خدمت کی انجام دہی کے پوری طرح سے اہل نہیں ہیں اس لیے کہ ان کا مبلغِ علم اسلامی تاریخ اور اسلامی علوم کے متعلق نہایت ہی محدود ہے۔ اخلاق اور مذہب کے اصول و فروع کی تلقین کے لیے موجودہ زمانے کے واعظ کو تاریخ، اقتصادیات اور عمرانیات کے حقائقِ عظیمہ سے آشنا ہونے کے علاوہ اپنی قوم کے ادب اور تخیل میں پوری دسترس رکھنی چاہیے۔ الندوہ، علی گڑھ کالج، مدرسہ دیوبند اور اس قسم کے دوسرے مدارس جو الگ الگ کام کر رہے ہیں، اس بڑی ضرورت کو رفع نہیں کر سکتے۔ ان تمام بکھری ہوئی تعلیمی قوتوں کا شیرازہ بند ایک وسیع تر اغراض کا مرکزی دارالعلوم ہونا چاہیے، جہاں افرادِ قوم نہ صرف خاص قابلیتوں کو نشو ونما دینے کا موقع حاصل کر سکیں بلکہ تہذیب کا وہ اسلوب یا سانچہ بھی تیار کیا جا سکے جس میں زمانۂ موجودہ کے ہندوستانی مسلمانوں کو ڈھالنا ضروری ہے۔

اس مضمون کا مطالعہ یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ ایسے زمانے میں جب کہ برصغیر کے بیشتر مسلم

قائدین کا سیاسی فکر نہایت ہی تنگ دائرے تک محدود تھا، اقبال نے قومیّتِ اسلام کے اصول کی روشنی میں مسلمانوں کے مسائل کا تجزیہ کیا اور ان کا حل پیش کیا۔

مضمون ''اسلام میں سیاسی فکر'' کے تعارفی حصے میں اقبال زمانۂ جاہلیت کے عرب قبائل میں وراثت حکومت کے طریقے کا ذکر کرنے کے بعد تحریر کرتے ہیں کہ پیغمبرِ اسلامؐ کی ذاتِ اقدس اور آنحضورؐ کی ہمہ گیر تعلیمات کے زیر اثر عرب قبائل متحد ہو کر ایک مشترک اور مسلسل پھیلتی ہوئی ملت کی صورت میں ابھرے۔ موروثی ملوکیت کا خیال ان کے اذہان کے لیے ایک قطعی غیر ملکی تصور تھا۔ پھر اقبال خلفائے راشدین کے دور پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ابتداء ہی سے یہ بنیادی اصول تسلیم کر لیا گیا کہ اسلامی تعلیمات کے مطابق سیاسی اقتدار اصلاً عوام الناس کے ہاتھوں میں ہے اور ان کی اجتماعی رضا کے بغیر کسی قسم کی بھی حاکمیت کا قیام ممکن نہیں۔ اس سلسلے میں آپ کے نزدیک دو نکتے بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ اوّل یہ کہ مسلم کامن ویلتھ (دول مشترکہ) اس اصول پر مبنی ہے کہ اسلامی قانون کی نگاہ میں تمام مسلمان ہر لحاظ سے برابر کی حیثیت رکھتے ہیں اور دوم یہ کہ اسلامی قانون کے تحت مذہب اور سیاست میں کوئی امتیاز موجود نہیں۔

نکتۂ اوّل کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ اسلام کا سیاسی مقصد تمام نسلوں اور قومیتوں کے ادغام سے ایک ملت کی تعمیر ہے۔ اسلام کے نزدیک قومیت بجائے خود سیاسی ارتقا کی آخری منزل نہیں ہے۔

نکتۂ دوم کی تشریح کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ اسلام کے نزدیک مذہب اور ریاست ایک وحدت ہے۔ جہاں تک اسلامی قانون کے دنیاوی (سیکولر) معاملات کا تعلق ہے، ان کی تفاصیل کی تشریح پیشہ ور وکلاء پر چھوڑ دی گئی ہے۔

اس کے بعد اقبال نے سنی نظریہ خلافت کی تشریح گیارہویں صدی عیسوی کے شافعی فقیہ الماوردی کی تصنیف احکام السلطانیہ کی روشنی میں کی ہے۔ مقالے کا یہ حصہ تحقیقی نوعیت کا ہے اور اس کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابن خلدون سمیت کئی اور فقہا کی تحریریں بھی اقبال کے زیر مطالعہ رہی ہوں گی۔ پھر اس موضوع پر شیعہ نقطہ نظر اور خوارج کے مختلف فرقوں کے نظریات بھی پیش کیے ہیں۔

مقالے کے اختتامی حصے میں اقبال تحریر کرتے ہیں کہ قرآن مجید میں تو ریاست کا بنیادی اصول انتخاب ہی قرار دیا گیا ہے، اگرچہ حکومت کی عملی تشکیل کے سلسلے میں اس کی تفاصیل طے

کرنے کا معاملہ کئی اور امور پر چھوڑا گیا ہے۔ بد قسمتی سے انتخاب کے بنیادی اصول کی خالص جمہوری خطوط پر نشوونما نہ ہوئی۔ سیاسی مصلحین کے لیے نہایت ضروری ہے کہ اسلام کے آئینی اصولوں کا گہرا مطالعہ کریں اور محض نئے تمدن کے پیغامبر بن کر اپنے عوام کے قدامت پسندی کے جذبے کو ٹھیس نہ پہنچائیں، بلکہ انہیں تو متاثر کرنا مشکل نہیں، کیونکہ مصلحین یہ بآسانی ثابت کر سکتے ہیں کہ سیاسی آزادی کے جو نظریات وہ بظاہر یورپ سے مستعار لے رہے ہیں، درحقیقت اسلام ہی کے اپنے تصورات ہیں اور ان کا عملی نفاذ آزاد مسلم ضمیر کا جائز مطالبہ ہے۔

اس مقالے میں پیش کردہ اقبال کے خیالات کو پوری طرح سمجھنا ضروری ہے، کیونکہ اسلام میں ریاست کے تصور کے بارے میں ان کے بعد کے ذہنی ارتقا کا ان خیالات کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ اقبال نے اس بات پر بحث نہیں کی کہ مسلم فلاسفہ کے نزدیک اسلامی ریاست کا تصور دیگر اقوام میں ریاست کے تصورات سے کیونکر مختلف ہے۔

اقبال نے اپنے مضمون میں اس بحث کو بھی نہیں چھیڑا کہ خلافت کا قیام یا ترکی میں اس کا تسلسل قائم رکھنا مسلمانوں پر فرض ہے۔ ترکی یا سلطنتِ عثمانیہ کے دیگر حصوں میں سیاسی صورتِ حال کے مطالعہ نے غالباً اقبال پر یہ واضح کر دیا تھا کہ خلافت کا مستقبل مخدوش ہے، اس لیے مسلم ممالک کے اتحاد کی بنیاد خلافت کے بجائے کسی اور اصول پر رکھنا ناگزیر ہے۔ لیکن جس زمانے میں یہ مقالہ تحریر کیا گیا، ترکی خلافت ہی کو اتحادِ اسلام کا خارجی مظہر سمجھا جاتا تھا۔

زیرِ نظر مقالے میں اقبال کے بعض افکار توجہ طلب ہیں، مثلاً یہ کہ قرآن مجید میں ریاست کا بنیادی اصول انتخاب ہی کو قرار دیا گیا ہے۔ اگرچہ حکومت کی عملی تشکیل کے متعلق تفاصیل طے کرنے کا معاملہ کئی اور امور پر چھوڑا گیا ہے، یا یہ کہ اسلامی دستور میں قانون سازی کا کام وکلاء کو سونپا گیا، اور اسلامی قانون کا ڈھانچا، عملی یا انتظامی شکل میں، قاضیوں کا بنایا ہوا قانون ہے۔ مزید برآں آپ اسلامی ریاست کے لیے اصطلاح ''مسلم کامن ویلتھ'' (دُول مشترکہ) استعمال کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس دور میں بھی اقبال نے ابن تیمیہ کی طرح ریاست کے اسلامی تصور کی بنیاد صرف ملت اور اسلامی قانون کے دو اصولوں پر استوار کی اور خلافت کے اصول کو خاص اہمیت نہ دی۔ قرآن مجید اور احادیث میں مسلمانوں کے لیے کسی حتمی کانسٹی ٹیوشن یا حکومت کی قسم کی تفصیل موجود نہیں ہے، کیونکہ ایسے ادارے ملت اپنے ضمیر کی روشنی میں قائم کر سکتی تھی اور

بہرصورت وہ دائمی قرار نہ دیئے جا سکتے تھے۔ اس لیے کہ ملت کی بدلتی ہوئی سیاسی ضروریات کے تحت وہ قانون تغیر کے پابند تھے۔ اسلام کا اصل مقصد ایک ایسی ملت کو وجود میں لانا تھا جو قانون شریعت کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتی ہو۔ اس لیے قانون شریعت کے نفاذ یا اطلاق کے لیے ملت کو اپنی رضا کے مطابق ایسا نظام حکومت قائم کرنے کا اختیار دیا گیا جو اس کی ضروریات کو پورا کر سکتا تھا۔

گذشتہ ایک ہزار چار سو سالوں میں خلافت نے تغیر پذیر سیاسی صورت حالات میں کئی شکلیں اختیار کیں۔ صدیوں تک خلافت اور سلطنت کا امتزاج رہا۔ پھر سلطنت نے خلافت سے الگ مقام حاصل کر لیا اور سلطنت و خلافت کی آپس میں کشمکش جاری ہوئی، جس کے نتیجے میں خلافت کو شکست کھانا پڑی۔ بعد میں سلطنت ہی کے زیرِ سایہ خلافت کا از سر نو احیاء ہوا اور بالآخر وہ سلطنت ہی میں مدغم ہو کر ختم ہو گئی۔ تاریخ اسلام شاہد ہے کہ گو سیاسی حوادث نے دنیائے اسلام کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے تھے لیکن اس تمام عرصے میں فقہا کی یہی مسلسل کوشش رہی کہ وہ اصول اور حقیقت کے درمیان خلیج کو عبور کرنے کے لیے ایسے قانونی استدلالات پیش کرتے چلے جائیں جن سے ملت کا اسلامی تشخص برقرار رہے۔

اس پس منظر میں یہ سمجھنا آسان ہے کہ اقبال نے اسلامی ریاست کا ذکر کرتے وقت اصطلاح مسلم کامن ویلتھ (دول مشترکہ) کیوں استعمال کی یا ان کے نزدیک ملت اسلامیہ کا وطن ساری دنیا کس اعتبار سے تھا۔ بات یہ ہے کہ اسلامی ریاست کا تصور جدید مغربی ریاست کے تصور سے مختلف ہے۔ مغربی تصور کے مطابق ریاست کی تین خصوصیات ہیں۔ اول یہ کہ وہ مکمل طور پر بااختیار ہو، دوم یہ کہ وہ کسی مخصوص قومیت پر مشتمل ہو اور سوم یہ کہ اس کی علاقائی حدود متعین ہوں مگر اسلامی ریاست میں اصل حاکمیت خدا تعالیٰ کی ہے اور اس لحاظ سے وہ مکمل طور پر بااختیار نہیں۔ وہ کسی مخصوص قومیت پر مشتمل نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے یا مختلف قومیتوں کے ادغام سے وجود میں آتی ہے اور پھر اس کی علاقائی حدود کا تعین بھی ممکن نہیں، کیونکہ وہ عالمی ریاست ہے۔

بہرحال اپنے ذہنی ارتقاء کے اس مرحلے پر اقبال کا زیادہ زور ملت یا قومیت اسلام کے تصور کی پیش رفت پر تھا۔ اسی سبب وہ اسلامی قانون کی از سر نو تشریح کے لیے اجتہاد کی ضرورت پر بار بار اصرار کرتے تھے۔ اجتہاد کے مسئلے میں ان کی دلچسپی ۱۹۰۴ء سے ثابت ہے، کیونکہ ان کے نزدیک ملت اسلام کی تعمیر اسلامی قانون کی تفسیر نو کے بغیر ممکن نہ تھی۔ اقبال کے عقیدے

کے مطابق اسلام کا تصورِ حیات متحرک تھا، اس لیے ان کی نگاہ میں ایسے قدامت پسند علماء کی کوئی وقعت نہ تھی، جن کا تصورِ حیات اسلامی جامد تھا۔ غالباً اسی بنا پر انہوں نے بالآخر اجتہاد کی روایتی تعریف کو کلّی طور پر تسلیم نہ کیا اور اس کی تعریف اسلامی معاشرہ میں حرکت کے اصول کے طور پر کی۔ اجتہاد کے موضوع پر وہ اکثر اپنے جاننے والے علماء سے خط و کتابت یا بحث و مباحثے کرتے رہتے تھے۔ اس سلسلے میں جنوبی ہند میں اپنے لیکچر سے پیشتر انہوں نے ایک انگریزی مقالہ بعنوان ''اسلام میں اجتہاد'' سر عبدالقادر کی زیرِ صدارت ۱۳ دسمبر ۱۹۲۴ء کو حبیبیہ ہال اسلامیہ کالج لاہور میں بھی پڑھا تھا۔ لیکن اس کی تفصیل[illegible]ط نہ رکھی گئی۔ ممکن ہے، یہی مقالہ اضافے کے ساتھ ۱۹۲۹ء میں دورہ علی گڑھ کے دوران بھی پڑھا گیا ہو۔

اقبال کی زیرِ نظر تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مسلم ہند کی تمام ہم عصر برگزیدہ ہستیوں میں سے پہلی اہم شخصیت تھے، جس نے قومیت اسلام کا عقیدہ قبول کر لینے کے بعد ہندوستان میں مخلوط قومیت کے تصور کو حتمی طور پر خیر باد کہا۔ اقبال کا عملی سیاست سے کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ اپنی زندگی کے اس مختصر ابتدائی دور میں بھی، جب وہ حب وطن کے جذبہ کے تحت متحدہ ہندی قومیت کے حامی تھے، کانگرس میں شریک نہ ہوئے اور ہندوستان کو مختلف اقوام کا وطن قرار دیا۔ قیامِ یورپ کے دوران میں انقلاب نے ان کا رخ کاملاً اسلام کی طرف پھیر دیا۔ عین ممکن ہے کہ تقسیم بنگال کی تنسیخ کے لیے ہندوؤں کے یک طرفہ مظاہرے بھی متحدہ قومیت کے تصور سے ان کے انحراف کا سبب بنے ہوں۔ بہر حال دسمبر ۱۹۱۱ء میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں اقبال کے گلے میں ہار پہنانے کی رسم کی ادائیگی سے عیاں ہے کہ اس مایوس کن اور غیر یقینی دور میں بھی تعلیم یافتہ مسلمانوں کی نگاہ میں ان کا کیا مقام تھا۔

انجمن حمایت اسلام یا دیگر مواقع پر اقبال کی اسلام کے موضوع پر تقاریر اور مقالوں میں ان کا ایک انگریزی نوٹ جو ۴ جون ۱۹۲۵ء کو ایک خط کی صورت میں انہوں نے صاحبزادہ آفتاب احمد خان، سیکرٹری آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس (اور بعد میں وائس چانسلر علی گڑھ یونیورسٹی) کو ارسال کیا، خصوصی طور پر قابل توجہ ہے۔ اس تحریر میں اقبال نے وقت کے جدید تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے علوم اسلامیہ کے مقاصد کے سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

اقبال کے بعض یورپی نقادوں کے برعکس ان کا ہیومنزم کا تصور مغربی نہیں جو اقبال کے نزدیک انفرادی روح کا حامل ہے۔ تاہم اقبال کی رائے میں یورپ میں ہیومنزم کی تحریک بڑی

حدتک ان قوتوں کا نتیجہ تھی جو فکر اسلامی سے بروئے کار آئیں۔ فرماتے ہیں:

یورپ میں اسلام کا سیاسی زوال، کہا جاتا ہے، بدقسمتی سے ایسے وقت میں رونما ہوا، جب مسلم حکماء کو اس حقیقت کا احساس ہونے لگا تھا کہ استخراجی علوم لایعنی ہیں اور جب وہ استقرائی علوم کی تعمیر کی طرف کسی حدتک مائل ہو چکے تھے۔ دنیائے اسلام میں تحریک ذہنی (عقلیت) عملاً اس وقت سے مسدود ہوگئی اور یورپ نے مسلم حکما کے غور وفکر کے ثمرات سے بہرہ اندوز ہونا شروع کیا۔ یورپ میں جذبہ انسانیت (ہیومنزم) کی تحریک بڑی حدتک ان قوتوں کا نتیجہ تھی جو اسلامی فکر سے بروئے کار آئیں۔ آج کل کے مسلمانوں کی جہالت کا یہ عالم ہے کہ جو کچھ ایک بڑی حدتک خود ان کے تمدن سے برآمد ہوا ہے، وہ اسے بالکل غیر اسلامی تصور کرتے ہیں۔ مثلاً اگر کسی مسلم حکیم کو یہ معلوم ہو کہ آئن سٹائن کے نظریے سے ملتے جلتے خیالات پر اسلام کے سائنٹیفک حلقوں میں سنجیدگی سے بحث ومباحثے ہوتے تھے (ابوالمعالی جس کا قول ابن رشد نے نقل کیا ہے) تو آئن سٹائن کا موجودہ نظریہ اس کو اتنا اجنبی معلوم نہ ہو۔ اس کے علاوہ جدید استقرائی منطق سے اسے جو بیگانگی ہے وہ بہت کچھ کم ہو جائے، اگر اس کو یہ علم ہو کہ جدید منطق کا تمام نظام رازی کے ان مشہور ومعروف اعتراضات سے وجود میں آیا جو انہوں نے ارسطو کے استخراجی منطق پر عائد کیے تھے۔

اقبال کی رائے میں مسلم یونیورسٹی کے لیے ایسے عالموں کا تیار کرنا از بس ضروری ہے جو اسلامی فلسفے کے ساتھ جدید فلسفے پر بھی عبور رکھتے ہوں، کیونکہ جدید علوم کے اخذ وجذب کرنے میں صرف یہی لوگ مدد کر سکتے ہیں۔ اسی طرح ایسے عالم تیار کرنا بھی نہایت ضروری ہے جو اسلامی تاریخ، آرٹ (فنون) اور علم تہذیب وتمدن (کلچر) کے مختلف پہلوؤں پر حاوی ہوں، جو اسلام کے قانونی لٹریچر (فقہ) میں تحقیق وتدقیق کے لیے موزوں ہوں اور جو اسلامی افکار اور ادبیات کے مختلف شعبوں میں اپنی تحقیقات سے اسلامی تمدن اور جدید علوم کے درمیان حیات ذہنی کا جو تسلسل پایا جاتا ہے، اس کی از روئے نشو ونما جستجو کریں۔

دینیات کے مطالعے کے متعلق تحریر کرتے ہیں:

ہمارا پہلا مقصد...... موزوں صفات کے علماء پیدا کرنا ہے، جو ملت کی روحانی ضرورتوں کو پورا کر سکیں، مگر زندگی کے متعلق ملت کے زاویۂ نگاہ کے دوش بدوش ملت کی روحانی ضرورتیں بھی بدلتی رہتی ہیں۔ فرد کی حیثیت اس کی ذہنی وفکری آزادی اور طبعی علوم کی لامتناہی ترقی، ان چیزوں میں جو تبدیلی واقع ہوئی ہے، اس نے جدید زندگی کے اساس کو یکسر متغیر کر دیا ہے۔ اجتہادی

گہرائیوں کو دوبارہ حاصل کرنا مقصود ہے، تو فکر دینی کو از سرِ نو تعمیر کرنا قطعاً لازمی ہے۔ میرے نزدیک قدیم طرز پر مسلم دینیات کا شعبہ قائم کرنا بالکل بے سود ہے۔ اگر اس سے آپ کا یہ مقصد نہیں ہے کہ سوسائٹی کی زیادہ قدامت پسند جماعت کی تالیف قلب مدنظر رہے۔ جہاں تک روحانیت کا تعلق ہے، کہا جا سکتا ہے کہ قدیم تر دینیات فرسودہ خیالات کی حامل ہے اور جہاں تک تعلیمی حیثیت کا تعلق ہے، جدید مسائل کا طلوع اور قدیم مسائل کی طرح نو کے مقابلے میں اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ آج ضرورت ہے کہ دماغی اور ذہنی کاوش کی ایک نئی وادی کی طرف مہمیز کیا جائے اور ایک نئی دینیات اور علم کلام کی تعمیر و تشکیل میں اس کو برسر کار لایا جائے۔ مگر آپ کا نصب العین یہ ہونا چاہیے کہ آپ تدریجاً اس کے بجائے ان لوگوں کی جماعت کو کار فرما بنائیں جو میری تجویز کردہ سکیم کے مطابق خود اجتہاد فکر پر قادر ہوں۔

اس کے بعد دیوبند اور ندوہ کے طلبہ کی عربی علمیت کو تسلیم کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ان کے بہترین مواد کو برسر کار لانے کی کوئی سبیل نکالی جائے۔ انہیں علوم اسلامیہ کے نئے شعبے میں داخلہ لینے کی دعوت دی جائے۔ انگریزی میں انٹرمیڈیٹ امتحان پاس کرنے پر مجبور کیا جائے۔ علوم طبیعی، ریاضیات، فلسفہ اور اقتصادیات کے مضامین میں انتخاب کرنے کو کہا جائے تاکہ افکارِ جدیدہ اور سائنس سے متعارف ہو جائیں۔ اس کے بعد دوسری منزل میں انہیں اسلام کے فرقہ جات، اسلامی اخلاق اور فلسفۂ مابعد الطبیعیات، دینیات، کلام اور تفسیر پر مجتہدانہ خطبے دینے کے لیے یونیورسٹی کے فیلو بنا دیا جائے۔ ان میں سے جو خالص سائنٹیفک تحقیقات کا ذوق رکھتے ہیں، ان کو ان کے میلاناتِ طبعی کے مطابق جدید ریاضیات، سائنس اور فلسفے کی مکمل تعلیم دی جائے۔ جو طلبہ اسلامی تمدن کی عام تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہوں، ان کے کورس میں مسلم آرٹ اور فن تعمیر بھی شامل کیا جائے اور جو اسلامی حکمت، ادبیات، آرٹ تاریخ نیز دینیات کا نصاب اختیار کریں ان کے لیے جرمن اور فرانسیسی زبانوں کا حسب ضرورت جاننا ازبس ضروری قرار دیا جائے۔

اسلامی قانون کی تعلیم کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

ہمیں دیوبند اور ندوہ سے ایسے ذہین اور طباع لوگ منتخب کرنے چاہئیں، جو قانون کا خاص ذوق رکھتے ہوں، کیونکہ قانونِ محمدی سرتاسر تعمیری تشکیل کا محتاج ہے۔ ہم کو چاہیے کہ انہیں اصولِ فقہ و قانون سازی کے اصولوں کی تعلیم دیں اور شاید جدید اقتصادیات اور اجتماعیات کی جامع تعلیم دینے کی بھی ضرورت پیش آئے۔ مسلم قانون دان، جن کا پیشہ وکالت ہو اور جو قانون محمدیؐ کے اصولوں

پر پورے طور پر حاوی ہوں، وہ عدالت اور کونسل دونوں میں بے حد مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔

آخر میں تحریر کرتے ہیں:

میری رائے میں جدید اسلامی ملتوں کے لیے جدید دینیاتی افکار کی توسیع اور ترویج ضروری ہے۔ قدیم اور جدید اصولات تعلیم کے مابین اور روحانی آزادی اور معبدی اقتدار کے مابین دنیائے اسلام میں ایک کشاکش شروع ہوگئی ہے۔ ان حالات کے تحت مسلم یونیورسٹی کی حیثیت سے آپ کا فرض ہے کہ دلیری سے اس وادی کی طرف قدم بڑھائیں۔ اس میں شک نہیں کہ محتاط رہنا لازم ہوگا اور فکر وحکمت کی اصلاح اس طور پر عمل میں لانی ہوگی کہ معاشرتی امن وسکون میں خلل نہ آنے پائے۔

اس عہد میں فن شاعری کے متعلق اقبال کا مطمح نظر کیا تھا؟ اس موضوع پر ان کے ایک وقیع انگریزی مضمون بعنوان ''جناب رسالت مآبؐ کا ہمعصری عربی شاعری پر تبصرہ'' کا مطالعہ بے حد ضروری ہے، جو ۱۹۱۷ء میں شائع ہوا، وہ تحریر کرتے ہیں:

آنحضورؐ نے اپنے عہد کی شاعری کی نسبت وقتاً فوقتاً جن ناقدانہ خیالات کا اظہار فرمایا، تاریخ نے انہیں [illegible]ط کیا ہے لیکن دو موقعوں پر جو تنقیدات آپؐ نے ارشاد فرمائیں ان سے مسلمانان ہند کو اس زمانے میں بہت بڑا فائدہ پہنچ سکتا ہے، اس لیے کہ ان کا ادب ان کے قومی انحطاط کے دور کا نتیجہ ہے اور اب انہیں کسی نئے ادبی نصب العین کی تلاش ہے۔ ایک تنقید تو یہ ظاہر کرتی ہے کہ شاعری کیسی نہ ہونی چاہئے اور دوسری تنقید کا مقصد یہ بتانا ہے کہ شاعری کیسی ہونی چاہیے۔ امراء القیس نے اسلام سے چالیس برس قبل کا زمانہ پایا ہے۔ روایت ہے کہ آنحضورؐ نے اس کی نسبت ایک موقع پر رائے ظاہر کی کہ **اشعر الشعراء وقائدھم الی النار** یعنی وہ شاعروں کا سرتاج ہے لیکن جہنم کے راستے میں ان کا سردار۔ امراء القیس قوت ارادی کو جنبش میں لانے کے بجائے اپنے سامعین کے تخیل پر جادو کے ڈورے ڈالتا ہے اور ان میں بجائے ہوشیاری کے بے خودی کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے...... ایک دفعہ قبیلہ بنو عبس کے مشہور شاعر عنترہ کا یہ شعر آنحضورؐ کے سامنے پڑھا گیا ؎

ولقدابیت علی الطوئ والظلّہ
حتٰی انال بہ کریم الماکل

یعنی میں نے بہت سی راتیں محنت و مشقت میں بسر کی ہیں تاکہ میں اکل حلال کے قابل ہو سکوں۔ رسول اللہ، جن کی بعثت کا مقصد وحید یہ تھا کہ انسانی زندگی کو دل کش بنائیں، اور اس کی

آزمایشوں اور سختیوں کو خوش آیند اور مطبوع کر کے دکھائیں، اس شعر کو سن کر بہت محظوظ ہوئے اور صحابہ کرام سے مخاطب ہو کر فرمایا: کسی عرب کی تعریف نے میرے دل میں اس کا شوق ملاقات پیدا نہیں کیا لیکن میں سچ کہتا ہوں کہ اس شعر کے کہنے والے کو ملنے کے لیے میرا دل بے اختیار چاہتا ہے۔ رسول اللہؐ نے جو عزت عنترہ کو بخشی اس کی وجہ عیاں ہے عنترہ کا شعر صحت بخش حیات کی جیتی جاگتی بولتی چالتی تصویر ہے۔ حلال کی کمائی میں انسان کو جو سختیاں اٹھانی پڑتی ہیں، جو کڑیاں جھیلنی پڑتی ہیں، اس کا نقش پردۂ خیال پر شاعر نے نہایت خوبصورتی کے ساتھ کھینچا ہے۔ آنحضورؐ نے جو اس شعر کی تعریف فرمائی، اس سے آرٹ کے ایک اور اہم اصول کی شرح ہوتی ہے کہ آرٹ حیات انسانی کے تابع ہے، اس پر فوقیت نہیں رکھتا۔ تمام انسانی عمل کا منتہائے نظر شوکت، قوت اور جوش سے بھری ہوئی زندگی کی تحصیل ہے۔ اس لیے ہر انسانی آرٹ اس غایت آفرین کا مطیع ہونا چاہئے اور ہر شے کی قدر و قیمت کا معیار یہی ہونا چاہیے کہ اس میں حیات بخشی کی صلاحیت کتنی ہے۔ ارفع آرٹ وہی ہے جو ہماری خوابیدہ قوت عزم کو بیدار کرے اور ہمیں زندگی کی آزمایشوں کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی ترغیب دے۔

اقبال کی تحریروں کے مطالعے سے عیاں ہے کہ وہ ابتدا ہی سے مسلم فرد اور معاشرے کی تعمیرِ نو کے سلسلے میں بعض مخصوص خیالات رکھتے تھے۔ اقبال مسلم تعلیم یافتہ طبقے جو متضاد اور دوہرے خیالات کا حامل تھا کی عملی، اعتقادی اور ذہنی دوئی کا خاتمہ کرنا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک مسلم فرد اور معاشرے کی تعمیرِ نو صرف مذہب کی روایتی تعبیر کے فروغ سے ممکن نہ تھی۔ وہ وقت کے جدید تقاضوں اور علوم کی بے انتہا ترقی کے پیش نظر علم کلام اور فقہ کی ازسرنو تدوین کے آرزومند تھے اور اس کے ساتھ ہی اسلام اور علوم کی حیات ذہنی کا ٹوٹا ہوا سلسلہ دوبارہ جوڑ کر صحیح معنوں میں اسلامی تمدن کے احیاء کے لیے کوشاں تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلم تعلیمی اداروں میں سیرت کا وہ اسلوب یا ڈھانچا تیار کیا جاسکے جو دورِ حاضر میں خالصتاً مسلم کردار کی تشکیل کے لیے ممد ثابت ہو۔ اپنے خیالات کی قبولیت کی راہ میں حائل رکاوٹوں سے آگاہ ہوتے ہوئے وہ ایک طرف تو مسلم فرد اور معاشرے کی تعمیرِ نو کی خاطر خالصتاً عملی تجاویز پر مبنی منصوبہ تشکیل دینے اور دوسری طرف اس انسان کامل یا مردِ فردا کی جستجو میں لگے رہتے تھے جس نے اقبال کے مستقبل کے مثالی مسلم معاشرے کو وجود میں لانا تھا۔

❁ ❁ ❁

باب: ۱۲

قلمی ہنگامہ

مثنوی اسرار خودی کی اشاعت پر وجودی تصوف کے حامی صوفیوں، روایتی سجادہ نشینوں عہدِ تنزل کی شاعری کے دلدادوں اور فرسودہ یونانی فلسفۂ اشراق کے پیروکاروں کی اقبال اور اس کے حامیوں کے ساتھ جو قلمی جنگ ہوئی، وہ ۱۹۱۵ء کے اواخر سے لے کر ۱۹۱۸ء یعنی تقریباً ڈھائی تین برس تک جاری رہی۔ اس مخالفت میں خواجہ حسن نظامی اور ان کے مرید سب سے آگے تھے۔ اقبال نے خود اس بحث میں پڑ کر کئی مضامین لکھے۔ ان کے حامیوں میں مولوی سراج الدین پال ایڈووکیٹ، مولانا عبداللہ عمادی، مولانا ظفر علی خان، مولوی الف دین وکیل، مولوی محمود علی، عبدالرحمن بجنوری وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ بعض ادیبوں نے اپنے نام مخفی رکھے اس مخالفانہ مہم کی تفصیل عبد اللہ قریشی کی کتاب معاصرین اقبال کی نظر میں اور مضمون ''حیاتِ اقبال کی گمشدہ کڑیاں'' (معرکہ اسرارِ خودی)، غلام رسول مہر کی تصنیف مطالب اسرار و رموز کے مقدمہ، عبدالواحد معینی کی تصنیف مقالات اقبال اور انوار اقبال مرتبہ بشیر احمد ڈار میں موجود ہے۔

عبد اللہ قریشی کی رائے میں لفظ خودی کا مفہوم مروجہ معنوں سے ہٹ کر اقبال کے ذہن میں ۱۸۹۷ء سے موجود تھا اور اس کی تائید میں وہ اس دور میں لکھی گئی ان کی ایک غزل کا یہ شعر پیش کرتے ہیں:

جو وفا پیشہ سمجھتا ہے خودی کو ایماں
جنتی ہو گا، فرشتوں میں نمایاں ہو گا

وجودی تصوف سے انحراف کا اعلان اقبال نے پہلی بار ۱۹۱۴ء میں انجمنِ حمایتِ اسلام کے جلسے میں عجمی تصوف اور اسلام کے موضوع پر خطبہ دیتے ہوئے کیا۔ انہوں نے فرمایا:

اس (یعنی مروجہ) تصوف کو اسلام کے سادہ عقائد اور عربی روح دینی سے کوئی علاقہ نہیں اور اس کا بنیادی ستم یہ ہے کہ یہ خودی کو تباہ کرتا ہے۔ حالانکہ یہ تصور بالکل خلافِ اسلام ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ ہر انسان کی خودی نہ صرف قائم رہے بلکہ ارتقا کی منزلیں طے کرتے کرتے اس مقام

پر پہنچ جائے جو اس کے لیے مقدر ہے اور جس سے بڑا کوئی مقام انسانی تصور میں نہیں آ سکتا۔

اسی تقریر کے دوران میں اقبال نے بتایا کہ انہوں نے اسرار خودی کے نام سے ایک مثنوی تحریر کی ہے جو عجمی تصوف کے اس طلسم کو پاش پاش کر دے گی جس نے مسلمانوں کو عمل کی قوت سے محروم کر کے ساکت و جامد کر رکھا ہے۔ اس کے بعد اسرار خودی کے بعض مقامات پڑھ کر سنائے۔

۱۹۱۵ء کے وسط میں مثنوی اسرار خودی کی اشاعت پر قلمی جنگ کے محرک دراصل اقبال کا دیباچہ اور حافظ سے متعلق اشعار تھے۔ مثنوی کو سر سید علی امام کے نام پر معنون کیا جانا بھی اعتراض کا سبب بنا لیکن اس کی حیثیت ثانوی تھی۔ دیباچے میں اقبال نے خودی یعنی احساسِ نفس یا تعینِ ذات کو وحدتِ وجدانی، شعور کا روشن نقطہ، پر اسرار شے، مشاہدات کی خالق، فطرت انسانی کی لاتعداد منتشر کیفیتوں کی شیرازہ بند قرار دیتے ہوئے لکھا کہ مشرقی اقوام اسے محض ایک فریب تخیل تصور کرتی ہیں اور ان کے نزدیک اس پھندے کو گلے سے اُتار دینے کا نام نجات ہے۔ اسلام جس کا آغاز پیغام عمل کی صورت میں تھا مگر بعد میں ابن عربی کی قرآن مجید کی تفسیر سے جو سری شنکر کی گیتا کی تفسیر کے مماثل ہے، مسئلہ وحدت الوجود اسلامی تخیل کا ایک لاینفک جزو بن گیا۔ کرمانی اور عراقی اس تعلیم سے بے حد متاثر ہوئے اور رفتہ رفتہ چودھویں صدی عیسوی کے تمام عجمی شعرا اسی رنگ میں رنگے گئے۔ اقبال نے تحریر کیا:

> مختصر یہ کہ ہندو حکما نے مسئلہ وحدت الوجود کے اسباب میں دماغ کو اپنا مخاطب کیا۔ مگر ایرانی شعراء نے تمام اسلامی اقوام کو ذوق عمل سے محروم کر دیا...... اگرچہ مغرب کے فلسفہ جدید کی ابتداء ہالینڈ کے اسرائیلی فلسفی کے نظام وحدت الوجود سے ہوتی ہے، لیکن مغرب کی طبائع پر رنگ عمل غالب تھا۔ سب سے پہلے جرمنی اور رفتہ رفتہ فلاسفۂ مغرب بالخصوص حکمائے انگلستان کے عملی ذوق کی بدولت وہ اس خیالی طلسم کے اثر سے آزاد ہو گئے۔

اقبال نے واضح کیا کہ جس طرح رنگ و بو وغیرہ کے لیے حواس مختص ہیں۔ اسی طرح انسانوں میں ایک اور حاسہ بھی ہے جسے حسِ واقعات کا نام دیا جا سکتا ہے۔ پس حکمائے یورپ کی جدید تحریریں اس قابل ہیں کہ مشرقی دل و دماغ ان سے مستفید ہو کر اپنی قدیم فلسفیانہ روایات پر نظر ثانی کریں۔ اقبال نے آخر میں لکھا:

> یہ ہے ایک مختصر خاکہ اس مسئلہ کی تاریخ کا جو اس نظم کا موضوع ہے۔ اس دیباچہ سے اس نظم کی تفسیر مقصود نہیں، محض ان لوگوں کو نشانِ راہ بتلانا مقصود ہے شاعرانہ پہلو سے اس نظم کے متعلق

کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ شاعرانہ تخیل محض ایک ذریعہ ہے۔ اس حقیقت کی طرف توجہ دلانے کا کہ لذتِ حیات انا کی انفرادی حیثیت، اس کے اثبات، استحکام اور توسیع سے وابستہ ہے۔ یہ نکتہ مسئلہ حیات مابعد الموت کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے ایک تمہید کا کام دے گا۔

اقبال نے مثنوی اسرار خودی میں جو اشعار حافظ کے خلاف لکھے اور جن پر اعتراض ہوا وہ یہ تھے:

ہوشیار از حافظِ صہبا گسار — جامش از زہر اجل سرمایہ دار
رہنِ ساقی خرقۂ پرہیز اُو — مے علاجِ ہولِ رستا خیز اُو
نیست غیر از بادہ در بازارِ اُو — از دو جام آشفتہ شد دستارِ اُو
چوں جرس صد نالۂ رسوا کشید — عیش ہم در منزلِ جاناں ندید
آں فقیہِ ملتِ مے خوارگاں — آں امامِ اُمّتِ بے چارگاں
گوسفند است و نوا آموخت است — عشوہ و ناز و ادا آموخت است
دلربائی ہاے او زہر است و بس — چشم او غارتگرِ شہر است و بس
از بز یوناں زمیں زیرک تر است — پردۂ عودش حجابِ اکبر است
بگرز از جامش کہ در مینائے خویش — چوں مریدانِ حسن دارد حشیش
محفلِ او درخورِ ابرار نیست — ساغرِ او قابلِ احرار نیست

بے نیاز از محفل حافظ گزر
الحذر از گوسفنداں الحذر

مثنوی اسرار خودی کی مخالفت میں جو طوفان اٹھا، اس کے متعلق عبداللہ قریشی تحریر کرتے ہیں:

بعض صوفی، پیر اور سجادہ نشین جنہیں روایات باطلہ کی پابندی اور شریعت حقہ، سے ناواقفیت کی نمایندگی کا شرف حاصل تھا، اقبال کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ حافظ کے ایک ہمعصر شاہ جہانگیر اشرف تو انہیں ولیِ کامل تصور کرتے تھے۔ اسی بنا پر حمیت کے جوش میں مخالفوں نے ڈاکٹر اقبال کو بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

اس تنازع میں خواجہ حسن نظامی جیسی شخصیت نے بھی اشعار اور دیباچے پر بحث کے دوران ایسی باتیں شامل کر دیں جو اصل میں نہ تھیں۔ کئی لوگ مثلاً اکبر الہ آبادی صرف پروپیگنڈے سے متاثر ہو گئے۔ مخالفین علمی اعتراض کی بجائے اقبال کی ذات پر حملے کرنے

لگے۔

غلام رسول مہر اس قلمی جنگ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

حیرت انگیز امر یہ ہے کہ کسی کا بھی نقطۂ نگاہ درست نہ تھا۔ خواجہ حسن نظامی مرحوم صرف خواجہ حافظ، وحدت الوجود اور خودی کا نام لے کر خود بھی پریشان ہو رہے تھے اور دوسروں کو بھی پریشان کر رہے تھے۔ یعنی اقبال نے کچھ کہا تھا اور ان حضرات نے کچھ اور ہی فرمایا...... سب کچھ شائع ہوا اور ناپید ہو گیا۔ آج ان چیزوں کو تلاش کیا جائے تو ایک بھی شاید ہی مل سکے۔

مثنوی کی اشاعت پر ۱۶ نومبر ۱۹۱۵ء کے زمیندار نے لکھا کہ مدعائے اسلام یہی ہے کہ ہر مسلمان اپنی مخفی قوتوں کے اثر سے آگاہ ہو اور ان حدود کے اندر رہ کر جو قرآن مجید نے مقرر کر دیئے ہیں، ان سے کام لے۔ یہی وہ بھولا ہوا سبق ہے جسے اقبال نے اپنی مثنوی کے ذریعے مسلمانوں کو پھر یاد دلایا ہے۔

بقول عبداللہ قریشی جنگ کی ابتداء خواجہ حسن نظامی نے اپنے ایک مرید ذوقی شاہ سے اسرارِ خودی کی مخالفت میں ایک مضمون لکھوا کر کی۔ انہوں نے لکھا کہ اقبال کا نصب العین، جیسے کہ مثنوی کی سرخیوں سے ظاہر ہے، نظام عالم کی تسخیر ہے۔ حالانکہ مذہب ہمیں سکھاتا ہے اور تصوف ہمیں اس راستہ پر چلاتا ہے کہ ہمارا نصب العین اللہ ہونا چاہیے اور ہر وہ شے جو غیر اللہ کی فہرست میں شامل ہو، خواہ تسخیر عالم کی تمنا ہو، خواہ پولیٹیکل اقتدار کی خواہش، حب دنیا ہو، خواہ ہوائے نفس، شہرت طلبی ہو، خواہ عزت کی آرزو، انا کا بت ہو یا خودی کی مورت، شیشے کے گنبد کی طرح ان سب کو چکنا چور کر دینا چاہیے کیونکہ مردانِ خدا کا مقصود اللہ ہے۔ انہوں نے وحدت الوجود کو ماورائے عقل مسئلہ اور حافظ کو اللہ کا مقبول بندہ قرار دے کر ان موضوعات پر اقبال سے بحث میں پڑنے سے گریز کیا۔ اس مضمون کے جواب میں اقبال کے کسی حامی کشاف کا ایک مضمون ۲۲ دسمبر ۱۹۱۵ء کے اخبار وکیل میں چھپا۔ انہوں نے تحریر کیا کہ مثنوی اسرار خودی کی مخالفت خواجہ حسن نظامی کے ایما پر ہو رہی ہے، کیونکہ وہ آل انڈیا صوفی کانفرنس کے سیکرٹری ہیں۔

اس مرحلے پر خواجہ حسن نظامی خود میدانِ کارزار میں اتر آئے۔ خواجہ حسن نظامی، اقبال کے پرانے احباب میں سے تھے۔ ۱۹۰۳ء سے ایک دوسرے کا ملنا جلنا تھا اور اقبال نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ اگر میں خواجہ حسن نظامی جیسی نثر لکھنے پر قادر ہوتا تو کبھی شاعری کو اظہار خیال کا ذریعہ نہ بناتا۔ خواجہ حسن نظامی نے انجمن حمایت اسلام کے ایک جلسے میں اقبال کے نظم پڑھنے

کے انداز سے متاثر ہو کر اپنا عمامہ سر سے اتار کر ان کو دے دیا تھا، اور کہا تھا:

تمہارے جامِ مے کی نذر میری پارسائی ہو

اقبال کے تعلقات آخری دم تک ان سے قائم رہے۔ دہلی جاتے تو انہیں ضرور ملتے اور خطوط کے ذریعے خیالات کا تبادلہ بھی ہوتا رہتا۔ ۱۹۱۵ء میں خواجہ حسن نظامی نے اقبال کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں ''سرِّ الوصال'' کا خطاب دیا تھا اور اسی کے جواب میں اقبال نے خط میں ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایش کی تھی کہ مثنوی کے لیے بھی کوئی نام یا خطاب تجویز کریں۔ خواجہ حسن نظامی تحریر کرتے ہیں کہ مثنوی اسرار خودی کا نام میں نے تجویز کیا تھا اور بھی کئی نام تجویز کیے تھے مگر اقبال نے اس کو پسند کیا۔ بہرحال یکم اگست ۱۹۱۳ء کے ہفتہ وار توحید میرٹھ میں جو خواجہ حسن نظامی کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ اقبال کے چند اشعار مثنوی اسرار خودی کے زیر عنوان خواجہ حسن نظامی کے مندرجہ ذیل تعارف کے ساتھ شائع ہوئے:

یہ نظم ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کی شہرہ آفاق اور ہر دلعزیز شاعری میں ایک نئے باب کا افتتاح کرتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے خواب میں دیکھا کہ حضرت مولانا رومؒ ارشاد فرماتے ہیں اقبال مثنوی لکھو۔ عرض کیا، مثنوی کا حق تو آپ ادا کر گئے؛ فرمایا ’نہیں تم بھی لکھو‘۔ التماس کی، آپ فرماتے ہیں، خودی کو مٹاؤ اور مجھ کو یہ مفہوم ہوتا ہے کہ خودی قائم کرنے کی چیز ہے، ارشاد ہوا، ’نہیں ہمارا مطلب بھی یہی ہے جو تم سمجھتے ہو‘۔ آنکھ کھلی تو زبان پر یہ شعر تھے، جن کو قلم بند کرنا شروع کیا۔ پہلی قسط اخبار توحید کے ذریعے شائع کی جاتی ہے، جس میں کچھ حصہ نعت کا ہے اور کچھ متفرق اشعار قیامِ خودی کی نسبت ہیں۔ ایسے دارو گیر کے زمانہ میں ڈاکٹر اقبال کی یہ نظم ہندوستانیوں میں ایک نئی زندگی پیدا کرے گی۔ میں چاہتا ہوں کہ ناظرین توحید اس نظم کو خود بھی یاد کریں اور اپنے دوستوں کو بھی یاد کرائیں۔

لیکن مثنوی کے قلمی ہنگامے میں کشاف کے جواب میں خواجہ حسن نظامی نے مضمون بعنوان ''کشاف خودی'' تحریر کیا جو وکیل ۱۹ دسمبر ۱۹۱۵ء میں شائع ہوا۔ آپ نے اقبال کے کمال شاعری، سوز و گداز اور اس کے اثر یا مسلمانوں کی موجودہ نسل کی بیداری میں ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے بتلایا کہ انھوں نے ہر طریقے سے اقبال کے خیالات کی تبلیغ کی۔ کشاف کو جواب دیتے ہوئے لکھا:

مجھے کوئی بتائے اسرار خودی چاہتی کیا ہے؟ اسی انقلاب کا نتیجہ ہے کہ فرانس میں مذہب ناپید ہو گیا، خود پرستی نے قبضہ کرلیا اور فرانس نے خدا کو چھوڑ دیا اگر یہ ارادہ ہے تو سمجھ لو کہ ایسا نہیں ہو سکے گا۔ مذہب کے ہاتھ پر بکے ہوئے ایسا نہیں کرنے دیں گے۔

پھر اقبال کے بارے میں فرمایا:

میں اقبال کی نیت پر حملہ نہیں کروں گا۔ انہوں نے تو یہ مثنوی اپنی دانست میں مسلمانوں کے فائدہ کے لیے لکھی ہوگی، مگر اس سے سخت خطرے پیدا ہوں گے اور مسلمانوں کے اصول عقائد میں تزلزل پڑ جائے گا۔

> دراصل یہ مثنوی اقبال کی نہیں بلکہ اقتضاے وقت کی لسانِ حال ہے۔ وقت کی خواہش ہے کہ مشرقی مغربی بن جائیں، حافظ شیرازی کی ......کیسی آبروریزی کی ہے۔ کیسے کریہہ الفاظ سے ان کو یاد کیا ہے۔ اگر وہ سچے ہیں کہ حافظ کے کلام نے مسلمانوں کو کم ہمت بنا دیا ہے تو میں پوچھوں گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دنیاے مردار کی مذمت کی تھی، اس سے مسلمانوں کی ہمت نہ ٹوٹی؟ حضور اور سب صحابہ دین کو مقدم اور دنیا کو مؤخر کہتے تھے انہوں نے کیسی کیسی فتوحات کیں۔

خواجہ حسن نظامی نے چند سوالات مرتب کر کے مشائخ کو ارسال کیے اور ان کے جوابات کی، جو مثنوی پڑھے بغیر لکھے گئے تھے، اپنے رسائل میں خوب تشہیر کی۔ سوال یہ تھے: کیا قرآن شریف عقیدۂ وحدت الوجود کا مخالف ہے؟ کیا توحید اور وحدت الوجود دوجداگانہ اشیاء ہیں؟ کیا اسلام صرف انانیت مٹانے کو آیا ہے؟ تصوف کا انتہائی نتیجہ اور مقصود کیا ہے؟ کیا صحابہ کرام میں سے کسی میں بھی کیف سکر مثل خواجہ حافظ شیرازی کے نہ تھا؟ کیا کیفیت وحدت الوجود کسی مقام کا نام ہے اور اس مقام کے بعد کیا مقام ہے؟ کیا حضرت ابن عربیؒ نے اس کے بعد عدم محض تسلیم کیا ہے اور یہ مذہبی امور میں مفید ہے یا نہیں؟ کیا وحدت الوجود محض علمی مسئلہ ہے یا اس کو مذہب سے بھی کچھ تعلق ہے؟

یکم جنوری ۱۹۱۶ء کے وکیل میں اسرار خودی کی حمایت میں ایک مضمون ایک مسلمان کے نام سے شائع ہوا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ دنیا کشمکش کی دنیا ہے۔ افراد اور قوموں کی زندگی خودی یا خودداری سے قائم اور باقی رہ سکتی ہے۔ اقبال کہتا ہے، کچھ کر کے دکھاؤ، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اقبال کو جو محبت اور عشق ہے وہ اس امر کی ضمانت کے لیے کافی ہے کہ اس کے دل و دماغ میں روحانیت کا کیسا صادق ولولہ اور جوش ہے۔

اس کے بعد ۲۴ جنوری ۱۹۱۶ء کے ہفتہ وار سراج الاخبار (جہلم) میں ''ڈاکٹر صاحب کی کمزوریاں'' کے زیرعنوان ایک مسلم فلاسفر وطبعی کے فرضی نام سے حافظ کی حمایت اور اقبال کی مخالفت میں مضمون شائع ہوا جو مثنوی کے مطالعے کے بغیر لکھا گیا۔ وکیل ۲۹ جنوری ۱۹۱۶ء میں کسی نقاد نے مثنوی میں پیش کردہ خیالات پر اپنی رائے کا اظہار کیا۔ ۲۰ جنوری ۱۹۱۶ء کے لائل گزٹ لاہور میں مثنوی کے خلاف ایک مضمون نکلا۔ تصوف و اقبال کے موضوع پر کئی مضمون وکیل میں، اخبار لمحات میں اور سراج الاخبار میں شائع ہوئے لیکن کسی بھی لکھنے والے نے اپنا نام ظاہر کرنا مناسب نہ سمجھا۔

مولوی الف دین وکیل کا مضمون وکیل میں شائع ہوا جس میں انہوں نے ذوقی شاہ اور خواجہ حسن نظامی کے مضامین پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ دونوں بزرگوں کی تحریریں مثنوی سے غیر متعلق ہیں۔ مثنوی کی مخالفت میں خواجہ حسن نظامی کا دوسرا مضمون ''سرِ اسرار خودی'' ۳۰ر جنوری ۱۹۱۶ء کے خطیب میں شائع ہوا جس میں انہوں نے مثنوی کے اصول پر بحث کی اور پانچ وجوہ کی بنا پر اسے نامعقول قرار دیا۔ تاہم مثنوی کے اصل معنی کا لبادہ پہنا کر پیش کیا۔ جن وجوہ کی بنا پر مثنوی کو نامعقول قرار دیا گیا۔ وہ مندرجہ ذیل ہیں:

اوّل یہ کہ مثنوی میں اقبال نے خودی کی حفاظت کے بارے میں جو کچھ تحریر کیا ہے وہ کوئی نرالی بات نہیں بلکہ قرآن مجید کی تعلیم سے بہت کم ہے۔

دوم یہ کہ دیباچے میں مسئلہ وحدت الوجود اور صوفیہ کو معتوب قرار دیا گیا ہے کہ انہی کے سبب مسلمانوں میں ترک خودی کا جذبہ پیدا ہوا کہ مثنوی کا اصل مقصد صوفیانہ تحریک کو ختم کرنا ہے۔

سوم یہ کہ اقبال نے دیباچے میں مسلمانوں کو یورپی فلسفیوں کی پیروی کرتے ہوئے اپنے عقائد بدل دینے کا مشورہ دیا ہے۔

چہارم یہ کہ مثنوی گو خودداری کی تعلیم دیتی ہے لیکن اس کے ساتھ مغربی خودغرضی کو اپنانے کی تلقین بھی کرتی ہے جو اسلام کے سراسر خلاف ہے۔

پنجم یہ کہ مثنوی نے ان کی خودی کی توہین کی ہے۔

خواجہ حسن نظامی نے مسئلہ وحدت الوجود کو قرآن مجید کی روشنی میں ثابت کرنے کا قصد بھی کیا، لیکن اکبر الہ آبادی اور شاہ سلیمان پھلواروی نے انہیں ایسا کرنے سے منع کیا۔ اکبر الہ

آبادی نے انہیں تحریر کیا:

میں آپ کو مناسب اوسط جگہ نہ پاؤں گا، اگر آپ قرآن مجید سے مسئلہ وحدت الوجود کو ثابت کرنے کے لیے قلم اٹھائیں گے۔ علماے شریعت نے غالباً فرما دیا ہے کہ یہ مسئلہ جزو اسلام نہیں اور میں تو یہ کہتا ہوں کہ ہمہ اوست کہنے سے پہلے ''او'' کو ثابت کرو پھر ''ہست'' کی توضیح کرو، یعنی ہستی کیا چیز ہے اور ''او'' کسے کہتے ہیں۔

شاہ سلیمان پھلواروی نے انہیں لکھا:

وحدت الوجود ایک علمی مسئلہ ہے جس کو اصطلاح میں ربط الحادث بالقدیم کہتے ہیں اور تمام کتبِ الٰہیات میں اس کا ذکر ہوتا ہے۔ اسلامی سیر و سلوک اور مشاہدۂ انوار و تجلیات سے اس کا تعلق ضرور ہے، مگر مدارِ نجات سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔

اسی دور میں پیرزادہ مظفر احمد فضلی نے اسرار خودی کے جواب میں ایک مثنوی رازِ بے خودی اور ملک محمد ٹھیکیدار جہلم نے بھی اسرار خودی کے جواب میں ایک مثنوی لکھی ان میں حافظ کی مدح سرائی کی گئی اور اقبال کو بُرا بھلا کہا گیا۔

میرٹھ کے رسالے اسوۂ حسنہ نے اپنی فروری ۱۹۱۶ء کی اشاعت میں اسرار خودی اور ان مضامین کو پڑھ کر جو اس کی حمایت یا مخالفت میں خطیب اور وکیل میں شائع ہو چکے تھے، اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے تحریر کیا کہ مثنوی اسلامی نقطۂ نظر سے قابلِ اعتراض ہے۔ مسلمانوں کے تنزل کے اسباب میں غلط فہمیوں کا دخل ہے، نہ کہ نفیِ خودی کا۔ اگر مسلمانوں کی کمزوری اور بے عملی کا سبب نفی خودی ہے تو کیا خودی کی تعمیر کا وہی نتیجہ ہوگا جو یورپ کی انسانیت سوز جنگوں کی صورت میں سامنے آیا ہے۔ صوفی خودی کو مٹانے کا جو درس دیتے ہیں قرآن کی بھی یہی تعلیم ہے مگر غلط فہمیوں کے باعث مسلمان تنزل کا شکار ہیں۔

حکیم فیروز الدین احمد طغرائی نے حافظ کی حمایت میں ایک رسالہ لسان الغیب کے نام سے شائع کیا۔ انہوں نے لکھا کہ مثنوی اسرار خودی کا مطالعہ یاس آفرین ثابت ہوا، کیونکہ اقبال نہ تو اربابِ مشاہدہ میں سے تھے، نہ انہیں طریقِ اظہار میں پختہ کلامی حاصل تھی۔ طغرائی نے کلام حافظ میں سے جوش، ولولہ انگیزی، تحریک عمل، صبر و استقلال، حزم و احتیاط اور فلسفہ اخلاق کی تعلیم کی مثالیں پیش کرتے ہوئے تحریر کیا کہ اقبال نے حافظ کے ان پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا، کیونکہ عرفا کے رموز و اشارات سمجھنے کے لیے اربابِ حال کی خدمت میں کچھ عرصہ

زانوئے ادب تہ کرنے کی ضرورت ہے، جس سے اقبال محروم تھے۔

مولوی محمود علی نے اسرار خودی کی حمایت میں ایک مضمون لکھا جو خطیب ۷ فروری ۱۹۱۶ء میں شائع ہوا۔ انہوں نے تحریر کیا کہ مثنوی میں اقبال نے کون سا ایسا خیال پیش کیا ہے جو مسلکِ وحدت الوجود کو تسلیم کرتے ہوئے بھی غلط کہا جا سکتا ہے۔ اگر انہوں نے جذبۂ عمل کو تحریک دینا تھا تو جذبۂ عمل ہی کے ذکر سے شروع کیا جاتا۔ وحدت الوجود کا ذکر کرنا تھا تو نثر میں کسی مستقل مضمون یا کتاب کی شکل میں پیش کرتے۔

حافظ محمد اسلم جیراجپوری نے ایک غیر جانب دار کی حیثیت سے بحث میں حصہ لیا۔ انہوں نے اپنے مضمون میں لکھا کہ اقبال نے مثنوی میں حافظ کے متعلق جو کچھ تحریر کیا، وہ اگر نہ لکھتے تو بہتر تھا۔ حالی نے بھی ''حیات سعدی'' میں لکھا ہے کہ حافظ کی غزل محافل میں زیادہ گائی جاتی ہے۔ گو اکثر سامعین اس کے مضامین سے واقف نہیں۔ حافظ کی غزل سے سامعین کے دلوں میں دنیا کی بے ثباتی، توکل، استغناء اور قناعت کا خیال پیدا ہوتا ہے اور اوباش لوگوں کو بے فکری، عاقبت نا اندیشی، عشق بازی، بدنامی اور رسوائی کی ترغیب ہوتی ہے۔ قوم کی موجودہ حالت میں یہ دونوں تاثیریں اس کے لیے مضر ہیں۔

لندن سے شیخ مشیر حسین قدوائی کا ایک مضمون حافظ کی حمایت میں زمیندار ۲۳ مارچ ۱۹۱۶ء میں شائع ہوا۔ ان کا ایک مضمون رہبانیت کی حمایت میں بھی شائع ہوا۔ انہوں نے لکھا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ راہبوں کا ادب ملحوظ رکھا اور ان کی تعظیم فرمائی۔ اس کے رد میں مولوی سراج الدین پال ایڈووکیٹ نے وکیل ۵ جولائی ۱۹۱۶ء میں ایک مضمون تحریر کیا۔ جس میں لکھا کہ اسلام میں رہبانیت ممنوع ہے اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا راہبوں سے تعرض نہ کرنا رہبانیت کی عظمت پر مبنی نہ تھا بلکہ اس کا سبب یہ تھا کہ وہ اسلام میں مزاحم نہ ہوتے تھے۔

اقبال اپنے نقطۂ نظر کی مدافعت میں اس بحث میں شریک ہوئے۔ ان کا پہلا مضمون بعنوان ''اسرار خودی اور تصوف'' وکیل ۱۵ جنوری ۱۹۱۶ء میں شائع ہوا۔ انہوں نے فرمایا کہ وہ تحریکِ تصوف کی ایک مفصل تاریخ لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں کہ یہ تحریک غیر اسلامی عناصر سے خالی نہیں اور اگر وہ مخالف ہیں تو صرف صوفیہ کے اس گروہ کے جنہوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر بیعت لے کر دانستہ یا نادانستہ ایسے مسائل کی تعلیم دی جو دین اسلام سے غیر متعلق تھے۔ لیکن جو صوفیہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ پر قائم ہیں، اقبال ان کی خاک پا ہے

اور ان کی محبت کو سعادتِ دارین کا سبب سمجھتا ہے۔ اس مضمون میں اقبال نے اپنے متعلق تحریر کیا:

مجھے اس امر کا اعتراف کرنے میں کوئی شرم نہیں کہ میں ایک عرصے تک ایسے عقائد و مسائل کا قائل رہا جو بعض صوفیہ کے ساتھ خاص ہیں اور جو بعد میں قرآن شریف پر تدبر کرنے سے قطعاً غیر اسلامی ثابت ہوئے۔ مثلاً شیخ محی الدین ابن عربی کا مسئلہ قدم ارواح کملا، مثلاً وحدت الوجود یا مسئلہ تنزلات ستہ یا دیگر مسائل جن میں بعض کا ذکر عبدالکریم جیلی نے اپنی کتاب انسان کامل میں کیا ہے۔ تنزلات ستہ افلاطونیت جدید کے بانی پلوٹائنس کا تجویز کردہ ہے ...... مسئلۂ تنزلات ستہ ...... یونانی فلسفے سے منتقل ہو کر مسلمانوں میں مروج ہوا اور بعد میں اسلامی حکماء اور صوفیہ نے اپنی اپنی اغراض کے مطابق اصطلاحات اسلامیہ میں بیان کیا۔ میرا مذہب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نظامِ عالم میں جاری و ساری نہیں بلکہ نظام عالم کا خالق ہے اور اس کی ربوبیت کی وجہ سے یہ نظام قائم ہے۔ جب وہ چاہے گا، اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔ حکماء کا مذہب تو جو کچھ ہے، اس سے بحث نہیں، رونا اس بات کا ہے کہ یہ مسئلہ اسلامی لٹریچر کا ایک غیر منفک عنصر بن گیا ہے اور اس کے ذمہ دار زیادہ تر صوفی شاعر ہیں، جو پست اخلاق، اس فلسفیانہ اُصول سے بطورِ نتیجہ کے پیدا ہوتے ہیں ان کا بہترین گواہ فارسی زبان کا لٹریچر ہے۔

اس کے بعد اپنے اندازِ فکر کی وضاحت کے سلسلے میں پنجابی زبان کے ایک شاعر وحید خان کی مثال پیش کرتے ہیں۔ وحید خان کسی ہندو جوگی رگناتھ جی کا مرید ہو کر فلسفہ ویدانت یا وحدت الوجود کا قائل ہو گیا تھا اور اس تبدیلیِ عقیدہ نے جو اثر اس پر کیا اسے یوں بیان کرتے ہیں:

تھے ہم پوت پٹھان کے، دل کے دل دیں موڑ
شرن پڑے رگناتھ کے، سکیں نہ تنکا توڑ

اقبال نے مزید لکھا:

فلسفیانہ اور مؤرخانہ اعتبار سے مجھے بعض ایسے مسائل سے اختلاف ہے جو حقیقت میں فلسفے کے مسائل ہیں، مگر جن کو عام طور پر تصوف کے مسائل سمجھا جاتا ہے۔ تصوف کے مقاصد سے مجھے کیونکر اختلاف ہو سکتا ہے، کوئی مسلمان ہے جو ان لوگوں کو بُرا سمجھے جن کا نصب العین محبتِ رسولؐ اللہ ہے اور جو اس ذریعے سے ذاتِ باری سے تعلق پیدا کر کے اپنے اور دوسروں کے ایمان کی پختگی کا باعث ہوتے ہیں۔ اگر میں تمام صوفیہ کا مخالف ہوتا تو مثنوی میں ان کی حکایات و مقولات سے استدلال نہ کرتا۔

پھر حافظ کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ حافظ محض ایک شاعر تھے اور ان کے کلام سے جو صوفیانہ حقایق اخذ کیے گئے وہ بعد کے لوگوں کا کام ہے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کی زندگی اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ مسلم قلب کی مستقل کیفیت بیداری ہے نہ کہ خواب یا سُکر۔ مزید براں جو لوگ سُکر کی حالت کو مستقل بنا لیتے ہیں، وہ کشمکش حیات کے قابل نہیں رہتے اور قومی و ملی اعتبار سے بھی اس کے نقصان دہ ہونے کی مثالیں اسلامی تاریخ میں ملتی ہیں۔ اقبال نے لکھا:

شاعرانہ اعتبار سے میں حافظ کو نہایت بلند پایہ سمجھتا ہوں...... لیکن فردی اور ملی اعتبار سے کسی شاعر کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کے لیے کوئی معیار ہونا چاہیے۔ میرے نزدیک معیار یہ ہے کہ اگر کسی شاعر کے اشعار اغراضِ زندگی میں ممد ہیں تو وہ شاعر اچھا ہے اور اگر اس کے اشعار زندگی کے منافی ہیں یا زندگی کی قوت کو کمزور یا پست کرنے کا میلان رکھتے ہیں تو وہ شاعر خصوصاً قومی اعتبار سے مضرت رساں ہے...... جو حالت خواجہ حافظ اپنے پڑھنے والوں کے دل میں پیدا کرنا چاہتے ہیں (یعنی بحیثیت صوفی ہونے کے) وہ حالت افراد و اقوام کے لیے جو اس زمان و مکان کی دنیا میں رہتے ہیں، نہایت ہی خطرناک ہے بحیثیت مجموعی خواجہ حافظ کا اخلاقی نصب العین حالت سُکر ہے نہ کہ حالت صحو، اور کسی شاعر کی تنقید کے لیے اس کے نصب العین ہی کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔

اس کے بعد اپنے نصب العین کی مزید توضیح کے سلسلے میں اقبال نے محمد دین فوق کی تصنیف وجدانی نشتر میں اورنگ زیب عالمگیر سے متعلق ایک واقعے کا ذکر کیا۔ اورنگ زیب عالمگیر نے جب طوائفوں پر پابندی لگائی تو ایک طوائف روزانہ حضرت شیخ کلیم اللہ جہان آبادی کی خدمت میں روزانہ حاضر ہو کر دست بستہ کھڑی ہو جاتی اور جب آپ نظر اٹھاتے تو سلام کر کے چلی جاتی۔ ایک دن آپ نے حقیقت حال پوچھی تو طوائف نے تمام کیفیت بیان کر دی۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ حافظ کا یہ شعر:

در کوے نیک نامی مارا گزر نہ دادند
گر تو نمی پسندی تغییر کن قضا را

تم سب یاد کر لو اور جب تمہیں دریا کی طرف لے چلیں تو بآواز بلند اس شعر کو پڑھتی جاؤ۔ طوائفوں نے شعر ازبر کر لیا۔ جب روانہ ہونے لگیں تو خوش الحانی سے بڑے دردناک لہجے میں یہ شعر پڑھنا شروع کر دیا۔ جس جس نے سُنا دل تھام کے رہ گیا۔ جب اورنگ زیب عالمگیر کے کان میں آواز پہنچی تو بے قرار ہو گیا اور حکم دیا کہ سب کو چھوڑ دو۔ اقبال نے اس مثال سے

واضح کیا کہ حافظ کے کلام کی یہ تاثیر ان کی خوبی نہیں بلکہ ایک ایسا عیب ہے جس نے اورنگ زیب عالمگیر کو بھی قوانین اسلام پر عمل درآمد سے روک دیا۔

اس مضمون کی اشاعت کے چند دنوں بعد اپنے ایک خط بنام محمد نیاز الدین خان محررہ ۱۹ جنوری ۱۹۱۶ء میں اقبال نے تحریر کیا:

شاہ ولی اللہ کا رسالہ میں نے دیکھا ہے۔ یہی افلاطونیت جدید ہے جس کا اشارہ میں نے اپنے مضمون میں کیا ہے۔ فلسفہ افلاطون کی ایک بگڑی ہوئی صورت ہے جس کو ایک پیرو پلوٹائنس نے مذہب کی صورت میں پیش کیا۔ میرے نزدیک یہ تعلیم قطعاً غیر اسلامی ہے اور قرآن کریم کے فلسفے سے اسے کوئی تعلق نہیں۔ تصوف کی عمارت اسی یونانی بے ہودگی پر تعمیر کی گئی۔

خواجہ حسن نظامی کے مضمون ''سرِ اسرار خودی'' کے چھپنے سے پہلے اقبال نے ان کے نام ایک خط شائع کیا، جس میں فرمایا:

مجھے خوب معلوم ہے کہ آپ کو اسلام اور پیغمبر اسلام سے عشق ہے۔ پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ آپ کو ایک حقیقت اسلامی معلوم ہو جائے اور آپ اس سے انکار کریں، بلکہ مجھے ابھی سے یقین ہے کہ آپ بالآخر مجھ سے اتفاق کریں گے، میری نسبت بھی آپ کو معلوم ہے، میرا فطری اور آبائی میلان تصوف کی طرف ہے مگر قرآن پر تدبر کرنے اور تاریخ اسلام کا بغور مطالعہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے اپنی غلطی معلوم ہوئی اور میں نے محض قرآن کی خاطر اپنے قدیم خیال کو ترک کر دیا۔

اقبال نے یہ بھی واضح کیا کہ اسلام حقیقت میں رہبانیت کے خلاف ایک صدائے احتجاج ہے اور ان کے نزدیک ''گسستن'' عین اسلام ہے اور ''پیوستن'' رہبانیت یا ایرانی تصوف ہے۔ اقبال نے خواجہ حسن نظامی کو یاد دلایا کہ انہوں نے اپنے لیے ''سر الوصال'' کے بجائے ''سر الفراق'' کا خطاب پسند کیا تھا۔ گسستن جس کا تصور شیخ احمد مجدد الف ثانی کے ہاں موجود ہے، شان عبدیت کا نام ہے صحو اور انتہائی کمال روح انسانی کا ہے۔ جب کہ حالت سکر منشائے اسلام اور قوانین حیات کے مخالف ہے۔

اقبال کی رائے میں توحید اور وحدت الوجود دو مختلف حقیقتیں ہیں۔ توحید کا مفہوم ذہنی ہے اور وحدت الوجود کا مفہوم فلسفیانہ ہے۔ توحید کی ضد کثرت نہیں بلکہ شرک ہے اور وحدت الوجود کی ضد کثرت ہے۔ جب توحید اور وحدت الوجود ایک ہی مسئلہ سمجھ لیا گیا تو صوفیہ کو فکر ہوئی کہ توحید ثابت کرنے کا کوئی ایسا طریقہ ہونا چاہیے جو منطقی قوانین سے لاتعلق ہو۔ اس غرض کے

لیے حالت سُکر ممد ہوئی۔ اقبال کو حقیقت سُکر کی واقعیت سے انکار نہ تھا لیکن ان کی رائے میں جس غرض کے لیے یہ حالت پیدا کی جاتی ہے، وہ غرض اس سے مطلق پوری نہیں ہوتی۔ اس سے زیادہ سے زیادہ صاحب حال کو ایک علمی یا فلسفیانہ مسئلہ کی تصدیق ہو جاتی ہے اور بس۔ پس اقبال کے عقیدے کے مطابق ہر کیفیت قلبی مذہبی اعتبار سے کوئی فائدہ نہیں رکھتی۔

بحث کچھ تلخی کا رنگ اختیار کرنے لگی تھی، اس لیے اکبر الہ آبادی، اقبال اور خواجہ حسن نظامی میں صلح کرانے کی کوشش کرنے لگے۔ اس سلسلے میں اقبال نے انہیں اپنے ایک خط محررہ ۲۷ جنوری ۱۹۱۶ء میں تحریر کیا:

ان شاء اللہ اختلاف رائے کا اثر پرائیویٹ تعلقات پر نہ ہوگا۔ میں نے صرف دو ایک خط شائع کیے تھے اور وہ بھی اسی وقت جب خواجہ حسن نظامی نے خود مضامین لکھے اور اپنے احباب سے لکھوائے۔ ان مضامین کی مجھے کوئی شکایت نہیں۔ شکوہ صرف اس امر کا تھا کہ پرائیویٹ خطوں میں تو وہ مجھے لکھتے تھے، اور لکھتے ہیں کہ تمہاری نیت پر کوئی حملہ نہیں، لیکن اخباروں میں اس کے برعکس لکھتے ہیں۔ میں نے خود خواجہ حسن نظامی سے اس امر کی شکایت کی تھی اور نہایت صاف باطنی کے ساتھ لکھا تھا کہ آپ میرے ساتھ ناانصافی نہ کریں۔ علمی بحث ہونی چاہیے، حریف کو بدنام کرنا مقصود نہ ہونا چاہیے۔

پھر اپنے ایک اور خط محررہ ۴ فروری ۱۹۱۶ء بنام اکبر الہ آبادی میں لکھا:

چونکہ خواجہ حسن نظامی نے عام طور پر اخباروں میں میری نسبت یہ مشہور کر دیا ہے کہ میں صوفیاے کرام سے بدظن ہوں، اس واسطے مجھے اپنی پوزیشن صاف اور واضح کرنی ضروری ہے ...... ان کا خیال ہے میں تحریک تصوف کو دنیا سے مٹانا چاہتا ہوں۔ ''سرِ اسرار خودی'' کے عنوان سے انہوں نے ایک مضمون خطیب میں لکھا ہے، جو آپ کی نظروں سے گزرا ہوگا۔ جو پانچ وجوہ انہوں نے مثنوی سے اختلاف کرنے کے لکھے ہیں، انہیں ذرا غور سے ملاحظہ فرمایئے۔

اس کے بعد اقبال نے ''سرِ اسرار خودی'' کے عنوان سے دوسرا مضمون خواجہ حسن نظامی کے اعتراضات کے جواب میں لکھا، جو وکیل ۹ فروری ۱۹۱۶ء میں شائع ہوا۔ اس میں بھی اپنے عقیدے کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ اسلام نے دین اور دنیا کے فرائض کو یکجا کیا ہے اور اس طرح بنی نوع انسان کے لیے ایک معتدل راہ قائم کی ہے۔ جہاں یہ تعلیم دی ہے کہ انسان کا مقصود اصلی اعلاے کلمۃ اللہ ہے، وہاں یہ بھی سکھایا ہے **ولا تنس نصیبک من الدنیا**

(دنیا سے اپنا حصہ لینا نہ بھولو) پھر اس حصہ کو حاصل کرنے کا طریقہ بھی بتایا جو شریعت اسلامیہ کا وہ حصہ ہے جو معاملات سے تعلق رکھتا ہے لیکن جس طرح خواجہ حسن نظامی نے اپنے مضمون میں اسلام کی تعبیر کی ہے اس طرح تو اسلام اور رہبانیت میں کوئی فرق نہیں رہتا۔

پھر اقبال نے خواجہ حسن نظامی کی ان لغزشوں کی نشان دہی کی جو انھوں نے اقبال کے حافظ سے متعلق اشعار کو غلط معانی پہنا کر یا مثنوی کے دیباچے کے بعض حصوں کی غلط تعبیر کے ذریعے کی تھیں اور جن کا مقصد عوام کو مثنوی سے بدظن کرنا تھا۔ مثنوی کی نامعقولیت سے متعلق جو پانچ وجوہ خواجہ حسن نظامی نے دی تھیں، ان میں پہلی وجہ کے جواب میں تحریر کیا:

مجھے خواجہ صاحب سے اتفاق ہے کہ قرآن شریف میں کہیں زیادہ تعلیم خودی کی ہے اور مثنوی ......ایک مسلمان کی لکھی ہوئی ہے، جس نے قرآن سے فائدہ اٹھایا ہے اور اس کی تعلیم کو بنی نوع انسان کی نجات کا باعث تصور کرتا ہے......خواجہ صاحب نے اس مثنوی کی نامعقولیت کی ایک دلیل یہ دی ہے کہ چونکہ مجھ کو اس کی ضرورت نہیں، اس واسطے یہ مثنوی نامعقول ہے۔ سبحان اللہ۔

دوسری وجہ نامعقولیت کے جواب میں فرمایا:

دیباچے میں جو کچھ لکھا ہے، اس کا مفہوم یہی ہے اور یہی میرا عقیدہ ہے......خواجہ صاحب کی خدمت میں مؤدبانہ عرض ہے کہ صوفی تحریک کو مٹانا میرا مقصد نہیں، میرا مقصد محض حفاظتِ اسلام ہے۔

تیسری وجہ کے جواب میں ارشاد فرمایا:

کہاں میں نے مسلمانوں کو یہ صلاح دی ہے کہ وہ اپنے عقائد بدل دیں۔ میں تو ان کو یہ صلاح دیتا ہوں کہ وہ اپنی فلسفیانہ روایات پر نظر ثانی کریں۔

چوتھی وجہ کے جواب میں تحریر فرمایا:

اس (وجہ) کی تائید میں ایک شعر بھی مثنوی کا پیش نہیں کیا گیا، جس سے معلوم ہو کہ اقبال (خودداری کے ساتھ) خودغرضی کی تعلیم دیتا ہے۔

پانچویں وجہ کے جواب میں لکھا:

یعنی چونکہ خواجہ صاحب، حافظ کے حلقہ بگوش ہیں اس واسطے (ان کے نزدیک) یہ مثنوی بوجۂ تنقید حافظ نامعقول ہے۔

آخر میں اقبال نے تحریر کیا:

باقی مضمون میں دو باتیں ہیں، مثنوی کو سر علی امام کے نام سے نامزد کرنے کے جواب میں صرف

اس قدر عرض ہے کہ خواجہ صاحب لفظ ''ڈیڈیکیشن'' کے معنی نہیں سمجھتے ...... دوسرا الزام جو خواجہ صاحب مجھ پر لگاتے ہیں یہ ہے کہ اقبال نے مثنوی کو بیداری میں نہیں پڑھا۔ حضرت! میں نے مولانا جلال الدین رومیؒ کی مثنوی کو بیداری میں پڑھا ہے اور بار بار پڑھا ہے۔ آپ نے شاید اسے سُکر کی حالت میں پڑھا ہے کہ اس میں آپ کو وحدت الوجود نظر آتا ہے۔ مولوی اشرف علی تھانوی سے پوچھیے، وہ اس کی تفسیر کس طرح کرتے ہیں۔ میں اس بارے میں انہی کا مقلد ہوں۔

اقبال مثنوی کا دوسرا حصہ لکھنے کے لیے بیتاب تھے، لیکن خواجہ حسن نظامی نے بحث چھیڑ کر ان کی توجہ ہٹا دی اس بات کا ذکر اپنے ایک خط محررہ ۱۳؍ فروری ۱۹۱۶ء بنامِ محمد نیاز الدین خان میں یوں کرتے ہیں:

میرا تو خیال تھا کہ فرصت کا وقت مثنوی کے دوسرے حصے کو دوں گا، جو پہلے سے زیادہ ضروری ہے، مگر خواجہ حسن نظامی نے بحث چھیڑ کر توجہ اور طرف منعطف کر دی ہے ...... دین کی اصل حقیقت ائمہ اور علماء کی کتابیں پڑھنے سے ہی کھلتی ہے اور آج کل زمانہ کا اقتضاء یہ ہے کہ علم دین حاصل کیا جائے اور اسلام کے عملی پہلو کو نہایت وضاحت سے پیش کیا جائے۔ اپنی شریعت کی حفاظت کی وجہ سے ہی یہودی قوم اس وقت تک زندہ ہے ورنہ اگر فیلو (پہلا یہودی متصوف) قوم کے دل و دماغ پر حاوی ہو جاتا تو آج یہ قوم دیگر اقوام میں جذب ہو کر اپنی ہستی سے ہاتھ دھو چکی ہوتی۔

اپنے ایک اور خط محررہ ۱۳؍ اپریل ۱۹۱۶ء بنام مہاراجہ کشن پرشاد میں فرماتے ہیں:

خواجہ حسن نظامی صاحب نے تنقید حافظ کی وجہ سے اس مثنوی کو مخالفِ تصوف سمجھا ہے ان کو تصوف کے لٹریچر سے واقفیت نہیں اور جس تصوف پر وہ قائم ہیں اس کا میں مخالف نہیں۔ میرا عقیدہ ہے کہ ان کا اصل مرض قوائے حیات کی ناتوانی اور ضعف ہے اور یہ ضعف زیادہ تر ایک خاص قسم کے لٹریچر کا نتیجہ ہے جو ایشیا کی قوموں کی بدنصیبی سے ان میں پیدا ہو گیا ...... اب حالات حاضرہ اس امر کے مقتضی ہیں کہ اس نکتہ خیال میں اصلاح کی جائے۔

اپنے ایک دوسرے خط محررہ ۱۰ مئی ۱۹۱۶ء میں انہیں لکھا:

اگرچہ میں کوئی معمولی ذہانت و فطانت رکھنے والا آدمی نہیں ہوں اور نہ کوئی غیر معمولی علم رکھتا ہوں، تاہم عام لوگوں سے علم اور سمجھ کسی قدر زیادہ رکھتا ہوں۔ جب مجھ کو اس نتیجے پر پہنچنے کے لیے بیس سال کی ضرورت ہے، تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ عام لوگ جو دنیا کی دماغی اور علمی تاریخ سے پورے واقف نہیں، تھوڑے غور و فکر سے اس کی حقیقت تک پہنچ جائیں۔

مگر مہاراجہ کشن پرشاد بھی خواجہ حسن نظامی کے اعتراضات سے اثر قبول کر کے یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ مثنوی میں 'جرمن فلسفہ' پیش کیا گیا ہے، اس لیے اقبال نے انہیں اپنے ایک خط محررہ ۲۴ جون ۱۹۱۶ء میں تحریر کیا:

تعجب ہے آپ کا بھی یہ خیال ہے کہ میں نے جرمن فلسفہ، اس مثنوی میں لکھا ہے۔ علماے اسلام ابتدا سے آج تک تصوف وجودیہ کے مخالف رہے ہیں۔ میں نے کوئی نئی بات نہیں کی۔ ہندوؤں میں کشن کی گیتا (جہاں تک میں اسے سمجھا ہوں) اس کے خلاف ایک زبردست آواز تھی۔ اسلامی تصوف کا دارو مدار گسستن پر ہے، تصوف وجودیہ کا پیوستن یا فنا پر۔ اگر میں نے گسستن کی حمایت کی ہے تو کوئی بدعت نہیں کی۔ صوفیہ میں سے جن لوگوں نے مجھ پر اعتراض کیا ہے وہ خود اپنے تصوف کے لٹریچر سے آگاہ نہیں معلوم ہوتے۔ تصوف وجودیہ کے متعلق خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک پیش گوئی موجود ہے جس پر میں نے مفصل بحث کی ہے، ان شاء اللہ عنقریب یہ مضمون شائع ہوگا۔

قلمی جنگ کے سلسلے میں اقبال کا تیسرا مضمون بعنوان ''علم ظاہر و علم باطن'' وکیل ۲۸؍جون ۱۹۱۶ء میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں اقبال نے واضح کیا کہ اس تصوف کو جس کا نصب العین شعائرِ اسلام میں مخلصانہ استقامت پیدا کرنا ہو وہ عین اسلام سمجھتے ہیں، لیکن ایک گروہ ایسا بھی ہے جو معرفت کے نام پر شریعت اسلامیہ کو علمِ ظاہر کے حقارت آمیز خطاب سے یاد کرتا ہے۔ مگر علم پر معرفت کو ترجیح دینا اور شریعت کی تحقیر اسلام کے خلاف ہے۔ شریعت اسلامیہ کو ہر اعتبار سے فوقیت حاصل ہے اور صوفیہ کے معرفت یا علم باطن کے ایک علیحدہ دستور العمل ہونے کے متعلق تمام دعوے باطل ہیں۔

اسی مضمون کی اہمیت کے بارے میں اقبال اپنے ایک خط محررہ ۸ جولائی ۱۹۱۶ء بنام محمد نیاز الدین خان میں تحریر کرتے ہیں:

معلوم ہوتا ہے میرا مضمون علم ظاہر و باطن جو وکیل میں شائع ہوا ہے، آپ کی نظر سے نہیں گزرا، اسے بھی پڑھیے۔ ایک اور مضمون لکھ رہا ہوں جو بالکل نرالا ہے۔ غالباً آج تک ایسا مضمون نہیں لکھا گیا۔ جن علماء نے تصوف وجودیہ کی مخالفت کی ہے، ان کی توجہ کبھی اس طرف نہیں ہوئی۔

اپنے ایک اور خط محررہ ۱۰ جولائی ۱۹۱۶ء بنام مولوی سراج الدین پال میں لکھتے ہیں:

حدیث میں آتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے تو اسے دین کی سمجھ عطا

کرتا ہے۔افسوس ہے مسلمان مردہ ہیں۔انحطاطِ ملّی نے ان کے تمام قویٰ کو شل کر دیا ہے......مگر ہمیں اپنے ادائے فرض سے کام ہے۔شعرائے عجم میں بیشتر وہ شعرا ہیں جو اپنے فطری میلان کے باعث وجودی فلسفہ کی طرف مائل تھے۔ان شعراء نے نہایت عجیب وغریب اور بظاہر دلفریب طریقوں سے شعائر اسلام کی تردید و تنسیخ کی ہے اور اسلام کی ہر محمود شے کو ایک طرح سے مذموم بیان کیا ہے۔اگر اسلام افلاس کو بُرا کہتا ہے تو حکیم سنائی افلاس کو اعلیٰ درجے کی سعادت قرار دیتا ہے۔اسلام جہاد فی سبیل اللہ کو حیات کے لیے ضروری تصور کرتا ہے تو شعرائے عجم اس شعار اسلام میں کوئی اور معنی تلاش کرتے ہیں۔

پھر اپنے خط محررہ ۱۹ جولائی ۱۹۱۶ء میں انہیں تحریر کیا:

ہندی مسلمانوں کی بڑی بدبختی یہ ہے کہ اس ملک سے عربی زبان کا علم اٹھ گیا اور قرآن کی تفسیر میں محاورہ عرب سے بالکل کام نہیں لیتے۔یہی وجہ ہے کہ اس ملک میں قناعت اور توکل کے وہ معنی لیے جاتے ہیں جو عربی زبان میں ہرگز نہیں ہیں یہ حیرت کی بات ہے کہ تصوف کی تمام شاعری مسلمانوں کے پولیٹیکل انحطاط کے زمانے میں پیدا ہوئی اور ہونا بھی چاہیے تھا۔جس قوم میں طاقت وتوانائی مفقود ہو جائے، جیسا کہ تاتاری یورش کے بعد مسلمانوں میں مفقود ہو گئی، تو پھر اس قوم کا نکتۂ نگاہ بدل جایا کرتا ہے۔ان کے نزدیک ناتوانی ایک حسین وجمیل شے ہو جاتی ہے اور ترکِ دنیا موجب تسکین۔اس ترکِ دنیا کے پردے میں قومیں اپنی سستی وکاہلی اور اس شکست کو جو ان کو تنازع للبقا میں ہو، چھپایا کرتی ہیں۔خود ہندوستان کے مسلمانوں کو دیکھیے کہ ان کے ادبیات کا انتہائی کمال لکھنؤ کی مرثیہ گوئی پر ختم ہوا۔

ہمہ اوست اور ہمہ از اوست یا وحدت الوجود اور وحدت الشہود میں امتیاز کے سلسلے میں اقبال نے اپنے ایک خط محررہ ۱۱ ستمبر ۱۹۱۶ء بنام محمد نیاز الدین خان میں فرمایا:

میرے نزدیک منطقی اعتبار سے کوئی آدمی ایک ہی وقت میں ان دونوں شقوں کا قائل نہیں ہو سکتا۔اسی واسطے لاٹسا (جرمن مفکر) کا فلسفہ یورپ میں مقبول نہ ہوا، گو اس کی تعلیم اس قسم کی تھی کہ وحدت الوجود اور وحدت الشہود دونوں کی طرف میلان رکھنے والی طبائع کے لیے موزوں تھا، مذہب کا مقصود عمل ہے نہ کہ انسان کے عقلی اور دماغی تقاضاؤں کو پورا کرنا......اس وقت وہی قوم ✠ رہے گی جو اپنی عملی روایات پر قائم رہ سکے گی:

اس دور میں سب مٹ جائیں گے ہاں باقی وہ رہ جائیگا
جو اپنی راہ پہ قائم ہے اور پکا اپنی ہٹ کا ہے

اس کے بعد اقبال نے بقول ان کے دو تین مضمون تصوف وجودیہ کے متعلق لکھے۔ اس سلسلۂ مضامین میں دوسرا مضمون ۱۳ دسمبر ۱۹۱۶ء کے وکیل میں شائع ہوا، جس میں انہوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک پیش گوئی پر بحث کی کہ میری امت میں تین قرنوں کے بعد ''سمن'' کا ظہور ہوگا۔ اسی طرح انگریزی میں ایک مضمون ''اسلام اور تصوف'' کے زیر عنوان تحریر کیا جو نیو ایرا کی جولائی ۱۹۱۷ء کی اشاعت میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں اقبال نے نوجوانانِ ملت سے مخاطب ہو کر کہا:

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں کوئی چیز نہیں جسے مخفی کہا جا سکے...... مسلم نوجوانو! ایسے شعبدہ باز سے خبردار رہو کیونکہ اس کی کمند بڑی مدت سے تمہاری گردن میں پڑی ہوئی ہے۔ دنیائے اسلام کے احیاء کا انحصار اس پر ہے کہ بڑی سختی سے غیر مصلحانہ انداز میں اس توحید کے اصول کو اپنا لیا جائے جس کی تعلیم تیرہ سو سال پیشتر عربوں کو دی گئی تھی۔

اکبر الٰہ آبادی کے مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے نام خطوط پڑھ کر اقبال کو احساس ہوا کہ انہوں نے مثنوی پڑھے بغیر بعض اعتراضات کیے تھے۔ اس لیے اقبال نے انہیں اپنے ایک خط محررہ ۱۱ جون ۱۹۱۸ء میں تحریر کیا:

میں نے خواجہ حافظ پر کہیں یہ الزام نہیں لگایا کہ ان کے دیوان سے میکشی بڑھ گئی۔ میرا اعتراض حافظ پر بالکل اور نوعیت کا ہے۔ اسرارِ خودی میں جو کچھ لکھا گیا وہ ایک لٹریری نصب العین کی تنقید تھی...... اس وقت اسلام کا دشمن سائنس نہیں (جیسا کہ بعض دوست نادانی سے سمجھے بیٹھے ہیں، اسلام کی پوزیشن سائنس کے خلاف نہایت مضبوط ہے) مگر اس کا دشمن یورپ کا علاقائی نیشنلزم ہے جس نے ترکوں کو خلافت کے خلاف اُکسایا، مصر، مصریوں کے لیے، کی آوازِ بلند کی اور ہندوستان کو پان انڈین ڈیما کریسی کا بے معنی خواب دکھایا...... مذہب اسلام کا ایک نہایت ضروری پہلو قومیت ہے، جس کا مرکز کعبۃ اللہ ہے۔

پھر انہیں اپنے ایک خط محررہ ۲۰ جولائی ۱۹۱۸ء میں لکھا:

آپ مجھے تناقض کا ملزم گردانتے ہیں، یہ بات درست نہیں بلکہ میری بدنصیبی یہ ہے کہ آپ نے مثنوی اسرارِ خودی کو اب تک نہیں پڑھا...... میں اس خودی کا حامی ہوں جو سچی بے خودی سے پیدا ہوتی ہے......بس حقیقی اسلامی بے خودی میرے نزدیک اپنے ذاتی اور شخصی میلانات، رجحانات و تخیلات کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کے احکام کا پابند ہو جانا ہے، اس طرح کہ اس پابندی کے نتائج سے انسان بالکل لاپروا ہو جائے اور محض رضا و تسلیم کو اپنا شعار بنائے یہی اسلامی تصوف

کے نزدیک فنا ہے۔

اقبال نے مثنوی اسرارِ خودی کی اشاعتِ ثانی سے حافظ سے متعلق اشعار اور دیباچہ حذف کر دیئے اور اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے حافظ محمد اسلم جیراجپوری کو اپنے ایک خط محررہ ۱۷ رمئی ۱۹۱۹ء میں تحریر کیا:

خواجہ حافظ پر جو اشعار میں نے لکھے تھے، ان کا مقصد محض ایک لٹریری اصول کی تشریح اور توضیح تھا۔ خواجہ کی پرائیویٹ شخصیت یا ان کے معتقدات سے سروکار نہ تھا۔ دیباچہ بہت مختصر تھا اور اپنے اختصار کی وجہ سے غلط فہمی کا باعث تھا...... کیمبرج کے پروفیسر نکلسن بھی اس خیال میں آپ کے ہمنوا ہیں کہ دیباچہ دوسری ایڈیشن سے حذف نہ کرنا چاہیے تھا...... تصوف سے اگر اخلاص فی العمل مراد ہے (اور یہ مفہوم قرونِ اولیٰ میں اس کا لیا جاتا تھا) تو کسی مسلمان کو اس پر اعتراض نہیں ہوسکتا۔ ہاں جب تصوف فلسفہ بننے کی کوشش کرتا ہے اور عجمی اثرات کی وجہ سے نظامِ عالم کے حقایق اور باری تعالیٰ کی ذات کے متعلق موشگافیاں کر کے کشفی نظریہ پیش کرتا ہے تو میری روح اس کے خلاف بغاوت کرتی ہے۔

۱۹۱۸ء کے اوائل میں پھر غلط فہمی کا امکان پیدا ہوا۔ زمیندار پر پابندی عاید تھی اور مولانا ظفر علی خان نے اپنے نئے ہفتہ وار ستارہ صبح کی اشاعت بڑھانے کی خاطر اس میں پیشہ ور پیروں اور صوفیوں کے خلاف مضامین کا سلسلہ شروع کر دیا۔ خواجہ حسن نظامی کو شبہ ہوا کہ یہ سب کچھ اقبال کے ایما پر ہو رہا ہے۔ اس سلسلے میں، غلام بھیک نیرنگ نے ایک وضاحتی خط لکھ کر ان کا مغالطہ دور کر دیا۔

مولوی فضل الدین احمد کے اس دعوے کہ اسرار خودی اور رموز بے خودی مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریکِ الہلال ہی کی آوازِ بازگشت ہیں اقبال نے اپنے ایک خط محررہ ۱۰ رنومبر ۱۹۱۹ء میں سید سلیمان ندوی سے شکایت کی:

شاید ان کو یہ معلوم نہیں کہ جو خیالات میں نے ان مثنویوں میں ظاہر کیے ہیں، ان کو برابر ۱۹۰۷ء سے ظاہر کر رہا ہوں...... اس بات سے مجھے رنج ہوا کہ ان کے خیال میں اقبال تحریکِ الہلال سے پہلے مسلمان نہ تھا، تحریک الہلال نے اسے مسلمان کیا...... میرے دل میں مولانا ابوالکلام آزاد کی بڑی عزت ہے اور ان کی تحریک سے ہمدردی، مگر کسی تحریک کی وقعت بڑھانے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ اوروں کی دل آزاری کی جائے۔

اقبال کی فرمایش پر رموزِ بے خودی پر سید سلیمان ندوی نے کچھ لغزشوں کی نشان دہی

کی۔ان میں سے بیشتر کے جوابات اقبال نے اساتذہ فارسی کے کلام کی اسناد کے ساتھ دے دیئے۔ دونوں مثنویوں کی تعریف میں عبدالرحمن بجنوری کا ایک انگریزی مضمون ایسٹ اینڈ ویسٹ میں شائع ہوا۔جس میں انہوں نے لکھا کہ اقبال مسیحا بن کر آیا ہے اوراس نے مردوں میں زندگی کے آثار پیدا کر دیئے ہیں۔ جب یہ مثنویاں حقیقی معنوں میں سمجھ میں آ جائیں گی تو دنیائے اسلام میں وہ لہر اٹھے گی جس کے نتائج نہایت شاندار ہوں گے۔ اس مضمون کی گونج یورپ اورامریکہ میں بھی سنی گئی۔

مثنوی اسرارِ خودی کا انگریزی ترجمہ کیمبرج کے مشہور مستشرق نکلسن نے کیا جولندن سے ۱۹۲۰ء میں شائع ہوا۔مسئلہ خودی پر اقبال نے ایک وضاحتی نوٹ بھی بھیجا، جسے انہوں نے دیباچہ تحریر کرتے وقت استعمال کیا۔ادبائے مغرب نے مثنوی پر تبصرے کیے۔تاہم ایک انگریز نقاد ڈکنسن نے تحریر کیا کہ اقبال کا انسانِ کامل اور ارتقائے حیات کا تصور جرمن مفکر نطشے اور فرانسیسی مفکر برگساں کا مرہونِ منت ہے اور وہ مادی قوت کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے حیاتِ انسانی میں کشمکش اور جارحیت کا علمبردار ہے۔ ڈکنسن کا مجموعی تاثر یہ تھا کہ اقبال نے ایشیاء کی پسماندہ اقوام اورخصوصاً مسلمانوں کو جنگ کی تعلیم دی ہے اوراس کے ہرلفظ میں ایک سیاسی قوت چھپی ہوئی ہے۔

اقبال نے اس کا جواب ڈکنسن کے نام ایک طویل خط کے ذریعے جنوری ۱۹۲۱ء میں دیا جس میں تحریر کیا:

> وہ (ڈکنسن) انسان کامل کے متعلق میرے تخیل کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکے...... میں نے آج سے تقریباً بیس سال قبل انسانِ کامل کے متصوفانہ عقیدے پر قلم اٹھایا تھا اوراس زمانے میں نہ تو نطشے کے عقائد کا غلغلہ میرے کانوں تک پہنچا تھا نہ اس کی کتب میری نظروں سے گزری تھیں ...... میں روحانی قوت کا تو قائل ہوں لیکن مادی قوت پر یقین نہیں رکھتا۔ جب ایک قوم کو حق و صداقت کی حمایت میں دعوت پیکار دی جائے تو میرے عقیدے کی رو سے اس دعوت پر لبیک کہنا اس کا فرض ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں کسی ایسی شخصیت کی ضرورت ہے جو ہمارے معاشرتی مسائل کی پیچیدگیاں سلجھائے، ہمارے تنازعات کا فیصلہ کرے اور بین الاقوامی اخلاق کی بنیادیں مستحکم و استوار کر دے...... ڈکنسن نے آگے چل کر میرے فلسفۂ سخت کوشی کا ذکر کیا ہے...... میں کشمکش کو سیاسی حیثیت سے نہیں بلکہ اخلاقی حیثیت سے ضروری سمجھتا ہوں ممکن ہے

فطرت کا ارتقا ...... (بالآخر) تصادم اور جنگ و پیکار کو ...... (ہمیشہ کے لیے) مٹا دے ...... (لیکن) میرے نزدیک اس نوع کے انقلاب کا زمانہ ابھی بہت دور ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ یورپ کی جنگ عظیم نے جو سبق انسانیت کو سکھایا ہے، وہ اس سے عرصہ دراز تک فائدہ نہ اٹھا سکے گی۔ پس ظاہر ہے کہ میں نے صرف اخلاقی زاویۂ نگاہ سے کشمکش کو ضروری قرار دیا ہے۔ انسان دوستی کا آئیڈیل شاعری اور فلسفے میں ہمیشہ عالمگیر ہی ہوتا ہے لیکن اگر اس کا عملی اطلاق کرنا ہو تو اس کا دائرہ ایک ایسی سوسائٹی تک محدود کرنا پڑے گا جو ایک مستقل عقیدہ اور معین راہِ عمل رکھتی ہو ...... میرے نزدیک اس قسم کی سوسائٹی اسلام ہے ...... میرا دعویٰ ہے کہ اسرارِ خودی کا فلسفہ مسلم صوفیہ اور حکما کے افکار و مشاہدات سے ماخوذ ہے۔ برگساں کا تصورِ زماں بھی ہمارے صوفیہ کے لیے نئی چیز نہیں ...... بدقسمتی سے اہلِ مغرب اسلامی فلسفہ کی تاریخ سے ناآشنائے محض ہیں۔

مثنوی کے انگریزی ترجمہ پر مشہور امریکی ادیب اور نقاد ہربرٹ ریڈ نے بھی تبصرہ کیا جو نیوایج مورخہ ۲۵ اگست ۱۹۲۱ء میں چھپا۔ انہوں نے اقبال کا موازنہ امریکی فلسفی شاعر وٹمین سے کرتے ہوئے تحریر کیا کہ مثنوی نے ہندی مسلم نوجوانوں کے خیالات میں ایک محشر برپا کر دیا ہے۔

مثنوی کے معقولات پر ہندوستان، یورپ اور امریکہ میں تو اہلِ علم نے رائے زنی کی، لیکن دنیائے اسلام میں خاموشی طاری رہی۔ دراصل اس افراتفری کے دور میں دنیائے اسلام کی مختلف اقوام کے لیے مثنوی کے پیغام کی نہ تو کوئی اہمیت تھی اور نہ وہ اسے سمجھنے کو ابھی تیار تھیں مگر جن قوموں کو اس مثنوی میں خطاب نہیں کیا گیا، وہ اس کا مطلب سمجھ گئیں۔

مثنوی اسرارِ خودی سے متعلق بحث سے ظاہر ہے کہ اقبال تصوفِ وجودیہ سے متنفر ہو گئے تھے، لیکن وہ تصوفِ اسلامیہ کے حامی تھے اور آخری دم تک حامی رہے۔ اقبال کے افکار نطشے اور برگساں کی آوازِ بازگشت نہیں تھے۔ کیونکہ انسان کامل یا ارتقائے حیات کا تخیل مسلم صوفیہ وحکما میں صدیوں سے موجود تھا اور اس کا ثبوت الجیلی، جلال الدین رومی، ابن مسکویہ اور ابن باجہ کی تحریریں ہیں۔ نطشے کے فوق الانسان کا موازنہ اقبال کے انسانِ کامل کے بجائے اگر بارہویں صدی عیسوی کے اندلسی مسلم مفکر ابن باجہ کے ''متوحد'' سے کیا جائے تو گمان ہوگا کہ نطشے نے شاید اس کے افکار کا مطالعہ کر رکھا تھا، کیونکہ ابن باجہ کی کتب خصوصاً کتاب تدبیر المتوحد اور کتاب اتصال العقل بالانسان کا ترجمہ عبرانی اور غالباً لاطینی زبانوں میں یورپ میں موجود تھا۔ ابن باجہ کا متوحد بھی نطشے کے فوق الانسان کی طرح صحبت انسان سے

گریزاں ہے اور شریعت اسلامیہ کو نظر انداز کرتے وقت ارتقائے عقل کے تسلسل پر ایمان رکھتا ہے۔ فلسفہ نطشے کے برعکس گو ابن باجہ فلسفیانہ طور پر خدا کی ہستی کا بحیثیت خالق و مالکِ کائنات قائل تھا، پھر بھی اس کے افکار کے سبب اس کے مخالفین نے ۱۱۳۸ء میں اسے زہر دے کر مروا دیا۔ اقبال غالباً ابن باجہ کی تحریروں سے ناآشنا تھے ورنہ نطشے کے ضمن میں اس کا ذکر ضرور کرتے۔

اقبال مغرب کے انسانِ جدید سے اُسی طرح بیزار تھے، جس طرح مشرق کے انسانِ مردہ سے۔ وہ جلال الدین رومی کی طرح کسی ایسے انسان کی تلاش میں تھے جو حقیقی معنوں میں کامل ہو؛ اسی لیے مثنوی کی ابتدا جلال الدین رومی کے ان اشعار سے کی:

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گردِ شہر
کزدام و دد ملولم و انسانم آرزو ست
زیں ہمرہانِ سست عناصر دلم گرفت
شیرِ خدا و رستمِ دستانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نہ شود جُستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می نہ شود آنم آرزوست

مغرب کا جدید انسان مغربی اقوام کی مادی ترقی کا حاصل ہے مجموعی حیثیت سے یہ ترقی ان اقوام کے افراد کی انفرادی آمدنی میں اضافے سے سامنے آئی۔ اقبال کے اس عہد میں مغرب کا انسان ایک ایسا نیا انسان تھا جس کے ذہنی رجحانات نئے تھے۔ وہ بنیادی طور پر مغربی انسان تھا، جسے سائنس کی ترقی نے رفتہ رفتہ صنعتی انسان، ٹکنیکاتی انسان، تھوک انسان، یک طرفہ انسان، بے طاقت انسان، ناراض انسان، تنہا انسان، وغیرہ بنا دیا۔ بقولِ اقبال وہ ایسا پست فطرت انسان تھا جس سے شیطان تک بیزار تھا کیونکہ وہ انکار کی اہمیت سے ناواقف محض تھا اور شیطان کے احکام کی بے چون و چرا تعمیل کرتا چلا جا رہا تھا۔ ایسے انسانوں پر مشتمل معاشروں کا ایمان فقط سیاسی و اقتصادی قوت میں اضافہ کرتے چلے جانا تھا اور اسی سبب یہ معاشرے ایک دوسرے سے دائمی طور پر مصروف پیکار تھے۔

اقبال میں مغرب کے جدید انسان کی خامیوں اور کمزوریوں کا مشاہدہ کرنے ہی سے صحیح معنوں میں انسانِ کامل کے لیے جستجو کی تحریک پیدا ہوئی۔ یہ وقت کے تقاضوں کے پیشِ نظر ایک

عملی ضرورت تھی۔ اسی سبب اقبال کا انسانِ کامل محض متصوفانہ یا فلسفیانہ تخیل کے خلا میں معلق نہ تھا بلکہ ان کی نگاہ دور بین نے تاریخ تمدّنِ اسلامی کے تسلسل میں، ''مردِ مومن'' کی حقیقی صورت میں اس انسان کامل یا مرد فردا کو پالیا۔ اسرارِ خودی کے انگریزی ترجمے کے دیباچے میں نکلسن نے درست کہا ہے:

> اقبال کے احساسات ایک پرُ جوش مسلم کے احساسات ہیں۔ اس کا اسلام سے یہ عقیدتمندانہ تعلق دنیا میں ایسی حکومت چاہتا ہے جس میں مسلمانوں کے لیے قومیّت اور وطنیت کی رکاوٹیں حائل نہ ہوسکیں۔ اس کا نصب العین ایک ایسے آزاد مسلم معاشرے کا قیام ہے جس کا مرکز کعبہ ہو اور جو ایمان و ایقان کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر مضبوط عقیدہ رکھتا ہو۔ اقبال نے اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی میں اسی کی تعلیم دی ہے۔

باب: ۱۳

خانہ نشینی

۱۵۔ ۱۹۱۴ء میں برصغیر میں بے چینی اور مظاہروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس کے اسباب پنجاب کے کاشت کاروں میں بے چینی، بنگال میں دہشت پسندوں کی انقلابی کارروائیاں اور امریکہ اور کینیڈا سے ملک بدر کیے جانے والے سکھوں کے مظاہرے تھے۔ اس صورت حال کے بغاوت میں بدل جانے کے خوف کے پیشِ نظر ۱۹۱۷ء میں رولٹ کمیشن کا تقرر کیا گیا جس کا مقصد سیاسی مجرموں کے خلاف تادیبی کارروائی کے بارے میں غور کرنا تھا۔

برطانوی وزیر اعظم لائڈ جارج نے ۵ جنوری ۱۹۱۸ء کو اعلان کیا کہ ترکوں کو خالصتاً ترکی علاقوں اور ان کے دارالحکومت قسطنطنیہ سے محروم نہ کیا جائے گا۔ لیکن آرمینیا، شام، لبنان، عراق، اردن، فلسطین اور عرب کے علاقوں میں آباد اقوام کو اجازت دی جائے گی کہ وہ اپنے اپنے ملکوں میں آزاد قومی حکومتیں قائم کریں۔ مگر جنگِ عظیم کے خاتمے پر فاتح اتحادی طاقتوں میں خفیہ معاہدوں کے ذریعے عثمانی ترکیہ کے علاقوں کا بٹوارا ہو چکا تھا۔ یورپ کی استعماری طاقتوں کی اس سودا بازی سے مسلمانانِ ہند نہ صرف حکومت برطانیہ سے مایوس ہو گئے تھے بلکہ انہوں نے محسوس کیا کہ ان کے ساتھ غداری کی گئی ہے۔

رولٹ کمیشن نے سیاسی مجرموں کے خلاف تادیبی کارروائی کے سلسلے میں جو سفارشات انگریزی حکومت کو پیش کیں۔ ان میں انتظامیہ اور پولیس کو ناواجب اختیارات دیے گئے تھے۔ رولٹ ایکٹ کے نفاذ سے ہندوستان بھر میں احتجاجی جلسوں اور جلوسوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جس کے جواب میں انگریزی حکومت نے ظلم و تشدد اور قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا اور اس کی لپیٹ میں پنجاب بھی آ گیا۔

یہ زمانہ اقبال کی خانہ نشینی کا زمانہ تھا۔ دراصل اقبال کی عزلت نشینی کے زمانے کا آغاز تو

۱۹۱۴ء ہی سے ہو گیا تھا۔ مولانا شوکت علی نے انہیں علی گڑھ کالج کے اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے سالانہ اجلاس میں شرکت کے لیے دعوت بھیجی۔ اقبال نے جواب میں تحریر کیا:

بھائی شوکت! اقبال عزلت نشین ہے اور اس طوفانِ بے تمیزی کے زمانہ میں گھر کی چار دیواری کو کشتی نوح سمجھتا ہے۔ دنیا اور اہل دنیا کے ساتھ تھوڑا بہت تعلق ضرور ہے، مگر محض اس وجہ سے کہ روٹی کمانے کی مجبوری ہے۔ تم مجھے علی گڑھ بلاتے ہو، میں ایک عرصے سے خدا گڑھ میں رہتا ہوں اور اس مقام کی سیر کئی عمروں میں ختم نہیں ہو سکتی۔

لیکن ۱۹۱۹ء میں حالات مزید خراب ہو گئے۔ لاہور میں روز احتجاجی جلوس نکلتے تھے، جنہیں پنجاب کے گورنر مائیکل اڈوائر کی انتظامیہ بُری طرح سے کچل دیتی۔ اسی طرح کے ایک جلوس کا آنکھوں دیکھا حال خالد نظیر صوفی نے اپنی والدہ اور اقبال کی بھتیجی کے حوالے سے یوں بیان کیا ہے:

ان دنوں ہم انارکلی میں رہتے تھے۔ ایک روز بازار سے بڑا عظیم الشان جلوس گزرا۔ بے شمار نوجوان بازوؤں پر سیاہ پٹیاں باندھے اور رولٹ بل ہائے ہائے کے فلک شگاف نعرے لگاتے جا رہے تھے۔ ابھی تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ ہر طرف شور تھا کہ جلوس پر گولی چل گئی۔ بڑے بڑے خوبصورت نوجوان خون میں نہلا دیئے گئے تھے، یہ روح فرسا نظارہ دیکھ کر چچا جان کا چہرہ غصّے اور ضبط سے تمتمار رہا تھا فرمایا: میرے مولا کو یہی منظور ہے، سرتابی کی مجال نہیں، وہ ان شہداء کی قربانیاں ضرور قبول کرے گا جنہوں نے عروسِ آزادی کی مانگ کے لیے اپنا گرم اور نوجوان خون پیش کیا ہے۔ اتنا کہا اور پھر سر جھکا لیا۔ اس وقت اُن کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔

۱۳/اپریل ۱۹۱۹ء کو امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں ایک احتجاجی جلسہ منعقد ہوا، جس میں ہندو مسلم اور سکھ عوام نے شرکت کی۔ اس جلسے میں موجود لوگوں کو گھیرے میں لے کر جنرل ڈائر نے بڑی بے دردی سے اندھا دھند گولیاں چلوائیں اور سینکڑوں انسانوں کو موت کی نیند سلا دیا۔ اس سانحے میں جو لوگ مرے یا زخمی ہوئے، ان کی تعداد کا صحیح اندازہ آج تک نہیں لگایا گیا۔ قیاس ہے کہ مرنے والوں کی تعداد تین سو اور زخمی ہونے والوں کی تعداد تیرہ سو کے لگ بھگ تھی۔ پھر ان کو وہاں سے اٹھوانے کا بھی کوئی انتظام نہ کیا گیا۔ اقبال نے اس سانحہ سے متاثر ہو کر یہ اشعار کہے:

ہر زائرِ چمن سے یہ کہتی ہے خاک پاک
غافل نہ رہ جہاں میں گردوں کی چال سے
سینچا گیا ہے خونِ شہیداں سے، اس کا تخم
تو آنسوؤں کا بخل نہ کر اس نہال سے

جلیانوالہ باغ کے سانحے کے فوری بعد مائیکل اڈوائر کے حکم سے پنجاب میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ اس مارشل لاء کے دوران طالب علموں اور عوام سے جو وحشیانہ سلوک روا رکھا گیا اس کی تفصیل عاشق حسین بٹالوی کی تصنیف میں ملتی ہے، جو ان دنوں لاہور میں موجود تھے۔ وہ تحریر کرتے ہیں:

اس (مائیکل اڈوائر) نے لاہور، قصور، امرتسر، گجرات، گوجرانوالہ، شیخوپورہ اور لائل پور میں مارشل لاء جاری کر کے مظالم کی وہ آگ برسائی جس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں صرف ۱۸۵۷ء کا کشت و خون ہی پیش کر سکتا ہے...... چودہ چودہ برس کے بچوں کو ٹکٹکی میں باندھ کر کوڑوں کی سزا مقرر تھی، ہر محلہ سے چن چن کر معززین کو گھروں سے نکالا گیا تا کہ کھلے بندوں ان کی تذلیل ہو۔ مئی کی گرمی میں لاہور کے کالجوں کے طلبہ کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے سروں پر اپنے بستر اٹھا کر دن میں چار مرتبہ ۱۶ میل کا فاصلہ طے کر کے آئیں اور یونین جیک کو سلامی دیں۔ اسکول کے بچوں کو ہر روز دھوپ میں کھڑے ہو کر ایک فوجی افسر کے سامنے یہ کہنا پڑتا: حضور ہم نے کوئی قصور نہیں کیا! ہماری توبہ! آئندہ بھی ہم سے کوئی خطا سرزد نہیں ہوگی۔

ایک پوری بارات کو جس میں دولہا بھی شامل تھا، بلا وجہ پکڑ کر کوڑوں سے پٹوا دیا گیا۔ ریل گاڑیوں پر آزادانہ سفر کی ممانعت کر دی گئی......عورتوں کی کھلے منہ بے حرمتی کی گئی۔ ایک گلی مقرر کی گئی، جس میں ہر شخص کو پیٹ کے بل رینگتے ہوئے گزرنا پڑتا تھا۔ اُوپر گورا فوج کا سپاہی ہاتھ میں بندوق تھام کر کھڑا رہتا تھا اور اگر رینگنے والا شخص ذرا دم لیتا تو سپاہی بندوق کا کندا اس کی پشت پر مارتا تھا۔ شہر کے بعض معزز اور سر برآوردہ لوگوں کے مکانوں پر مارشل لاء کے احکام کے اشتہار چسپاں کر دیے جاتے تھے اور حکم تھا کہ اگر کسی نے اس اشتہار کو پھاڑ دیا تو مالک مکان کو گرفتار کر لیا جائے گا۔ چنانچہ صاحبِ خانہ کو محض اپنی عزت و ناموس کی حفاظت کے لیے دن بھر اپنے مکان سے باہر کھڑے رہنے کی ذلت برداشت کرنا پڑتی تھی۔ دیال سنگھ کالج کی بیرونی دیوار پر کسی نامعلوم شخص نے ایک اشتہار لگا دیا جس کا مضمون فوجی احکام کے نزدیک قابل اعتراض تھا۔ اس جرم کی پاداش میں کالج کے پرنسپل کو گرفتار

کرلیا گیا...... حکم صادر ہوا کہ جونہی کوئی انگریز نظر آئے، مقامی باشندوں کا فرض ہے کہ فوراً تانگے سے اُتر کر کھڑے ہو جائیں اور جھک کر سلام کریں۔ ایک پچیس فٹ لمبے اور بارہ فٹ چوڑے کمرے کے اندر مئی کے مہینے میں پچیس آدمیوں کو بند کر دیا گیا، ملزموں کو پھانسی اور عمر قید کے علاوہ مشکل ہی سے کوئی اور سزا ملتی تھی۔ قصور میں ستائیس آدمیوں کو پھانسی اور تیرہ کو عمر قید کی سزا ہوئی۔ گوجرانوالہ میں ...... پانچ آدمیوں کو پھانسی اور دس کی حبسِ دوام کی سزا ہوئی۔ حافظ آباد میں چار کو پھانسی اور پندرہ کو حبسِ دوام کی سزا ملی۔ نظام آباد میں چار کو پھانسی اور آٹھ کو عمر قید کی سزا ہوئی۔ امرتسر میں چونتیس کو پھانسی اور پندرہ کو حبسِ دوام کی سزا ملی۔ اسی طرح لاہور اور امرتسر ایسے شہروں سے لے کر چھوٹے چھوٹے قصبات تک میں سزاؤں کی وہ بھرمار ہوئی کہ اس کی مثال پہلے کبھی نہ دیکھی گئی تھی۔

عبدالمجید سالک تحریر کرتے ہیں:

اب پورا ملک بلا امتیاز مذہب وملت احتجاج اور تنفر کا ہنگامہ زار بن رہا تھا۔ مسلمانوں کے دلوں پر جلیانوالہ باغ اور پنجاب کے مظالم سے بھی زیادہ گہرا چرکہ ترکی کی شکست سے لگ چکا تھا جس کی وجہ سے خطرہ تھا کہ ترکانِ آلِ عثمان کی آزادی وخودمختاری خاک میں ملا دی جائے گی۔ خلافتِ اسلامیہ کی مسند کے گرد فرنگی گدھ منڈلا رہے تھے۔

اسی سال کے اواخر میں مولانا محمد علی چار سال کی نظر بندی کاٹ کر جب بحیثیتِ قائدِ تحریکِ خلافت لاہور پہنچے اور اقبال سے ملنے کے لیے انارکلی والے مکان میں گئے۔ اقبال بیٹھک میں دُھسا اوڑھے بیٹھے حقے کے کش لگا رہے تھے۔ مولانا محمد علی سے ان کی خاصی بے تکلفی تھی۔ مولانا محمد علی نے انہیں دیکھتے ہی طنزاً کہا: ظالم! ہم تو تیرے شعر پڑھ کر جیلوں میں چلے جاتے ہیں اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے ہیں لیکن تو ویسے کا ویسا دُھسا اوڑھے حقے کے کش لگاتا رہتا ہے۔ گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔ اقبال نے برجستہ جواب دیا: مولانا میں تو قوم کا قوال ہوں، اگر قوال خود ہی وجد وحال میں شریک ہو کر ہُوحق میں تہ و بالا ہونے لگے تو قوالی ہی ختم ہو جائے۔ بہرحال اقبال نے خلافت کانفرنس کے ایک آدھ جلسے میں شرکت کی اور صوبائی خلافت کمیٹی کے رکن بھی بن گئے۔

دسمبر ۱۹۱۹ء میں خلافت کانفرنس اور کانگرس کے جلسے امرتسر میں ہوئے۔ ان جلسوں میں مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، گاندھی، موتی لعل نہرو اور دیگر بڑے بڑے رہنما بھی شریک

ہوئے۔ اقبال اور مرزا جلال الدین خلافت کانفرنس کے جلسے کی رونق دیکھنے کے لیے نواب سر ذوالفقار علی خان کی موٹر کار میں امرتسر پہنچے۔ جب پنڈال میں داخل ہو کر اقبال، علی برادران سے بغلگیر ہوئے تو جلسہ میں عوام کے جوش و خروش کا عجیب عالم تھا۔ اکثر لوگ رو رہے تھے۔ اس موقع پر دونوں بھائیوں کو مخاطب کرتے ہوئے اقبال نے وہ اشعار جلسے میں پڑھ کر سنائے جو بانگ درا میں ''اسیری'' کے عنوان کے تحت موجود ہیں۔ اور جو اسی روز موٹر کار میں سفر کے دوران موزوں ہوئے تھے۔

دسمبر ۱۹۱۹ء ہی میں اتحادی طاقتوں کے ترکی کے ساتھ نامناسب سلوک پر ایک احتجاجی جلسہ عام سر فضل حسین کی صدارت میں موچی دروازے کے باہر منعقد ہوا۔ اس جلسے میں اقبال نے اکبر الٰہ آبادی کا یہ شعر پڑھ کر قرارداد پیش کی:

جو ہنس رہا ہے وہ ہنس چکے گا، جو رو رہا ہے وہ رو چکے گا
سکونِ دل سے خدا خدا کر، جو ہو رہا ہے وہ ہو چکے گا

مسلمانانِ لاہور اس جلسے میں اُس عظیم پریشانی اور بے چینی کا اظہار کرتے ہیں جو پیرس کی صلح کانفرنس میں اب تک سلطنت عثمانیہ اور خلیفۃ المسلمین کے متعلق قابلِ اطمینان فیصلہ نہ ہونے سے لاحق ہوئی ہے اور حکومت کو وہ وعدے یاد دلاتے ہیں جو مسٹر لائڈ جارج وزیر اعظم برطانیہ نے جنوری ۱۹۱۸ء میں تمام اسلامی دنیا سے سلطنت ترکی کے متعلق کیے تھے اور پیرس کی صلح کانفرنس کے اُصولوں کی طرف توجہ دلاتے ہیں، انہیں اُصولوں پر مسلمان سلطنتوں سے بھی صلح انجام پانی چاہیے اور سلطنتِ عثمانیہ کے کسی حصے پر صراحتاً یا اشارۃً کسی دوسری سلطنت کا قبضہ نہیں ہونا چاہیے۔

قرارداد کی حمایت میں تقریر کرتے ہوئے اقبال نے کہا:

جس قوم نے دنیا میں آزادی اور حریت کی اشاعت کی تھی، آج اُس کی آزادی چھینی جا رہی ہے۔ جب عرب میں نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے، اس وقت دنیا کی کیا کیفیت تھی۔ قسطنطنیہ میں قیصر کی سختی یورپ کی قوموں کا گلا گھونٹ رہی تھی، اس وقت یہ امر واضح کیا گیا کہ خدا کی اطاعت کے سوا اور کسی کی اطاعت نہ کی جائے تمہارا مذہبی عقیدہ ہے کہ انسان کو آزادی ملنی چاہیے...... پریذیڈنٹ ولسن نے چودہ اصول قائم کیے جن کے مطابق عالمگیر جنگ کا فیصلہ کیا جانا تھا۔ ہماری سرکار نے بارہا اس بات کا اعلان کیا کہ ہم حق، انصاف اور صداقت کے لیے لڑ رہے ہیں۔ ہماری جنگ اس لیے ہے کہ بین الاقوامی معاہدے قائم رکھے جائیں ہم بھی

یہی کہتے ہیں کہ ہمارے حقوق کا خیال رکھا جائے اور ان کو پامال نہ کیا جائے۔

اقبال اگرچہ صوبائی خلافت کمیٹی کے رکن تھے لیکن ان کا خلافت کانفرنس کے رہنماؤں سے دو باتوں پر شدید اختلاف ہو گیا۔ اوّل یہ کہ اقبال خلافت وفد کے انگلستان بھیجنے کے حق میں نہ تھے۔ انہوں نے اپنے ایک خط محررہ ۲۷ ستمبر ۱۹۱۹ء میں سید سلیمان ندوی پر واضح کیا کہ واقعات صاف اور نمایاں ہیں، مگر ہندوستان کے سادہ لوح مسلمان نہیں سمجھتے اور لندن میں آغا خان کے اشاروں پر ناچتے چلے جاتے ہیں۔ اقبال نے اپنے اسی خط میں سید سلیمان ندوی کو مندرجہ ذیل اشعار معارف میں اشاعت کے لیے بھیجے اور انہیں لکھا کہ عنوان ان اشعار کا خود تجویز کر لیں اور اگر معارف کے لیے انہیں موزوں نہ سمجھیں تو واپس بھیج دیں:

بہت آزمایا ہے غیروں کو تو نے
مگر آج ہے وقتِ خویش آزمائی
نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا؟
خلافت کی کرنے لگا تو گدائی
خریدیں نہ ہم، جس کو اپنے لہو سے
مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشاہی
مرا از شکستن چنیں عار ناید
کہ از دیگراں خواستن مومیائی

دوم یہ کہ اقبال مسئلہ تحفظِ خلافت پر مسلمانوں کے ہندوؤں کے ساتھ مل کر عدمِ تعاون کی تحریک میں شرکت کے خلاف تھے، انہی اختلافات کی بنا پر اقبال نے صوبائی خلافت کمیٹی کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا اور محمد نیاز الدین خان کو اپنے ایک خط محررہ ۱۱ فروری ۱۹۲۰ء میں واضح کیا:

گرامی صاحب کی خدمت میں السلام علیکم عرض کیجیے۔ سنا ہے وہ مجھ پر ناراض ہیں کہ میں نے خلافت کمیٹی سے کیوں استعفیٰ دے دیا۔ وہ لاہور آئیں تو ان کو حالات سے آگاہ کروں۔ جس طرح یہ کمیٹی قائم کی گئی اور جو کچھ اس کے بعض ممبران کا مقصد تھا، اس کے اعتبار سے تو اس کمیٹی کا وجود میری رائے میں مسلمانوں کے لیے خطرناک تھا۔

اسی زمانے میں اقبال کے بھتیجے شیخ اعجاز احمد نے دیگر نوجوانوں کی طرح تحریکِ خلافت

میں خاصی سرگرمی کے ساتھ حصہ لینا شروع کر دیا۔ ان کے والد نے اقبال سے اس کا ذکر کیا تو جواب میں فرمایا:

اعجاز کو چاہیے کہ پہلے اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے، اس کے بعد ملک کی تحریکوں میں شامل ہو۔ خلافت کا کام کرنے سے میں نہیں روکتا، کیونکہ اس کا سارا دارومدار قلب کی اندرونی کیفیت پر ہے، مگر پہلے اسے اپنے کام میں پختہ ہو جانا چاہیے ...... اس کے علاوہ خلافت کمیٹیوں کے بعض ممبر ہر جگہ قابلِ اعتماد نہیں ہوتے، وہ بظاہر جوشیلے مسلمان ہوتے ہیں لیکن در باطن اخوان الشیاطین ہیں۔ اسی وجہ سے میں نے خلافت کمیٹی کی سیکرٹری شپ سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ اس استعفیٰ کے وجوہ اس قابل نہ تھے کہ پبلک کے سامنے پیش کیے جاتے، لیکن اگر پیش کیے جا سکتے تو لوگوں کو سخت حیرت ہوتی۔

بہرحال مارچ ۱۹۲۰ء میں مولانا محمد علی، سیّد سلیمان ندوی، سیّد حسن، محمد حیات وغیرہ پر مشتمل خلافت وفد لندن پہنچا۔ وفد پیرس بھی گیا لیکن ناکام لوٹا۔ اقبال کو اس کے انجام کا پہلے ہی سے علم تھا۔ اس لیے سید سلیمان ندوی کو تحریر کیا کہ وزارت انگلستان کا جواب وہی ہے، جو ان حالات میں ہمیشہ دیا گیا ہے، **فقالوا انومن لبشرین مثلنا و قومھما لنا عبدون** یہ قرآن مجید کی آیت اس موقع کی ہے، جب فرعون نے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام پر ایمان لانے سے اس لیے انکار کر دیا تھا کہ یہ دونوں عام بشر تھے اور ان کی قوم فرعون کی غلام رعایا میں تھی۔

اندریں حالات جمعیتِ علمائے ہند نے فتویٰ جاری کیا کہ چونکہ ترکی کے ساتھ صلح کی شرائط مسلمانانِ ہند کی خواہشات کے مطابق طے نہیں پائیں، اس لیے ہندوستان دارالحرب بن چکا ہے اور مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ اس ملک سے ہجرت کر کے کسی مسلم ملک میں جا آباد ہوں۔ ۱۹۲۰ء کی گرمیوں میں اعلان کیا گیا کہ مسلمانانِ ہند ہجرت کر کے افغانستان چلے جائیں۔ اس فتویٰ کے زیر اثر ہزاروں کی تعداد میں سندھ، پنجاب اور سرحد کے کاشتکار اپنی اپنی اراضی اور گھر بار نہایت سستے داموں ہندوؤں کے ہاتھ فروخت کر کے اہل و عیال سمیت درۂ خیبر کی طرف بڑھنے لگے۔

اقبال کے بعض خطوط میں ان مہاجرین کی روانگی کے متعلق اشارے ملتے ہیں۔ مثلاً خط بنام گرامی محررہ ۱۲ جولائی ۱۹۲۰ئ:

سندھی مہاجرین کابل کا نظارہ بڑا رقت انگیز تھا۔ لوگ ہزاروں کی تعداد میں ان کے استقبال کو حاضر تھے۔ اہلِ لاہور نے بڑے جوش سے ان کا خیر مقدم کیا۔

خط بنام پروفیسر محمد اکبر منیر محررہ ۱۴ اگست ۱۹۲۰ئ:

ہندوستان اور بالخصوص پنجاب سے بے شمار لوگ (مسلمان) افغانستان کی طرف ہجرت کر رہے ہیں۔ اس وقت تک پندرہ بیس ہزار آدمی اور ممکن ہے کہ زیادہ جا چکا ہوگا۔

لیکن جمعیتِ علمائے ہند کے فتوے بحقِ تحریکِ ہجرت نے برصغیر کے شمال مغربی حصے میں مسلمانوں کے لیے تباہی و بربادی کا سامان پیدا کر دیا۔ اقبال کے تحریکِ ترکِ موالات کے حامی یا مخالف ہونے پر اقبال شناسوں میں اختلاف ہے۔ محمد حنیف شاہد کی تحریر سے یہ تاثر ملتا ہے کہ شاید اقبال تحریک ترکِ موالات کے حامی تھے۔ عبدالسلام خورشید کے نزدیک اگرچہ اقبال کو تحریک ترکِ موالات کے مقاصد سے اتفاق تھا لیکن وہ نہیں چاہتے تھے کہ نہایت محنت سے بنائی ہوئی ایک اسلامی درسگاہ (یعنی اسلامیہ کالج لاہور) اس کی زد میں آ کر برباد ہو جائے۔ سیّد نور محمد قادری کی رائے میں اقبال نہ صرف تحریک ترکِ موالات کے مخالف تھے، اس کے رہنماؤں سے سخت نالاں بھی تھے۔

اقبال کی چند نثری تحریروں سے عیاں ہے کہ وہ خلافت عثمانیہ کے مستقبل کو مخدوش سمجھتے تھے۔ لیکن وہ تحریکِ خلافت کے ذریعے مسلمانانِ ہند کو سیاسی طور پر بیدار ہوتے دیکھ کر خوش ضرور تھے۔ اس سے زیادہ ان کی تحریکِ خلافت میں دلچسپی نہ تھی۔ وہ تحفظِ خلافت کے سلسلے میں خلافت وفد کے یورپ جانے کے خلاف تھے۔ اسی طرح وہ مسلمانوں کے ہندوؤں کے ساتھ تحریکِ موالات میں شریک ہونے پر بھی معترض تھے۔ وہ مسلمانوں کی کسی علیحدہ تنظیم عدم تعاون یا ترک موالات کے حق میں بھی نہ تھے۔ ان کے نزدیک ترکِ موالات کی تحریک میں حصہ لینا مسلمانوں کے لیے شرعی فرض نہ تھا اور طلبہ کا تو ایسی تحریک میں حصہ لینا قطعاً غیر شرعی تھا۔

تحریکِ ترکِ موالات کا ایک پہلو انگریزی حکومت سے زرِ امداد لینے والے تعلیمی اداروں کا مقاطعہ تھا۔ تحریک کے زور میں آتے ہی مولانا محمد علی وغیرہ نے علی گڑھ یونیورسٹی کے طلبہ کی بڑی تعداد کو توڑ کر آزاد قومی یونیورسٹی یا جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد ڈالی۔ ۲۲ نومبر ۱۹۲۰ء کو مولانا محمد علی نے تجویز پیش کی کہ اقبال سے نئی یونیورسٹی میں عہدۂ پرنسپل قبول کرنے کی درخواست کی

جائے اور اخبارات میں خبر شائع کرا دی۔ یہ خبر پڑھ کر اقبال کو سخت ذہنی کوفت ہوئی، جس کا اظہار انہوں نے اپنے ایک خط محررہ ۲۸ اکتوبر ۱۹۲۰ء بنام محمد نیاز الدین خان میں یوں کیا:

علی گڑھ سے ابھی تک کوئی خبر نہیں آئی۔ میری تو یہی رائے ہے کہ گرانٹ اور الحاق کے بارے میں جو فتویٰ علماء کا ہو، اس پر عمل کرنا چاہیے، چونکہ واجب اطاعت امام اس وقت موجود نہیں، اس لیے جمہور مشاہیر علمائے ہند کا فتویٰ ضروری ہوگا۔ صرف ایک عالم کا فتویٰ اس بارے میں کافی نہیں خواہ وہ صحیح ہی کیوں نہ ہو۔ باقی رہا میرا ان لوگوں سے ہم خیال ہونا، ہم خیالی صرف اسی حد تک ہے جس حد تک قرآن کا حکم ہو اور بس۔ اخباروں میں انہوں نے شائع کیا ہے کہ اقبال نے قومی آزاد یونیورسٹی سے متعلق مدد دینے کا وعدہ کیا ہے۔ واقعات کی رو سے یہ بات بالکل غلط ہے۔ اس خیال سے کہ علی گڑھ میں اس بیان سے لوگ دھوکا نہ کھائیں میں نے ایک تار آنریری سیکرٹری کو دیا ہے کہ یہ بات صحیح نہیں ہے، جو اخبارات میں شائع ہوئی ہے۔

اسی اثنا میں مولانا محمد علی وغیرہ کے ایماء پر گاندھی نے اقبال کو ایک خط تحریر کیا، جس میں لکھا:

مسلم نیشنل یونیورسٹی آپ کو آواز دے رہی ہے۔ اگر آپ اس کا چارج لے سکیں تو مجھے یقین ہے کہ وہ آپ کی صحیح رہنمائی میں ترقی کر سکے گی۔ حکیم اجمل خان، ڈاکٹر انصاری اور علی برادران کی یہی خواہش ہے اور میری بھی خواہش ہے کہ آپ قبول یابی کا کوئی رستہ نکالیں۔ نئی بیداری کے تقاضوں کے بقدر آپ کے اخراجات کی کفالت کی جا سکے گی۔ براہ کرم پنڈت نہرو (موتی لعل) کی معرفت الہ آباد کے پتے پر جواب دیجئے۔

اقبال نے اپنے خط محررہ ۲۹ نومبر ۱۹۲۰ء میں گاندھی کو جواب دیا:

...... مجھے بے حد افسوس ہے کہ بعض وجوہ کی بنا پر، جن کا ذکر اس وقت ضروری نہیں، اُن حضرات کی آواز پر، جن کی میرے دل میں بڑی عزت ہے، لبیک کہنا میرے لیے مشکل ہے۔ مزید یہ کہ فطری طور پر میں پرسکون حالات ہی میں کام کر سکتا ہوں، بنیادی طور پر مسلمانوں کو ادب و فلسفہ کی نہیں ٹکنیکاتی تعلیم کی ضرورت ہے ...... جن حضرات نے جامعہ ملیہ قائم کی ہے، انہیں چاہیے کہ اس نئے ادارے میں خصوصی طور پر طبعی علوم کے ٹکنیکاتی پہلو پر زور دیں اور اس کے ساتھ ساتھ مذہبی تعلیم کا بھی انتظام کریں۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ میں شریعت کا ماہر نہیں ہوں، لیکن میرا عقیدہ ہے کہ جہاں تک تعلیم کا سوال ہے، موجودہ مجبوریوں کے باوجود فقہ اسلامی ہماری مناسب رہنمائی کرنے سے معذور نہیں۔

علی گڑھ میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد مولانا محمد علی اور دیگر رہنما انجمن حمایت اسلام کے ارباب بست و کشاد سے ملاقات کی خاطر لاہور پہنچے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح اسلامیہ کالج لاہور کے اساتذہ اور طلبہ کو ترک موالات کی تحریک میں شمولیت کے لیے آمادہ کیا جائے۔ اقبال ۳۱ مارچ ۱۹۲۰ء سے انجمن کے آنریری جنرل سیکرٹری کے عہدہ پر فائز تھے۔ مولانا محمد علی انجمن کے ٹرسٹیوں اور اقبال سے ملے، لیکن اقبال نے ان سے اتفاق نہ کیا۔ انجمن کی مجلس عاملہ کا ایک اجلاس ۱۴ نومبر ۱۹۲۰ء کو زیر صدارت نواب سر ذوالفقار علی خان منعقد ہوا، جس میں اقبال نے تقریر کرتے ہوئے کہا:

مسٹر محمد علی، مسٹر شوکت علی، مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے اصحاب لاہور آئے ہوئے ہیں۔ ان کے خیالات سننے کے لیے ارکانِ انجمن کے دو جلسے ہو چکے ہیں۔ اسلامیہ کالج میں جو جلسہ ہوا تھا اس میں مجلس عاملہ نے انجمن کے غور و فکر کے لیے ذیل کی دو تجاویز پیش کیں:

۱۔ اسلامیہ کالج اور اسکولوں کے لیے حکومت سے جو سالانہ عطیات اور امدادی رقوم لی جاتی ہیں، انہیں ترک کر دیا جائے۔

۲۔ اگر اسلامیہ کالج کے طلبہ کی اکثریت موجودہ نظام تعلیم پر عدم اطمینان کا اظہار کرے تو کالج کا رشتہ الحاق پنجاب یونیورسٹی سے منقطع کر لیا جائے۔

حامیان ترکِ موالات نے (حکومت کی مالی امداد کی بجائے) انجمن کو سالانہ گیارہ ہزار روپے کی رقم دینے کا وعدہ کیا ہے، نیز خطوط موصول ہوئے ہیں، جن میں اسلامیہ کالج کو یونیورسٹی سے علیحدہ کر لینے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔

ان ایّام میں اقبال نے زمیندار میں ایک مضمون بھی لکھا تھا، جس میں زیر بحث موضوع کے متعلق علمائے کرام کو ایک مقام پر جمع کرنے اور ان سے فتویٰ لینے کے اُصول اور طریقوں کی وضاحت کی تھی۔ اس سلسلے میں چند فتوے شائع ہو چکے تھے۔ اقبال نے تقریر میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:

میرا عقیدہ یہ ہے کہ انجمن الحاق اور حکومت سے امداد لینے کے مسائل کا فیصلہ مذہبی علماء سے مشورہ لیے بغیر اور دینی احکام معلوم کیے بغیر نہیں کر سکتی۔

لیکن اقبال کی تجویز منظور نہ ہوئی۔ اس کے بعد سر فضل حسین کی طرف سے جو اسلامیہ کالج کے سیکرٹری تھے، تجویز پیش کی گئی کہ اسلامیہ کالج اور اسکول بدستور پنجاب یونیورسٹی سے

ملحق رہیں۔چھبیس ارکان نے اس تجویز کے حق میں ووٹ دیئے۔اقبال اور پندرہ دیگر ارکان نے ووٹ دینے میں حصہ نہ لیا، پھر بھی زمیندار نے یہ غلط خبر شائع کر دی کہ اقبال اور چند دوسرے اصحاب نے تجویز کی مخالفت کی ہے اس پر اقبال نے زمیندار میں اپنے ایک خط محررہ ۱۵ نومبر ۱۹۲۰ء میں واضح کیا:

آج کے زمیندار میں جنرل کونسل انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسہ منعقدہ ۱۴ نومبر ۱۹۲۰ء کی کارروائی پر آپ نے جو کچھ لکھا ہے، اس میں ایک آدھ فروگذاشت ہوگئی ہے جس کا ازالہ عام مسلمانوں کی آگاہی کے لیے ضروری ہے......ارکان کونسل کے سامنے تین تجویزیں تھیں:

۱۔ اسلامیہ کالج کا الحاق پنجاب یونیورسٹی سے جاری رکھا جائے۔محرک، میاں فضل حسین صاحب سیکرٹری کالج۔

۲۔ انجمنِ حمایتِ اسلام لاہور اپنے طور پر علمائے پنجاب و ہندوستان کی ایک کانفرنس کرے، جس میں حالات حاضرہ سے واقف کار لوگ بطورِ مشیر کام کریں تا کہ حضرات علماء مسائل متنازعہ فیہ کے ہر پہلو پر پوری بحث و تمحیص کے بعد نتائج پر پہنچیں۔علماء کی اس بحث میں مشیروں کو رائے دینے کا کوئی حق نہ ہوگا اور فیصلہ کثرت آراء سے ہوگا۔اختتام کانفرنس تک اسلامیہ کالج کا الحاق یونیورسٹی سے قائم رہے۔محرک، مولوی ابراہیم سیالکوٹی۔

۳۔ جمعیت علماء کا اجلاس دہلی میں عنقریب ہونے والا ہے۔ان کے فتوے کا انتظار کیا جائے اور چند حضرات، انجمن کی طرف سے بطور وفد اس جلسے کے بحث مباحثے میں شریک ہوں۔ محرک، ڈاکٹر کچلو۔

......تجویز اوّل پر ووٹ لیے گئے، جن کا نتیجہ یہ ہے کہ کثرتِ آرا میاں فضل حسین کی تجویز کے حق میں تھی......خاکسار......(نے) ووٹ دینے سے اس بنا پر انکار کیا کہ......معاملہ زیر بحث کا ایک نہایت اہم مذہبی پہلو ہے، جس کا فیصلہ علماء سے استفتا کیے بغیر ایک ایسی انجمن کے لیے ناممکن ہے جو انجمن حمایت اسلام کے نام سے موسوم ہے، پہلی تجویز کے فیصلہ ہو جانے پر باقی دو تجاویز پر ووٹ لینا ضروری نہ سمجھا گیا......ممبران میں سے بعض ڈاکٹر کچلو کی تجویز کے موید تھے اور بعض مولوی ابراہیم صاحب کی تجویز کے مویّد تھے۔میری رائے یہ تھی کہ مولوی ابراہیم صاحب کی تجویز کے مطابق انجمن خود علماء کی ایک کانفرنس مدعو کرے تا کہ اس نازک مسئلے کے ہر پہلو پر پوری بحث ہو سکے؛ جو فتوے دفتر انجمن میں موصول ہوئے ہیں ان کو حضرات علماء سے فرداً فرداً حاصل کیا گیا ہے اور نیز بعض نہایت ضروری سوالات ان سے پوچھے ہی نہیں گئے......

اس وقت مسلمانوں کی بدنصیبی سے ایک ملک میں یا اور اسلامی ممالک میں کوئی واجب الطاعۃ امام موجود نہیں۔ فی الحال تو میرے نزدیک یہی راہ کھلی ہے اور یہی راہ شریعت کی رو سے بھی انسب و اولیٰ ہے کہ حضرات علماء ایک جگہ جمع ہو کر ہر قسم کا اعتراض سننے اور پورے بحث و مباحثے کے بعد مسلمانوں کے لیے ترکِ موالات کا ایک پروگرام مرتب کریں میں مولوی ابراہیم صاحب کی تجویز کی اس بنا پر تائید کرتا ہوں کہ کوئی، شائبہ بھی کسی قسم کے شک و ظن کا نہ رہے اور ایک ایسی کانفرنس قائم کی جائے، جس کا فتویٰ ہر خیال کے مسلمانوں کے لیے حجت ہو اور کسی بھی قسم کے اعتراض کی گنجایش نہ رہے۔ قومی زندگی کی کوئی حالت ایسی نہیں جس پر فقہاے اسلام نے حیرت انگیز چھان بین نہ کی ہو۔ اگر مسلمان اس خدا کے دیے ہوئے قانون سے فائدہ نہ اٹھائیں تو ان کی بدنصیبی ہے...... مسلمانوں کے لیے نہ مسٹر گاندھی کی زندگی اسوۂ حسنہ ہے، نہ کسی انسان کا بنایا ہوا ہدایت نامہ ان کے لیے دلیل راہ ہو سکتا ہے۔ ان کے ہر فعل کے لیے خواہ انفرادی ہو، خواہ اجتماعی، کتاب اللہ اور رسول ﷺ کے عمل میں نظام کار تلاش کرنا چاہیے وہ سیاست جو مذہب سے معرا ہو، ضلالت و گمراہی ہے اور وہ مذہب جو اپنے احکام میں تمام ضروریات انسانی کو ملحوظ نہیں رکھتا، ایک قسم کی ناقص رہبانیت ہے۔

اگر اقبال کی تجویز منظور کر لی جاتی اور برصغیر کے مختلف مکتبہ ہائے فکر کے علماے کرام کی کانفرنس منعقد کرانے کا اہتمام ہو جاتا تو متنازع فیہ مسائل کے حل کے علاوہ مستقبل کے لیے ایک مستقل اجماع کی مثال قائم ہو جاتی، مگر اس جوش و خروش کے زمانے میں علماے کرام اور مسلم سیاسی رہنماؤں میں سے کسی نے بھی اقبال کا ساتھ نہ دیا۔ اسی صورتحال کے پیش نظر اقبال نے اپنے ایک خط بنام محمد نیاز الدین خان محررہ ۳ دسمبر ۱۹۲۰ء میں فرمایا:

امید کہ عوام کی حالتِ جنوں اب زیادہ دیر تک نہ رہے گی۔ تعلیم میں عدم تعاون کرنے کا یہ طریقہ نہ تھا جو بعض لوگوں نے اختیار کر رکھا ہے۔ اگر عدم تعاون کو شرعی فرض بھی تسلیم کر لیا جائے تو طریق کار میرے نزدیک شریعت اسلامیہ کی سپرٹ کے مخالف ہے۔

اقبال سے ملاقات اور ان کے اختلاف کی جو روداد مولانا محمد علی نے تحریر کی، اس میں مایوسی اور طنز کے جذبات نمایاں تھے۔ بیان کرتے ہیں:

ہم لاہور پہنچے اور اسلامیہ کالج کے ٹرسٹیوں اور اساتذہ کو دعوت الی الخیر دی، تو ان کو علی گڑھ کالج کے ٹرسٹیوں اور اساتذہ سے بھی زیادہ مستعد پایا اور اس سے اندازہ کیا کہ طلبہ کس قدر مستعد ہوں گے، مگر ڈاکٹر محمد اقبال صاحب سیکرٹری تھے اور آپ نے جن سے ہم نے اسلام سیکھا تھا

(نہ کہ کسی مولوی سے)، ہماری دعوت کو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ پہلے علمائے کرام کا فتویٰ لیا جائے۔ خیر پانچ سو علماء نے بھی چند ماہ بعد فتویٰ صادر فرما دیا، مگر ڈاکٹر اقبال نے اس پر بھی توجہ نہیں فرمائی، البتہ اجتہاد فرمایا تو علم الاقتصاد کے ماہر کی حیثیت سے، اس وقت جبکہ مہاتما گاندھی ایک کروڑ روپیہ جمع کر لائے اور وہ اجتہاد یہ تھا کہ اس سے ٹیکنالوجیکل (صنعتی) انسٹی ٹیوٹ کا افتتاح کیا جائے۔

مولانا محمد علی کی روداد میں جو گاندھی کے ایک کروڑ روپیہ جمع کر لینے کا ذکر ہے، وہ روپیہ اگرچہ مسلمانوں نے دیا تھا، لیکن کانگرس کو ملک گیر بنانے پر صرف ہوا۔ اس سلسلے میں سید عابد حسین تحریر کرتے ہیں:

یہ رقم جو یوں خاصی بڑی معلوم ہوتی ہے مگر سارے ہندوستان پر پھیلائی جائے تو کچھ ایسی بڑی نہیں، مدرسوں کے لیے استعمال ہوئی، قومی یونیورسٹیوں اور دیہی صنعتوں خصوصاً کھدر کو فروغ دینے میں، اُچھوتوں کے کام اور دوسری تعمیری تجاویز کے سلسلے میں، اس میں سے بہت سی رقم تو پہلے مختلف کاموں کے لیے مخصوص تھی اور یہ فنڈ اب تک موجود ہیں اور ان مخصوص اغراض میں کام آ رہے ہیں۔ باقی حصہ مقامی کمیٹیوں کے سپرد کر دیا گیا ہے اور کانگرس کے تنظیمی اور سیاسی کام میں صرف ہوا۔ تحریکِ ترکِ موالات کے مصارف اس سے پہلے اور چند سال دور تک کانگرس کا کام بھی اسی روپیہ سے چلا۔

تحریکِ ترکِ موالات میں طلبہ پیش پیش تھے۔ علی گڑھ کالج میں گڑبڑ ہوئی اور اسلامیہ کالج لاہور میں تو ہنگامے انتہا کو پہنچ گئے۔ توڑ پھوڑ کے سبب کالج کچھ مدت کے لیے بند کرنا پڑا، لیکن اقبال نے اسلامیہ کالج کو تحریکِ ترکِ موالات کی لپیٹ میں آ کر مکمل طور پر تباہ ہونے سے بچا لیا۔ مسلم تعلیم کو عدم تعاون کی تحریک سے علیحدہ رکھنے کی وجہ دراصل یہ تھی کہ اس زمانہ میں خالصتاً مسلم درسگاہیں صرف تین تھیں۔ علی گڑھ کالج، اسلامیہ کالج لاہور اور اسلامیہ کالج پشاور۔ اقبال کو یقین تھا کہ اگر مسلم درس گاہیں عدم تعاون کی لپیٹ میں آ گئیں تو مسلمانوں کی تعلیمی حالت اور بھی ناگفتہ بہ ہو جائے گی۔ اس زمانے میں تعلیمی معاملے میں مسلمانوں کے اعداد و شمار کے متعلق علی گڑھ کے سید سلیمان اشرف تحریر کرتے ہیں:

سارے ہندوستان میں مسلمانوں کے صرف تین کالج ہیں۔ علی گڑھ لاہور اور پشاور میں اس وقت ہندوستان میں مجموعی تعداد کالجوں کی ایک سو پچیس ہے۔ تین مسلمانوں کے اور ایک سو

بائیس ہندوؤں کے ان میں سے اگر سرکاری کالجوں کو جن کی تعداد چونتیس ہے، الگ کر دیجیے، جب بھی اٹھاسی کالج ہندوؤں کے رہ جاتے ہیں۔ ان میں سے بائیس کالج ایسے ہیں جن میں گورنمنٹ کی امداد قطعاً شامل نہیں اور چھیاسٹھ کالج ایسے ہیں، جن میں گورنمنٹ کی امداد جاری ہے۔ تین اور اٹھاسی کی نسبت ذرا غور سے ملاحظہ کیجیے تو پھر تعلیم کو ملیا میٹ کر دینے کا فیصلہ کیجیے۔ سارے کالجوں میں مجموعی تعداد ہندوستانی طلبہ کی چھیالیس ہزار چار سو سینتیس ہے، جن میں سے مسلم طلبہ چار ہزار چار سو پچھتّر ہیں۔ ہندو طلبہ کی تعداد اکیالیس ہزار پانچ سو باسٹھ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہندو چوبیس کروڑ اور مسلمان سات کروڑ ہیں۔ اس تناسب سے، جب کہ مسلمانوں کے تین کالج تھے، ہندوؤں کے بارہ ہوتے۔ مسلمان طلبہ کی تعداد کالج میں چار ہزار تھی تو ہندو سولہ ہزار ہوتے، لیکن جبکہ واقعہ نمونہ عبرت پیش کر رہا ہو تو مسئلہ تعلیم کو تہ و بالا کرنے میں کس کا نقصان ہے۔

جون ۱۹۲۱ء میں اقبال زندگی میں پہلی مرتبہ کسی مقدمے کے سلسلے میں کشمیر گئے۔ مولوی احمد دین ایڈووکیٹ اور منشی طاہرالدین ان کے ہمراہ تھے وہ تقریباً دو ہفتے تک سری نگر میں ٹھہرے اور ہاؤس بوٹ میں قیام کیا۔ مقدمہ ڈسٹرکٹ جج کی عدالت میں تھا، لیکن اس کا فیصلہ حسبِ منشا نہ ہوا۔ سری نگر میں قیام کے دوران میں اقبال کو ایک اور مقدمہ بھی ملا۔ یہ سری نگر کے ایک رحمان راہ کا تھا جو قتل کے الزام میں گرفتار ہوا تھا۔ اقبال کی بحث سے وہ پھانسی سے تو بچ گیا مگر اسے قید کی سزا ہوگئی۔ قانونی کاموں سے فراغت کے بعد اقبال شکارے میں بیٹھ کر ڈل کی سیر کو جاتے اور احباب کے ہمراہ نشاط باغ اور شالا مار باغ میں دن گزارتے۔ ''ساقی نامہ'' جو بعد میں پیام مشرق کی زینت بنا، انہوں نے نشاط باغ ہی میں بیٹھ کر لکھا تھا۔ ایک شام شکارے میں بیٹھے ڈل کی سیر سے واپس آ رہے تھے، صاحبزادہ محمد عمران کے ہمراہ تھے۔ وہ تحریر کرتے ہیں:

> دونوں وقت مل رہے تھے کہ شکارہ (ہلکی کشتی) اس انجمنِ ادب کو لیے ڈل میں پہنچ گیا، اس کیف آور منظر نے عجیب کیفیت پیدا کر رکھی تھی، جس نے علامہ ممدوح کے دل پر خاص اثر کیا۔ تھوڑی دیر صحیفہ قدرت کے اس سنہری ورق کا مطالعہ کرنے کے بعد خلاقِ معانی بحرِ فکر میں غوطہ زن ہوئے اور دو دُرِ شہوار نکال لائے۔ نقاشِ فطرت کی قدرت دیکھنا، دو شعروں میں سارے منظر کی تصویر کھینچ دی ہے:

تماشائے ڈل کن کہ ہنگام شام
دہد شعلہ را آشیاں زیر آب
بشوید ز تن تا غبار سفر!
زند غوطہ در آب ڈل آفتاب

تحریکِ ترکِ موالات سال بھر سے جاری تھی لیکن عوام کے جوش و خروش کے ٹھنڈا پڑنے کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ اسی اثنا میں بعض تعاون پسند مسلم قائدین نے سوچا کہ خلافت کانفرنس نے کانگرس سے اتحاد کر کے مسلم لیگ کی اہمیت ختم کر دی ہے لہٰذا اسے از سر نو زندہ کر کے مسلمانوں کو احتجاجی سیاست سے نکال کر آئینی سیاست کی طرف آنے کی ترغیب دینا چاہیے، چنانچہ آغا خان ایک طرف تو تحفظِ خلافت کی حمایت میں بیانات دینے لگے اور دوسری طرف محمد علی جناح کے ذریعے مسلم لیگ کے احیاء کی کوششیں تیز تر کر دیں۔ اقبال نے اس محکومانہ سیاسی حکمت عملی کو تحسین کی نگاہ سے نہ دیکھا اور ''صدائے لیگ'' کے عنوان سے چند اشعار میں، جو زمیندار ۹ نومبر ۱۹۲۱ء میں شائع ہوئے آغا خان اور محمد علی جناح دونوں کو اپنی طنز کا نشانہ بنایا:

لندن کے چرخِ نادرہ فن سے پہاڑ پر
اُترے مسیح بن کے محمد علی جناح
نکلے گی تن سے تو کہ رہے گی، بتا ہمیں
اے جان بر لب آمدہ اب تیری کیا صلاح
دل سے خیالِ دشت و بیاباں نکال دے
مجنوں کے واسطے ہے یہی جادۂ فلاح
آغا امام اور محمد علی ہے باب
اس دین میں ہے ترکِ سواد حرم مباح
''بشریٰ لکم'' کہ منتظر ما رسیدہ است
یعنی حجابِ غیبتِ کبریٰ دریدہ است

اقبال کے بیشتر سوانح نگار یہی سمجھتے ہیں کہ اقبال نے اس عہد کی پر شور سیاست کے سبب

کنارہ کشی اختیار کر لی تھی اور اس کے ہنگاموں سے الگ تھلگ پیام مشرق کی ترتیب میں مصروف رہے۔ لیکن اقبال کی لاتعلقی یا خانہ نشینی کا اصل سبب عالمِ تنہائی تھا اور وہ کسی ایسے ہمدم یا رفیق کے لیے ترستے تھے جو ان کا ہم خیال ہو۔ اس نوع کی تنہائی کا احساس انہیں چند برسوں سے لگاتار ہو رہا تھا جیسا کہ اسرار خودی کے آخر میں دعائیہ اشعار سے ظاہر ہے:

یا مرا یک ہمدم دیرینہ دہ
عشق عالم سوز را آئینہ دہ
من مثالِ لالۂ صحرا ستم
درمیانِ محفلے تنہا ستم
خواہم از لطفِ تو یارے ہمدمے
از رموزِ فطرتِ من محرمے

۱۹۲۲ء کے اوائل میں معاہدۂ سیورے کی رو سے مقاماتِ مقدسہ فلسطین و شام کے تنازعات کا فیصلہ کرنے کے لیے حکومت برطانیہ نے ایک ایسا کمیشن مقرر کرنے کا ارادہ کیا، جو مسلم، عیسائی اور یہودی اراکین پر مشتمل ہونا تھا۔ خیال تھا کہ اس کمیشن کے اجلاس یروشلم میں منعقد ہوں گے اور یہ سلسلہ دو تین برس تک جاری رہے گا۔ انگریزی حکومت نے اقبال سے دریافت کیا کہ آیا وہ اس کمیشن کا رکن بننا قبول کریں گے۔ لیکن اقبال نے انکار کر دیا بعد میں حالات نے ایسی صورت اختیار کی کہ یہ کمیشن بن ہی نہ سکا۔

اقبال نے انجمن حمایت اسلام کے ۱۹۲۰ء کے سالانہ جلسے میں دو ایک چھوٹی نظمیں، ''ارتقا'' اور ''مردِ آزاد'' کے عنوان سے پڑھیں۔ چونکہ ترکِ موالات کی تحریک زوروں پر تھی، اس لیے کوئی مستقل نظم تحریر نہ کی۔ البتہ انجمن کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۶ اپریل ۱۹۲۲ء میں انہوں نے اپنی مشہور نظم ''خضر راہ''، کوئی بیس ہزار کے مجمع کے سامنے پڑھی۔ اقبال کو ان دنوں نہ صرف تنہائی کا شدید احساس تھا بلکہ بیمار بھی تھے۔ اس لیے نظم کے انداز بیان نے سامعین کو رُلا دیا۔ نظم پڑھتے ہوئے اقبال نے یہ شعر پڑھا تو رو پڑے:

بیچتا ہے ہاشمی ناموس دین مصطفی
خاک و خوں میں مل رہا ہے ترکمانِ سخت کوش

اور جب اس شعر پر پہنچے تو خود بھی رو رہے تھے اور سارا مجمع بھی اشکبار تھا:

ہو گیا مانندِ آب ارزاں مسلماں کا لہو
مضطرب ہے تو کہ تیرا دل نہیں دانائے راز

نظم ''خضر راہ'' کے متعلق بعض باتیں غور طلب ہیں۔ پہلی یہ کہ جن دنوں اقبال نے یہ نظم لکھنا شروع کی، ان پر نقرس کے مرض کا شدید حملہ ہوا اور انہوں نے کئی راتیں لگاتار بیداری کے عالم میں گزاریں۔ وہ انارکلی والے مکان کی بیٹھک سے ملحقہ کمرے میں اٹھ آئے تھے اور رات کو عموماً علی بخش ان کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ ایک شب درد کی شدت کے سبب ان پر نیم بیہوشی کی کیفیت طاری ہوگئی۔ اس کیفیت میں انہیں محسوس ہوا، گویا کوئی مرد بزرگ ان کے پاس بیٹھا ہے۔ اقبال اس مرد بزرگ سے سوال پوچھتے ہیں اور وہ ان کے ہر سوال کا جواب دیتا جاتا ہے۔ کچھ دیر کے بعد وہ مرد بزرگ اٹھتا ہے اور چل دیتا ہے۔ اس کے رخصت ہونے کے فوراً بعد اقبال نے علی بخش کو آواز دے کر بلایا اور اس مرد بزرگ کے پیچھے دوڑایا تاکہ اسے واپس لے آئے۔ علی بخش کا بیان ہے کہ وہ بیٹھک کے فرش پر لیٹا اس وقت جاگ رہا تھا اور اقبال کو تنہائی میں کسی کے ساتھ باتیں کرتے سن رہا تھا۔ رات کے تقریباً تین بجے تھے۔ علی بخش تعمیل حکم میں پھرتی سے سیڑھیاں اترا لیکن نچلے دروازے کو اندر سے مقفل پایا۔ دروازہ کھول کر بازار میں نکلا مگر ہو کا عالم طاری تھا، اور بازار کے دونوں طرف دور دور تک اسے کوئی بھی شخص دکھائی نہ دیا۔ سو ظاہر ہے کہ نظم تحریر کرتے وقت کسی مرحلے پر اقبال حالتِ سکر سے گزرے، کیونکہ وہ بیمار تھے اور شدتِ درد کا وہ عالم تھا کہ شعوری طور پر اس پر غالب آنا یا حالتِ صحو برقرار رکھنا غالباً ان کے لیے ممکن نہ رہا تھا۔ اس کے علاوہ شدید تنہائی اور ہر طرف سے مخالفت کے سبب انہیں شاید اپنے آپ پر اعتماد نہ رہا تھا اور ان کے دل میں یہ احساس پیدا ہو گیا تھا کہ ان کا مؤقف غلط ہے یا وہ صحیح راہ سے بھٹک گئے ہیں، اور انہیں راستہ دکھانے کے لیے کسی رہبر کی ضرورت ہے۔

دوسری یہ کہ نظم اسلوب اور انداز کے اعتبار سے اقبال کی دیگر نظموں میں منفرد ہے جلسے میں یہ نظم پڑھی گئی تو عبدالمجید سالک سامعین میں موجود تھے، وہ تحریر کرتے ہیں۔

ایک تو اس نظم میں اقبال کے شاعرانہ تخیل اور بدیع اسلوب کا جمال پوری تابانیوں کے ساتھ جلوہ گر تھا اور ایک ایک شعر پر اربابِ ذوقِ سلیم وجد کر رہے تھے، دوسرے اس میں علامہ نے جنگِ عظیم کے سلسلے میں فاتح اقوام کی دھاندلی، ان کی ابلیسانہ سیاست، سرمایہ داری کی عیاری، مزدور کی بیداری، عالمِ اسلام خصوصاً ترکانِ آلِ عثمان کی بے دست و پائی پر مؤثر اور بلیغ تبصرہ کیا

ہے اور اسی سلسلے میں نسلی قومیّت اور امتیازِ رنگ وخون کے خیالات پر بھر پور چوٹ کی ہے۔اس دور میں ترکی موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا تھا اور ہندوستان کے مسلمان جوش وخروش کے عالم میں ایک ایسی جنگ لڑ رہے تھے جس کا انجام انہیں معلوم نہ تھا۔

تیسری یہ کہ نظم کے متعلق گرامی نے اعتراض کیا کہ اس کے تمام اشعار بے لطف ہیں اور بعض غلط۔اس پر اقبال نے انہیں اپنے ایک خط محررہ ۱۶ مئی ۱۹۲۲ء میں جو جواب دیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کو خضر کی شخصیت سے شناسائی کا ذاتی تجربہ تھا، فرماتے ہیں:

آپ کے اعتراض کا پہلا حصہ صحیح ہے، مگر یہ اعتراض گرامی کے شایانِ شان نہیں۔آپ کو معلوم ہے کہ اس نظم کا بیشتر حصہ خضر کی زبان سے ادا ہوا ہے اور خضر کی شخصیت ایک خاص قسم کی شخصیت ہے۔ وہ عمرِ دوام کی وجہ سے سب سے زیادہ تجربہ کار آدمی ہے اور تجربہ کار آدمی کا یہ خاصہ ہے کہ اس کی قوتِ متخیّلہ کم ہوتی ہے اور اس کی نظر حقائق واقعی پر جمی رہتی ہے۔خضر کی طرف جو کلام منسوب کیا جائے اس میں رنگینی پیدا کی جا سکتی ہے، مگر وہ خضر کا کلام نہ رہے گا، بلکہ نظیریؔ یا عرفیؔ کا کلام ہوگا اور بالغ نظر اہل فن تخیل کی اس رنگینی کو بہ نگاہ استحسان نہ دیکھیں گے۔ان رموز اور اسرار کو آپ سے بہتر کون جانتا ہے۔

چوتھی یہ کہ اس نظم میں اقبال نے پہلی بار مغربی سرمایہ دارانہ نظام کے استحصال کے مقابلے میں مزدوروں کی بیداری کا ذکر کیا، جس سے ظاہر ہے کہ وہ انقلاب روس کی حقیقت کو نظر انداز نہ کر سکتے تھے۔اقبال کی نگاہ میں انقلابِ روس، یورپ کی نوآبادیاتی طاقتوں کی عیاری، جنگِ زرگری، استحصال اور استعمار کا لازمی ردعمل تھا۔ اور اس میں دنیا بھر کے پسماندہ انسانوں کے لیے جو پیغام مخفی تھا، اس نے اقبال کے ذہن میں ایک اہم سوال اٹھایا تھا کہ اسلام کا معاشی نظام کیا ہے؟ یا اسلام نے مساوات کا جو تصور دیا ہے، اسے مادی اعتبار سے عملی طور پر ایک جدید مسلم معاشرے میں کیونکر نافذ کیا جا سکتا ہے؟ اقبال کو یقین تھا کہ اگر اس سوال کا جواب نہ ڈھونڈا گیا اور مسلم اقوام مغرب کی اندھا دھند تقلید میں مصروف رہیں تو ایک نہ ایک دن وہ سب بھی اسی قسم کے انقلاب کی لپیٹ میں آ جائیں گی اور اسلام کا نام ونشان صفحہ ہستی سے مٹ جائے گا۔

مئی ۱۹۲۲ء میں لاہور کے شاہ عالمی دروازے کے باہر ہندوؤں نے ایک مندر تعمیر کیا۔ مسلمانوں نے مطالبہ کیا کہ مندر کے ساتھ مسجد بھی بننی چاہیے۔ یہ مطالبہ سارے لاہور شہر میں آگ کی طرح پھیل گیا۔ جوش وخروش اور ہندو مسلم اتحاد کا زمانہ تھا۔سیکڑوں مسلمانوں نے مندر

کے ساتھ بلدیہ لاہور کے ملکیتی ایک قطعہ اراضی پر نمازِ عشا کے بعد عمارتی مسالہ اکٹھا کیا اور بنیادوں کی کھدائی اور تعمیر کے کام میں مصروف ہو گئے، یہاں تک کہ صبح ہونے تک انہوں نے دو دکانیں اور اس کے اوپر مسجد کی عمارت مکمل کر دی۔ اقبال نے مسلمانوں کے اس جذبۂ دینی سے متاثر ہو کر چند اشعار کہے جو بانگِ درا کے آخر میں درج ہیں۔ پہلا شعر یہ ہے:

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا

دسمبر ۱۹۲۲ء میں اقبال انارکلی والا مکان چھوڑ کر میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں آ گئے۔ یہ کوٹھی ایک سو ستر روپے ماہوار کرایہ پر لی گئی تھی اور کسی ہندو بیوہ کی ملکیت تھی۔ ساز و سامان کے ساتھ کبوتر بھی کوٹھی میں منتقل ہوئے۔ اقبال کھانا کم مگر ذائقے میں اچھا پسند کرتے تھے۔ شادیوں سے قبل تو علی بخش ہی سودا سلف لاتا اور ان کے لیے کھانا پکاتا لیکن بعد میں گھر بھر کا کھانا سردار بیگم پکاتیں اور ان کی مدد اقبال کی بھتیجیاں یا ایک ملازمہ کرتی تھیں، اقبال پلاؤ، دہی، شامی کباب، قورمہ، زردہ اور فرنی بڑے شوق سے کھاتے۔ سالن عموماً خمیری روٹی کے ساتھ کھایا کرتے۔ پھلوں میں سردا اور آم انہیں خاص طور سے مرغوب تھے۔ ایک مرتبہ انہیں اکبر الہ آبادی نے لنگڑے آموں کی پیٹی بھیجی۔ اقبال نے رسید میں یہ شعر لکھا:

اثر یہ تیرے اعجاز مسیحائی کا ہے اکبر!
الہ آباد سے لنگڑا چلا لاہور تک پہنچا

ترکی میں خلافت کے خاتمے کے ساتھ برصغیر میں تحریکِ خلافت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ خلافت کانفرنس کے اکثر قائدین نے گاندھی سے تعلقات توڑ لیے اور کانگرس سے علیحدگی اختیار کر لی مگر ان میں سے چند مسلم رہنما اور جمعیت علمائے ہند سیاسی اور مذہبی طور پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کانگرس کے ہمنوا بن گئے۔ جب سید سلیمان ندوی نے کانگرس سے علیحدگی اختیار کر لی تو اقبال نے انہیں تحریر کیا:

جس راہ پر آپ اس سے پہلے قدم زن تھے، اس سے متعلق ان شاء اللہ بوقتِ ملاقات گفتگو ہو گی۔ ہندوستانی نیشنلزم کی انتہا یہی تھی جو آپ کے مشاہدہ میں آ گئی۔

ایک اور موقع پر انہیں لکھا:

اسلام کا ہندوؤں کے ہاتھ بک جانا گوارا نہیں ہو سکتا۔ افسوس اہلِ خلافت اپنی اصلی راہ سے بہت

دور جا پڑے۔ وہ ہم کو ایک ایسی قومیت کی راہ دکھا رہے ہیں جس کو کوئی مخلص مسلمان ایک منٹ کے لیے بھی قبول نہیں کر سکتا۔

اقبال مسلم اقوام میں مغربی طرز کے نیشنلزم کے فروغ پر خوش نہ تھے۔ پھر بھی انہیں یقین تھا کہ مستقبل میں ایسے حالات پیدا ہو جائیں گے جب مسلم اقوام کو اتحاد کے سوا کوئی چارہ نہ رہے گا۔ اسی زمانے میں پروفیسر محمد اکبر منیر کو ایک خط لکھتے ہیں:

مغربی اور وسطی ایشیا کی مسلمان قومیں اگر متحد ہو گئیں تو بچ جائیں گی اور اگر ان کے اختلافات کا تصفیہ نہ ہو سکا تو اللہ حافظ ہے۔ مضامین اتحاد کی سخت ضرورت ہے، میرا مذہبی عقیدہ یہی ہے کہ اتحاد ہو گا اور دنیا پھر ایک دفعہ جلال اسلامی کا نظارہ دیکھے گی ......قلوب کا ہیجان حیرت انگیز ہے۔ اتنے عرصے میں اتنا انقلاب تاریخ امم میں بے نظیر ہے۔ ہم لوگ جو انقلاب سے خود متاثر ہونے والے ہیں، اس کی عظمت اور اہمیت کو اس قدر محسوس نہیں کرتے۔ آئندہ نسلیں اس کی تاریخ پڑھ کر حیرت میں ڈوب جائیں گی۔ ایشیا کی مسلمان اقوام کی حرکت بھی کم حیرت انگیز نہیں۔ کیا عجب کہ اس نئی بیداری کو ایک نظر دیکھنے کے لیے میں بھی جولائی یا اگست کے مہینے میں ایران جا نکلوں۔

چوہدری محمد احسن کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

زمانۂ حال میں میرے نزدیک اگر کوئی شخص مجدد کہلانے کا مستحق ہے تو وہ صرف جمال الدین افغانی ہے۔ مصر و ایران و ترکی و ہند کے مسلمانوں کی تاریخ جب کوئی لکھے گا تو اسے سب سے پہلے عبدالوہاب نجدی اور بعد میں جمال الدین افغانی کا ذکر کرنا ہو گا۔ مؤخر الذکر ہی اصل میں موسس ہے زمانۂ حال کے مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کا۔ اگر قوم نے ان کو عام طور پر مجدد نہیں کہا یا انہوں نے خود اس کا دعویٰ نہیں کیا تو اس سے ان کے کام کی اہمیت میں کوئی فرق، اہلِ بصیرت کے نزدیک نہیں آتا۔

مستقبل قریب میں اسلام کے عروج و جلال کے متعلق ان کا ایمان اس قدر پختہ تھا کہ اس زمانے کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی خاطر زندہ رہنا چاہتے تھے، بلکہ بعض اوقات تو اس بارے میں اخباری گپ شپ پر بھی یقین کر لیتے۔ شیخ اعجاز احمد کے پاس اقبال کے کچھ نادر خطوط موجود ہیں، جو انہوں نے اپنے والد، بھائی اور ہمشیرہ کو وقتاً فوقتاً تحریر کیے۔ اعجاز احمد ان مکاتیب کو کتابی صورت میں شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، ذیل میں ان مکاتیب میں سے چند کے اقتباس پیش کیے جاتے ہیں۔ ایک مرتبہ شیخ عطا محمد ریٹائرمنٹ کے بعد شدید بیمار ہوئے اور

بیماری کی حالت میں اپنی مشکلات یا ذمہ داریوں کے متعلق سوچتے سوچتے اتنے افسردہ ہوئے کہ زندگی سے دل برداشتہ ہو گئے۔ اقبال نے انہیں اپنے خط محررہ ۲۸ ستمبر ۱۹۲۲ء میں لکھا:

میں آپ کے لیے دعا کر رہا ہوں۔ ان شاء اللہ آپ کی صحت ضرور اچھی ہو جائے گی۔ خدا تعالیٰ آپ کی تمام مشکلات رفع کر دے گا اور برکت نازل کرے گا۔ اگر آپ زندگی سے دل برداشتہ بھی ہوں تو محض اس خیال سے کہ اسلام پر بہت اچھا زمانہ عنقریب آنے والا ہے، اپنی صحت کی طرف توجہ کیجیے تا کہ آپ اپنی آنکھوں سے اس زمانے کا ایک حصہ دیکھ لیں۔ آج چودہ یا شاید سولہ سال ہو گئے، جب مجھ کو اس زمانے کا احساس انگلستان کی سرزمین پر ہوا تھا۔ اسی وقت سے آج تک یہی دعا رہی ہے کہ بارالٰہی اس وقت تک مجھے زندہ رکھ، یہاں تک کہ اپنی بعض پرائیویٹ مشکلات کے متعلق بھی میں نے شاذ ہی دعا مانگی ہو گی۔ آپ نے اخباروں میں پڑھ لیا ہو گا کہ ترکوں کا قبضہ بغیر جنگ کے اپنے تمام ممالک پر ہو گیا ہے۔ آبناؤں پر ان کا اقتدار تسلیم کر لیا گیا ہے۔ البتہ یہ اقتدار بعض شرائط کا پابند ہو گا، جس کا فیصلہ مجلس اقوام کرے گی۔ ترکستان کی جمہوریت کو بھی روس کی گورنمنٹ نے تسلیم کر لیا ہے۔ اس کے صدر غازی انور پاشا ہوں گے۔ اس سے بھی زیادہ معنی خیز یہ ہے کہ روس کی سلطنت کا صدر اب ایک مسلمان محمد استالین نام ہے۔ لینن جو پہلے صدر تھا، بوجہ علالت رخصت پر چلا گیا ہے۔ اس کے علاوہ روسی گورنمنٹ کا وزیر خارجہ بھی ایک مسلمان مقرر ہوا ہے، جس کا نام قرہ خان ہے۔ ان تمام واقعات سے انگریزی پولیٹیکل حلقوں میں بہت اضطراب پیدا ہو گیا ہے اور ان سب باتوں پر طرہ یہ ہے کہ ایشیاء میں ایک لیگ اقوام کی قائم ہونے والی ہے، جس کے متعلق افغانی اور روسی گورنمنٹ کے درمیان گفتگو ہو رہی ہے۔ یہ سب اخباروں کی خبریں ہیں اور مجھے یقین ہے کہ حقیقت اس سے بھی زیادہ ہے۔ غالباً اب مسلمانانِ ایشیا کا فرض ہے کہ تمام اسلامی دنیا میں چندہ کر کے کابل اور قسطنطنیہ کو بذریعہ ریل ملا دیا جائے اور یہ ریل ان تمام اسلامی ریاستوں میں سے ہو کر گزرے جو روس کے انقلاب سے آزاد ہوئی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ تجویز ضرور عمل میں آئے گی۔ باقی خدا کا فضل و کرم ہے جو واقعات رونما ہوئے ہیں انہوں نے قرآنی حقائق پر مہر لگا دی ہے کہ حقیقت میں کون کمزور یا طاقتور ہیں۔ جس کو اللہ چاہتا ہے، طاقتور بنا دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے، آن کی آن میں تباہ کر دیتا ہے۔

اپنی بہن کریم بی کو ایک خط محررہ ۸ دسمبر ۱۹۱۹ء میں تحریر کرتے ہیں:

میرا عقیدہ بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو نئی زندگی عطا فرمائے گا اور جس قوم نے آج

تک اس کے دین کی حفاظت کی ہے، اس کو ذلیل و رسوا نہ کرے گا۔ مسلمانوں کی بہترین تلوار دُعا ہے، سو اسی سے کام لینا چاہیے ہر وقت دعا کرنا چاہیے اور نبی کریم ﷺ پر درود بھیجنا چاہیے۔ کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ اس اُمت کی دعا سن لے اور اس کی غریبی پر رحم فرمائے۔ میں جو اپنی گذشتہ زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے بہت افسوس ہوتا ہے کہ میں نے اپنی عمر یورپ کا فلسفہ وغیرہ پڑھنے میں گنوائی۔ خدا تعالیٰ نے مجھ کو قوائے دماغی بہت اچھے عطا فرمائے تھے۔ اگر یہ قوائے دینی علوم پڑھنے میں صرف ہوتے تو آج خدا کے رسول ﷺ کی کوئی خدمت کر سکتا اور جب مجھے یاد آتا ہے کہ والد مکرم مجھے دینی علوم ہی پڑھانا چاہتے تھے تو مجھے اور بھی قلق ہوتا ہے کہ باوجود اس کے کہ صحیح راہ معلوم بھی تھی، تو بھی وقت کے حالات نے اس راہ پر چلنے نہ دیا۔ بہرحال جو کچھ خدا کے علم میں تھا، ہوا اور مجھ سے بھی جو کچھ ہو سکا، میں نے کیا، لیکن دل چاہتا ہے کہ جو کچھ ہوا، اس سے بڑھ کر ہونا چاہیے تھا اور زندگی تمام و کمال نبی کریم ﷺ کی خدمت میں بسر ہونی چاہیے تھی۔

اپنے والد کو ایک خط محررہ ۳ جون ۱۹۲۰ء میں تحریر کرتے ہیں:

روحانی کیفیات کا سب سے بڑا ممد و معاون یہی کھانے پینے کی چیزوں میں احتیاط ہے۔ نبی کریم ﷺ کی ساری زندگی اسی بات کا ثبوت ہے۔ میں خود اپنی زندگی کم از کم کھانے پینے کے متعلق اسی طریق پر ڈھال رہا ہوں۔ موجودہ زمانہ تو روحانیت کے اعتبار سے بالکل تہی دست ہے۔ اسی واسطے اخلاق، محبت، رواداری یک جہتی کا نام و نشان نہیں رہا۔ آدمی آدمی کا خون پینے والا اور قوم، قوم کی دشمن ہے۔ یہ زمانہ انتہائی تاریکی کا ہے۔ لیکن تاریکی کا انجام سفید ہے۔ کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ جلد اپنا فضل کرم اور بنی نوع انسان کو پھر ایک دفعہ ''نورِ محمدی'' عطا کرے۔ بغیر کسی بڑی شخصیت کے اس بدنصیب دنیا کی نجات نظر نہیں آتی۔

ایک اور خط محرّرہ ۳ جنوری ۱۹۲۱ء میں اپنے والد کو لکھتے ہیں:

حقیقی شخصیت یہی ہے کہ انسان اپنی اصلی حقیقت کا خیال کر کے تمام تعلقات سے آزاد ہو جائے۔ نبی کریم ﷺ کی زندگی میں بھی اس کی مثال ملتی ہے۔ ان سے زیادہ اپنے عزیزوں سے محبت کرنے والا بلکہ ساری دنیا کو اپنا عزیز جاننے والا اور کون ہوگا؟ لیکن ایک وقت ایسا بھی آیا تھا۔ جب آپ کو نہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ عائشہ کون ہے اور ابوبکر کون ہے نہ یہ کہ محمد کون ہے۔ ہمارے صوفیہ نے اس کو فنا سے تعبیر کیا ہے، لیکن سچ بات یہ ہے کہ یہ شخصیت یا خودی کا کمال ہے، اسے فنا نہیں کہنا چاہیے اور انسانی حیات کی یہی کیفیت حیات مابعد الموت کی تیاری

ہے۔ ناانصافی یہ ہے کہ بعض افراد کو قربتِ خونی کی وجہ سے قریب جاننا اور بعض کو بُعدِ خونی کی وجہ سے بعید جاننا، حالانکہ زندگی کی حقیقت قرب و بُعد سے مُعّرا ہے۔ کامل انسان تمام عالم کے لیے رحمت ہے۔ بالفاظ دیگر یوں کہیے کہ کامل انسان تعلقات سے بالاتر ہے۔

اقبال کو جنوری ۱۹۲۰ء میں ایک گمنام خط موصول ہوا، جس میں تحریر کیا گیا تھا کہ نبی کریم ﷺ کے دربار میں تمہاری ایک خاص جگہ ہے، جس کا تمہیں کچھ پتا نہیں۔ اگر تم فلاں وظیفہ پڑھا کرو تو تمہیں اس کا علم ہو جائے گا اور وہ وظیفہ خط میں درج تھا۔ چونکہ خط گمنام تھا اس لیے اقبال نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی اور وہ خط ضائع ہو گیا۔ چار ماہ بعد اسی سلسلے میں اقبال کے ساتھ ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا اور انہوں نے اپنی روح کے کرب و اضطراب کو کم کرنے یا تسکینِ قلب کے حصول کی خاطر اپنے والد سے رہبری کی التماس کی۔

اپنے ایک خط محررہ ۲۳ اپریل ۱۹۲۰ء میں انہیں تحریر کیا:

پرسوں کا ذکر ہے کہ کشمیر سے ایک پیرزادہ مجھ سے ملنے کے لیے آیا۔ اس کی عمر قریباً تیس پینتیس سال کی ہوگی۔ شکل سے شرافت کے آثار معلوم ہوتے تھے۔ گفتگو سے ہوشیار، سمجھدار اور پڑھا لکھا آدمی معلوم ہوتا تھا، مگر پیشتر اس کے کہ وہ مجھ سے کوئی گفتگو کرے، مجھ کو دیکھ کر بے اختیار زار و قطار رونے لگا۔ میں نے سمجھا کہ شاید مصیبت زدہ ہے اور مجھ سے کوئی مدد مانگتا ہے۔ استفسارِ حال کیا، تو کہنے لگا، کسی مدد کی ضرورت نہیں۔ مجھ پر خدا کا بڑا فضل ہے۔ میرے بزرگوں نے خدا کی ملازمت کی اور میں ان کی پنشن کھا رہا ہوں۔ رونے کی وجہ خوشی ہے، نہ غم۔ مفصل کیفیت پوچھنے پر اس نے کہا کہ نوگام میں جو میرا گاؤں سری نگر کے قریب ہے، میں نے عالمِ کشف میں نبی کریم ﷺ کا دربار دیکھا۔ صف نماز کے لیے کھڑی ہوئی تو حضور سرور کائنات ﷺ نے پوچھا کہ محمد اقبال آیا ہے یا نہیں۔ معلوم ہوا، محفل میں نہیں تھا۔ اس پر ایک بزرگ کو اقبال کے بلانے کے واسطے بھیجا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ ایک جوان آدمی جس کی ڈاڑھی منڈھی ہوئی تھی اور رنگ گورا تھا، مع ان بزرگ کے صفِ نماز میں داخل ہو کر حضور سرور کائنات ﷺ کے دائیں جانب کھڑا ہو گیا۔ پیرزادہ صاحب کہتے ہیں کہ اس سے پہلے میں آپ کی شکل سے واقف نہ تھا۔ نہ نام معلوم تھا۔ کشمیر میں ایک بزرگ نجم الدین صاحب ہیں، جن کے پاس جا کر میں نے یہ سارا قصہ بیان کیا تو انہوں نے آپ کی بہت تعریف کی۔ وہ آپ کو آپ کی تحریروں کے ذریعے سے جانتے ہیں۔ گو انہوں نے آپ کو کبھی نہیں دیکھا۔ اس دن سے میں نے ارادہ کیا کہ لاہور جا کر آپ کو ملوں گا۔ سو محض آپ کی

ملاقات کی خاطر میں نے کشمیر سے سفر کیا ہے اور آپ کو دیکھ کر مجھے بے اختیار رونا اس واسطے آیا کہ مجھ پر میرے کشف کی تصدیق ہوگئی۔ کیونکہ جو شکل آپ کی میں نے حالت کشف میں دیکھی، اس سے سر بمو فرق نہ تھا۔ اس ماجرا کو سن کر مجھ کو معاً وہ گمنام خط یاد آیا، جس کا ذکر میں نے اس خط کی ابتدا میں کیا ہے۔ مجھے سخت ندامت ہو رہی ہے اور روح نہایت کرب و اضطراب کی حالت میں ہے کہ میں نے کیوں وہ خط ضائع کر دیا۔ اب مجھ کو وہ وظیفہ یاد نہیں جو اس خط میں لکھا تھا۔ آپ مہربانی کر کے اس مشکل کا کوئی علاج بتائیں، کیونکہ پیرزادہ صاحب کہتے تھے کہ آپ کے متعلق میں نے جو کچھ دیکھا ہے، وہ آپ کے والدین کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ جو کچھ انہوں نے کہا ہے، بالکل صحیح ہے کیونکہ میرے اعمال تو اس قابل نہیں ہیں۔ ایسا فعل ضرور ہے کہ دعا کا ہی نتیجہ ہو۔ لیکن اگر حقیقت میں پیرزادہ صاحب کا کشف صحیح ہے تو میرے لیے لاعلمی کی حالت سخت تکلیف دہ ہے۔ اس کا یا تو کوئی علاج بتائیے یا مزید دُعا فرمائیے کہ خدا تعالیٰ اس گرہ کو کھول دے۔

باب : ۱۴

ہندو مسلم تصادم کا ماحول

یکم جنوری ۱۹۲۳ء کو انگریزی حکومت نے اقبال کی علمی اور ادبی خدمات کے صلے میں انہیں "سر" کا خطاب دیا۔ خطاب کے پس منظر کے متعلق اقبال نے مہاراجہ کشن پرشاد کو تحریر کیا:

سرکار نے میرے خطاب کے متعلق جو کچھ سُنا ہے، صحیح ہے یہ اسرار خودی کا انگریزی ترجمہ ہونے اور اس پر یورپ اور امریکہ میں متعدد ریویو چھپنے کا نتیجہ ہے۔

مزید تفصیل کے بارے میں فقیر سیّد وحید الدین اپنی تصنیف میں اقبال کی زبانی تحریر کرتے ہیں کہ پنجاب کے گورنر سر ایڈورڈ میکلیگن نے اقبال کو گورنمنٹ ہاؤس میں مدعو کیا۔ جب وہ وہاں پہنچے تو انہیں لندن ٹائمز کے ایک مقالہ نگار سے، جس نے اسرار خودی کا انگریزی ترجمہ پڑھا تھا، ملوایا گیا۔ مقالہ نگار نے کوئی کتاب تحریر کی تھی، جس کے متعلق اقبال کی رائے معلوم کرنا چاہتا تھا۔ اقبال کی اس کے ساتھ خاصی دیر تک صحبت رہی۔ جب رخصت ہونے لگے تو گورنر کا پیغام ملا کہ اس سے ملتے جائیں۔ اقبال اس کے کمرے میں گئے تو اس نے کہا کہ میں آپ کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر آپ کے لیے "نائٹ ہڈ" کے خطاب کی سفارش کرنا چاہتا ہوں، بشرطیکہ آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو۔ اقبال کچھ پس و پیش کے بعد رضا مند ہو گئے۔ اس کے بعد گورنر نے پوچھا کہ کیا ان کی نگاہ میں کوئی ایسا شخص ہے جو شمس العلماء کے خطاب کا مستحق ہو۔ اس پر اقبال نے جواب دیا کہ وہ ایک نام پیش کرنے کو تیار ہیں، بشرطیکہ کسی دوسرے نام کو سفارش میں شریک نہ کیا جائے۔ گورنر نے قدرے تامّل کے بعد جب شرط قبول کر لی تو اقبال نے اپنے استاد مولانا سید میر حسن کا نام تجویز کیا۔ گورنر، مولانا میر حسن کے نام سے واقف نہ تھا، اس لیے دریافت کیا کہ انہوں نے کون کون سی کتابیں تحریر کی ہیں؟ اقبال نے کہا کہ انہوں نے کتاب تو کوئی نہیں لکھی لیکن میں ان کی زندہ تصنیف آپ کے سامنے

موجود ہوں، کیونکہ وہ میرے استاد ہیں۔ اس کے بعد یہ بھی واضح کر دیا کہ اگر ان کے لیے شمس العلماء کے خطاب کی سفارش منظور ہو جائے تو ضعیف العمری کے سبب انہیں سندِ خطاب لینے کے لیے سیالکوٹ سے لاہور آنے کی زحمت نہ دی جائے۔ چنانچہ جب خطاب کا اعلان ہوا تو مولانا سید میر حسن کی سندِ خطاب ان کے فرزند کے حوالے کی گئی۔

تحریکِ ترکِ موالات کے سبب لوگوں میں سرکاری خطابات کے خلاف نفرت پیدا ہو چکی تھی، اس لیے سر کا خطاب ملنے پر اقبال کے متعلق طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ اخبارات کے کالموں میں ان پر طنز بھری چوٹیں کی گئیں۔ عبدالمجید سالک نے فوری ردِ عمل کے طور پر چند اشعار بھی زمیندار میں شائع کر دیے جو زبان زدِ عام ہو گئے۔

اقبال کے پرانے دوست میر غلام بھیک نیرنگ نے انہیں خط میں اندیشہ ظاہر کیا کہ اب آپ شاید آزادی اظہار سے کام نہ لے سکیں۔ اقبال نے جواب میں تحریر کیا:

میں آپ کو اس اعزاز کی خود اطلاع دیتا، مگر جس دنیا کے میں اور آپ رہنے والے ہیں، اس دنیا میں اس قسم کے واقعات احساس سے فروتر ہیں۔ باقی رہا وہ خطرہ جس کا آپ کے قلب کو احساس ہوا ہے، سو قسم ہے خدائے ذوالجلال کی جس کے قبضے میں میری جان اور آبرو ہے اور قسم ہے اس بزرگ و برتر وجود کی جس کی وجہ سے مجھے خدا پر ایمان نصیب ہوا اور مسلمان کہلاتا ہوں، دنیا کی کوئی قوت مجھے حق کہنے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ ان شاء اللہ اقبال کی زندگی مومنانہ نہیں لیکن اس کا دل مومن ہے۔

۱۷ جنوری ۱۹۲۳ء کو خطاب ملنے پر اقبال کے لیے ایک مبارک باد پارٹی کا اہتمام ہندو، مسلم اور سکھ معززین لاہور کی طرف سے مقبرہ جہانگیر میں کیا گیا، جس میں گورنر پنجاب سمیت تمام سرکاری اور غیر سرکاری عمائد و حکام شریک ہوئے۔ اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے اقبال نے بتایا کہ وہ گوئٹے کے دیوان مغرب کے جواب میں ایک کتاب تحریر کر رہے ہیں جس کا نام پیامِ مشرق ہوگا۔ اخبار بندے ماترم لاہور، اس تقریب کا آنکھوں دیکھا حال یوں بیان کرتا ہے:

۱۷ جنوری کو بوقت چار بجے شام ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کو سر کا خطاب ملنے کی تقریب پر شاہدرہ میں ایک پر لطف گارڈن پارٹی دی گئی۔ جن اصحاب کی طرف سے دعوتی کارڈ جاری ہوئے تھے، ان میں گورنر پنجاب کی انتظامیہ کونسل کے ممبر سر جان مینارڈ، میاں فضل حسین وزیر تعلیم

اور لالہ ہر کشن لعل وزیر صنعت و حرفت کے علاوہ سر ذوالفقار علی خان، نواب سر فتح علی خان قزلباش، چوہدری شہاب الدین، میاں احمد یار خان دولتانہ اور دیگر بہت سے سرکار پرستوں کے نام بھی تھے۔ دعوت شہنشاہ جہانگیر کے مقبرے کے وسیع احاطے میں دی گئی۔ جلسۂ دعوت کے صدر سر ایڈورڈ میکلیگن گورنر پنجاب تھے۔ میر میزبان سر ذوالفقار علی خان تھے، لیکن جلسے کو کامیاب بنانے کا سہرا زیادہ تر میاں فضل حسین کے سر سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ لاہور کے تقریباً تمام سکولوں اور کالجوں کے پروفیسر، ٹیچر اور شاید طالب عالم بھی خاصی تعداد میں مدعو کیے گئے تھے۔ کھانے کے دوران میں سر ایڈورڈ میکلیگن اور سر جان مینارڈ کی کرسیوں کے قریب سکول کے چند لڑکے ڈاکٹر اقبال کی نظم، ہندوستاں ہمارا، گا رہے تھے، جو باعتبارِ مضمون اس مجمع میں نہایت غیر موزوں معلوم ہوتی تھی۔ کھانا ختم ہو چکنے کے بعد سر ذوالفقار علی خان نے ایک تقریر کی۔ سر محمد اقبال نے جوابی تقریر میں اس دلچسپی کا ذکر کیا جو مغربی ممالک میں ایشیائی خصوصاً عربی و فارسی علوم کے متعلق پیدا ہو گئی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ اقبال کے نزدیک خطابات یا دینوی اعزازات کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ اس لیے خطاب حاصل کرنے کے بعد، جیسا کہ ان کی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے، آزادیِ اظہار میں کمی کی بجائے اور بھی زیادہ اضافہ ہوا۔ مگر ایسے زمانے میں جب عوام میں خطابات کے خلاف نفرت پیدا ہو چکی تھی، اقبال نے خطاب کیوں قبول کیا؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اقبال کا تعلق اقلیتی قوم سے تھا اور برصغیر کے سیاسی پس منظر میں اقلیتی قوم کی نفسیات اکثریتی قوم سے مختلف تھیں؛ یعنی انگریزی حکومت یا ہندو اکثریت کے مقابلے میں مسلم اقلیت کا رویہ بنیادی طور پر مدافعانہ تھا اور اقبال کے خطاب قبول کرنے کی مصلحت اسی مدافعانہ نفسیات کی غماز تھی۔

شیخ احمد سرہندی کو مسلمانانِ ہند کی ملی تاریخ میں جو عظیم سیاسی مرتبہ حاصل ہے، اس کا اندازہ ابھی تک نہیں لگایا گیا۔ اقبال انہیں ہندوستان میں مسلم قومیت کا بانی تصور کرتے تھے اور ان کی تحریروں سے بے حد متاثر تھے۔ اقبال کی تصنیف اسرار و رموز اور شیخ احمد سرہندی کی تحریروں بالخصوص مکتوباتِ امام ربانی میں جو روحانی تعلق موجود ہے، وہ مزید غور و فکر اور تحقیق کا محتاج ہے۔ دراصل برصغیر میں جن حالات کے پیشِ نظر شیخ احمدؒ سرہندی نے اسلام کی حفاظت و تقویت کی خاطر تجدید کا تاریخ ساز اور عہد آفرین کام انجام دیا، کچھ اسی نوع کا ماحول مغربی تصورات مثلاً علاقائی قومیت و وطنیت، سیکولر یا لادین سیاست و معاشرت وغیرہ کے فروغ کے

سبب عہدِ اقبال میں بھی پیدا ہوگیا تھا یہ ماحول احیائے اسلام کا مقتضی تھا۔

۱۹۱۱ء اور ۱۹۱۵ء تا ۱۹۱۸ء میں مونگھیر، پٹنہ، شاہ آباد، آرہ اور کرتار پور (بہار و یوپی)، ۲۳۔۱۹۲۲ء میں پنجاب، یوپی اور سندھ کے صوبے ہندو مسلم فسادات کی زد میں آئے۔ انہی ایام میں اقبال نے اپنے ایک خط بنام مہاراجہ کشن پرشاد محررہ ۱۹/ مارچ ۱۹۲۳ء میں فرمایا:

> افسوس ہے کہ پنجاب میں ہندو مسلمانوں کی رقابت بلکہ عداوت بہت ترقی پر ہے۔ اگر یہی حالت رہی تو آیندہ تیس سال میں دونوں قوموں کے لیے زندگی مشکل ہوجائے گی۔

اسی دور میں اپنے ایک اور خط بنام سیّد محمد سعید الدین جعفری محررّہ ۱۴ نومبر ۱۹۲۳ء میں واضح کیا:

> میرے نزدیک اسلام بنی نوع انسان کی اقوام کو جغرافیائی حدود سے بالاتر کرنے اور نسل و قومیت کی مصنوعی مگر ارتقاء انسانی کے ابتدائی مراحل میں مفید امتیازات کو مٹانے کا ایک عملی ذریعہ ہے۔ اسی وجہ سے اور مذاہب (یعنی مسیحیت، بدھ اِزم وغیرہ) سے زیادہ کامیاب رہا ہے۔ چونکہ اس وقت ملکی اور نسلی قومیت کی لہر یورپ سے ایشیا میں آ رہی ہے اور میرے نزدیک انسان کے لیے یہ ایک بہت بڑی لعنت ہے، اس واسطے بنی نوع انسان کے مفاد کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس وقت اسلام کے اصلی حقائق اور اس کے حقیقی پیش نہاد پر اور زور دینا نہایت ضروری ہے، یہی وجہ ہے کہ میں خالص اسلامی نقطۂ خیال کو ہمیشہ پیش نظر رکھتا ہوں۔ ابتدا میں، میں بھی قومیت پر اعتقاد رکھتا تھا اور ہندوستان کی متحدہ قومیت کا خواب شاید سب سے پہلے میں نے دیکھا تھا، لیکن تجربے اور خیالات کی وسعت نے میرے خیال میں تبدیلی پیدا کر دی اور اب قومیت میرے نزدیک محض ایک عارضی نظام ہے اسلام ایک قدم ہے نوع انسانی کے اتحاد کی طرف، یہ ایک سوشل نظام ہے جو حرّیت و مساوات کے ستونوں پر کھڑا ہے۔ پس جو کچھ میں اسلام کے متعلق لکھتا ہوں، اس سے میری غرض محض خدمت بنی نوع ہے، اور کچھ نہیں اور میرے نزدیک عملی نقطۂ خیال سے صرف اسلام ہی انسان دوستی کے آئیڈیل کو حاصل کرنے کا ایک کارگر ذریعہ ہے۔ اس بات میں میں آپ سے متفق ہوں کہ مسلمانوں کو محبت کے طریق اختیار کرنے چاہئیں۔ نبی کریم ﷺ کی حدیث ہے کہ مسلمان دنیا کے لیے سراپا شفقت ہے، مگر اس اخلاقی انقلاب کو حاصل کرنے کے لیے بھی یہی ضروری ہے کہ اسلام اپنی اصلی روشنی میں پیش کیا جائے۔ میرا ذاتی طریقہ یہی ہے کہ میں دنیا کی تمام مذہبی تحریکوں کو ادب اور احترام کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔

ہندو مسلم فسادات روکنے کے لیے مختلف قوموں کے رہنماؤں نے امن و اتحاد قائم کرنے کی غرض سے جو کانفرنسیں منعقد کیں، ان کے تحت بعض مخصوص اور ہنگامی جماعتیں بھی قائم ہوئیں لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ لاہور میں نیشنل لبرل لیگ کے نام سے ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک مشترکہ انجمن قائم ہوئی۔ اقبال اس میں شریک ہوئے مگر کچھ مدت بعد مستعفی ہو گئے۔ اس کے بعد چنتا منی نے اس مقصد کے لیے بمبئی میں ایک نیشنلسٹ کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کے داعیوں میں نام درج کرنے کی خاطر اقبال سے اجازت طلب کی۔ اقبال نے اجازت دے دی۔ اس پر اقبال سے استفسار کیا گیا کہ نیشنل لبرل لیگ سے علیحدگی اور چنتا منی کانفرنس میں شرکت کے متعلق ان کے رویے کا سبب کیا ہے؟ جواب میں اقبال نے ایک بیان دیا جو زمیندار میں شائع ہوا:

> پنجاب میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی کشیدگی کے باعث جو شرمناک حالات پیدا ہو رہے ہیں اور صوبے کی فضا جیسی مکدّر ہو رہی ہے۔ اسے کوئی مخلص انسان اچھی نظروں سے نہیں دیکھتا۔ میں دل سے چاہتا ہوں کہ ہندو اور مسلمان اپنے اختلافات کو دور کر کے ملک میں بھائیوں کی طرح سے رہیں اور بات بات پر ایک دوسرے کا سر نہ پھوڑتے پھریں۔ میرے بعض احباب نے مجھ سے کہا کہ پنجاب کی مختلف اقوام کے تعلقات کو بہتر بنانے کے لیے ایک متحدہ کوشش ضروری ہے جس میں ہر جماعت کے افراد شامل ہوں گے، میں نے ان سے کہا کہ میرے پیش نظر فی الحال کوئی سیاسی مقصد نہیں ہے، تاہم اخلاقی اعتبار سے اس میں شرکت کرنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ چنانچہ میں ان کی اس کوشش میں شریک ہوا۔ لیکن تھوڑی ہی مدت کے بعد معلوم ہوا کہ گو ہر مقصود یہاں بھی مفقود ہے اور ملک میں ابھی حصولِ مقصد کے امکانات بہت کم ہیں۔ اس بنا پر میں نے اس جماعت سے استعفا دے دیا۔ اس کے بعد چند روز ہوئے مسٹر چنتا منی کا تار میرے نام موصول ہوا، جس میں مجھ سے استدعا کی گئی تھی کہ مجوزہ نیشنلسٹ کانفرنس کے داعیوں میں اپنا نام درج کرنے کی اجازت دیجیے۔ میں نے رسمی طور پر جلسے کا داعی بننا منظور کر لیا اور ان کو اجازت دے دی کہ وہ میری طرف سے دستخط کریں۔ جس سے میری مراد کسی سیاسی جماعت کی موافقت یا مخالفت نہ تھی۔

پس ظاہر ہے کہ اقبال اپنے مؤقف پر قائم رہنے کے باوجود ہندوستان میں ہندو اور مسلم اقوام کے درمیان صلح اور امن کے خواہشمند تھے اور اس نصب العین کو حاصل کرنے کے لیے ہر

کوشش میں دوسروں کے ساتھ تعاون کرنے پر تیار رہتے تھے۔ مگر ان کو بارہا یہ تجربہ ہوا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مصالحت کی کوشش کے پردے میں ہر سیاسی رہنما اپنا یا اپنی قوم کا مفاد سامنے رکھتا تھا اور حقیقی معنوں میں صلح و امن کے لیے کوئی بھی مخلص نہ تھا۔ اسی وجہ سے ایسی تمام کوششیں ناکام ہوتی تھیں۔

۳۰ مارچ ۱۹۲۳ء کو انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں اقبال نے اپنی معروف نظم ''طلوع اسلام'' پڑھی۔ عبدالمجید سالک تحریر کرتے ہیں:

حقیقت یہ ہے کہ ''خضرِ راہ'' اور ''طلوع اسلام'' نے اس زمانے میں مسلمانوں کو بہت بڑا سہارا دیا۔ اور ان کے جذبات و خیالات کو ایک طوفانی دور کے بعد صراطِ مستقیم پر لگانے میں بڑا کام کیا۔

مئی ۱۹۲۳ء میں پیام مشرق پہلی بار شائع ہوئی۔ اشاعت سے چند برس پیشتر پیام مشرق کی تالیف کے متعلق اقبال نے سید سلیمان ندوی کو تحریر کیا:

فی الحال میں ایک مغربی شاعر کے دیوان کا جواب لکھ رہا ہوں، جس کا تقریباً نصف حصہ لکھا جا چکا ہے......شاعری میں لٹریچر بحیثیت لٹریچر کے کبھی میرا مطمحِ نظر نہیں رہا کہ فن کی باریکیوں کی طرف توجہ کرنے کے لیے وقت نہیں۔ مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو اور بس اس بات کو مدنظر رکھ کر جن خیالات کو مفید سمجھتا ہوں، ان کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کیا عجب کہ آئندہ نسلیں مجھے شاعر تصور نہ کریں۔ اس واسطے کہ آرٹ (فن) غایت درجہ کی جان کاہی چاہتا ہے اور یہ بات موجودہ حالات میں میرے لیے ممکن نہیں۔ جرمنی کے دو بڑے شاعر بیرسٹر تھے، یعنی گوئٹے اور اوہلنڈ۔ گوئٹے تھوڑے دن پریکٹس کے بعد ویمر کی ریاست کا تعلیمی مشیر بن گیا اور اس طرح فن کی باریکیوں کی طرف توجہ کرنے کا اُسے پورا موقع مل گیا۔ اوہلنڈ تمام عمر مقدمات پر بحث کرتا رہا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت تھوڑی نظمیں لکھ سکا اور وہ کمال پورے طور پر نشوونما نہ پا سکا جو اس کی فطرت میں ودیعت کیا گیا تھا۔

پیام مشرق کی تصنیف کے دوران میں اقبال گرامی کے مشوروں سے بھی مستفید ہوئے اس کتاب کا مسودہ چودہری محمد حسین نے اشاعت کے لیے مرتب کیا۔ کتاب کی اشاعت سے چند ماہ پیشتر چوہدری محمد حسین نے اس پر ایک نہایت مدّلل تبصرہ لکھا جو پہلے ھزار داستان اور پھر زمیندار میں بالاقساط شائع ہوا۔ پیام مشرق کو امیر امان اللہ خان فرمانروائے افغانستان کے نام سے منسوب کیا گیا۔ کیونکہ بقولِ اقبال:

اس دنیا میں اور بالخصوص ممالک مشرق میں ہر ایسی کوشش، جس کا مقصد افراد و قوم کی نگاہ کو جغرافیائی حدود سے بالاتر کر کے ان میں ایک صحیح اور قومی انسانی سیرت کی تجدید یا تولید ہو، قابل احترام ہے۔ اسی بنا پر میں نے ان چند اوراق کو اعلیٰ حضرت فرمانروائے افغانستان کے نام نامی سے منسوب کیا ہے کہ وہ اپنی فطری ذہانت و فطانت سے اس نکتے سے بخوبی آ گاہ معلوم ہوتے ہیں اور افغانوں کی تربیت انہیں خاص طور پر مدّ نظر ہے۔

تصنیف کی غرض و غایت کے متعلق اقبال نے تحریر کیا:

پیام مشرق کی تصنیف کا محرّک جرمن حکیم حیات گوئٹے کا مغربی دیوان ہے ...... پیامِ مشرق کے متعلق جو مغربی دیوان سے سو سال بعد لکھا گیا ہے مجھے عرض کرنے کی ضرورت نہیں، ناظرین خود اندازہ کر لیں گے کہ اس کا مدعا زیادہ تر ان اخلاقی، مذہبی اور ملّی حقایق کو پیش نظر لانا ہے جن کا تعلق افراد و اقوام کی باطنی تربیت سے ہے۔ اس سے سو سال پیشتر کی جرمنی اور مشرق کی موجودہ حالت میں کچھ نہ کچھ مماثلت ضرور ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اقوامِ عالم کا باطنی اضطراب جس کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہم محض اس لیے نہیں لگا سکتے کہ خود اس اضطراب سے متاثر ہیں، ایک بہت بڑے روحانی اور تمدنی انقلاب کا پیش خیمہ ہے مگر اقوامِ مشرق کو یہ محسوس کر لینا چاہیے کہ زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی، جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی، جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔

کتاب میں نقشِ فرنگ (یعنی دنیائے فرنگ میں کیا ہو رہا ہے) کے بارے میں اقبال نے سرمایہ و محنت کی کشمکش کے متعلق چند نظمیں بعنوان ''پیامِ صحبتِ رفتگان'' (در عالمِ بالا) ''محاورہ مابین حکیم فرنسوی اگسٹس کومٹ و مردِ مزدور''، ''موسیولینن و قیصر ولیم''، ''قسمت نامہ''، ''سرمایہ دار و مزدور'' اور ''نوائے مزدور'' شامل کیں۔ اقبال کی ان نظموں اور ''خضرِ راہ'' کا حوالہ دے کر پنجاب کے چند اشتراکیت کے حامیوں نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ اقبال اشتراکیت کے مبلغِ اعلیٰ ہیں۔ اس زمانے میں اشتراکیت کی تبلیغ کے لیے ایک رسالہ انقلاب بھی شائع ہوتا تھا، جس کی ادارت کے فرائض کچھ مدت تک شمس الدین حسن نے ادا کیے، لیکن رسالہ مالی خسارے کی وجہ سے بند ہو گیا۔ شمس الدین حسن ایک سرگرم اشتراکی تھے۔ انہوں نے اپنے ایک مضمون میں جو زمیندار ۲۳ جون ۱۹۲۳ء میں شائع ہوا۔ تحریر کیا:

بالشویک نظام حکومت کارل مارکس کے فلسفہ سیاست کا لبِ لباب ہے؛ اور کارل مارکس کے فلسفہ کو عام فہم زبان میں سوشلزم اور کمیونزم کہا جاتا ہے۔ان حالات میں اگر کوئی تھوڑی سی عقل کا مالک بھی سر محمد اقبال کی ''خضر راہ'' اور پیام مشرق کو بغور دیکھے تو فوراً اس نتیجے پر پہنچے گا کہ علامہ اقبال یقیناً ایک اشتراکی ہی نہیں بلکہ اشتراکیت کے مبلغِ اعلیٰ بھی ہیں۔پیام مشرق میں 'قسمت نامہ' 'سرمایہ دار و مزدور' اور 'نوائے مزدور' کے عنوان سے جو مختصر سی نظمیں لکھی ہیں، ان سے قطع نظر کر کے صفحہ ۱۵۶ کی غزل کا مطلع ملاحظہ ہو:

تیر و سنان و خنجر و شمشیرم آرزو ست
با من میا کہ مسلکِ شبیرم آرزو ست

کیا ایسے اشعار کی موجودگی میں کسی کو شک ہو سکتا ہے کہ علامہ اقبال ایک انتہائی خیالات رکھنے والے اشتراکی نہیں ہیں۔

اقبال کی نظر سے یہ مضمون یا اخبار نہ گزرا تھا۔ انہیں کسی نے اطلاع دی کہ ان سے بالشویک خیالات منسوب کیے گئے ہیں۔انہوں نے بلا تاخیر اس کی تردید میں ۲۴ جون ۱۹۲۳ء کے زمیندار میں اپنا خط شائع کرایا، جس میں تحریر کیا:

کسی صاحب نے ...... میری طرف بالشویک خیالات منسوب کیے ہیں چونکہ بالشویک خیالات رکھنا میرے نزدیک دائرہ اسلام سے خارج ہو جانے کے مترادف ہے، اس واسطے اس تحریر کی تردید میرا فرض ہے۔ میں مسلمان ہوں۔ میرا عقیدہ ہے اور یہ عقیدہ دلایل و براہین پر مبنی ہے کہ انسانی جماعتوں کے اقتصادی امراض کا بہترین علاج قرآن نے تجویز کیا ہے اس میں شک نہیں کہ سرمایہ داری کی قوت جب حد اعتدال سے تجاوز کر جائے تو دنیا کے لیے ایک قسم کی لعنت ہے، لیکن دنیا کو اس کے مضر اثرات سے نجات دلانے کا طریق یہ نہیں کہ معاشی نظام سے اس قوت کو خارج کر دیا جائے، جیسا کہ بالشویک تجویز کرتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے اس قوت کو مناسب حدود کے اندر رکھنے کے لیے قانون میراث، حرمتِ ربا اور زکوٰۃ وغیرہ کا نظام تجویز کیا ہے اور فطرتِ انسانی کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہی طریق قابلِ عمل بھی ہے۔ روسی بالشوزم یورپ کی ناعاقبت اندیش اور خودغرض سرمایہ داری کے خلاف ایک زبردست ردِّعمل ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مغرب کی سرمایہ داری اور روسی بالشوزم دونوں افراط و تفریط کا نتیجہ ہیں۔ اعتدال کی راہ وہی ہے جو قرآن نے ہم کو بتائی ہے اور جس کا میں نے اوپر اشارۃً ذکر کیا ہے۔ شریعت حقہ اسلامیہ کا مقصود یہ ہے کہ سرمایہ داری کی بنا پر ایک

جماعت دوسری جماعت کو مغلوب نہ کر سکے اور اس مدعا کے حصول کے لیے میرے عقیدے کی رو سے وہی راہ آسان اور قابل عمل ہے جس کا انکشاف شارح علیہ السلام نے کیا ہے۔ اسلام سرمایہ کی قوت کو معاشی نظام سے خارج نہیں کرتا بلکہ فطرت انسانی پر ایک عمیق نظر ڈالتے ہوئے اسے قائم رکھتا ہے اور ہمارے لیے ایک ایسا معاشی نظام تجویز کرتا ہے جس پر عمل پیرا ہونے سے یہ قوت کبھی اپنے مناسب حدود سے تجاوز نہیں کر سکتی۔ مجھے افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اسلام کے اقتصادی پہلو کو مطالعہ نہیں کیا۔ ورنہ ان کو معلوم ہوتا کہ اس خاص اعتبار سے اسلام کتنی بڑی نعمت ہے۔ میرا عقیدہ ہے **فاصبحتم بنعمتہ اخوانا**، میں اسی نعمت کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ کسی قوم کے افراد صحیح معنوں میں ایک دوسرے کے اخوان نہیں ہو سکتے جب تک کہ وہ ہر پہلو سے ایک دوسرے کے ساتھ مساوات نہ رکھتے ہوں اور اس مساوات کا حصول بغیر ایک ایسے سوشل نظام کے ممکن نہیں جس کا مقصود سرمایہ داری کی قوت کو مناسب حدود کے اندر رکھنا ہے۔ یورپ اس نکتے کو نظر انداز کر کے آج آلام و مصائب کا شکار ہے۔ میری دلی آرزو ہے کہ بنی نوع انسان کی تمام قومیں اپنے اپنے ممالک میں ایسے قوانین وضع کریں جن کا مقصود سرمایہ کی قوت کو مناسب حدود کے اندر رکھ کر مذکورہ بالا مساوات کی تخلیق و تولید ہو اور مجھے یقین ہے کہ خود روسی قوم بھی اپنے موجودہ نظام کے نقائص تجربے سے معلوم کر کے کسی ایسے نظام کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہو جائے گی جس کے اصولِ اساسی یا تو خالص اسلامی ہوں گے یا ان سے ملتے جلتے ہوں گے۔ موجودہ صورت میں روسیوں کا اقتصادی نصب العین خواہ کیسا ہی محمود کیوں نہ ہو، ان کے طریق عمل سے کسی مسلمان کو ہمدردی نہیں ہو سکتی۔ ہندوستان اور دیگر ممالک کے مسلمان جو یورپ کی پولیٹیکل ایکانمی پڑھ کر مغربی خیالات سے فوراً متاثر ہو جاتے ہیں، ان کے لیے لازم ہے کہ اس زمانے میں قرآنِ کریم کی اقتصادی تعلیم پر نظرِ غائر ڈالیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی تمام مشکلات کا حل اس کتاب میں پائیں گے۔ لاہور کی لیبر یونین کے مسلمان ممبر بالخصوص اس طرف توجہ کریں۔ مجھے ان کے اغراض و مقاصد کے ساتھ دلی ہمدردی ہے مگر مجھے امید ہے کہ وہ کوئی ایسا طریقِ عمل یا نصب العین اختیار نہ کریں گے جو قرآنی تعلیم کے منافی ہو۔

زمیندار میں یہ خط اقبال کی پہلی تحریر ہے جس کے مطالعے سے ان کے معاشی تصورات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ بعد میں اقبال نے جاوید نامہ یا اپنی دیگر تحریروں اور تقریروں کے ذریعے انہی خیالات کی وضاحت کی۔ ان کا جائزہ مناسب مقام پر لیا جائے گا۔ بہر حال اس

تحریر سے کمیونسٹ عناصر اقبال سے منحرف ہو گئے اور انہیں ایک رجعت پسند مسلمان سمجھتے ہوئے ان کی کردار کشی کی مہم میں بڑی شد و مد سے حصہ لینے لگے۔

نئی دستوری اصلاحات کے تحت پنجاب میں جب ۱۹۲۳ء کے انتخابات کا وقت آیا تو اقبال کے احباب نے اصرار کیا، عوام نے وفود بھیجے اور اخبارات نے اپیلیں شائع کیں کہ لاہور کونسل کی رکنیت کے لیے اقبال امیدوار کھڑے ہو جائیں، لیکن چونکہ اسی حلقے سے ان کے ایک دوست میاں عبدالعزیز بیرسٹر کی امیدواری کا اعلان ہو چکا تھا، اس لیے اقبال ان کے مقابلے میں کھڑے نہ ہوئے اور محمد نیاز الدین خان کو تحریر کیا:

میں الیکشن کے ہنگامے میں نہ پڑوں گا۔ لاہور کے لوگ مجبور کرتے ہیں اور بہت سے ڈیپوٹیشن ان کے آ چکے ہیں، مگر میاں عبدالعزیز سے مقابلہ کرنا میں نہیں چاہتا۔ ان سے دیرینہ تعلقات ہیں۔ اگرچہ مقابلہ کے بعد انتخاب ہو جانا قریباً یقینی ہے، تاہم یہ بات میرے نزدیک مروّت کے خلاف ہے کہ ایک موہومی دنیوی فائدے کی خاطر دیرینہ تعلقات کو نظر انداز کر دوں۔

۲۳/اکتوبر ۱۹۲۳ء کو لارڈ ریڈنگ وائسرائے ہند پنجاب کے نئے ہائی کورٹ کے افتتاح کے لیے لاہور آیا۔ اس موقع پر ہائی کورٹ کے لان میں ججوں، وکیلوں اور صوبے کے احکام کا ایک بہت بڑا اجتماع ہوا۔ سر شادی لعل چیف جسٹس نے خطبۂ استقبالیہ پیش کیا اور وائسرائے نے اپنی جوابی تقریر میں اقبال کا ذکر تعریفی انداز میں کیا، جس سے بقول اقبال سب کو تعجب ہوا، کیونکہ انہیں اس کی توقع نہ تھی۔

۱۹/مئی ۱۹۲۴ء کو اقبال انجمن حمایت اسلام کے صدر منتخب ہوئے، لیکن ۲۸/جون ۱۹۲۴ء کو مستعفی ہو گئے۔ کیونکہ کونسل کے اراکین میں اختلاف تھا اور انجمن کی عام حالت اچھی نہ تھی۔ بعض ارکان ذاتی اغراض سے اس میں داخل ہوئے تھے اور ان کے نزدیک انجمن ان اغراض کے حصول کا ذریعہ تھی۔

ستمبر ۱۹۲۴ء میں بانگ درا شائع ہوئی۔ چوہدری محمد حسین کا اصرار تھا کہ اقبال اپنے اردو کلام پر نظر ثانی کا کام ختم کریں اور مجموعہ جلد چھاپیں تاکہ کوئی اور اسے مرتب کر کے شائع نہ کر دے۔ ابھی اقبال بانگ درا ترتیب دے رہے تھے کہ محمد عبدالرزاق نے ان کی اجازت کے بغیر مختلف رسالوں اور اخباروں میں سے ان کا کلام اکٹھا کر کے کلیات اقبال کے نام سے حیدر آباد دکن میں شائع کر دیا۔ چونکہ اقبال نے نظر ثانی کرتے وقت اپنی اکثر

نظموں میں اصلاح و ترمیم کی تھی یا بعض کو ناقص سمجھ کر رد کر دیا تھا اور اپنے ذہنی ارتقا کے مراحل کو ملحوظ رکھتے ہوئے کلام کا انتخاب کر رہے تھے، اس لیے وہ اس جسارت پر سخت برہم ہوئے۔ بہرحال سر اکبر حیدری کی مداخلت سے طے یہ پایا کہ مرتب اقبال کو ایک ہزار روپیہ بطور معاوضہ ادا کر دے اور کتاب کی فروخت ریاست حیدر آباد تک محدود رکھی جائے۔ اسی طرح اقبال کے دوست مولوی احمد دین ایڈووکیٹ نے بھی ۱۹۲۴ء میں اقبال نامی کتاب میں ان کے حالات کے ساتھ کلام کا مجموعہ شائع کر دیا، لیکن جب معلوم ہوا کہ اقبال خود اردو کلام کا مجموعہ مرتب کر رہے ہیں تو بے حد نادم ہوئے اور اپنے مجموعے کو نذرِ آتش کر دیا۔ بانگِ درا کی ترتیب میں چوہدری محمد حسین نے اقبال کی مدد کی۔ دیباچہ سر عبدالقادر نے تحریر کیا۔ کتاب شائع ہوتے ہی اتنی مقبول ہوئی کہ ہاتھوں ہاتھ بک گئی۔

اقبال کی دونوں بیویاں سردار بیگم اور مختار بیگم ۱۹۱۳ء سے لے کر ۱۹۲۳ء تک اولاد سے محروم رہیں، مگر عجیب اتفاق ہے کہ ۱۹۲۴ء کے اوائل میں دونوں قریباً ایک ہی وقت امید سے ہوئیں۔ دونوں کی آپس میں بے حد محبت تھی۔ اس لیے طے پایا کہ دونوں اپنی اپنی اولاد کا تبادلہ کر لیں گی اور ایک کی اولاد دوسری پالے گی۔ اقبال کو جب معلوم ہوا کہ ان کی دونوں بیگمات امید سے ہیں تو ۱۹۲۴ء کی گرمیوں میں شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ کے مزار پر سرہند شریف پہنچے اور دعا کی کہ اگر خدا تعالیٰ انہیں اولادِ نرینہ سے نوازے تو پھر اسے احیائے اسلام اور مسلمانوں کی خدمت اسی طرح انجام دینے کی توفیق عطا کرے جس طرح شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ کو عطا کی تھی۔

اقبال اپنے محبوب صوفیہ کے مزاروں پر اکثر حاضری دیتے تھے اور علماء و مشائخ کے طبقے میں جس کسی کی بھی شہرت سنتے، اس کی خدمت میں حاضر ہو کر استفادہ کرتے۔ ان کے مہاراجہ کشن پرشاد کے نام چند خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعض بزرگ ہستیوں یا مجذوبوں کے متعلق سن کر ملاقات کے شوق میں ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اسی طرح ایک دن لاہور سے چند میل کے فاصلے پر قصبہ شرق پور میں ایک نہایت متقی اور پرہیزگار بزرگ میاں شیر محمد کے متعلق سنا اور ان کی خدمت میں پہنچے، میاں شیر محمد ہمیشہ احترام شریعت پر اصرار کرتے تھے اور جو کوئی بھی انہیں ملنے آتا اسے ڈاڑھی رکھنے کی سخت تاکید کرتے۔ جب اقبال انہیں ملے تو وہ مسجد میں بیٹھے تھے۔ پوچھا: کیسے آئے ہو؟ جواب دیا: میرے لیے دعا کیجیے۔ فرمایا:

تم ڈاڑھی منڈاتے ہو، میں تمہارے لیے دعا نہیں کروں گا۔ اقبال یہ سن کر اٹھے اور مسجد سے نکل کر تانگوں کے اڈے کی طرف چل دیئے اسی اثنا میں میاں شیر محمد کے پاس بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے کسی نے کہہ دیا کہ یہ اقبال تھے۔ یہ سُن کر میاں شیر محمد کی عجیب حالت ہوئی۔ عبدالمجید سالک تحریر کرتے ہیں:

مسجد سے نکل کر ننگے پاؤں اڈے کی طرف دوڑے، علامہ تانگے پر سوار ہو ہی رہے تھے کہ یہ آن پہنچے، بے حد معذرت کی اور کہا کہ میں عام لوگوں کو ڈاڑھی رکھنے کی تاکید کرتا رہتا ہوں، لیکن میرے نزدیک آپ جیسے شخص پر جس نے لاکھوں کروڑوں مسلمانوں کے قلوب میں ایمان وعمل کے چراغ روشن کر دیے ہیں۔ ڈاڑھی کے معاملے میں سختی کرنا مناسب نہیں۔ اس کے بعد علامہ کے لیے دعا کی اور علامہ مسرور و مطمئن واپس لاہور آئے۔

بہر حال اقبال کے اہلِ دل مشائخ سے ملاقات کے شوق سے ظاہر ہے کہ وہ کسی ایسی ہستی کی تلاش میں تھے جو ان پر ایک ہی نگاہ ڈال کر ان کی روحانی تکمیل کر دے، جیسے خواجہ باقی باللہ نے شیخ احمد سرہندی کو خلوت میں لے جا کر ذکرِ قلبی کی تلقین کی تھی اور ان کی توجہ سے اسی وقت ذکرِ قلبی جاری ہو گیا اور شیخ احمد سرہندی نے ایسی حلاوت محسوس کی جو آناً فاناً ترقی کرنے لگی، جس کے ذریعے انہوں نے منازل سلوک طے کیں، ایک نئی نوعیت وطرز سے احیائے دین کا کام مکمل کیا، طریقت کو شریعت کے تابع بنایا اور وسائل کو مقاصد تک پہنچایا، لیکن اقبال کو اپنی جستجو میں کامیابی نہ ہوئی۔

۵/اکتوبر ۱۹۲۴ء کو رات ساڑھے نو بجے راقم سیالکوٹ میں سردار بیگم کے بطن سے پیدا ہوا۔ شیخ نور محمد نے کان میں اذان دی اور اپنے بڑے پوتے آفتاب کی نسبت سے راقم کا نام قمر الاسلام تجویز کیا، لیکن اقبال کو یہ نام پسند نہ آیا اور پہلے سے اپنے سوچے ہوئے نام جاوید کو ترجیح دی۔ لہٰذا راقم کا نام جاوید رکھا گیا۔

انہی دنوں مختار بیگم بچے کی پیدائش کے لیے لدھیانے اپنے میکے گئی ہوئی تھیں۔ اقبال لاہور ہی میں تھے اور اعجاز احمد ان کے پاس کسی کام کے سلسلے میں آئے ہوئے تھے۔ توقع تھی کہ اکتوبر کے آخر میں لدھیانے سے بھی خوشی کی خبر آئے گی، لیکن لدھیانے میں مختار بیگم کو زچگی کی حالت میں نمونیہ ہو گیا اور ان کی تشویش ناک علالت کی اطلاع لاہور پہنچی۔ اقبال بے حد متفکر ہوئے اور ۱۹/اکتوبر ۱۹۲۴ء کو افراتفری کے عالم میں اعجاز احمد کو ساتھ لے کر لدھیانہ پہنچے،

مگر مختار بیگم ۲۱/ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو فوت ہو گئیں۔ فقیر سید وحید الدین اعجاز احمد کی زبانی تحریر کرتے ہیں:

نمونیہ نے چچی مختار کو سخت کمزور کر دیا تھا اور وہ وضع حمل کی زحمت برداشت کرنے کے قابل نہ رہی تھیں۔ انہوں نے جان دے دی۔ وفات سے پندرہ منٹ پہلے چچا جان نے ان کو دیکھا اور حال پوچھا تو انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اس دردناک وفات نے چچا جان کے قلب پر بڑا اثر کیا۔ ان کے کرب اور بے چینی کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔ وفات کے دوسرے دن لدھیانہ سے میرے ابا جان کو لکھا: کل آپ کی خدمت میں تار دے چکا ہوں۔ تقدیر الٰہی کا مقابلہ تدبیر انسانی سے نہیں ہو سکتا۔ مرحومہ کی موت کا منظر نہایت درد انگیز تھا۔ خدا تعالیٰ اس کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ مزید لکھا: ایک معمولی انسان کو دنیا میں لانے کے لیے، جو پچاس ساٹھ سال سے زیادہ اس دار فانی میں نہیں ٹھہرتا نیچر اس قدر تکلیف ایک ضعیف عورت کو دیتی ہے۔ اس خط میں سردار چچی کے نام پیغام تھا کہ انہیں مرحومہ کی خالہ زاد بہنوں کو ہمدردی کا خط لکھنا چاہیے اور کہنا چاہیے کہ میں تا عمر تمہاری بہن ہوں اور ہمیشہ تم کو ایسا ہی سمجھوں گی۔ سردار چچی جان نے نہ صرف ایسا خط ہی لکھا بلکہ پھر زندگی بھر اس عہد کو نبھایا۔ چچا جان کی طبیعت بہت دنوں تک نہایت پریشان رہی۔ مرحومہ کی لوحِ مزار تیار کرا کے لاہور سے بھجوائی۔ جس پر حسبِ ذیل قطعۂ تاریخ کندہ تھا:

اے دریغا! ز مرگِ ہم سفرے
دلِ من در فراقِ او ہمہ درد
ہاتف از غیب داد تسکینم
سخن پاک مصطفی آورد
بہر سال رحیل او فرمود
بشہادت رسید و منزل کرد

یہ قطعہ لدھیانے کے قیام کے دوران میں ہی وفات کے دوسرے یا تیسرے دن کہا تھا۔ جس کاغذ پر لکھا تھا، وہ میرے سپرد کر دیا تھا کہ لاہور پہنچ کر انہیں دے دوں۔

سردار بیگم جب راقم کے ہمراہ لاہور واپس پہنچیں تو ان سے مختار بیگم کی جدائی برداشت نہ ہوتی تھی۔ گھر میں تنہا بیٹھی روتی رہتیں۔ اقبال نے انہیں بارہا صبر کرنے کی تلقین کی، مگر

سردار بیگم یہی کہتیں کہ مرحومہ کی گیارہ سالہ رفاقت کے بعد وہ شدید تنہائی محسوس کرتی ہیں۔ انہوں نے اقبال سے استدعا کی کہ مرحومہ کی کسی خالہ زاد بہن سے عقد کر لیں اور یوں سردار بیگم کو مختار بیگم کی بجائے گھر میں ان کی بہن کی رفاقت میسر آ جائے۔ اقبال اسے مذاق سمجھ کر ٹالتے رہے، لیکن سردار بیگم کا اصرار تھا کہ خاندانوں کا تعلق قائم رکھنے کے لیے مروت کا تقاضا یہی ہے کہ وہ اس سلسلے میں مرحومہ کے بھائی سے بات کریں۔ بالآخر ایک مرتبہ اقبال اور مرزا جلال الدین، نواب سر ذوالفقار علی خان کو ملنے دہلی گئے۔ اقبال نے سردار بیگم کی ضد کا تذکرہ ان دونوں سے کیا۔ نواب سر ذوالفقار علی خان نے مشورہ دیا کہ مرزا جلال الدین بات کریں چنانچہ اقبال اور مرزا جلال الدین واپسی پر لدھیانہ اترے اور مرزا جلال الدین نے اس سلسلے میں مختار بیگم کے بھائی لالہ غلام محمد سے بات چھیڑی، لیکن انہوں نے بات ٹال دی اور یوں سردار بیگم کی آرزو پوری نہ ہو سکی۔

۳۰/ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو اقبال نے انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں اپنی غزل ''نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا'' الخ پڑھی۔ یہ جلسہ اسلامیہ ہائی اسکول بھاٹی دروازے میں منعقد ہوا تھا اور بقول عبدالمجید سالک، انجمن کے بے حد کس مپرسی کی حالت میں ہونے کے سبب اس کے سالانہ اجلاس بھی اب محض بغرض خانہ پری ہی منعقد ہونے لگے تھے۔

۳/ نومبر ۱۹۲۴ء کے زمیندار میں سلطان ابنِ سعود کی حمایت میں اقبال کا بیان شائع ہوا۔ صورت اصل میں یہ تھی کہ ہندوستان کے بعض علماء کے نزدیک حجاز کا نظام حکومت سابق خلیفہ ترکی عبدالمجید خان کے سپرد کیا جانا چاہیے تھا۔ اس سلسلہ میں انگریزی اخبار مسلم آؤٹ لُک کے نمایندے نے اقبال کے خیالات معلوم کرنے کے لیے ان سے ملاقات کی اور دوران ملاقات اقبال نے حرم پاک کی خدمت و حفاظت کا منصب سابق خلیفہ عبدالمجید خان کے سپرد کرنے کی تجویز کے متعلق فرمایا:

> تجویز نامناسب ہے اور اگر موجودہ نازک صورت حالات میں اس پر زیادہ زور دیا گیا تو اندیشہ ہے کہ کہیں دنیائے اسلام کے پیچیدہ معاملات میں مزید الجھنیں پیدا نہ ہو جائیں۔ ابن سعود عام وہابیوں کا نمائندہ ہے اور سابق خلیفۃ المسلمین سُنی دنیائے اسلام کے دینی پیشوا رہ چکے ہیں۔ حجاز اس وقت عملاً وہابیوں کے قبضے میں ہے اگر اس حالت میں سابقہ خلیفۃ المسلمین کو حاکمِ حجاز بنانے کی کوشش کی گئی تو اندیشہ ہے کہ مسلمانوں کے ان دو فرقوں میں سخت کشمکش

شروع ہو جائے گی۔ میں اس انتظام کو عارضی اور ہنگامی طور پر بھی مناسب نہیں سمجھتا میری رائے یہ ہے کہ ایسی تجویز کا پیش کرنا ہی ایک غلطی ہے۔ میں حجاز کی موجودہ صورت حالات سے پورے طور پر مطمئن ہوں اور ابن سعود پر بدون تذبذب اعتماد رکھتا ہوں۔ میری رائے میں سلطان نجد ایک روشن خیال آدمی ہے اور جو لوگ سلطان موصوف سے ملے ہیں یا انہوں نے نجد کو دیکھا ہے، وہ میری اس رائے کے مؤید ہیں ...... اس وقت دنیائے اسلام میں گونا گوں تغیرات کا سلسلہ قائم ہے لیکن ابن سعود چونکہ خود نمایندگان اسلام کی موتمر منعقد کرنے کے خواہاں ہیں اس لیے توقع ہے کہ وہ اس موتمر کے فیصلے کی پابندی کریں ...... بہت ممکن ہے کہ عرب میں ابن سعود کے ماتحت ایک زبردست قومی تحریک نشوونما پائے اور اس کے آثار و علائم نظر آ رہے ہیں۔ اس احساس خودی کا ہمیں تہ دل سے خیر مقدم کرنا چاہیے، اگرچہ اس کی تہ میں تجرد و تفرید کے مادہ کے نشوونما کا بھی اندیشہ ہے، لیکن ہمیں کچھ مدّت تک اس تجرد و تفرید کو بھی برداشت کرنا چاہیے۔ عرب فطرتاً جمہوریت پسند ہیں اور سرزمینِ عرب میں کوئی مطلق العنان حکومت زیادہ مدت تک قائم نہیں رہ سکتی۔

اقبال نے تجویز پیش کی کہ سابق خلیفہ کو چاہیئے کہ بغرضِ تبلیغِ اسلام ایک وسیع بین الاقوامی تنظیم قائم کرے جسے دنیائے اسلام کے مختلف مما لک کی مالی امداد حاصل ہو۔ اس تنظیم کے تحت مبلغین کی ایک وسیع بین الملّی تبلیغی درس گاہ قائم کی جائے اور مبلغین، اسلام کی مشعل ہاتھ میں لے کر دنیا کے ہر گوشے میں پہنچ جائیں۔

۱۹۲۵ء میں پنجاب ہائی کورٹ میں ایک مسلم جج کے تقرر کا مسئلہ پیدا ہوا۔ سر شادی لعل چیف جسٹس تھا۔ صوبے بھر کے مسلم اخباروں، انجمنوں، وکیلوں اور تعلیم یافتہ لوگوں نے مطالبہ کیا کہ اقبال کو ان کی قابلیت اور روشن دماغی کی بنا پر عدالت عالیہ کا جج مقرر کیا جائے۔ مگر سر شادی لعل نے ان کے متعلق یہ ریمارکس دیے کہ ہم اقبال کو شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں، قانون دان کی حیثیت سے نہیں۔ چنانچہ اقبال جج نہ بن سکے اور اسامی کو پُر کرنے کے لیے سر شادی لعل کی خواہش کے مطابق یوپی سے سید آغا حیدر کا تقرر عمل میں آیا۔

سر شادی لعل ایک متعصب ہندو تھا اور مسلمانوں کے خلاف اس کا تعصب پنجاب بھر میں مشہور تھا۔ وہ پنجاب کی عدالت عالیہ میں ۱۹۱۳ء میں ایڈیشنل جج مقرر ہوا اور ۱۹۱۷ء میں مستقل جج بنا دیا گیا۔ ۱۹۲۰ء میں جب عدالت کے چیف جسٹس کی تقرری کا

سوال پیدا ہوا تو لاہور کی معروف میاں فیملی کے سربراہ سر محمد شفیع نے خاص طور پر وائسرائے کو کہہ کر اس کا تقرر کروایا۔ اس سلسلے میں سر محمد شفیع کی غیر مطبوعہ یادداشتوں کی کتاب کے اندراجات غور طلب ہیں۔ مثلاً ۳۰ جنوری ۱۹۲۰ء کا اندراج ہے:

راجہ نریندر ناتھ چائے پر آئے اور شکوہ کیا کہ ہندوؤں کے ساتھ حکومت پنجاب کا رویہ نہایت غیر ہمدردانہ ہے۔ آئی سی ایس، امپیریل پولیس سروس اور ریاست بہاولپور کی ریجنسی کونسل سے متعلق ان کے دعووں کو نظر انداز کیا گیا ہے اور مجھے (وائسرائے کی کونسل میں) ایک ہندوستانی رکن کی حیثیت سے کچھ کرنا چاہیے۔ انہوں نے سفارش کی کہ شادی لعل کا تقرر بحیثیت چیف جسٹس ایک صحیح فیصلہ ہوگا، میں نے امداد کا وعدہ کیا۔

۱۹/فروری ۱۹۲۰ء کا اندراج اس سلسلے میں وائسرائے سے ہفتہ وار ملاقات کے بارے میں ہے:

وائسرائے نے مجھے یہ بھی بتایا کہ انہوں نے سیکرٹری آف سٹیٹ کو لکھ دیا ہے کہ اگر چیمیئر یا اس جیسی اہلیت کا کوئی شخص نہ مل سکے تو وہ شادی لعل کے چیف جسٹس پنجاب کی حیثیت سے تقرر کی سفارش کریں گے۔ میں نے ان سے اپنے اطمینان اور مسرت کا اظہار کیا، نیز انہیں یقین دلایا کہ شادی لعل کا تقرر پنجاب کے لیے بہتری کا باعث ہوگا۔

پھر ۲۲ اپریل ۱۹۲۰ء کے اندراج میں تحریر کرتے ہیں:

میں نے وائسرائے سے کہا کہ میں نے حال ہی میں لاہور اور امرتسر کا دورہ کیا ہے اور اگرچہ ابھی تک وہاں کی فضا میں کشیدگی موجود ہے، لیکن مجھے یقین ہے کہ شادی لعل کا تقرر بحیثیت چیف جسٹس تعلیم یافتہ طبقے اور ہر مذہبی حلقے میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

سو، ۱۹۲۱ء میں سر محمد شفیع کی کوششوں ہی سے سر شادی لعل عدالت عالیہ پنجاب کا چیف جسٹس بنا۔ مگر چیف جسٹس مقرر ہوتے ہی وہ سر محمد شفیع کی میاں فیملی کا حریف بن گیا، اور اسے ہر ممکن طریق سے نیچا دکھانے کی کوشش کرنے لگا۔ ویسے تو سر شادی لعل اپنے تعصب کے سبب پنجاب کی ہر اہم مسلم شخصیت کے خلاف تھا، لیکن اقبال سے اس کی دشمنی کی وجہ یہ بھی تھی کہ ان کے میاں فیملی سے بہت اچھے تعلقات تھے۔ مرزا جلال الدین تحریر کرتے ہیں:

میں کراچی گیا ہوا تھا۔ شادی لعل مجھ سے ملے اور کہنے لگے کہ میاں محمد شفیع اقبال کو بہت ناپسند کرتا ہے، کہتا ہے کہ وہ شرابی ہے، چال چلن بھی اچھا نہیں۔ یہ بات ڈاکٹر اقبال کے مستقبل کے لیے

بہت بُری ہے۔ ڈاکٹر صاحب میرے ساتھ ہو جائیں تو بہت اچھا ہے۔ میں لاہور آیا تو ڈاکٹر صاحب سے ذکر کیا۔ وہ بولے: مرزا صاحب! شادی لعل اپنا الو سیدھا کرنا چاہتا ہے۔ اس کا اپنا مطلب ہے ہمیں کیا مصیبت پڑی ہے کہ اس جھگڑے میں پڑیں۔ ہم اس کا ساتھ نہیں دے سکتے۔

اقبال گو نظریاتی طور پر مسلم قومیت کے اصول پر کار بند تھے لیکن اپنی نجی زندگی میں انہوں نے مذہبی اختلافات کو کبھی کوئی اہمیت نہ دی ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ ان کے گہرے دوستانہ مراسم تھے اور بعض ہندو عقیدت مند اپنے اشعار میں ان سے اصلاح بھی لیتے تھے۔ سر تیج بہادر سپرو نے اقبال کی وفات کے چند ماہ بعد ایک خط میں مولانا عبدالحق بابائے اردو کو تحریر کیا:

اقبال کے ساتھ میرے خیال میں وہ لوگ بہت بے انصافی کرتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ وہ محض اسلامی شاعر تھا۔ یہ کہنا اس کے دائرہ کو محدود کرنا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس نے اسلامی فلسفہ، اسلامی عظمت اور اسلامی تہذیب پر بہت کچھ لکھا ہے لیکن کسی نے آج تک ملٹن کی نسبت یہ کہہ کر وہ عیسائی مذہب کا شاعر تھا، یا کالی داس کی نسبت یہ کہہ کر کہ وہ ہندو مذہب کا شاعر تھا، اس کے اثر کو محدود نہ کیا اور نہ مذہب کے آدمیوں نے اس وجہ سے اس کی قدردانی میں کمی کی۔ اگر وہ اسلامی تاریخ کے بڑے کارناموں کے بارے میں، یا اسلامی عظمت کا تذکرہ کرتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ غیر مسلم اس کی قدر نہ کریں، بال جبریل میں (میں صرف تمثیلاً عرض کرتا ہوں) جو نظم متعلق ہسپانیہ لکھی ہے، کیا اس کا اثر صرف مسلمانوں ہی کے دل پر ہوسکتا ہے؟ ...... شاعری اور تخیل ایک طرف، ان کے اشعار کی زبان دوسری طرف۔ آج کل جو مسئلہ زبان کے اوپر بحث چھڑی ہوئی ہے، اس پر اکثر غور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ جس زبان میں یہ درد، یہ قدرت اور یہ وسعت ہے، جو ان اشعار میں پائی جاتی ہے، اس کو ہم کیوں چھوڑیں۔ مگر زمانے کی فضا بدلی ہوئی ہے۔ رنگ بدلا ہوا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ مزاجِ یار دگرگوں ہے۔ ایجاد اور مرجاو کا مقابلہ ہے۔ خدا معلوم ہم کہاں سے کہاں پہنچیں۔

بہرحال عام مسلمانوں کو تو ذکر ہی کیا، اقبال جیسی شخصیت بھی اپنی تمام صلاحیتوں اور صلح جوئی کے باوجود، سر شادی لعل جیسے ہندو کے تعصب کا نشانہ بنی۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ تحریر راقم کی نظر سے گزری ہے جو ہندوستان کے ایک نابینا ادیب وید مہتہ کی اپنے خاندان کے متعلق

انگریزی میں لکھی ہوئی یادداشتیں ہیں اور جو امریکی رسالہ نیویارکر میں تین اقساط میں پر وفائلز کے زیرعنوان شائع ہوئیں۔ ویدمہتہ کے والد بابوجی سے سرشادی لعل کا گہرا دوستانہ تھا۔ ویدمہتہ تحریر کرتے ہیں:

ایک شام سرشادی لعل، بابوجی سے مخاطب ہوکر کہنے لگے، مجھے مبارک باد دو بھائی! آج میں نے دو پنجابی مسلمانوں کی بطخ پکادی ہے (یعنی انہیں ختم کر دیا ہے) کیا تمہیں معلوم ہے کہ ہائی کورٹ میں ایک جج کی اسامی خالی تھی، خیر! ہزایکسیلنسی، گورنر نے مجھے اپنے ہاں بلوایا اور پوچھا کہ سرمحمد اقبال اور خان بہادر شاہ نواز (یعنی میاں شاہ نواز، سرمحمد شفیع کے داماد) کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے، کیونکہ خالی اسامی کے لیے یہ دو نام ان کے زیرغور تھے۔ میں نے جواب دیا، ان دو میں سے کوئی ایک بھی بنچ کے لیے نہایت مناسب انتخاب ہوگا، لیکن یور ایکسیلنسی آپ ان سے انٹرویو کیوں نہیں کر لیتے۔ پھر ہم فیصلہ کرسکیں گے کہ ان دونوں میں سے کون سا بنچ کے لیے موزوں ہے۔ اس کے بعد میں اقبال کے پاس گیا اور اسے اطلاع دی کہ گورنر اس سے ججی سے متعلق انٹرویو کرنے والے ہیں اور اس کا سب سے بڑا حریف شاہ نواز ہے۔ میں نے اس کا بازو پکڑتے ہوئے رازدارانہ لہجے میں کہا، اقبال! جب تم گورنر سے ملو تو انہیں ضرور بتانا کہ شاہ نواز کس قسم کا آدمی ہے، یعنی وہ طوائفوں اور خانگیوں سے میل جول رکھتا ہے۔ اقبال سے فارغ ہوکر میں شاہ نواز کے ہاں گیا اور اسے بھی یہی مشورہ دیا کہ گورنر کو ضرور بتانا کہ اقبال فاحشہ عورتوں سے میل جول رکھتا ہے اور ان کے لیے اشعار بھی لکھتا ہے۔ جب ان کے انٹرویو ہوئے تو انہوں نے ایک دوسرے پر خوب کیچڑ اُچھالا۔ گورنر نے بعد میں مجھ سے کہا، توبہ! دونوں کتنے بیہودہ آدمی ہیں۔ سو آج میں نے گورنر سے اپنی پسند کے الہ آباد سے تعلق رکھنے والے ایک اچھے اور فرمانبردار مسلمان کا تقرر ججی کے لیے کروالیا ہے۔ بابوجی نے اپنی سوٹی زمین پر پٹختے ہوئے کہا، تم نے بہت بڑی غلطی کی شادی لعل! اقبال اور شاہ نواز دونوں مشہور اور قابل شخصیتیں ہیں۔ اگر تم ان میں سے کسی ایک کا تقرر کروادیتے تو وہ تمام عمر تمہارا احسان مند رہتا اور یوں ایک معروف پنجابی شخصیت تمہاری جیب میں ہوتی۔ سرشادی لعل نے جواب دیا، میری جیب میں الہ آباد کا جج جو ہے، مجھے اور کیا چاہیے۔ بابوجی بولے، لیکن تم نے دو طاقتور پنجابی مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے اپنا دشمن بنالیا۔ سرشادی لعل نے حقارت آمیز لہجے میں کہا: اقبال اور شاہ نواز کو ایک دوسرے کا گلا کاٹنے دو! پنجابی مسلمان اسی کے

مستحق ہیں۔

اگر وید مہتہ کی یادداشتیں درست ہیں اور سر شادی لعل اور ان کے والد کے مابین یہ گفتگو واقعاتی طور پر ہوئی ہے تو اس سے عیاں ہے کہ سر شادی لعل معروف وکیل اور عدالت عالیہ کا چیف جسٹس ہونے کے باوجود ایک مکار، جھوٹا اور کمینہ فطرت آدمی تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال اور میاں شاہ نواز ایک دوسرے کے انتہائی گہرے دوست تھے اور آخری دم تک ان کی دوستی قائم رہی۔ اس کے علاوہ وہ دونوں سر شادی لعل کو خوب سمجھتے تھے۔ اس لیے سر شادی لعل کے لیے یہ قطعی ممکن نہ تھا کہ دونوں کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکا سکے اور پھر اس کے بھڑکانے پر دونوں گورنر کے سامنے جا کر ایک دوسرے پر کیچڑ اُچھالنے لگیں۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ انگریزوں کا زمانہ بہتر تھا اور آزادی کے بعد ان کی قائم کردہ عدلیہ کا وقار معیاری ججوں کے تقرر میں لازمی احتیاط کی عدم موجودگی کے سبب گر گیا ہے، مگر یہ بات درست نہیں۔ انگریزوں ہی کے زمانے میں سر شادی لعل جیسا مکار، جھوٹا اور کمینہ فطرت شخص تیرہ برس کی مدت تک پنجاب کی عدالت عالیہ کا چیف جسٹس رہا، لیکن کوئی اس کا بال بھی بیکا نہ کر سکا۔ اسی طرح ججوں کے تقرر میں اخلاقی گراوٹ کی بعض اور مثالیں بھی موجود ہیں۔ ۱۹۳۴ء میں جب سر شادی لعل ریٹائر ہوا تو لاہور کے ہندو اخبار ملاپ نے ایک جھوٹی خبر شائع کی کہ اقبال سر شادی لعل کے خلاف مظاہرہ کرنا چاہتے تھے اور اس سازش میں مولانا ظفر علی خان بھی شامل تھے، لیکن دفعتہ یہ بھانڈا پھوٹ گیا۔ اس جھوٹی خبر پر پنجاب ہی کے نہیں بلکہ ہندوستان بھر کے مختلف مسلم اخباروں نے تبصرہ کیا۔ روزنامہ خلافت بمبئی نے سر شادی لعل کے عہد انصاف کے متعلق تحریر کیا:

سر شادی لعل پنجاب ہائی کورٹ کے چیف جسٹس اپنی مدتِ ملازمت ختم کر کے انگلستان جا رہے ہیں۔ لاہور کی متعدد جماعتوں کی طرف سے انہیں سپاسنامے پیش کیے جا رہے ہیں، جن میں ہندو بھی ہیں اور سکھ بھی۔ مسلمانوں کو ظاہر ہے ان کے عہد انصاف سے شکایت ہے۔ انہیں بجا طور پر یہ احساس ہے کہ اپنے زمانہ ملازمت میں انہوں نے مسلمانوں کے حقوق نظر انداز کیے اور ہائی کورٹ میں مسلمانوں کی نمایندگی ہمیشہ قلیل رکھی۔ اس پر اگر وہ انہیں خوش دلی سے رخصت نہ کریں تو اس پر شکایت کا کیا موقع ہے۔ ملاپ نے نہایت عامیانہ اور سوقیانہ لب و لہجے میں ایک اطلاع شائع کی ہے کہ سر اقبال، سر شادی لعل کے خلاف مظاہرہ کرنا چاہیے تھے۔ اس سازش میں ظفر علی خان جیسا پیشہ ور ایجی ٹیٹر بھی شامل تھا لیکن دفعتہً یہ بھانڈا پھوٹ

گیا۔ ملاپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ مسلم زعما کے متعلق اس کا یہ لب ولہجہ بہت ناگوار ہے اور اسے اس طرزِ عمل میں اصلاح کرنا پڑے گی۔ سر شادی لعل، ملکِ معظم نہیں ہیں، جن کے خلاف سازش کی جائے، نہ مسلمانوں کی نظر میں انہیں اتنی اہمیت حاصل ہے کہ وہ ان کی پوزیشن پر حملہ کریں۔ بلاشبہ مسلمانوں کو سر شادی لعل سے شکایات ہیں، لیکن وہ اتنے بزدل نہیں ہیں کہ وہ ان کے خلاف سازش کرتے پھریں۔ ان کی جو شکایات ہیں، وہ اعلانیہ ہیں۔ پریس اور پلیٹ فارم پر بارہا اس کا تذکرہ آچکا ہے۔ نہ سر شادی لعل کو سراڈوائر جیسے اختیاراتِ ملوکانہ حاصل ہیں کہ لوگ ان کے خلاف کچھ کہتے ہوئے ڈریں۔ وہ ایک ملازم سرکار تھے۔ ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ جائز حدود میں ان پر نکتہ چینی کرے اور ان سے شکایات کرے۔ رہی اقبال کی ہائی کورٹ کی ججی سے محرومی کی داستان تو اسے سب جانتے ہیں کہ اگر اقبال ہائی کورٹ کا جج ہو جائے یہ ہائی کورٹ کا اعزاز ہوگا۔ اقبال کی سر بلندی میں اس سے کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا۔ سر شادی لعل ہائی کورٹ کے چیف جسٹس بنیں، پنجاب کے گورنر بنا دیے جائیں، پھر بھی وہ اقبال کی عظمت کے مالک نہیں ہو سکتے۔ ان کا اور اقبال کا مقابلہ ہی کیا۔ اقبال جس مقامِ بلند پر آج فائز ہے، سر شادی لعل کا وہاں تک پہنچنا بہت دشوار ہے۔

اس دور میں اقبال صرف ہندو تعصب ہی کا شکار نہ ہوئے بلکہ ان علماء کو بھی جو عرصۂ دراز سے ان کے خلاف اُدھار کھائے بیٹھے تھے، اقبال پر کفر کا فتویٰ صادر کرنے کا بہانہ مل گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سلطان ابن سعود کے حامیوں اور مخالفوں کے درمیان، کشمکش جاری تھی اور ہندوستان کے مسلمان دو مذہبی گروہوں، یعنی وہابیوں اور سنیوں میں بٹے ہوئے تھے۔ اقبال نے سلطان ابن سعود کی حمایت میں بیان دے کر ان کے مخالف علماء کی عداوت مول لے رکھی تھی۔ اسی اثنا میں کسی پیرزادہ محمد صدیق سہارنپوری نے ایک استفتاء مرتب کر کے مولانا ابو محمد سید دیدار علی شاہ خطیب مسجد وزیر خان کو بھی بھیج دیا۔

یہ صاحب بقولِ عبدالمجید سالک، اپنے شوقِ تکفیر کے لیے بے حد مشہور تھے۔ چنانچہ کئی مسلم زعما کو کافر قرار دے چکے تھے۔ استفتاء میں تحریر کیا گیا:

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اور حامیان شرع مبین اس مسئلے میں کہ ایک شخص اشعار میں آفتاب کو خدائی صفات کے ساتھ متصف کرے اور اس سے مرادیں طلب کرے، آخرت پر یقین نہ رکھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر سے استہزا کرے، علمائے کرام اور پیران

عظام پر آوازے کسے اور انہیں بُرے خطابات سے یاد کرے۔ ہندوؤں کے ایک بزرگ کو جسے وہ خدا کا اوتار مانتے ہیں، امام اور چراغ ہدایت کے الفاظ سے یاد کرے اور اس کی تعریف میں رطب اللسان ہو۔ کیا ایسا آدمی اسلام پر ہے یا کفر پر؟ اس کے ساتھ لین دین، نشست و برخاست اور ہر طرح کا مقاطعہ کرنا جائز ہے یا ناجائز اور نہ کرنے والوں کے متعلق کیا حکم ہے؟ بینوا و توجروا۔ اشعار حسب ذیل ہیں:

آفتاب

۱۔ اے آفتاب ! ہم کو ضیائے شعور دے
چشمِ خرد کو اپنی تجلّی سے نور دے
ہے محفلِ وجود کا ساماں طراز تو
یزدانِ ساکنانِ نشیب و فراز تو
ہر چیز کی حیات کا پروردگار تو
زائیدگانِ نور کا ہے تاجدار تو
نے ابتدا کوئی، نہ کوئی انتہا تری
آزادِ قید اوّل و آخر ضیا تری
(ترجمہ گایتری منتر)

۲۔ کہاں کا آنا، کہاں کا جانا، فریب ہے امتیازِ عقبیٰ
نمود ہر شے میں ہے ہماری، کوئی ہمارا وطن نہیں ہے

۳۔ خصوصیت نہیں کچھ اس میں، اے کلیم ! تری
شجر حجر بھی خدا سے کلام کرتے ہیں

۴۔ غضب ہیں یہ مرشدانِ خود بیں، خدا تری قوم کو بچائے
بگاڑ کر تیرے مسلموں کو، یہ اپنی عزت بنا رہے ہیں

رام کی تعریف میں فرماتے ہیں:

۵۔ اس دیس میں ہوئے ہیں ہزاروں ملک سرشت
مشہور جن کے دم سے ہے دنیا میں نامِ ہند
ہے رام کے وجود پہ ہندوستان کو ناز

اہل نظر سمجھتے ہیں اس کو امامِ ہند
اعجاز ، اس چراغِ ہدایت کا ہے یہی
روشن تر از سحر ہے ، زمانے میں شامِ ہند
تلوار کا دھنی تھا، شجاعت میں فرد تھا
پاکیزگی میں جوشِ محبت میں فرد تھا

(المستفتی پیرزادہ محمد صدیق سہارنپوری)

فتویٰ

بسم اللہ الرّحمن الرّحیم

اسم پروردگار اور یزداں عرفاً مخصوص ذاتِ جنابِ باری ہے اور اوتار ہنود کے نزدیک خدا کے جنم لینے کو کہتے ہیں۔ اندریں صورت یزداں اور پروردگار آفتاب کو کہنا صریح کفر ہے۔ علیٰ ہذا خدا کے جنم لینے کا عقیدہ بھی کفر اور توہین موسیٰ علیہ السلام بھی کفر اور توہین بزرگان دین فسق۔ لہٰذا جب تک ان کفریات سے قائل اشعار مذکورہ توبہ نہ کرے، اس سے ملنا جلنا تمام مسلمان ترک کر دیں، ورنہ سخت گنہگار ہوں گے۔

(ابومحمد دیدار علی، خطیب فی مسجد وزیر خان المرحوم)

یہ حقیقت ہے کہ اس فتوے سے مولوی دیدار علی پر ہر طرف سے ملامت کی بوچھاڑ ہوئی۔ لیکن یہ علماء کے طبقے کا اس شخص سے انتقام تھا، جس نے مسلمانوں کو خودی کا احساس دلا کر ایک قوم یا ملّت کی صورت میں متحد کرنے کی جسارت کی تھی۔

باب: ۱۵

عملی سیاست کا خارزار

اقبال نے ۱۹۲۶ء سے پیشتر عملی سیاست میں حصہ نہ لیا تھا۔ وہ شاید پہلی شخصیت تھے جس نے ہندوستان میں قومیت متحدہ کا خواب دیکھا تھا۔ تاہم انہوں نے کانگرس میں شمولیت اختیار نہ کی بلکہ برصغیر کو مختلف اقوام کا وطن ہی تصور کیا، مسلم قومیت کا خیال بھی کم از کم ۱۹۰۰ء سے اُن کی قومی شاعری میں موجود تھا۔ قیام انگلستان کے دوران میں پان اسلامک سوسائٹی یا مسلم لیگ کی برٹش کمیٹی سے ان کی وابستگی سرسری نوعیت کی تھی۔ لاہور واپسی پر مسلم لیگ کی صوبائی شاخ سے ان کا تعلق بھی ابتدائی فکری بنیادوں پر قائم ہوا۔ میثاق لکھنؤ اور خلافت کانفرنس کا دور اقبال کی ذہنی اور قلبی تنہائی کا دور تھا کیونکہ عدم تعاون کے حامی اور تعاون پسند دونوں قسم کے مسلم قائدین کے گروہ ان کے زاویہ نگاہ کو سمجھنے سے قاصر تھے۔

اقبال برصغیر میں مسلمانوں کی عملی سیاست کو ایک بیکار مشق، وقتی شور و شغب یا تحصیل جاہ کے لیے ذریعہ سمجھ کر ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس پس منظر میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ۱۹۲۶ء میں انہوں نے عملی سیاست کے میدان میں اترنے کا فیصلہ کیوں کیا؟ بات یہ ہے کہ قیام انگلستان کے دوران میں جب وہ انقلاب سے گزرے اور انہی ایام میں برصغیر میں مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخاب کا اصول تسلیم کر لیا گیا، تو اقبال، سرسید احمد خان کے سیاسی مکتبۂ فکر کو درست خیال کرتے ہوئے، ذہنی و قلبی طور پر اس سے وابستہ ہو گئے۔ اقبال اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ برصغیر میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو اپنا اپنا قومی تشخص ایک دوسرے سے الگ برقرار رکھنا چاہیے۔ اسی عقیدے کے پیشِ نظر اقبال اپنی تحریروں کے ذریعے مسلم قومیت کے اُصول اجاگر کرتے رہے۔ انہوں نے عملی سیاست کے خارزار میں اترنے کا قصد بھی اس لیے کیا کہ کسی نہ کسی طرح مسلمانوں کو اپنے مطالبات منوانے کے لیے قومی سطح پر منظم کر کے ہندو اکثریت اور انگریزی حکومت دونوں کے مقابلے میں کھڑا کیا جائے۔

منٹو مورلے اصلاحات کی بنا پر ۱۹۰۹ء میں جو ایکٹ منظور ہوا، گو اس میں مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخاب کا مطالبہ تسلیم کر لیا گیا تھا۔ مانٹیگو چیمسفورڈ کی رپورٹ پر مزید دستوری اصلاحات کی صورت میں ۱۹۱۹ء کا ایکٹ نافذ ہوا۔ اُس میں صوبوں کی کونسلوں میں نشستوں کی تعداد بڑھا دی گئی اور یوں نیا دوعملی نظام رائج ہوا۔ نئے دستور کے تحت پہلی مرتبہ ۱۹۲۳ء کے صوبائی انتخابات میں اقبال پر لاہور سے کونسل کی رکنیت کے لیے امیدوار کھڑا ہونے کے بارے میں زور دیا گیا، لیکن چونکہ اُسی حلقے سے اُن کے دوست میاں عبدالعزیز بیرسٹر کی امیدواری کا اعلان ہو چکا تھا، وہ اُن کے مقابلے میں کھڑے نہ ہوئے۔

۱۹۲۶ء کے ابتدائی مہینوں میں اقبال معمول کے مطابق وکالت کے شغل میں مصروف رہے۔ اب وہ موٹر کار میں عدالت عالیہ جایا کرتے تھے، جسے فیروز نامی ایک شوفر چلاتا تھا۔ انھی ایّام میں وہ زبورِ عجم لکھ رہے تھے اور مختلف یونیورسٹیوں کے امتحانات کے لیے پرچے بھی بناتے یا دیکھتے تھے۔ احباب کی محفلیں بھی جمتیں جن میں عالمی، ملکی یا صوبائی سیاسیات پر گفتگو ہوتی یا علمی، ادبی اور فلسفیانہ موضوعات زیرِ بحث آتے۔

اسی سال اقبال کے اصرار پر چوہدری محمد حسین نے پنجاب سول سیکرٹریٹ میں ملازمت کر لی۔ وہ پریس برانچ سے وابستہ ہوئے اور ترقی کرتے کرتے ہوم ڈیپارٹمنٹ تک پہنچے۔ وہ اقبال کے بے حد مخلص دوست اور ان سے بے پناہ محبت کرنے والے تھے۔ ملازمت اختیار کرنے کے بعد جلد ہی انگریزی حکومت نے ان سے اقبال کے ملاقاتیوں کی خفیہ رپورٹ دینے کا حکم دیا تو وہ ملازمت ترک کرنے پر تیار ہو گئے۔ تاہم اقبال کے اصرار پر انہوں نے ملازمت جاری رکھی اور بعد میں اقبال کے ساتھ مل کر ملاقاتیوں کی خفیہ رپورٹ تیار کر کے حکومت کو دیتے رہے۔

انھی ایّام میں چوہدری محمد حسین نے اقبال کے ساتھ اپنی ملاقاتوں کی یادداشت بھی لکھنا شروع کی۔ اس یادداشت میں دینی، علمی اور ادبی باتوں کے علاوہ بعض اندراجات بڑے دلچسپ ہیں۔ مثلاً ایک مقام پر تحریر کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ یک خاتون نے اقبال پر فریفتہ ہو کر انہیں شادی کی دعوت دے دی۔ جواب نہ ملنے پر اس نے اپنی طرف سے کسی شخص کو اقبال کے پاس بھیجا۔ اقبال نے معذرت کی اور کہا کہ وہ شادی شدہ ہیں اور انہیں مزید شادی کی فی الحال ضرورت نہیں۔ جب وہ مایوس ہو کر جا چکا تو اقبال نے سارا قصہ چوہدری محمد حسین کو کہہ سنایا۔

چوہدری محمد حسین بولے: واہ! آپ کو چاہیے تھا کہ میری طرف اشارہ کر کے کہہ دیتے کہ ڈاکٹر اقبال میں ہوں۔ اگر آپ نے خود بیاہ نہ کرنا تھا تو کم از کم میرا بندوبست تو ہو جاتا۔

میکلوڈ روڈ والی رہائش گاہ میں راقم کی پیدائش کے فوراً بعد اقبال نے اپنے سارے کبوتر احباب میں بانٹ دیئے اور کبوتر بازی کے شغل کو اس لیے ترک کر دیا کہ کہیں راقم بھی بڑا ہو کر ان کی دیکھا دیکھی کبوتر اُڑانے کی عادت نہ ڈال لے۔ گھر کی حالت خستہ تھی، لیکن ماحول نہایت پُرسکون تھا۔ کوٹھی کے بالمقابل میدان تھا جس کی ایک طرف قانون کی کتب سے بھرا منشی خانہ، اس کے ساتھ مہمان خانہ، برآمدہ، گیراج اور نوکروں کے چند کوارٹر تھے، اس مختصر سی عمارت کی بغل میں ایک قبرستان تھا، جس کا اب نام ونشان مٹ چکا ہے۔ کوٹھی کے سامنے برآمدے کے ستونوں میں لکڑی کے تختے جڑے تھے اور ایک چھوٹا سا سیمنٹ کا تھڑا تھا جس پر کرسیاں رکھی جاتی تھیں اور اقبال اور اُن کے احباب سردیوں میں دن کے وقت دھوپ میں یہیں بیٹھتے تھے، یا گرمیوں میں رات کو اقبال کا بستر لگایا جاتا تھا۔ برآمدے سے ایک دروازہ ڈرائنگ روم میں کھلتا تھا۔ یہ ایک وسیع کمرہ تھا جس میں قالین پر صوفے اور کرسیاں رکھی تھیں۔ دیوار پر ایک طرف سیمنٹ عرصے سے اُکھڑا ہوا تھا جسے چھپانے کی خاطر ملکہ وکٹوریہ کی بڑی تصویر آویزاں کی گئی تھی۔ ڈرائنگ روم کی دائیں جانب دروازہ ایک چھوٹے سے بغلی کمرے میں کھلتا تھا جو اقبال کی خواب گاہ تھا۔ اس کمرے میں لوہے کی اسپرنگ والی چارپائی پر وہ سردیوں میں سویا کرتے تھے۔ ساتھ ان کے استعمال کے لیے غسل خانہ بھی تھا۔ ڈرائنگ روم کی سامنے والی دیوار میں دروازہ ایک اور بڑے کمرے میں کھلتا تھا جس میں اقبال مع اہل وعیال عموماً گرمیوں میں دوپہر کو آرام کیا کرتے۔ باہر کے برآمدے میں دوسرا دروازہ زنانخانے کی طرف جانے کا راستہ تھا جو ایک ڈیوڑھی میں سے ہوتا ہوا اندر کے برآمدے تک جاتا تھا۔ اندر کے برآمدے کے سامنے ایک بڑا دالان تھا جس کے ایک طرف باورچی خانہ تھا اور سامنے اونچی دیوار تھی جو کوٹھی کی حدِفاصل تھی اور اُسے دیال سنگھ کالج کی گراؤنڈ سے علیحدہ کرتی تھی۔ اندر کے برآمدے سے ایک دروازہ دو وسیع کوٹھریوں میں کھلتا تھا جن کے ساتھ ایک غسل خانہ ملحق تھا۔

گھر کے تمام افراد کے لیے کھانا سردار بیگم خود پکاتی تھیں۔ تاہم اُن کی مدد کے لیے ایک ادھیڑ عمر کی کشمیری خاتون رحمت بی بی بھی تھیں، جنہیں ہر چھوٹا بڑا اماں وڈی، (بڑی اماں) کہہ کر بلاتا تھا۔ کوٹھی کی پشت پر مُصلّیوں (نومسلم) کا محلہ تھا جن کی لڑکیاں سردار بیگم سے قرآن مجید

پڑھنے آ تیں۔ کبھی کبھار اقبال کی بہنوں زینت بی یا کریم بی میں سے کوئی ایک بھی آ جاتیں اور یہیں ٹھہرتیں۔ اسی طرح اقبال کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد بھی تبدیلیِ آب و ہوا کے لیے لاہور آتے تو اقبال ہی کے پاس قیام کرتے، لیکن چونکہ اقبال کے والد شیخ نور محمد اب بہت ضعیف ہو چکے تھے، اس لیے اقبال انہیں ملنے کی غرض سے گرمیوں کی تعطیلات میں مع اہل و عیال سیالکوٹ چلے جایا کرتے۔ باہر منشی خانے میں تو منشی طاہر الدین یا موکل بیٹھا کرتے اور مہمان خانے میں اقبال کے بھتیجے مختار احمد مقیم تھے جو اپنی تعلیم مکمل کر لینے کے بعد سول سیکرٹریٹ میں ملازم ہوئے۔ اس دور میں راقم نے اقبال کے ہاں رشتے داروں کے علاوہ صرف دو مہمان مختار احمد والے مہمان خانے میں ٹھہرتے ہوئے دیکھے۔ ان میں سے ایک تو جنوبی ہند کے کوئی سر اور ڈاڑھی منڈے سوامی جی تھے جو کبھی کبھار لاہور آتے اور یہیں ٹھہرتے۔ وہ ہمیشہ ننگے پاؤں رہتے اور ہلکے کیسری رنگ کا کھدر کا چولا پہنتے جس کے اندر چمڑے کی ایک پیٹی میں اپنی رقم رکھتے تھے۔ دوسرا مہمان ایک جرمن تھا جو جغرافیائی نقشہ جات بنانے میں ماہر تھا اور جس نے ۱۹۲۹ء میں اقبال کی فرمائش پر انہیں برصغیر کی اس وقت کی مردم شماری کی رپورٹ کے مطابق، ہندو مسلم آبادی کے تناسب سے، ہندوستان اور اس کے مختلف صوبوں کے نقشے تیار کر کے دیئے۔ راقم نے اپنے بچپن میں یہ نقشے گھر میں بکھرے ہوئے دیکھے ہیں، لیکن بعد میں ضائع ہو گئے۔ راقم کی یادداشت کے مطابق ان نقشوں میں آبادی نقطوں کی صورت میں ظاہر کی گئی تھی۔ ہندو اور مسلم آبادی کی شناخت کے لیے یہ نقطے کیسری اور سبز رنگوں کی روشنائی سے بنائے گئے تھے۔

علی بخش کی امداد کے لیے اب ایک اور ملازم رحماں بھی رکھ لیا گیا تھا، جو علی بخش ہی کے گاؤں اٹل گڑھ ضلع ہوشیار پور کا رہنے والا تھا۔ میکلوڈ روڈ والی رہائش گاہ ایک ہندو بیوہ اور اس کے دو یتیم بچوں کی ملکیت تھی۔ اسی خیال کے پیشِ نظر اقبال نہ صرف کوٹھی کا کرایہ زیادہ ادا کرتے بلکہ انہوں نے کبھی مرمت کا بھی تقاضا نہ کیا۔

۱۹۲۶ء میں دوسری مرتبہ پنجاب قانون ساز کونسل کے انتخابات میں احباب کے اصرار پر اقبال نے الیکشن لڑنے کا فیصلہ کیا۔ میاں عبدالعزیز بیرسٹر نے اقبال کے حق میں دستبرداری کا اعلان کیا جو ۱۵ جولائی ۱۹۲۶ء کے زمیندار میں شائع ہوا۔ اس کے بعد ۲۰ / جولائی ۱۹۲۶ء کے زمیندار میں اقبال کی طرف سے امیدواری کا باقاعدہ اعلان چھپا۔ انہوں نے میاں

عبدالعزیز بیرسٹر کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا۔

مسلمانوں کو معلوم ہے کہ میں اب تک اس قسم کے مشاغل سے بالکل علیحدہ رہا، محض اس لیے کہ لوگ یہ کام انجام دے رہے تھے اور میں نے اپنے لیے دوسرا دائرہ کار منتخب کر لیا تھا، لیکن اب قوم کی مصیبتیں مجبور کر رہی ہیں کہ اپنا حلقۂ عمل قدرے وسیع کر دوں۔ شاید میرا ناچیز وجود اس طرح اس ملّت کے لیے زیادہ مفید ہو سکے جس کی خدمت میں میری زندگی کے تمام لیل و نہار گزر رہے ہیں۔

اقبال جیسی شخصیت کو بلا مقابلہ کونسل کا رکن منتخب کیے جانے کے اصرار کے باوجود دو اور حضرات مقابلے میں کھڑے ہو گئے۔ ان میں سے ملک محمد حسین صدر بلدیہ لاہور نے اقبال کے حق میں دستبردار ہونے کا فیصلہ کیا اور اقبال نے اُن کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا:

میں اُن کے اس جذبے کو بے انتہا قابل تعریف سمجھتا ہوں کہ وہ مسلمانوں میں برادریوں کے افتراق کو دیکھنا پسند نہیں کرتے اور اتحاد المسلمین کے مقصدِ عزیز کے لیے انتہائی ایثار سے کام لے سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو اس قسم کی دردمندی اور ایثار کی توفیق دے۔

مگر ملک محمد دین مقابلے میں ڈٹے رہے، اس لیے اقبال کو انتخابی جنگ کے میدان میں اترنا پڑا۔ لاہور میں اُن کی حمایت میں تقریباً بیس جلسے منعقد ہوئے جن میں بعض سے اقبال نے خطاب کیا۔ ہر محلے سے جلوس نکالے گئے۔ شہر کی کئی برادریوں نے اُن کی حمایت میں اشتہار شائع کیے اور اقبال کو انتخابی مہم میں اپنی جیب سے بہت کم خرچ کرنا پڑا۔

انتخابی مہم میں ملک محمد دین نے اقبال کے عقائد پر اعتراض کرتے ہوئے انہیں وہابی العقیدہ قرار دیا اور خود اہلِ سنت والجماعت کے دعوے دار ہوتے ہوئے ووٹ طلب کیا۔ ملک محمد دین نے اقبال کے کشمیری برادری سے تعلق کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے کہا کہ چونکہ ملک محمد دین ارائیں ہیں اس لیے ارائیں برادری کو اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے ارائیں ہی کو اپنا نمایندہ چننا چاہیے۔ اشتہارات کے ذریعے اقبال کے ذاتی کردار پر بھی کیچڑ اچھالا گیا۔ مگر اقبال کی طرف سے ان الزامات کے جواب میں کسی بھی طرح کے ردعمل کے بجائے عوام کو اسلامی اتحاد و اتفاق برقرار رکھنے کی تلقین کی گئی۔

مدیر زمیندار نے اقبال کی حمایت میں ملک محمد دین کی انتخابی مہم پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر کیا:

کیا یہ مسلمانوں کی انتہائی بدبختی اور نامرادی کی دلیل نہیں کہ انہوں نے ایسی محترم شخصیت کو بھی

پنجاب کونسل ممبری جیسے حقیر منصب کے لیے بلا مقابلہ منتخب نہ ہونے دیا؟ علامہ اقبال کے مقابلے میں لاہور کے ایک غیر معروف بیرسٹر ملک محمد دین صاحب کھڑے ہوئے ہیں جن کے نام سے بھی عامۃ المسلمین اب تک ناواقف تھے...... ملک محمد دین نے اپنے انتخاب کے سلسلے میں جو اعلان شائع کیا ہے اس میں جابجا اس امر پر زور دیا ہے کہ میں اہلِ سنت والجماعت میں سے ہوں۔ ہم یہ سوال کرنا چاہتے ہیں کہ کیا کونسل کی ممبری کے لیے آئندہ اہلِ سنت اور غیر اہل سنت معیار معتبر سمجھا جائے گا؟...... ایک لالہ لاجپت رائے جس حلقے سے چاہتا ہے ایک شخص کو نامزد کر کے بلا مقابلہ منتخب کرا دیتا ہے، اور کسی دوسرے کو اس کے مقابلے میں کھڑے ہونے کی جرأت نہیں ہوتی۔ ہندوؤں نے شدید باہمی مخالفت کے باوجود پنڈت موتی لعل نہرو اور پنڈت مالویہ کو بلا مقابلہ منتخب کرانے کا فیصلہ کر لیا ہے جس حلقے سے پنڈت مالویہ کھڑے ہو رہے ہیں اس میں لاکھوں کانگرسی موجود ہیں اور جس حلقے سے پنڈت موتی لعل نہرو امیدوار ہیں، اُس میں لاکھوں سنگھٹنی موجود ہیں، لیکن قومی اتحاد کی یہ حالت ہے کہ ان اکابر مملکت کے مقابلے میں کوئی شخص کھڑا نہیں ہوسکتا اور مسلمان ہیں جو علامہ اقبال کی جلیل القدر اور عظیم ایشان شخصیت کے ساتھ عقیدت کا یہ منظر بھی پیش نہیں کر سکتے۔

حاجی دین محمد خوشنویس کے بیان کے مطابق، جو انتخابات میں اقبال کے زبردست حامیوں میں سے تھے اور جنہوں نے اس سلسلے میں نمایاں خدمات انجام دیں، ملک محمد دین کو سر شادی لعل نے اقبال کے مقابلے میں کھڑا ہونے کے لیے تیار کیا تھا۔ مزنگ میں اقبال کے حامیوں کا جلسہ ہونے والا تھا۔ ملک لال دین قیصر نے خواہش ظاہر کی کہ ملک محمد دین کی طرح اقبال کے لیے بھی قدِ آدم اشتہار شائع ہو۔ حاجی دین محمد جو نمایاں خوش نویسی میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے، نے فوراً اشتہار شائع کرایا اور مزنگ کی دیواروں اور جلسہ گاہ کے باہر چسپاں کر دیا۔ لوگ بڑے متعجب ہوئے کہ اتنی قلیل مدت میں اتنا بڑا اشتہار کیوں کر تیار ہو گیا۔ جب اقبال کو پتا چلا تو انہوں نے بھی حیرت کا اظہار کیا اور فرمایا: حاجی صاحب تو کاتبِ کُن فیکون ہیں۔ انہوں نے اشتہار سے کہا ''کُن'' اور وہ اسی وقت ''فیکون'' ہو گیا۔

ملک لال دین قیصر بھی اقبال کے زبردست حامی اور پنجابی کے معروف شاعر تھے اور اقبال کے ہر جلسے میں اپنے پنجابی اشعار سنا کر سامعین کو محظوظ کرتے۔ اس زمانے میں ملک لال دین قیصر کے پنجابی اشعار: ''آ گئی فوج اقبالی، کر دیو رستہ خالی'' (الخ) کارکنان کی زبان پر

رہتے۔ جلوسوں میں اسلامیہ کالج کے طلبہ اور شہر کے دیگر نوجوان یہی اشعار پڑھتے یا اقبال کے اس شعر کا ورد ہوتا:

یوں تو سیّد بھی ہو، مرزا بھی ہو، افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو، بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

چوہٹہ مفتی باقر میں کسی انتخابی جلسے کے تقریباً تین چار ہزار کے مجمع میں اقبال بھی موجود تھے۔ اس جلسے میں مولوی محرم علی چشتی کو، جو ملک محمد دین کے حمایتی تھے ملک لال دین قیصر اپنے ساتھ کھینچ لائے اور حاضرین سے ان کا تعارف کراتے ہوئے یہ طنزیہ پنجابی اشعار پڑھے:

جیبی پور اک پنڈ سنی دا، اوتھوں دا پٹواری اے
اسی تے اُوسنوں کجھ نہیں کہنا، اوہدے منہ تے داہڑی اے
کل جو کسے یار نے جا کے اوسنوں بولی ماری اے
حضرت تہاڈی طاقت کتھے ، اودھر خلقت ساری اے
کہن لگا اوہ بے وقوفا ، مت تری گئی ماری اے
شہر لاہور اقبال دے ولّے ، ساڈا زور اٹاری اے

اقبال کے حامیوں میں لاہور شہر کی کئی معروف ہستیاں تھیں۔ میاں نظام الدین، میاں امیر الدین، میاں حسام الدین بیرسٹر، میاں ایم اسلم، محمد دین تاثیر، خلیفہ شجاع الدین، میاں عبدالعزیز بیرسٹر، مولوی سید ممتاز علی، غلام رسول مہر، عبدالمجید سالک، خواجہ فیروز دین، خواجہ دل محمد، پہلوان چنن دین، ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ، مولوی احمد دین ایڈووکیٹ، حفیظ جالندھری، سید محسن شاہ ایڈووکیٹ، سید مراتب علی، شیخ گلاب دین ایڈووکیٹ، شیخ عظیم اللہ ایڈووکیٹ، عبدالرحمن چغتائی، عبداللہ چغتائی، نواب محمد علی خان قزلباش، سید افضال علی حسنی، مرزا جلال الدین بیرسٹر، سردار حبیب اللہ، ملک میراں بخش، مولانا ظفر علی خان، شیخ محمد نقی، مولوی محبوب عالم، میاں شاہ نواز، حکیم محمد یوسف حسن کے علاوہ سیکڑوں شخصیتوں کے نام محمد حنیف شاہد نے اپنی تصنیف اقبال اور پنجاب کونسل میں درج کیے ہیں۔ مختلف علاقوں کی انجمنوں یا وارڈوں کے مکینوں نے اقبال کی حمایت میں اعلان جاری کیے۔ شہر میں کشمیریوں کی تعداد ارائیوں سے کم تھی، لیکن کئی دیگر برادریوں مثلاً زرگروں، خوجوں، قصابوں، گوجروں اور لوہاروں نے اقبال کے حق میں متفقہ فیصلے کیے۔ ککے زئی برادری نے عملی حیثیت سے اقبال کی امداد کی۔

مذہبی حلقوں میں شیعہ رہنما سید علی حائری، خواجگانِ نارووال، احمد دیان قادیان اور احمدیان لاہور نے بھی اقبال کی تائید اور حمایت میں اعلان جاری کیے۔ انجمن اسلامیہ میاں میر اور اہل حدیث بھی اقبال کے ساتھ تھے۔ سیاسی جماعتوں میں مجلس خلافت نے اقبال کو بہترین امیدوار قرار دیتے ہوئے ان کی اعانت کی۔ اقبال نے مجلسِ خلافت کے اُصول سے اتفاق کیا تھا اور اس کے منشور پر بھی دستخط کیے تھے۔

کشمیریوں کے دو اخبار سیاست اور نشتر اقبال کو جھوٹا، کذاب، وہابی، نجدی، اسلام دشمن وغیرہ کے خطابات سے نواز کر ان کی شدید مخالف کرتے رہے، لیکن لاہور کے باقی تمام مسلم اخبار اقبال کی حمایت میں لکھتے تھے۔ جلسوں کا سلسلہ اکتوبر ۱۹۲۶ء سے شروع ہوا۔ ان جلسوں میں تقریر کرنے والی معروف شخصیات میں مولانا غلام مرشد، ملک لال دین قیصر، مولانا محمد بخش مسلم، حفیظ جالندھری، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا ظفر علی خان، مولانا حبیب الرحمن اور مولانا مظہر علی اظہر شامل تھے۔ بڑے بڑے جلوس بھی نکلتے، جن میں اقبال شامل ہوتے۔ جلوس لاہور کے بازاروں سے گزرتے اور جلوس کے دوران میں اگر نماز کا وقت آ جاتا تو کسی بڑی مسجد میں باجماعت نماز ادا کرنے کے بعد جلوس پھر مرتب کیا جاتا اور اسی شان و شوکت سے مختلف بازاروں سے گزرتا ہوا لاہور شہر کے کسی نہ کسی دروازے پر اختتام پذیر ہوتا جہاں اقبال تقریر کرتے اور مسلمانوں کو اتحاد کا پیغام دیتے۔

ایسے انتخابی جلسوں یا جلوسوں میں کی گئی اقبال کی کچھ تقریریں جو زمیندار میں شائع ہوئیں، اب تک [illegible]ط ہیں۔ مثلاً ۱۱/اکتوبر ۱۹۲۶ء کو ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا:

> میں نے مسلمانوں کو زندگی کے صحیح مفہوم سے آشنا کرنے، اسلاف کے نقشِ قدم پر چلانے اور نا امیدی بزدلی اور کم ہمتی سے باز رکھنے کے لیے نظم کا ذریعہ استعمال کیا۔ میں نے پچیس سال تک اپنے بھائیوں کی مقدور بھر ذہنی خدمت کی۔ اب اُن کی بطرزِ خاص عملی خدمت کے لیے اپنے آپ کو پیش کر رہا ہوں اسلامیانِ ہند پر عجب دور گزر رہا ہے۔ ۱۹۲۹ء میں رائل کمیشن تحقیق کرے گا کہ آیا ہندوستان مزید رعایات و اصلاحات کا مستحق ہے یا نہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں کبھی بھی اپنے مفاد کو قوم کے مصالح کے مقابلے میں ترجیح نہیں دوں گا۔

۱۳/اکتوبر ۱۹۲۶ء کو ایک جلسے میں انہوں نے اعلان کیا کہ اگر قوم متفقہ طور پر مجھے دستبردار

ہونے کا حکم دے تو میں حکم کی تعمیل کے لیے بسر وچشم تیار ہوں۔ میں عنقریب نوجوانوں کا ایک جیش تیار کروں گا جو مسلمانوں کے درمیان فرقہ پرستی کی موجودہ لعنت کو بیخ و بنیاد سے اکھاڑ دے گا۔ ۱۵/اکتوبر ۱۹۲۶ء کو ایک مجمع سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد کیا کہ مذہب جیسی مقدس چیز کو الیکشن کی آڑ نہ بنایا جائے۔ میں نوجوانوں کے سامنے عنقریب ایک سوشل پروگرام پیش کرنے والا ہوں۔ ۱۷/اکتوبر ۱۹۲۶ء کو ایک جلسے میں انہوں نے جمہوریت، اسلام اور پنجاب کونسل کے موضوع پر ایک فاضلانہ خطبہ دیا۔ ۱۹/نومبر ۱۹۲۶ء کو کٹڑا ولی شاہ کا جلسہ اندرون شہر میں غالباً آخری جلسہ تھا۔ اقبال ساڑھے آٹھ بجے شب جلسہ گاہ میں تشریف لائے۔ جلسہ گاہ سے باہر بازار دور تک آراستہ تھا اور ہر سمت لوگوں کا ہجوم تھا۔ حاضرین کی کثرت کا یہ عالم تھا کہ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ اقبال کے داخل ہوتے ہی انہیں ہار پہنائے گئے اور جلسہ پر جوش نعروں سے گونج اٹھا۔ ملک لال دین قیصر، آس اور ثمر کی نظموں کے بعد شیخ عظیم اللہ ایڈووکیٹ، شمس الدین حسن ایڈیٹر، خواجہ فیروز دین اور مولانا محمد بخش مسلم نے تقریریں کیں۔ آخر میں اقبال کھڑے ہوئے اور فرمایا:

مسلمانوں کی زندگی کا راز اتحاد میں مضمر ہے۔ میں نے برسوں مطالعہ کیا، راتیں غور وفکر میں گزاریں تاکہ وہ حقیقت معلوم کروں جس پر کاربند ہو کر عرب حضورؐ سرورِ کائنات کی محبت میں تیس سال کے اندر اندر دنیا کے امام بن گئے۔ وہ حقیقت اتحاد و اتفاق ہے جو ہر شخص کے لبوں پر ہر وقت جاری رہتی ہے۔ کاش ہر مسلمان کے دل میں بیٹھ جائے۔ مسلمانانِ ہند کے لیے دوسری ضروری چیز یہ ہے کہ وہ ہندوستان کی سیاسیات کے ساتھ گہری دل بستگی پیدا کریں۔ جو لوگ خود اخبار نہ پڑھ سکتے ہوں وہ دوسروں سے سنیں۔ اس وقت جو قوتیں دنیا میں کارفرما ہیں، اُن میں سے اکثر اسلام کے خلاف کام کر رہی ہیں۔ لیکن لیظھرہ علی الدین کلہ کے وعدہ کی بنا پر میرا ایمان ہے۔ کہ انجام کار اسلام کی قوتیں کامیاب و فائز ہوں گی۔ لا تھنوا و لا تحزنوا و انتم الاعلون ان کنتم مومنین۔

انتخابی مہم کے دوران میں بعض لطیفے بھی پیدا ہوئے۔ مثلاً حفیظ جالندھری کے بیان کے مطابق ایک روز کسی جلسے کو خطاب کرنے کے بعد اقبال ان کے ساتھ اندرونِ شہر کی گلیوں میں سے ہوتے ہوئے پیدل واپس آ رہے تھے۔ چونکہ امیدوار تھے اس لیے رستے میں جو کوئی بھی ملتا اسے سلام کرتے۔ ایک شخص کو سلام کیا، لیکن وہ شاید ملک محمد دین کا حمایتی تھا، اس نے جواب میں اپنی دھوتی اٹھا دی اور ننگا ہو گیا۔ اقبال جب موٹر کار میں بیٹھے تھکے ہارے گھر جا رہے تھے تو نہایت بجھے ہوئے لہجے میں حفیظ جالندھری سے کہنے لگے: اس قوم کے مصائب کے سبب میری

راتوں کی نیند اچاٹ ہے، لیکن اس کے افراد اخلاق اور مرّوت کی دولت سے کیوں محروم ہیں؟ حفیظ جالندھری نے اپنے مخصوص انداز میں اقبال کو تسلی دیتے ہوئے جواب دیا: ڈاکٹر صاحب! قوم کے پاس جو کچھ ہے، وہ اس نے آپ کو دکھلا دیا۔ اس میں مغموم ہونے کی کیا بات ہے۔ اس پر اقبال کھلکھلا کر ہنس دیے اور ساری کدورت دور ہو گئی۔

۲۳ اور ۲۴ نومبر ۱۹۲۶ء کو پولنگ کے آنکھوں دیکھے حال کی تفصیل ان ایّام کے زمیندار اخبار کے حوالوں سے محمد حنیف شاہد کی تصنیف اقبال اور پنجاب کونسل میں پڑھی جا سکتی ہے۔ ۲۳ ؍نومبر کو لاہور شہر کے مسلم حلقے میں اور ۲۴ ؍نومبر کو لاہور چھاؤنی کے حلقے میں ووٹنگ ہوئی۔ بہت سے پڑھے لکھے ارائیوں نے جو اپنے آپ کو برادری کے سوال سے بالا خیال کرتے تھے اقبال کے حق میں ووٹ ڈالے۔ پولنگ کے اختتام پر ہجوم نے اقبال کو گھیر لیا اور شہر کے اندر لے گئے۔ چنانچہ خود بخود ایک جلوس مرتب ہو گیا جو اللہ اکبر اور اقبال زندہ باد کے نعرے لگاتا ہوا کشمیری بازار اور ڈبی بازار سے گزرا۔

۲۴ ؍نومبر کو لاہور چھاؤنی کے انتخابات کے دوران میں ملک محمد دین کے کئی جعلی ووٹروں کی شناخت پر انہیں گرفتار کیا گیا۔ ۶ ؍دسمبر ۱۹۲۶ء کو انتخابات کونسل کے نتائج کا سرکاری اعلان ضلع کچہری میں ہوا۔ اُس زمانے میں حلقے کے کل ووٹروں کی تعداد بارہ ہزار کے لگ بھگ تھی جن میں سے تقریباً ساڑھے آٹھ ہزار ووٹ ڈالے گئے۔ اقبال کو پانچ ہزار چھ سو پچھتر ووٹ ملے اور ملک محمد دین کو دو ہزار چار سو اٹھانوے۔ سو اقبال تقریباً تین ہزار ووٹوں کی اکثریت سے کامیاب قرار دیے گئے۔ بعد ازاں لوگوں نے اقبال کو گھیر لیا اور ایک جلوس مرتب ہو گیا۔ یہ جلوس تقریباً تین بجے دو پہر انار کلی اور لوہاری دروازے سے روانہ ہوا۔ رات ساڑھے دس بجے اقبال نے اہلِ جلوس کا شکریہ ادا کیا اور یہ جلوس منتشر ہوا۔

ملک محمد دین کی ناکامی کا ذکر کرتے ہوئے زمیندار نے ادارتی نوٹ میں تحریر کیا کہ ملک محمد دین کو ووٹ دینے والے ناخواندہ ارائیں تھے جو اقبال کی علمی قابلیت سے ناواقف محض تھے۔ جبکہ کچھ نے ''بریلوی حنفیت'' کے زیر اثر ایک مقامی اخبار اور حزب الاحناف کے پراپیگنڈے سے متاثر ہو کر ووٹ دیئے۔

ملک محمد دین کے ایک عزیز ملک ظہور الدین کے خلاف، جنھوں نے اقبال کے حق میں ووٹ ڈالا تھا، ارائیں برادری کے چند ارکان نے طوفانِ بدتمیزی کھڑا کر دیا۔ یہاں تک کہ انہیں

اپنی وضاحت کے لیے مدیر زمیندار کے نام ایک خط شائع کروانا پڑا جس میں تحریر کیا۔ مجھ پر عام اعتراض کیا جاتا ہے کہ میں نے پنجاب کونسل میں ملک محمد دین کی امداد کیوں نہ کی اور برادری اور رشتے داروں کے کہنے پر عمل کیوں نہ کیا۔ اس کی وجوہ حسب ذیل ہیں:

اوّل: برادری کے ایک اعلیٰ رکن عبدالعزیز بیرسٹرایٹ لا جیسے قابل شخص نے ڈاکٹر محمد اقبال کے حق میں دستبردار ہو کر اور امداد کا وعدہ فرما کر برادری پر ثابت کر دیا کہ ڈاکٹر اقبال اس قدر قابل ہستی ہیں۔

دوم: ملک محمد دین کو ڈاکٹر اقبال کے مقابلے میں کھڑا ہونے پر آمادہ کرنے والے اشخاص (یعنی سر شادی لعل) کی ارائیں برادری کے ساتھ کس قدر دیرینہ عداوت چلی آتی تھی۔

سوم: برادری کے تعلیم یافتہ اصحاب نے پچاس فیصدی ڈاکٹر اقبال کے حق میں رائے دی اور باقی پچاس فیصدی جو ملک محمد دین کے ساتھ مجبوراً رہے اُن میں سے بھی زیادہ نے اندر جا کر ڈاکٹر صاحب کو ووٹ دیا۔

اقبال کی کامیابی پر انہیں لاہور اور صوبے بھر سے مبارک باد اور دعوتوں کی اطلاعات موصول ہوئیں۔ لاہور شہر میں اقبال کو کئی اشخاص اور برادریوں کی طرف سے پر تکلف دعوتیں دی گئیں۔

پس ۱۹۲۶ء کا تقریباً سارا سال اقبال نے انتخابات کے ہنگاموں میں صرف کیا۔ ۳ جنوری ۱۹۲۷ء کو پنجاب قانون ساز کونسل کا افتتاحی اجلاس سہ پہر کے وقت منعقد ہوا۔ جہاں اراکین نے یکے بعد دیگرے حلف اٹھایا۔ اخبارات میں کونسل میں اقبال کی قیادت میں آزاد گروپ کی تشکیل کی خبریں آنے لگیں۔ یہ توقع تھی کہ آزاد گروپ بلا امتیاز صوبے کے تمام طبقات کی حفاظت کرے گا۔ لیکن اقبال نے موثر کردار ادا کرنے کے لئے اکثریتی پارٹی یونینسٹ پارٹی نے شرکت کا فیصلہ کیا۔ مگر جب اقبال نے یونینسٹ پارٹی کے اندر رہ کر اس جماعت کے طریق کار کو بغور دیکھا تو وہ سر فضل حسین اور یونینسٹ پارٹی دونوں سے منحرف ہو گئے۔

عظیم حسین اپنے والد سر فضل حسین کی سیاسی بائیوگرافی میں شکایتاً تحریر کرتے ہیں:

فضل حسین پر تنقید کی زیادہ تر ذمہ داری ڈاکٹر اقبال پر عائد ہوتی ہے...... یہ حقیقت ہے کہ فضل حسین ہمیشہ ڈاکٹر اقبال کی اعانت کرنے کی کوشش کرتے رہے، مگر ڈاکٹر اقبال ایسے موقعوں سے، جو اُن کو فراہم کیے گئے، فائدہ اٹھانے سے قاصر رہے۔ ۱۹۲۴ء میں فضل حسین نے سر

میلکم ہیلی (گورنر پنجاب) کو ترغیب دی کہ وہ ڈاکٹر اقبال کو عدالت عالیہ کی ججی کا عہدہ دیں، لیکن اقبال نے حکومت پر بے جا تنقید سے یہ موقع کھو دیا۔ ۱۹۲۷ء میں فضل حسین نے ڈاکٹر اقبال سے انگلستان جانے والے مسلم وفد کی قیادت کرنے کے لیے کہا اور اس غرض کے لیے تین ہزار روپیہ اکٹھا کیا۔ لیکن انہوں نے جانے سے انکار کر دیا۔ ان کے بجائے چوہدری ظفر اللہ خان جانے کے لیے راضی ہو گئے۔ فضل حسین نے بحیثیت صدر کونسل چوہدری شہاب الدین کی میعاد پوری ہونے پر یونینسٹ پارٹی کی حمایت سے ڈاکٹر اقبال کو صدر کونسل منتخب کرنے کی تجویز دی، مگر ڈاکٹر اقبال نے یونینسٹ پارٹی کی تمام ہمدردیاں اس کی پالیسی پر اعتراضات کر کے اور اس کے اراکین پر پریس میں شدید تنقید کر کے گنوا دیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پارٹی کی اکثریت نے انہیں اپنا امیدوار تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور چوہدری شہاب الدین کو دوبارہ صدر کونسل منتخب کیا گیا۔

عظیم حسین کا گلہ شاید اپنی جگہ درست ہو مگر جس قسم کا سیاسی مستقبل اقبال کے لیے سر فضل حسین تجویز کرتے رہے وہ انہیں زیادہ سے زیادہ ایک اور سر فضل حسین یا سر ظفر اللہ خان بنا دیتا۔ ایسی صورت میں وہ اقبال ہرگز نہ رہتے۔ اسی سبب اقبال سر فضل حسین کے معیار پر پورے نہ اترے اور انہیں ہر مرحلے پر اپنے بارے میں مایوس اور ناامید کرتے رہے۔ عاشق حسین بٹالوی تحریر کرتے ہیں:

> شہری دیہاتی چپقلش قانون ساز کونسل کے اندر اسی پارٹی نے پیدا کی تھی اور پھر اس چپقلش نے صوبے کی پوری آبادی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اقبال سے یہ تمام باتیں پوشیدہ نہ رہ سکتی تھیں۔ اگر اقبال کونسل کے اندر بیٹھ کر یونینسٹ پارٹی کے طرزِ عمل کو بچشم خود ملاحظہ نہ کرتے تو شاید ان کے ہاتھوں وہ کارنامہ سرانجام نہ پا سکتا جو قدرت نے ان کی زندگی کے آخری دو برسوں میں ان کے لیے مقدر کر رکھا تھا۔

سو اقبال نے پنجاب قانون ساز کونسل میں ساری مدت ایک تنہا رکن کی حیثیت ہی سے گزاری۔ البتہ عملی سیاست میں قدم رکھنے کے سبب وہ اسی سال پنجاب صوبائی مسلم لیگ کے سیکرٹری بن گئے۔ یوں انہیں برصغیر کے مسلمانوں کی قومی سیاسیات میں بھرپور حصہ لینے کا موقع مل گیا اور یہی ان کی سیاسی زندگی کا اہم ترین پہلو تھا۔

اس دور کے فسادات کا ایک بڑا سبب شُدھی اور سنگھٹن کی تحریکیں تھیں جن سے مسلمانوں کے جذبات کو شدید ٹھیس پہنچی تھی۔ اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کے لیے مسلمانانِ

لاہور کے دو عام جلسے اقبال کی صدارت میں منعقد ہوئے۔ پہلا جلسہ ۲۲/جنوری ۱۹۲۷ء کو باغ بیرونِ موچی دروازہ میں ہوا اور دوسرا جلسہ اسی مقام پر ۳۰/جنوری ۱۹۲۷ء کو منعقد ہوا۔ اقبال نے اس جلسے کے اختتام پر فرمایا:

ہندوستان اور ہندوستان سے باہر دیگر ممالک میں ہر جگہ ہماری رسوائی کے چرچے ہو رہے ہیں۔ ہمارے باہمی تنازعات نہایت افسوس ناک ہیں۔ ہم یہ بھی نہیں سوچتے کہ ہماری اس کشمکش کے نتائج ایشیا کے دیگر ممالک کے حق میں کیا ہوں گے۔ میرے تصور میں صداقت ایک ایسا تراشا ہوا ہیرا ہے جس کے کئی پہلو ہیں اور اس کے ہر پہلو سے مختلف رنگ کی شعاعیں نکل رہی ہیں اور ہر شخص اپنی اپنی پسند کے مطابق کسی رنگ کی شعاع کو اختیار کر لیتا ہے اور اپنے نقطۂ نگاہ سے صداقت کو دیکھتا ہے...... رواداری کا اصول یہی ہے کہ مثالِ بالا کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کسی کو یہ نہ کہا جائے کہ تم باطل پر ہو...... اختلافات کا نتیجہ یہ نہ ہونا چاہیے کہ آپس میں سر پھٹول ہو...... اسلام نے بھی اُسی صداقت کی تعلیم دی ہے، جو زمانۂ قدیم کے بعض رشیوں نے دی (آپ نے اس موقع پر سنسکرت کا ایک اشلوک پڑھ کر سنایا جس کا مفہوم قرآن کریم کی ان آیات کے مطابق تھا: **کل شئ ھالک الا وجھہ، نحن اقرب الیہ من حبل الورید**) میں تم سے صداقت کے نام سے اپیل کرتا ہوں کہ خدا کے لیے حقایق کی طرف دیکھو اور آپس میں مت لڑو۔ ہندوستان میں بعض ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنی اغراض کے لیے تمہارے درمیان پھوٹ ڈالنے کی مساعی میں رہتے ہیں۔ اگر تم آپس میں لڑو گے تو ملک میں بدامنی ہوگی۔ سب کو تکلیف اٹھانی پڑے گی۔

شُدھی اور سنگھٹن کے جواب میں مسلمانوں نے تبلیغ اور تنظیم کی متخالف تحریکیں جاری کر رکھی تھیں۔ غلام بھیک نیرنگ انجمن تبلیغ اسلام کے معتمد تھے اور ایک ایسی تبلیغی کانفرنس کرنا چاہتے تھے جس میں نو مسلم یورپین بھی شریک ہوں۔ اقبال نے انہیں اپنے ایک خط محررہ ۲۴/جنوری ۱۹۲۷ء میں کانفرنس کے لیے چندہ جمع کرنے اور اس کے انتظامات میں عملی حصہ لینے کا ارادہ ظاہر کیا۔ انہوں نے غلام بھیک نیرنگ کی تحریک کی نہ صرف تائید کی بلکہ اس کے لیے اپنی خدمات پیش کرتے ہوئے تحریر کیا:

میرے نزدیک تبلیغ اسلام کا کام اس وقت تمام کاموں پر مقدم ہے۔ اگر ہندوستان میں مسلمانوں کا مقصد سیاسیات سے محض آزادی اور اقتصادی بہبودی ہے اور حفاظت اسلام اس مقصد کا عنصر نہیں ہے، جیسا کہ آج کل کے قوم پرستوں کے رویے سے معلوم ہوتا ہے، تو مسلمان

اپنے مقاصد میں کبھی کامیاب نہ ہوں گے۔ بہرحال جس جانفشانی سے آپ نے تبلیغ کا کام کیا ہے اُس کا اجر حضور سرور کائناتؐ ہی دے سکتے ہیں۔ میں انشاء اللہ جہاں جہاں موقع ہوگا، آپ کے ایجنٹ کے طور پر کہنے سننے کو حاضر ہوں۔

جنوری ۱۹۲۷ء ہی میں اقبال پنجاب کونسل کی فنانس کمیٹی اور ایجوکیشن کمیٹی کے رکن مقرر کیے گئے۔ ۱۳؍فروری ۱۹۲۷ء کو انہوں نے کونسل کے آئندہ اجلاس میں دو قراردادیں پیش کرنے کا نوٹس دیا۔ اول یہ کہ تعلیم یافتہ طبقے میں بیکاری اور بے روزگاری کے پیشِ نظر حکومت بیکار تعلیم یافتہ اشخاص کو قطعاتِ اراضی عطا کرے تاکہ وہ اس میں زراعت کر سکیں۔ دوم یہ کہ چونکہ حکومت ہند نے پنجاب کا سالانہ زرتعاون معاف کر دیا ہے اس لیے ٹیکسوں میں تخفیف کرنے کے لیے ایک مجلس تحقیقات مقرر کر دی جائے تاکہ تخفیف سب محصول گزاروں پر مساوی تقسیم ہو سکے۔

۴؍مارچ ۱۹۲۷ء کو اسلامیہ کالج کے حبیبیہ ہال میں ایک جلسہ اقبال کی زیر صدارت منعقد ہوا۔ جس میں مرزا بشیر الدین محمود نے مذہب اور سائنس کے موضوع پر تقریر کی تقریر کے خاتمہ پر اقبال نے مختصر الفاظ میں اس موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا:

مذہب، فلسفہ، طبیعیات اور دیگر علوم و فنون سب کے سب مختلف راستے ہیں جو ایک ہی منزل مقصود پر جا کر ختم ہوتے ہیں۔ مذہب اور سائنس کے تصادم کا خیال اسلامی نہیں۔ قرآن پاک تو صاف الفاظ میں انسان کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ اگر وہ قوائے فطرت پر غلبہ حاصل کر لیں گے تو ستاروں سے بھی پرے پہنچنے کے قابل ہو جائیں گے۔

۵؍مارچ ۱۹۲۷ء کو اقبال نے بحیثیت رکن فنانس کمیٹی پنجاب کونسل میں اس سال کے بجٹ پر تقریر کرتے ہوئے دو تجاویز پیش کیں۔ اول یہ کہ چونکہ صوبے کی مالی حالت اطمینان بخش ہے اور ترقی کے کاموں کے لیے وافر رقومات موجود ہیں اس لیے دیہات میں صفائی کے بہتر انتظامات اور عورتوں کی طبی امداد بہم پہنچانے کی خاطر رقم کا ایک خاص حص[illegible]ط کر دیا جائے۔ دوم یہ کہ محاصل یعنی لگان میں کمی کی جائے۔ ۱۰؍مارچ ۱۹۲۷ء کو انہوں نے بحیثیت رکن ایجوکیشن کمیٹی حکومت پنجاب کی تعلیمی پالیسی پر تبصرہ کرتے ہوئے ابتدائی تعلیم کے جبری نفاذ پر زور دیا۔

۱۹۲۷ء میں سری نواس آئنگر کو کانگرس کا صدر منتخب کیا گیا۔ محمد علی جناح مسلم لیگ کے

صدر تھے۔ دونوں ایسی تدبیر سوچ رہے تھے جو مسلمانوں کے تحفظ اور جداگانہ انتخاب کے بارے میں ہندوؤں کی شکایت رفع کرنے کا باعث ہو۔ اس مقصد کے لیے محمد علی جناح نے مسلم لیگ کے بعض قائدین کا ایک اجلاس ۲۰/مارچ ۱۹۲۷ء کو دہلی میں طلب کیا۔ اس اجلاس میں ''تجاویز دہلی'' منظور کی گئیں۔

اقبال نے جداگانہ انتخاب سے دستبردار ہونے کی مخالفت کی۔ اُن کا زاویہ نگاہ یہ تھا کہ پنجاب، بنگال اور سندھ میں ہندوؤں کی اقتصادی برتری ہے اس لیے اگر مسلمان جداگانہ انتخاب سے دستبردار ہو گئے تو ہندو ایسے مسلم امیدواروں کو انتخابات میں کبھی کامیاب نہ ہونے دیں گے جو خالصتاً مسلم مفادات کا تحفظ کر سکیں۔

۱۶/اپریل ۱۹۲۷ء کو انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں اقبال نے روحِ تمدن اسلامی کے موضوع پر انگریزی میں ایک فاضلانہ خطبہ دیا۔ خطبے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بعثت مبارکہ کے بعد علم کے فروغ، مسلمانوں کے علمی کارناموں اور ان کے یورپ پر اثرات تفصیل سے جائزہ لیا گیا تھا۔ اقبال نے اردو میں خطبے کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے فرمایا:

> ہر انسان کے دل میں مشاہدہ حقیقت کی ہوس ہے...... مشاہدہ حقیقت کے حصول کے دو طریق ہیں سمع و بصر اور قلوب یا بہ اصطلاح قرآن حکیم، افئدہ۔ اسلام جس مشاہدے کا معلم ہے وہ اپنے آپ کو قائم رکھنے کی تعلیم دیتا ہے، یعنی اسلام کا مشاہدہ مردانگی پر مبنی ہے۔ ایک شاعر نے حضور سرور کائناتؐ کی نعت میں یہ نکتہ بڑے اچھے طریق پر واضح کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ نعت میں اس سے بہتر شعر نہیں لکھا گیا:
>
> موسیٰ ز ہوش رفت بہ یک جلوۂ صفات
> تو عینِ ذات می نگری در تبسّمے
>
> یہ اسلامی آئیڈیل ہے۔ اسلامی نقطۂ خیال سے معراج یہی ہے کہ مشاہدۂ ذات کے بعد بھی عبودیت قائم رہے، لیکن سرکشی اور تمرّد کے لیے نہیں بلکہ خدمت و عبودیت کے لیے۔ مسلم کو کسی چیز میں فنا نہ ہونا چاہیے گو یہ فنا فی اللہ ہی کیوں نہ ہو۔

یکم مئی ۱۹۲۷ء کو پنجاب صوبائی مسلم لیگ کا ایک اجلاس برکت علی محمڈن ہال لاہور میں منعقد ہوا۔ سر محمد شفیع نے تجاویز دہلی کے خلاف اور ہندو مہا سبھا کے جواب میں ایک جامع تقریر کی۔ اسی جلسے میں اقبال نے جداگانہ انتخاب قائم رکھنے کے حق میں اور مخلوط و مشترک انتخاب

کے خلاف قرارداد پیش کی۔ قرارداد پر تقریر کرتے ہوئے اقبال نے کہا:

مجھے یہ کہنے کا حق پہنچتا ہے کہ میں سب سے پہلا ہندوستانی ہوں جس نے اتحاد ہندو مسلم کی اہمیت وضرورت کا احساس کیا اور میری ہمیشہ سے آرزو ہے کہ یہ اتحاد مستقل صورت اختیار کرے، لیکن حالات حلقہ ہائے انتخاب کے اشتراک کے لیے موزوں نہیں ہیں اور ہمارے صدر (سر محمد شفیع) نے ہندو رہنماؤں کی تقریروں کے جو اقتباسات اپنے خطبۂ صدارت میں دیئے ہیں اُن سے ہندوؤں کی افسوناک ذہنیت آشکار ہوتی ہے...... آخر میں میں مسلمانوں سے ایک ضروری بات کہنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ مسلمان اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جائیں۔ ایک طرف ہندوؤں کی کوششیں اُن کے خلاف ہو رہی ہیں دوسری طرف حکومت کے موجودہ نظام کی سرگرمیاں مسلمانوں کے خلاف جاری ہیں۔ ان مصیبتوں میں بچاؤ کی صورت محض یہ ہے کہ مسلمان اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جائیں اور مردانہ وار ہر مصیبت کا مقابلہ کریں۔

تجاویز دہلی سے اختلاف کا سبب ہندو ذہنیت سے اقبال کی آگہی تھی۔ حکیم محمد حسن قرشی کو اقبال نے کہا:

مجھے یقین نہیں آتا کہ ہندو کبھی سمجھوتے پر رضامند ہو سکیں، بلکہ میرا تو خیال ہے کہ اگر مسلمان زعماء ہندو لیڈروں کی سب شرطیں مان لیں اور بلا شرط مفاہمت کی پیشکش کریں، جب بھی ہندو اس سے انحراف کی کوئی نہ کوئی صورت پیدا کرنے کی سعی کریں گے۔

پنجاب میں فرقہ وارانہ کشیدگی کی فضا خاصی سنگین تھی۔ ۳؍مئی ۱۹۲۷ء کو ہندوؤں اور سکھوں کی کثیر تعداد نے باولی صاحب ڈبی بازار میں مسلمانوں پر کرپانوں اور لاٹھیوں سے حملہ کر دیا۔ مسلمان اپنے شہدا کا جلوس نکالنا چاہتے تھے اور چونکہ ڈر تھا کہ احتجاجی جلوس مزید اشتعال کا باعث ہوگا۔ اس لیے اقبال دیگر معززین کے ساتھ جلوس میں شریک ہوئے اور مسلمانوں کے جذبات کو انہوں نے بے قابو نہ ہونے دیا۔ اسی سلسلے میں اخبار ٹریبیون کے نامہ نگار خصوصی سے ملاقات کے دوران انہوں نے بتایا:

۴ مئی کو میں ڈبی بازار میں تقریر کر رہا تھا کہ حاضرین میں سے کسی نے مداخلت کی اور کہا کہ سکھوں کے پاس تو کرپانیں ہیں مسلمانوں کے پاس کچھ بھی نہیں، وہ بھلا اپنی حفاظت کس چیز سے کریں۔ مسلمانوں کے رہنماؤں کو اس طرف متوجہ ہونا چاہیے اور اس سلسلے میں کچھ کرنا چاہیے۔ اگر اپنی حفاظت اور اغیار کے حملوں کی مدافعت کے لیے مسلمانوں کو ہتھیار رکھنے کی اجازت نہ ملے تو کونسل کے تمام مسلمان علی العموم (اور میں علیٰ الخصوص) اس کے لیے سعیِ بلیغ کریں گے۔

اقبال نے ۱۳ رمئی ۱۹۲۷ء کو ہندو مسلم اور سکھ اکابرینِ شہر کے اس اعلان کی حمایت کی کہ دیسی اخبار فرقہ وارانہ کشیدگی کا موجب بنتے ہیں، اس لیے حکومت کو ان کے خلاف قانونی کارروائی کرنی چاہیے۔ اقبال نے مسلم آؤٹ لُک کے نامہ نگار سے انٹرویو مورخہ ۲۳ رمئی ۱۹۲۷ء کے دوران میں کہا:

ہمیں لاہور کے فسادات سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس حقیقت نے مجھے اپنے سیاسی خیالات اور سیاسی عقائد پر از سرِ نو غور کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اب میں اس امر کا قائل ہو گیا ہوں کہ اس صوبے کے مسلمانوں کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ اپنی داخلی تنظیم اور اصلاح کی طرف متوجہ ہوں۔

جون ۱۹۲۷ء میں زبور عجم شائع ہوئی۔ گو اس کی کتابت کا کام اسی سال کے ابتدائی مہینوں میں ختم ہو چکا تھا، لیکن غالباً اقبال اپنی مصروفیات کے سبب اسے جلد چھپوا نہ سکے۔ اپنے ایک خط بنام گرامی محررہ ۳۱ رجنوری ۱۹۲۷ء میں کتاب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

میری کتاب زبور عجم ختم ہوگئی ہے۔ ایک دو روز تک کاتب کے ہاتھ میں جائے گی اور پندرہ دن کے اندر اندر شائع ہو جائے گی۔ اس کے چار حصے ہیں پہلے حصے میں انسان کا راز و نیاز خدا کے ساتھ دوسرے حصے میں آدم کے خیالات آدم کے متعلق طرز دونوں کی غزلیات کے موافق یعنی الگ الگ غزل نما ٹکڑے ہیں۔ تیسرے حصے میں مثنوی گلشن راز (محمود شبستری) کے سوالوں کے جواب ہیں اس کا نام میں نے ''مثنوی گلشن راز جدید'' تجویز کیا ہے۔ چوتھے حصے میں ایک مثنوی ہے، جس کا نام میں نے ''بندگی نامہ'' تجویز کیا ہے۔ مثنوی کا مضمون یہ ہے کہ غلامی کا اثر فنونِ لطیفہ مثلاً موسیقی و مصوری وغیرہ پر کیا ہوتا ہے۔

لاہور کے ایک ہندو راجپال نے اپنی کتاب رنگیلا رسول میں آنحضورؐ کی شانِ مبارک میں گستاخی کی تھی اور اس پر دو اڑھائی سال تک مقدمہ چلتا رہا، لیکن جون ۱۹۲۷ء میں لاہور ہائی کورٹ کے جسٹس دلیپ سنگھ نے راجپال کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ اس فیصلے کے خلاف مسلمانوں میں شدید ردِعمل ہوا۔ اقبال نے مسلم اکابرین لاہور کے ایک وفد کے ساتھ گورنر سے اس طرح کی تحریروں پر پابندی کا مطالبہ کیا۔ اس سلسلے میں مسلمانانِ لاہور کا ایک جلسۂ عام ۱۰ رجولائی ۱۹۲۷ء کو شاہی مسجد میں منعقد ہوا۔ اقبال نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

ایک مسلمان کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی ابتلا نہیں ہو سکتی جو اس وقت درپیش ہے۔ راجپال کی تصنیف نے، جس کا نام لینا میں پسند نہیں کرتا، مسلمانوں کے قلب کے نازک ترین حصے کو چوٹ لگائی ہے۔

توہین انبیاء و بزرگانِ دین کے واقعات کا مستقل سدِّ باب کرنے کے لیے اقبال نے پنجاب کونسل میں قرارداد بھی پیش کی ۔ آخر کار تقریباً دو سال بعد لاہور کے ایک نوجوان علم الدین نے راجپال کو قتل کر دیا، جس پر اقبال کے منہ سے بے اختیار نکلا:

اسی گلاں کر دے رہے تے ترکھاناں دا منڈا بازی لے گیا۔

علم الدین کے خلاف مقدمہ چلا اور جب اسے سزائے موت دی گئی تو مسلمانوں میں بڑا اضطراب پھیلا۔ حکومت اس کی نعش مسلمانوں کے حوالے کرنے سے ہچکچاتی تھی کہ مبادا فسادات کا سلسلہ شروع ہو جائے۔ اس پر اقبال سمیت مسلم رہنماؤں کا ایک وفد گورنر سے ملا اور امن قائم رکھنے کی ضمانت پر نعش وصول کی گئی۔ ایک لاکھ کے قریب مسلمانوں نے علم الدین شہید کی نمازِ جنازہ پڑھی اور پھر خاموشی سے منتشر ہو گئے۔

۱۸ / جولائی ۱۹۲۷ء کو پنجاب کونسل کے اجلاس میں اقبال نے پولیس کے بے رحمانہ رویئے کی طرف توجہ مبذول کرائی۔ صوبے میں فرقہ واریت اور منافرت کی فضا کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا:

میں سوچتا ہوں کہ اراکین کو اس امر کا احساس ہے بھی کہ درحقیقت ہم خانہ جنگی کی حالت میں زندگی بسر کر رہے ہیں اور اس خانہ جنگی کو دبانے کے لیے اگر سخت اقدام نہ اٹھائے گئے تو سارے صوبے کی فضا مسموم ہو جائے گی ...... یہ فرقہ وارانہ منافرت اگر یونہی پھیلتی رہی تو ملک کے دیگر حصے اور گاؤں میں رہنے والے لوگ بھی ایک دوسرے کا گلا کاٹنا شروع کر دیں گے پھر خدا ہی جانتا ہے کہ اس کشمکش کا انجام کیا ہو۔

۱۹ جولائی ۱۹۲۷ء کو سردار اجل سنگھ نے کونسل میں قرارداد پیش کی کہ سرکاری اداروں کی تمام اسامیاں بلاامتیاز مذہب کھلے مقابلے کے امتحان سے پُر کی جائیں۔ چونکہ مسلمان تعلیمی لحاظ سے پسماندہ تھے اس لئے اقبال اس تجویز کی حمایت نہیں کر سکتے تھے۔ اقبال نے تقریر کرتے ہوئے کہا:

میرے دوست پنڈت نانک چند بدقسمتی سے یہاں نہیں ہیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ حکومت نے رنگ کے امتیاز کو ختم کر دیا ہے۔ لیکن متحدہ قومیت کا نعرہ ازکاررفتہ ہے اور شاید ایک عرصہ دراز تک ازکاررفتہ ہی رہے گا۔ یہ لفظ اس ملک کے لوگوں کی زبان پر گذشتہ پچاس سال سے ہے، مگر وہ اس کُڑک مرغی کی کُڑکُوں ہے جس نے انڈا دینا بند کر دیا ہو۔ بہرحال آپ سے کہتا ہوں کہ اس ملک کے حالات ایسے ہیں کہ ہمارے لیے ناممکن ہے کہ کھلے مقابلے کے امتحان کے

سیدھے سادے اُصول کورائج کریں......ابھی چند روز پہلے میرے ایک دوست نے دو ہندو شرفاء کی گفتگو سُنی۔ ایک نے دوسرے سے پوچھا: اب ہماری پالیسی کیا ہونی چاہیے؛ دوسرے نے کہا: زبان پر قوم پرستی کے الفاظ ہوں لیکن اصل میں اپنے فرقے کے حقوق پر نگاہ رکھی جائے۔

۲۵ رجولائی ۱۹۲۷ء کو اقبال نے کونسل میں کئی قراردادیں پیش کرنے کا نوٹس دیا، جن میں چند یہ تھیں کہ: حکومت پنجاب نے نیلی بار ضلع منٹگمری میں سوا تین لاکھ ایکٹر رقبہ زیادہ تر سرمایہ داروں کے ہاتھ فروخت کیا، اُس اراضی کا نصف حصہ مزارعین کے لیے مخصوص کر دیا جائے یہ کہ توہینِ انبیاء و بزرگانِ دین کے انسداد کے لیے قانون نافذ کیا جائے (یہ قانون ۱۹۲۷ء ہی میں نافذ کر دیا گیا)، یہ کہ پنجاب میں انسدادِ شراب نوشی کے لیے قانون بنایا جائے اور تلوار کو قانونِ اسلحہ سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ چنانچہ اقبال کی کوششوں سے تلوار نو اضلاع یعنی میانوالی، ڈیرہ غازی خان، مظفر گڑھ، جھنگ، گڑ گاؤں، حصار، انبالہ، شملہ اور کانگڑہ میں قانونِ اسلحہ سے مستثنیٰ قرار دے دی گئی۔

۴ رستمبر ۱۹۲۷ء کو مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے ایک انجمن قائم ہوئی۔ اس کے پہلے اجلاس میں شرکت کے لیے تقریباً دس ہزار افراد کشمیری بازار کے متصل محلہ کوٹھی داراں میں جمع ہوئے۔ اقبال صدرِ جلسہ تھے۔ انہوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں مسلمانوں کو معاشی میانہ روی کے فوائد سے آگاہ کیا۔ فضول مصارف ترک کرنے کی تلقین کی، اور ''الکاسب حبیب اللہ'' کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ ہر مسلمان کو ضرور کچھ نہ کچھ کمانا چاہیے اور آپس میں اعتماد کی فضا پیدا کر کے تجارت وصنعت کی توسیع کے لیے کمپنیاں کھولنا چاہییں۔

۹ رنومبر ۱۹۲۷ء کو اقبال نے سائمن کمیشن کی تشکیل کے متعلق اپنے بیان میں کہا کہ بلاشبہ اس میں کسی ہندوستانی کا نہ لیا جانا ہندوستان کے وقار پر حملہ ہے، لیکن اس حملے کی وجہ وہ بے اعتمادی اور بدظنی ہے جو ہندوستان کی مختلف اقوام کو ایک دوسرے کے متعلق ہے۔

مسلم قائدین میں سے مولانا محمد علی اور محمد علی جناح کمیشن کے مقاطعے اور سر محمد شفیع، اقبال اور مولانا حسرت موہانی حامی تھے۔ اقبال نے بحیثیت سیکرٹری پنجاب صوبائی مسلم لیگ اخباروں میں ایک بیان شائع کرایا جس میں واضح کیا کہ:

پنجاب پراونشل مسلم لیگ نے مسئلے کے تمام پہلوؤں پر کامل غور وخوض کے بعد ایک قرارداد منظور کی ہے جس کا مفاد یہ ہے کہ کمیشن کا بائیکاٹ ملکی زاویہ نگاہ سے علی العموم اور اسلامی نقطۂ نگاہ سے علی الخصوص

نقصان رساں ہوگا۔ میرے خیال میں یہ قرارداد پنجابی مسلمانوں کے احساسات کا آئینہ ہے۔

مولانا محمد علی کو اقبال کا یہ اعلان تعاون پسند نہ آیا۔ لہٰذا انہوں نے اپنے اخبار ھمدرد میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے سر محمد شفیع کو وائسرائے کا وفادار قرار دیا اور اقبال کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا۔ جب دسمبر ۱۹۲۷ء میں محمد علی جناح نے مسلمانوں سے کمیشن کے مقاطعے کی اپیل کی تو اقبال نے بعض مسلم رہنماؤں کے ہمراہ ۸ر دسمبر ۱۹۲۷ء کو ایک بیان میں واضح کیا:

چند روز ہوئے مسٹر جناح اور چند ایک دیگر سربرآوردہ اشخاص نے ایک اعلان شائع کیا تھا جو ملک کے موجودہ ناگوار حالات کی طرف سے پریشان کر دینے والی بے حسی کو ظاہر کرتا ہے۔ اس اعلان میں اس حقیقت عظمٰی کو نظر انداز کر دیا گیا کہ رائل کمیشن موجودہ تاسف زار حالات ہی کی پیدائش ہے...... ہم نہایت عاجزی سے اپنے اہل وطن کو بالعموم اور مسلمان بھائیوں کو بالخصوص متنبہ کرنا چاہتے ہیں کہ مقاطعے کی لاحاصل روش اختیار کرنے سے، جیسا کہ مسٹر جناح اور اُن کے ہم خیالوں نے تجویز کی ہے، افسوس اور ندامت کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا...... یہ امر نہایت ضروری ہے کہ ہم اپنے ان حقوق کا تحفظ کر لیں جو ہندو ہمیں دینے سے انکار کر رہے ہیں۔ تدبّر کا اقتضا یہ ہے کہ اس نازک موقع پر جذبات کو عقل اور دلیل پر حاوی نہ ہونے دیں۔

پنجاب مسلم لیگ کے آل انڈیا مسلم لیگ سے دوسری دفعہ اختلاف کرنے پر محمد علی جناح و ڈاکٹر کچلو نے طے کیا کہ مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس لاہور کے بجائے کلکتے میں زیر صدارت سر محمد یعقوب منعقد ہو۔ اقبال نے اس فیصلے کو غیر دستوری قرار دیتے ہوئے ۱۴ر دسمبر ۱۹۲۷ء کو سر فیروز خان نون کی معیت میں ایک بیان جاری کیا جس میں کہا:

کلکتے میں اجلاس منعقد کرنے کے وجوہ کچھ اور ہی ہیں اور وہ نہیں جو ہمیں یا پبلک کو بتائے جا رہے ہیں۔ اصل وجہ یہ ہے کہ کلکتے میں مشترکہ حلقہ ہائے انتخاب کے متعلق ۲۰ر مارچ کی منظور کردہ تجاویز دہلی کو مسلمان قوم کے سر منڈھنے کا موقع لاہور کی بہ نسبت بہت زیادہ ہے کیونکہ مسلمانان پنجاب متفقہ طور پر جداگانہ حلقۂ ہائے انتخاب کے حامی ہیں۔

چنانچہ اس مرحلے پر مسلم لیگ دو حصوں میں بٹ گئی۔ ایک جناح لیگ کہلائی اور دوسری شفیع لیگ۔ ۱۹ر دسمبر ۱۹۲۷ء کو اقبال نے نواب سر ذوالفقار علی خان کے ہمراہ محمد علی جناح کی پالیسی پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک بیان میں واضح کیا:

ہم نے پہلے بھی وضاحت کر دی ہے کہ مختلف اقوام باہمی خونریزی کے ہولناک مظاہروں میں مصروف ہیں جس سے ہندوستان کی خودداری خاک میں مل گئی ہے۔ مسٹر جناح اور ان کے رفقاء

نے بدقسمتی سے قومی زندگی کی ایسی حالت کا تصور کر رکھا ہے جو حقیقت میں مفقود ہے...... کیا وہ ہم کو بتلا سکتے ہیں کہ ان کو کبھی ہندوؤں کی جانب سے سوائے سخت ہٹ دھرمی کے اور کوئی جواب ملا ہے...... ہم اکثریت کی ہوائی فیاضی پر اعتماد نہیں کر سکتے۔ اب قیاسات اور جذبات کی گنجائش نہیں۔ ہمیں ٹھوس دلائل کی ضرورت ہے۔

۲۹ ر دسمبر ۱۹۲۷ء کو باغ بیرون موچی دروازہ میں مسلمانوں کے ایک جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے اقبال نے اعلان کیا:

اس وقت مسلمانوں کے سامنے دو مسائل پیش ہیں۔ ایک حصول سوراج کا معاملہ اور دوسرا فرقہ وار نیابت کے قیام کا معاملہ ...... بدقسمتی سے ملک کی اکثریت کے طرزِ عمل نے مسلمانوں کو حصولِ سوراج کے مسئلے کی طرف سے بددل کر رکھا ہے۔ اب انہیں اپنے حقوق ملّی کے تحفظ کی فکر لاحق ہو رہی ہے اور مسلمانانِ ہند کی ترقی کا انحصار اس مسئلے پر ہے۔

بہرحال لیگ دو حصوں میں منقسم رہی۔ جناح لیگ نے اپنا سالانہ اجلاس کلکتے میں سر محمد یعقوب کی زیر صدارت منعقد کیا۔ جہاں تجاویز دہلی منظور کر لی گئیں، لیکن شفیع لیگ نے اپنا اجلاس زیر صدارت سر محمد شفیع ۳۱ر دسمبر ۱۹۲۷ء کو لاہور میں منعقد کیا۔ جس میں جداگانہ حق نیابت قائم رکھنے پر اصرار کیا گیا اور اقبال کی پیش کردہ مندرجہ ذیل قرارداد منظور ہوئی:

موجودہ نظام میں بنگال اور پنجاب کے مسلمانوں کو مجلسِ وضع قوانین میں اکثریت کے حقوق سے محروم رکھا گیا ہے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا یہ اجلاس اس کے خلاف پُرزور احتجاج کرتا ہے اور اسے اصول جمہوریت کے منافی بتاتا ہے۔ لیگ، حکومت سے مطالبہ کرتی ہے کہ ۱۹۲۱ء میں مسلمانوں کے ساتھ جو بے انصافی کی گئی تھی اسے دور کیا جائے۔

جنوری ۱۹۲۸ء میں مولانا محمد علی اقبال کا اپنا ہمنوا بنانے کے لئے لاہور آئے مگر اقبال کے دلائل کے پیش نظر انہیں کامیابی نہ ہوئی۔

۷ فروری ۱۹۲۸ء کو اقبال نے پنجاب کونسل کے آئندہ اجلاس میں یہ قرارداد پیش کرنے کا نوٹس دیا کہ گذشتہ سال ہنگامۂ فساداتِ لاہور میں جن اشخاص کو سزائیں دی گئیں، انہیں معاف کر کے رہا کر دیا جائے۔ ۲۲ر فروری ۱۹۲۸ء کو اقبال نے کونسل میں طب اور آیورویدک طریق علاج کے فروغ اور رواج دینے پر زور دیا۔ ۲۳ر فروری ۱۹۲۸ء کو انہوں نے کونسل میں انکم ٹیکس کے اصولوں کو محاصل اراضی پر عائد کرنے کی بحث میں شرکت کی اور اپنی دلچسپ تقریر

میں تاریخی حقائق اور قانونی تفصیلات کی روشنی میں واضح کیا کہ حکومت لگان وصول کرنا اپنا حق اس لیے سمجھتی ہے کہ وہی زمین کی مالک ہے، لیکن یہ نظریہ اب فرسودہ ہو چکا ہے۔ ۱۸ اپریل ۱۹۲۸ء کو انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں اقبال نے فلسفۂ اسلام کے موضوع پر انگریزی میں تقریر کی۔ انہی ایام میں وہ الٰہیاتِ اسلامیہ سے متعلق مقالوں کا ایک سلسلہ تحریر کر رہے تھے اور یہ خطبہ اس سلسلے کی ایک کڑی تھا۔

سائمن کمیشن کے لئے تیار کی جانے والی یادداشت میں مکمل صوبجاتی خودمختاری کا مطالبہ نہ کئے جانے پر اقبال نے ۲۴ر جون ۱۹۲۸ء کو شفیع لیگ کی سیکرٹری شپ سے استعفیٰ دے دیا اور اس سلسلے میں انہوں نے اپنے اخباری بیان میں اسے دوعملی کا مظہر اور دستوری ترقی کی راہ میں رکاوٹ قرار دیا۔ اقبال کے استعفیٰ کا اثر یہ ہوا کہ سر محمد شفیع کو لیگ کی یادداشت میں ترمیم کر کے مکمل صوبجاتی خودمختاری کا مطالبہ اس میں شامل کرنا پڑا اور اس کے بعد اقبال نے بھی یادداشت پر اپنے دستخط کر دیئے۔

۵ر نومبر ۱۹۲۸ء کو شفیع لیگ کے ایک وفد نے، جس میں اقبال بھی شامل تھے، سائمن کمیشن کے سامنے شہادت دی۔ بالآخر کمیشن نے کچھ حد تک مسلمانوں کے مطالبات قبول کر لینے کی سفارش کی۔ تاہم اقبال کمیشن کی رپورٹ سے مطمئن نہ تھے۔ وسط ۱۹۳۰ء میں جب سائمن رپورٹ شائع ہوئی تو انہوں نے اپنے بیان مورخہ ۲۴ر جون ۱۹۳۰ء میں اس پر کڑی تنقید کی۔ بہرحال گول میز کانفرنس کے متعلق وائسرائے کے اعلان نے سائمن رپورٹ کی اہمیت کو ختم کر دیا۔ لہٰذا یہ مشق بھی بارآور ثابت نہ ہوئی۔

اگست ۱۹۲۸ء میں جب نہرو رپورٹ کے کچھ حصے اخبارات میں شائع ہوئے تو اقبال نے اپنے تاثرات کا اظہار ایک بیان مورخہ ۲۰ر اگست ۱۹۲۸ء میں کیا۔ انہوں نے اعداد و شمار کی روشنی میں رپورٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے واضح کیا کہ اس سے مسلمانوں کی نیابت کو نقصان پہنچنے اور اکثریت سے اقلیت میں جانے کا اندیشہ ہے۔

اسی ماہ نہرو رپورٹ اور آل پارٹیز کانفرنس کے خلاف مولانا شوکت علی اور مولانا حسرت موہانی کے اخبارات میں بیانات شائع ہوئے۔ اقبال نے ان بیانات کو پڑھ کر ۴ر ستمبر ۱۹۲۸ء کو فری پریس کے نمائندے سے ملاقات کے دوران کہا:

مجھے ڈر ہے کہ آل پارٹیز کانفرنس کے اجلاس لکھنؤ کے فیصلہ جات اور مولانا شوکت علی کے وہ

حیرت انگیز انکشافات، جو انہوں نے اپنے ابتدائی بیان میں کئے ہیں، ہندوستان کی فرقہ وار صورتِ حال کو بد سے بدتر بنا دیں گے......ذاتی طور پر میں جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کا حامی ہوں۔ اس کی وجہ کسی حد تک تو مسلمانانِ ہند اور خاص کر مسلمانانِ پنجاب کی موجود اقتصادی حالت ہے، لیکن بڑی وجہ فرقہ وارامن وآتشی کے قیام کا احتمال ہے، جو میرے خیال میں صرف جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب ہی سے متعین ہوسکتا ہے۔

۷ نومبر ۱۹۲۸ء کو اقبال نے پنجاب کونسل کے آئندہ اجلاس میں صوبہ سرحد اور بلوچستان کے لیے علیحدہ یونیورسٹیوں کے قیام اور زرعی اراضی کے تحفظ سے متعلق قرار دادیں پیش کرنے کا نوٹس دیا۔ اسی ماہ انہوں نے اورئینٹل کانفرنس لاہور کے اجلاس میں شرکت کی اور مسلم سائنسدانوں کے عمیق تر مطالعہ کی دعوت کے موضوع پر انگریزی میں ایک جامع مقالہ پڑھا۔

۲۹ دسمبر ۱۹۲۸ء کو آل پارٹیز مسلم کانفرنس کا اجلاس زیر صدارت آغا خان دہلی میں منعقد ہونے والے اجلاس میں اقبال نے شرکت کی۔ اس میں جناح لیگ کے سوا تمام مسلم جماعتوں کے نمائندے شریک ہوئے۔ اجلاس میں نہرو رپورٹ کی مذمت کی گئی اور اس کے خلاف ایک قرارداد منظور کی گئی۔ اقبال نے قرارداد کی حمایت میں اپنی تقریر میں فرمایا:

میں اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہوں کہ آج سے نصف صدی قبل سرسید احمد خان مرحوم نے مسلمانوں کے لیے جو راہِ عمل قائم کی تھی وہ صحیح تھی اور تلخ تجربوں کے بعد ہمیں اس راہِ عمل کی اہمیت محسوس ہو رہی ہے۔ حضرات! آج میں نہایت صاف لفظوں میں کہنا چاہتا ہوں کہ ہم کو علیحدہ طور پر ایک پولیٹکل پروگرام بنانے کی ضرورت ہے۔ آج اس کانفرنس میں متفقہ طور پر جو ریزولیوشن پیش ہوا ہے وہ نہایت صحیح ہے اور اس کی صحت کے لیے میرے پاس ایک مذہبی دلیل ہے، اور وہ یہ ہے کہ ہمارے آقائے نامدار حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ میری اُمت کا اجتماع کبھی گمراہی پر نہ ہوگا۔

آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے اجلاس سے فراغت کے بعد اقبال دہلی سے ۲/جنوری ۱۹۲۹ء کو چوہدری محمد حسین اور عبداللہ چغتائی کی معیت میں جنوبی ہند کے دورے پر روانہ ہو گئے اور اس دورے کے دوران میں انہوں نے الٰہیات اسلامیہ کے موضوع پر مدراس، میسور، بنگلور اور حیدر آباد دکن میں خطبات دیے۔ جنوری ۱۹۲۹ء کے آخر میں وہ واپس لاہور پہنچے۔

اقبال افغانستان کے حالات میں گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ ۱۴/نومبر ۱۹۲۸ء کو افغانستان میں بغاوت کی ابتداء ہوئی، ہندوستان کی انگریزی حکومت نے اپنی اغراض کے

پیش نظر باغیوں کی امداد کی۔ بالآخر ۱۷؍جنوری ۱۹۲۹ء کو بچہ سقہ نامی ایک باغی نے کابل پر قبضہ کر لیا اور امیر امان اللہ خان کو ملک بدر کر دیا گیا۔ ۲۶؍فروری ۱۹۲۹ء کو لاہور کے ٹریبیون اخبار کے نمائندے نے افغانستان کے حالات کے متعلق اقبال کا ردعمل معلوم کرنے کے لیے ان سے ملاقات کی۔ انہوں نے فرمایا:

> معلوم ہوتا ہے کہ شہریار غازی کی ناکامی کا سبب بڑی حد تک یہ ہے کہ انہوں نے اصلاحات نافذ کرنے میں عجلت اور فوج کی طرف توجہ کرنے میں غفلت سے کام لیا اور دنیا کے ملاؤں کے نظریے کے خلاف حقیقی ترقی میں گہری دلچسپی لی۔ اس سے بلاشبہ افغانستان کے چند علماء ناراض ہو گئے ...... اس امر کے یقینی ہونے میں کوئی شبہ نہیں کہ عالمِ اسلام میں قدامت پسندانہ جذبات اور لبرل خیالات میں جنگ شروع ہو گئی ہے۔ اغلب ہے کہ قدامت پسند اسلام بغیر جدوجہد کے سر تسلیم خم نہیں کرے گا۔ اس لیے ہر ایک ملک کے مسلم مصلحین کو چاہیے کہ نہ صرف اسلام کی حقیقی روایات کو غور کی نگاہ سے دیکھیں بلکہ جدید تہذیب کی صحیح اندرونی تصویر کا بھی احتیاط سے مطالعہ کریں، جو بے شمار حالتوں میں اسلامی تہذیب کی مزید ترقی کا درجہ رکھتی ہے۔ جو چیزیں غیر ضروری ہیں ان کو ملتوی کر دینا چاہیے، کیونکہ ضروری چیزیں فی الحقیقت قابلِ لحاظ ہیں۔ یہ امر صحیح نہیں کہ مجلسی معاملات میں قدامت پسندانہ طاقتوں کو بالکل نظر انداز کر دیا جائے کیونکہ انسانی زندگی اپنی اصلی روایات کا بوجھ کندھوں پر اٹھا کر منزل ارتقا طے کرتی ہے۔

افغانستان میں سیاسی استحکام کے لئے حکومت برطانیہ نے پیرس میں مقیم افغان سفیر جنرل نادر خان سے رابطہ قائم کیا۔ چنانچہ جنرل نادر خان حکومت برطانیہ کی دعوت پر ہندوستان آئے۔ اقبال انہیں جانتے تھے، اس لیے جب جنرل نادر خان لاہور پہنچے تو ان کا استقبال کرنے والوں میں اقبال بھی لاہور ریلوے اسٹیشن پر موجود تھے۔ اقبال نے ان کی امداد کے لیے اپنی جیب سے پانچ سو روپے کی رقم پیش کی جو جنرل نادر خان نے انتہائی شکریے کے ساتھ انہیں لوٹا دی۔ اقبال نے کسی نہ کسی طریقے سے ان کی مدد جاری رکھی۔ جنرل نادر خان نے اقبال کی خدمات اور افغان قوم کے ساتھ اقبال کی ہمدردی اور وابستگی کا اعتراف اپنے ایک مکتوب محررہ ۲؍اکتوبر ۱۹۲۹ء میں کیا، جو انہوں نے اقبال کو لکھا۔

جنرل نادر خان کو وسیع مالی امداد فراہم کرنے کی خاطر سرمایہ اکٹھا کرنے کے لیے ایک جلسہ لاہور میں ۳؍اکتوبر ۱۹۲۹ء کو اقبال کی صدارت میں منعقد ہوا، جس میں باہمی مشورے کے بعد اتفاق رائے سے قرار پایا کہ فی الفور نادر خان ہلال احمر فنڈ کے نام سے ایک فنڈ کھول دیا

جائے۔ سرمائے کی فراہمی کے لیے ایک مجلس عاملہ قائم کی گئی، جس کے صدر اقبال منتخب ہوئے۔ اس سلسلے میں اقبال نے ۱۱/ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو مسلمانانِ ہند کے نام ایک اپیل بھی شائع کی۔ غرض انہی ایّام میں جنرل نادر خان اور ان کے لشکر نے کابل فتح کر لیا اور ۱۶/ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو افغانستان میں محمد نادر شاہ کی بادشاہت قائم ہوگئی۔

۴/ مارچ ۱۹۲۹ء کو اقبال نے پنجاب کونسل میں خسارے کے صوبائی بجٹ پر تقریر کرتے ہوئے انکم ٹیکس، محصولات، جائیداد کی تقسیم اور دوسرے مالی امور سے متعلق تجاویز پیش کیں۔

نہرو رپورٹ میں جناح ترمیمات کی نامنظوری کے تلخ تجربے کے بعد محمد علی جناح کو یہ احساس ہوگیا کہ ہندوؤں کے ساتھ کسی قسم کا سمجھوتا ممکن نہیں۔ یہی وہ موقع تھا جب اقبال اور محمد علی جناح کے سیاسی افکار میں، دونوں کی زندگی میں، پہلی بار ایسی ہم آہنگی پیدا ہوئی جو آخری دم تک قائم رہی۔ اس کا اعتراف محمد علی جناح نے اپنے ایک خط بنام انعام اللہ خان محررہ ۱۶/ مئی ۱۹۴۴ء میں کیا ہے فرماتے ہیں:

> ۱۹۲۹ء سے میرے اور سر محمد اقبال کے نظریات میں ہم آہنگی پیدا ہوئی اور وہی ایک عظیم اور اہم مسلمان تھے۔ جنہوں نے ہر مرحلے پر میری حوصلہ افزائی کی اور آخری دم تک میرے ساتھ مضبوطی سے کھڑے رہے۔

اس موقعے پر جناح لیگ اور شفیع لیگ میں اتحاد کی کوششیں کی گئیں۔ مگر جناح لیگ میں نیشنلسٹ مسلمانوں کے گروپ کی سازشوں کی وجہ سے اتحاد نہ ہو سکا۔ اقبال نے سر عبدالقادر اور سر فیروز خان نون کی معیت میں ۷/ اپریل ۱۹۲۹ء کو ایک بیان میں جناح لیگ میں موجودہ نیشنلسٹ مسلمانوں کے گروپ کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے پردہ اٹھایا۔

محمد علی جناح نے جناح لیگ میں موجود نیشنلسٹ مسلمانوں کے گروہ سے بیزار ہو کر آل انڈیا مسلم کانفرنس کی قرارداد کے دس مطالبات میں کچھ ترمیم (یعنی مرکز اور صوبے کی ہر وزارت میں ایک تہائی حصہ مسلمان ضرور ہوں) اور چار مطالبات کا اضافہ کر کے اپنا فارمولا، جو چودہ نکات کے نام سے مشہور ہوا، شائع کرایا۔

محمد علی جناح کے چودہ نکات کی اشاعت کے بعد جناح لیگ اور شفیع لیگ کے اختلافات ختم ہو گئے، لیکن دونوں لیگوں کا صحیح اتحاد ۲۸/ فروری ۱۹۳۰ء ہی کو عمل میں آیا، جب ڈاکٹر انصاری، چوہدری خلیق الزمان، آصف علی، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر کچلو اور ان کے ہمنوا جناح

لیگ سے نکل گئے تھے۔ ڈاکٹر کچلو اور ابوالکلام آزاد نے تو کانگرس کا رُخ اختیار کیا، لیکن باقیوں نے نیشنلسٹ مسلم پارٹی بنالی، جس کے صدر ڈاکٹر انصاری تھے اور سیکرٹری چوہدری خلیق الزمان۔ اب چودہ نکات مسلمانوں کی تمام سیاسی جماعتوں کے مشترکہ و متفقہ مطالبات قرار پائے لیکن چونکہ ماضی میں لیگ کے دولخت ہونے یا جناح لیگ میں موجودہ نیشنلسٹ مسلمانوں کے عنصر کے سبب بحیثیت مجموعی مسلم لیگ کی پوزیشن خاصی کمزور ہوگئی تھی، اس لیے یہی مناسب سمجھا گیا کہ مسلم لیگ کے ساتھ ساتھ آل پارٹیز مسلم کانفرنس کو بھی مسلمانانِ ہند کے فعال سیاسی ادارے کی حیثیت سے زندہ رکھا جائے۔

۱۴ر اپریل ۱۹۲۹ء کو انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں اقبال نے 'قرآن کا مطالعہ' کے موضوع پر ایک محققانہ اور فلسفیانہ خطبہ دیا اور یہ اجلاس دماغی اور روحانی روشنی کا بہتا ہوا چشمہ قرار دیا گیا۔

ستمبر ۱۹۲۹ء میں فلسطین میں حکومت برطانیہ کی یہودی نواز حکمت عملی کے سبب مسلمانوں میں بڑا اضطراب پھیلا۔ ۷ر ستمبر ۱۹۲۹ء کو لاہور میں ایک عظیم الشان جلسہ جس میں ہر جماعت کے لوگ شامل تھے، بیرون دہلی دروازہ منعقد ہوا۔ اس کی صدارت کے فرائض انجام دیتے ہوئے اقبال نے اپنے خطبے میں فرمایا:

> یہ بات قطعاً غلط ہے کہ مسلمانوں کا ضمیر حُبِ وطن کے جذبات سے خالی ہے۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ حُبِ وطن کے علاوہ مسلمانوں کے دل میں دینیت و محبت اسلام کا جذبہ بھی برابر موجود رہتا ہے اور یہ وہی جذبہ ہے جو ملّت کے پریشان اور منتشر افراد کو اکٹھا کر دیتا ہے، اور کر کے چھوڑے گا اور ہمیشہ کرتا رہے گا ...... فلسطین میں مسلمان اور ان کے بیوی بچے شہید کیے جا رہے ہیں۔ اس ہولناک سفا کی کا مرکز یروشلم ہے، جہاں مسجد اقصیٰ واقع ہے۔ اس مسجد کا تعلق حضرت خواجہ دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج مبارک سے ہے اور معراج ایک دینی حقیقت ہے جس کا تعلق مسلمانوں کے گہرے جذبات کے ساتھ ہے۔ شریعت اسلامیہ کی رو سے مسجد اقصیٰ کا سارا احاطہ وقف ہے جس پر قبضہ اور تصرف کا یہود اب دعویٰ کرتے ہیں۔ قانونی اور تاریخی اعتبار سے اس کا حق انہیں ہرگز نہیں پہنچتا۔ اب حکومت برطانیہ نے فلسطین میں تحقیقاتِ حالات کے لیے ایک کمیشن بھیجنا منظور کیا ہے، مگر میں اعلان کر دینا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کو اس پر کوئی اعتماد نہیں۔

اسی سال مرکزی اسمبلی میں شادی کے لیے عمر کے تعین سے متعلق شاردا بل پیش ہوا۔

اقبال کا موقف یہ تھا کہ ایسا قانون بنایا جائے کہ شادی کے بعد جو والدین اپنی نابالغ بیٹی کو خاوند کے گھر بھیجیں گے وہ مستوجب سزا ہوں گے۔

اکتوبر ۱۹۲۹ء کے پہلے ہفتے میں جب راقم پانچ برس کی عمر کو پہنچا تو اسے لاہور کے سیکرڈ ہارٹ مشنری اسکول میں داخل کرایا گیا۔ سردار بیگم اور اقبال دونوں راقم کے سکول سے واپس آنے کا بیتابی سے انتظار کرتے اسی زمانے میں مولانا محمد علی، اقبال سے ملاقات کے لیے آئے وہ متناسب جسم، میانہ قد اور باریش بزرگ تھے، نہایت خوش پوش، خوش باش اور خوش خوراک تھے۔ راقم کے لیے چاکلیٹ کا ڈبا بمبئی سے تحفے کے طور پر لائے تھے۔ اقبال سے بے تکلفی کے سبب وہ انہیں اقبال کہہ کر پکارتے تھے اور یہ بات راقم کے لیے بڑے تعجب و استعجاب کی تھی۔

۳۱/ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو وائسرائے ہند لارڈ ارون نے ہندوستان کی آئندہ دستور سازی کے مسئلے پر غور کرنے کے لیے گول میز کانفرنس کا اعلان کیا۔ اقبال نے چند سیاسی رفقا کے ساتھ اس اعلان کا خیر مقدم کیا۔ نومبر ۱۹۲۹ء کے آخری ہفتے میں اقبال علی گڑھ گئے اور وہاں مسلم یونیورسٹی میں مزید تین خطبات الٰہیات اسلامیہ کے موضوع پر دیے۔ ان ایّام میں سر راس مسعود مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ ۲۹/ نومبر ۱۹۲۹ء کو یونیورسٹی کے طلبہ کی یونین نے انہیں ایک سپاسنامہ پیش کیا اور آنریری لائف ممبر شپ دی۔ ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اقبال نے فرمایا:

> ایک دو باتیں ایسی کہوں گا جو کتابوں پر نہیں، میرے ذاتی تجربے پر مبنی ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ جب سے ہمارے تعلقات یورپ، خصوصاً انگلستان سے قائم ہوئے ہیں، اس وقت سے بہت سی چیزیں ہم تک وہاں سے پہنچی ہیں۔ سب سے اوّل چیز انگریزی لٹریچر ہے۔ دوسری بات افکار کی عادت ہے۔ تیسری چیز جو انگلستان نے ہم کو دی ہے وہ ایک مشتبہ قدر و قیمت کی چیز ہے اور وہ ڈیماکریسی ہے۔ جس صورت میں یہ ڈیماکریسی آ چکی ہے اور جو بمقدار کثیر آئندہ آنے والی ہے وہ افسوس ہے کہ میرے دل کو نہیں بھائی۔ ذاتی طور پر میں اس ڈیماکریسی کا معتقد نہیں ہوں اور محض اس لیے اس کو گوارا کر لیتا ہوں کہ اس کا فی الحال کوئی نعم البدل نہیں ہے۔ ایک اور بات جس پر میں زور دینا چاہتا ہوں وہ ہمارا انکشافِ ماضی ہے۔ میں گزشتہ بیس برس سے قرآن شریف کا بغور مطالعہ کر رہا ہوں، ہر روز تلاوت کرتا ہوں، مگر میں ابھی تک یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کے کچھ حصوں کو سمجھ گیا ہوں۔ اگر خدا نے توفیق دی اور فرصت ہوئی تو میں ایک دن کامل تاریخ اس بات کی قلمبند کروں گا کہ دنیاے جدیدہ اس مطمحِ حیات سے کس طرح ترقی کرتی ہوئی بنی ہے جو قرآن شریف نے ظاہر کیا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ یونیورسٹی ایسے لوگوں کی ایک تعداد پیدا

کرے گی جو مطالعہ قرآن میں اپنی زندگیاں صرف کر دیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ لوگ میرے ساتھ مل کر کام کریں۔ گذشتہ چند سال سے میں صرف اپنے جسد خاکی کا مالک ہوں، میری روح ہمیشہ آپ کی خدمت کے لیے حاضر رہی ہے اور جب تک میں زندہ ہوں وہ آپ کی خدمت کرتی رہے گی۔

اقبال کی تمنا تھی کہ گول میز کانفرنس سے پیشتر مسلمانوں کا آپس میں مکمل اتحاد ہونا چاہیے اور بعد میں اگر ممکن ہو سکے تو ہندو مسلم اتحاد، تبھی گول میز کانفرنس کے حوصلہ افزا نتائج برآمد ہو سکتے تھے۔ اس سلسلہ میں برکت علی محمڈن ہال کے ایک جلسہ مورخہ ۱۹ر دسمبر ۱۹۲۹ء میں انہوں نے بڑی دردمندی سے فرمایا:

خدا کے لیے مسلمانوں کے تحفظِ حقوق کے لیے کچھ کرو۔ تمام اسٹیجوں کو جلا دو اور ایک متحدہ اسٹیج بناؤ اور آئندہ گول میز کانفرنس میں جانے سے پیشتر ایک کانفرنس کر لو۔ ہندوؤں کو ایک موقع دو محض اتمام حجت کے لیے، تاکہ ان سے مفاہمت اگر ممکن ہو تو ہو جائے، گو مجھے اس کا یقین نہیں۔ انگلستان متحد ہو گا اور متحد ہندوستان کو انگلستان کا مقابلہ کرنا چاہیے۔

۷ر مارچ ۱۹۳۰ء کو اقبال نے پنجاب کونسل میں بجٹ پر اپنی آخری تقریر کے دوران میں صوبے کے مالی مسائل اور بے روزگاری کی طرف حکومت کی توجہ دلائی۔

۱۳ر جولائی ۱۹۳۰ء کو محمد علی جناح نے مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں اقبال کو صدر منتخب کرایا اور اقبال کی زیر صدارت لکھنؤ میں، ۱۷ر اگست ۱۹۳۰ء کو لیگ کا اجلاس طلب کیا تاکہ گول میز کانفرنس کے لیے پالیسی تشکیل دی جا سکے۔ تاہم یہ اجلاس کئی بار ملتوی کرنا پڑا۔ بالآخر طے پایا کہ اجلاس ۲۹ر دسمبر ۱۹۳۰ء کو الٰہ آباد میں منعقد کیا جائے۔

۱۷ر اگست ۱۹۳۰ء کو شیخ نور محمد کا سیالکوٹ میں انتقال ہوا۔ اقبال ان کی تیمارداری کے لیے سیالکوٹ آتے جاتے رہتے تھے۔ تجہیز و تکفین کے لیے بھی سیالکوٹ گئے اور فراغت کے بعد واپس لاہور پہنچے۔ شیخ نور محمد فطرتاً بڑے دیندار، عالی ظرف، بردبار، ناحق ایذا پہنچانے والوں کو معاف کرنے والے، سادہ، نیک، شفیق، حلیم اور صلح کن تھے۔ عطا محمد اور اقبال کو ان کی چند ہی خوبیاں ورثے میں ملیں۔ ورنہ باپ کے مقابلے میں دونوں بیٹوں کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ شیخ نور محمد کی لوحِ مزار پر اقبال کا یہ قطعۂ تاریخ کندہ ہے ؎

پدر و مُرشدِ اقبال ازیں عالم رفت ماہمہ را ہرواں، منزل ما ملک ابد

ہاتف از حضرتِ حق خواست دو تاریخ رحیل آمد آواز ’’اثر رحمت و آغوش لحد‘‘
۱۳۴۹ھ ۱۳۴۹ھ

۳۱/اگست ۱۹۳۰ء کو میکلوڈ روڈ والی رہائش گاہ میں سردار بیگم کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی۔ لڑکی کا نام منیرہ بیگم رکھا گیا۔

۱۲/نومبر ۱۹۳۰ء کو لندن میں پہلی گول میز کانفرنس شروع ہوئی، جس کا اختتام ۱۹ جنوری ۱۹۳۱ء کو ہوا۔ اس کانفرنس میں اقبال کو مسلم نمائندوں میں شامل نہیں کیا گیا تھا۔ دوران کانفرنس برطانوی حکومت نے پنجاب اور بنگال کے مسلم نمائندوں پر زور دیا کہ وہ مخلوط انتخاب کو قبول کر لیں۔ جب یہ خبر اقبال کو ملی تو انہوں نے ۱۵/نومبر ۱۹۳۰ء کو آغا خان کے نام اپنے تار میں اس پر سخت ردعمل کا اظہار کیا۔ ۲۳/نومبر ۱۹۳۰ء کو اقبال نے مسلم آؤٹ لک کے نمائندے کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ جن صوبوں مسلمان اکثریت میں ہیں ان میں حصول اکثریت کے لیے اصرار ضروری ہے۔ اقبال کے اسی موقف کے پیش نظر لاہور کے اخبار ٹریبیون نے لکھا کہ ہندو مسلم مفاہمت کی راہ میں دراصل اقبال ہی حائل ہیں۔

اپنے موقف کو عملی جامہ پہنانے کی خاطر اسی دن یعنی ۲۳/نومبر ۱۹۳۰ء کو اقبال کی دعوت پر مسلم اکابرین کا ایک اجتماع برکت علی محمڈن ہال لاہور میں منعقد ہوا، جس میں اقبال نے اجتماع کا مقصد بیان کرتے ہوئے فرمایا:

> حالات حاضرہ کے اعتبار سے شمالی ہند کے مسلمانوں کی ایک خاص کانفرنس کا انعقاد ضروری ہے، جس میں صوبہ سرحد، بلوچستان، پنجاب و سندھ کے نمائندے شریک ہوں اور ان صوبوں کے مسلمانوں کو اسلامی حقوق کے حصول کے لیے منظم بنانے اور ان میں جوش عمل پیدا کرنے کی تدابیر اختیار کی جائیں۔

اس اجتماع میں اپر انڈیا مسلم کانفرنس کی ایک مجلس استقبالیہ قائم کی گئی، اور اقبال کانفرنس کے صدر منتخب ہوئے۔ ۴/دسمبر ۱۹۳۰ء کو مجلس استقبالیہ کا اجلاس اقبال کی میکلوڈ روڈ والی رہائش گاہ پر منعقد ہوا اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ چونکہ مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس اقبال کی زیرِ صدارت دسمبر ۱۹۳۰ء میں الٰہ آباد میں ہونے والا ہے، اس لیے اپر انڈیا مسلم کانفرنس دسمبر ۱۹۳۰ء کی بجائے جنوری ۱۹۳۱ء کے آخری ہفتے میں لاہور میں منعقد کی جائے۔ ۱۹/دسمبر ۱۹۳۰ء کو اقبال اور دیگر ارکانِ مجلس استقبالیہ کی طرف سے صوبہ سرحد، بلوچستان، سندھ اور پنجاب کی اہم مسلم شخصیات کے نام اپر انڈیا مسلم کانفرنس کے اغراض و مقاصد کے متعلق ایک اپیل کی گئی اور ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں

کے تحفظ کے لیے سرگرم عمل ہونے کا پیغام دیا گیا۔ تاہم آغا خان کی طرف سے ہندوؤں کے ساتھ مفاہمت کی خبروں کو بے بنیاد کہنے کے بعد اپر انڈیا مسلم کانفرنس منعقد کرنے کی ضرورت نہ رہی۔

۲۷ / دسمبر ۱۹۳۰ء کو انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے کی صدارت کے لیے نظام حیدر آباد دکن نے آنا تھا، لیکن انہوں نے بعض مجبوریوں کے باعث معذرت کر دی۔ اس پر نواب صادق علی خان والیِ ریاست بہاولپور نے جلسے کی صدارت کے فرائض انجام دیے اور اقبال نے ان کی خدمت میں تہنیت نامہ پیش کیا۔ اس سے اگلے روز وہ مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارت کے لیے الٰہ آباد روانہ ہو گئے۔

عملی سیاست میں اقبال جس ملی خدمت کے لیے اترے تھے، انہوں نے وہ عہد کونسل کے اندر اور باہر پورا کیا۔ کونسل میں اقبال نے ایک منجھے ہوئے پارلیمنٹیرین کی طرح ہر اہم اجتماعی مسئلے پر پوری تیاری کے ساتھ اظہارِ خیال کیا۔ یہ مسائل معیشت، مذہب، قانون، تعلیم، خواتین، بہبود عامہ اور مسلمانوں کی پستی سے متعلق تھے۔ کونسل میں مقامی مسائل کے علاوہ کونسل سے باہر بین الاقوامی مسائل سے بھی اقبال لاتعلق نہ رہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اقبال کے عملی سیاست میں داخل ہونے کے بعد کب ان کے ذہن میں برصغیر کے شمال مغربی مسلم اکثریتی صوبوں پر مشتمل مسلم ریاست کا خاکہ ابھرنا شروع ہوا؟ اس سلسلے میں ان کی چند تقریروں کے اقتباسات اور بعض واقعات تاریخ وار پیش کرنے کی ضرورت ہے۔

اقبال نے یکم مئی ۱۹۲۷ء کو پنجاب صوبائی مسلم لیگ کے اجلاس میں اپنی تقریر میں ''تجاویز دہلی'' کے اس حصے کی شدید مخالفت کی جس میں جداگانہ انتخاب سے دست برداری کی پیشکش کی گئی تھی۔ ۲۸ / جون ۱۹۲۸ء کو اپنے اخباری بیان میں وفاق سے عدم دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے مسلم اکثریتی صوبوں کے لیے مکمل صوبجاتی خودمختاری کے مطالبہ پر اصرار کیا۔ ۲۹ / دسمبر ۱۹۲۸ء کو آل انڈیا مسلم کانفرنس کے اجلاس منعقدہ دہلی میں تقریر کے دوران میں واضح کیا کہ ہندوستان کے بعض حصے ایسے ہیں، جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور بعض حصے ایسے ہیں جن میں وہ قلیل تعداد میں ہیں، اس لیے ان حالات میں مسلمانوں کو علیحدہ طور پر ایک سیاسی پروگرام بنانے کی ضرورت ہے۔

عبد السلام خورشید کے بیان کے مطابق انہی ایّام میں اخبار انقلاب میں مولانا مرتضٰی احمد خان (میکش) نے چار مضامین یکے بعد دیگرے شائع کیے جن میں مسلمانوں کے لیے

پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان پر مشتمل ایک علیحدہ وطن کا تصور پیش کیا گیا۔ مولانا مرتضیٰ احمد خان کے یہ مضامین علامہ کی راہنمائی میں ہی لکھے گئے۔

۱۹۲۹ء کے اوائل میں جغرافیائی نقشہ جات بنانے میں ماہر ایک جرمن مہمان سے اقبال نے اس وقت کی مردم شماری کی رپورٹ پر انحصار کرتے ہوئے ہندو مسلم تناسب سے ہندوستان اور اس کے مختلف صوبوں کے نقشے تیار کرائے جن میں ہندو آبادی کیسری رنگ کے نقطوں سے اور مسلم آبادی سبز رنگ کے نقطوں سے ظاہر کی گئی۔ اقبال کے بھتیجے شیخ مختار احمد کے بیان کے مطابق جن کے کمرے میں جرمن ماہر مقیم تھا اور نقشے بنانے کے کام میں مصروف تھا، ان نقشوں میں بالخصوص پنجاب اور بنگال کے صوبوں کے مختلف اضلاع میں بھی ہندو مسلم آبادی کی تفصیل دی گئی۔ غالباً ۱۹۶۶ء یا ۱۹۶۷ء میں اس جرمن کو اقبال کی اس خدمت پر خراج تحسین ادا کرنے کی صورت میں حکومت پاکستان نے سرکاری مہمان کی حیثیت سے پاکستان کی سیر کے لیے بلوایا اور وہ راقم اور مختار احمد سے ملاقات کی خاطر لاہور بھی آیا تھا۔

۴/ مارچ ۱۹۲۹ء کو اقبال نے پنجاب کونسل میں بجٹ پر تقریر کرتے ہوئے انکم ٹیکس کو صوبہ جاتی بنانے کی جو تجویز پیش کی تھی۔ اس زمانے میں اسے ایک انوکھی تجویز سمجھا گیا، لیکن یہ اندازہ نہ لگایا جا سکا کہ ایسی تجویز اقبال نے کس ذہنی پس منظر کے ساتھ پیش کی ہے۔ اقبال کا موقف یہ تھا کہ مرکزی حکومت ہر صوبے سے صرف اپنا حصہ رسدی وصول کرے۔

۳۰/ دسمبر ۱۹۲۹ء کو خلافت کانفرنس کے اجلاس منعقدہ لاہور، جس میں دیگر اکابرین کے ساتھ اقبال بھی موجود تھے، نواب سر ذوالفقار علی خان جو اقبال کے گہرے دوست اور سیاسی اعتبار سے ان کے ہم فکر تھے، نے تقریر کرتے ہوئے کہا:

> ہندوستان کی آزادی اور ترقی کا انحصار اس بات پر ہے کہ مسلمانوں کو شمالی ہند میں ایسا علاقہ دے دیا جائے جو دو یا تین صوبوں پر مشتمل ہو یا انہیں مدغم کر کے ایک صوبہ بنا دیا جائے۔ اس صوبے میں مسلمانوں کی آبادی اسّی فیصد سے کم نہ ہونی چاہیے۔ اسی طرح مشرقی ہند میں بنگال کی ایسی تقسیم کر دی جائے کہ مسلمانوں کی آبادی وہاں اسّی فیصد ہو۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ حقوق کے بجائے علیحدہ وطن کا مطالبہ کریں۔

بعد ازاں نومبر ۱۹۳۰ء میں اقبال کے ایما پر مسلم اخبارات نے تجویز پیش کی کہ اپر انڈیا مسلم کانفرنس فوراً بلوائی جائے۔ عبدالسلام خورشید تحریر کرتے ہیں:

انہوں نے مدیرانِ انقلاب مہر و سالک، مدیر سیاست، سید حبیب، اور مدیر مسلم آؤٹ لک مجید ملک کو بلا کر تبادلۂ خیال کیا اور انہی کے مشورے پر انقلاب نے ایک مقالۂ افتتاحیہ میں یہ تجویز پیش کی کہ شمالی ہند کے مسلمان اپنے مخصوص مسائل پر غور کرنے کے لیے ایک کانفرنس منعقد کریں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مسلمانوں کی ایک علاقائی کانفرنس کرانے کا منصوبہ باندھا گیا، ورنہ اس سے پہلے کانفرنسیں صوبائی اور کُل ہند سطح پر ہوا کرتی تھیں۔

۲۳ر نومبر ۱۹۳۰ء کو اپر انڈیا مسلم کانفرنس قائم ہوئی اور اقبال اس کے صدر منتخب کیے گئے۔ دوسرا اجلاس ۱۹ر دسمبر ۱۹۳۰ء کو ہوا۔ جس میں اقبال اور دیگر ارکانِ مجلس استقبالیہ اپر انڈیا مسلم کانفرنس کے نام سے ایک اپیل تیار کی گئی، جو بعد میں اخباروں میں چھپی۔ اس اپیل کے الفاظ میں بھی اقبال ہی کا فکر کارفرما تھا، مثلاً

مسلمانانِ ہند کی اس کثرت کو جوان صوبہ جات میں ہے، جن کو خدائے حکیم و علیم و خبیر نے یقیناً بلا مصلحت نہیں بلکہ کسی ایسی مصلحت کے لیے، جو اربابِ دانش و بینش پر روز بروز عیاں ہوتی جاتی ہے، یکجا رکھا ہے۔

اس ساری تفصیل سے تو یہی واضح ہوتا ہے کہ سیاسیات کے عملی میدان میں داخل ہوتے ہی اقبال کے ذہن میں برصغیر کے شمال مغرب میں مسلم اکثریتی صوبوں پر مشتمل ایک مسلم ریاست کا خاکہ ابھرنے لگا تھا، جس کی جھلکیاں ان کی بعض تقاریر اور تجاویز میں صاف دکھائی دیتی ہیں۔ تاہم یہ انقلابی تصور پیش کرنے سے پیشتر انہوں نے اپنے دل کی بات مختلف ذرائع سے کہلوائی تاکہ ہندوؤں کا ردعمل معلوم کیا جا سکے یا مسلم رائے عامہ کو ایسی تجویز کے حق میں تیار کیا جا سکے۔

اب ایک اور سوال بھی غور طلب ہے۔ مسلم لیگ کے اجلاس الہ آباد کی صدارت کے لیے لیگ کونسل کے اجلاس مورخہ ۱۴ر جولائی ۱۹۳۰ء میں محمد علی جناح نے اقبال کا نام کیوں تجویز کیا؟ محمد علی جناح کی نہرو رپورٹ میں ترمیمات، ان کے چودہ نکات اور مولانا حسرت موہانی کے انڈیا کے اندر مسلم انڈیا کے قیام کے مطالبے کو ہندوؤں کی طرف سے مسترد کئے جائے کے بعد مسلمانانِ برصغیر کے لئے واحد قابلِ عمل حل وہی تھا جس کی طرف اقبال نے اپنے خطبے میں اشارہ کیا۔ اقبال اور محمد علی جناح میں سیاسی نظریات میں یگانگت اور ہم آہنگی کا جو دور مارچ ۱۹۲۹ء سے شروع ہوا اس کے نتیجے میں جناح سے یہ امر مخفی نہ تھا کہ اقبال کے خطبے کا مرکزی نکتہ کیا ہوگا۔ پس اسی سبب اجلاس الٰہ آباد کی صدارت کے لیے انہیں منتخب کیا گیا۔

• ۱۹۳۰ء کے بعد مسلمانوں کی سیاسیات میں بڑا انتشار پیدا ہوا۔ مولانا محمد علی فوت ہو گئے اور محمد علی جناح نے لندن میں گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کر لی۔ یہ صورت حال اس وقت تک جاری رہی، جب دسمبر ۱۹۳۳ء کے آخری ہفتے میں محمد علی جناح ہندوستان واپس آئے۔ آخر کار ۴/ مارچ ۱۹۳۴ء کو محمد علی جناح لیگ کے صدر منتخب کیے گئے اور لیگ کا احیاء عمل میں آیا۔

• ۱۹۳۰ء میں پنجاب کونسل کی مدتِ رکنیت کے خاتمے کے بعد اقبال برصغیر کے مسلمانوں میں ایک اہم سیاسی شخصیت کے طور پر اُبھرے۔ انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے منتخب صدر کی حیثیت سے الٰہ آباد میں اپنا معروف خطبہ دیا۔ بعد میں دو مرتبہ گول میز کانفرنسوں میں شمولیت کے لیے انگلستان گئے۔ آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے اجلاس لاہور کی صدارت کی اور آخری دم تک مسلمانانِ ہند اور مسلمانانِ عالم کے سیاسی مستقبل میں گہری دلچسپی لیتے رہے، لیکن پھر کبھی صوبائی یا دیگر نوعیت کے انتخابات میں امیدوار کی حیثیت سے کھڑے نہ ہوئے۔

• ۱۹۳۰ء سے لے کر ۱۹۳۳ء تک کل ہند مسلم سیاسیات کے محقق کو تاریخی اہمیت کی حامل اگر کوئی تحریریں ملتی ہیں۔ تو ان میں اقبال کے دو خطبات بھی ہیں۔ ایک خطبہ الٰہ آباد اور دوسرا خطبۂ صدارت آل پارٹیز مسلم کانفرنس لاہور، مورخہ ۲۱/ مارچ ۱۹۳۲ء ان خطبات کا تجزیہ مناسب مقام پر کیا جائے گا۔ یہاں اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ ان خطبات کے ذریعے اقبال نے نظریاتی اساس پر مسلمانوں کی آئندہ سیاسی حکمت عملی کے لیے ایک رُخ، سمت، نصب العین یا منزل کا تعین کر دیا دراصل مسلمانانِ برصغیر کے لیے اقبال کی خدمات کے دو قابلِ ذکر پہلو اس عہد میں منکشف ہوئے۔ ایک خالصتاً عملی، جس کا تعلق سیاسیات سے تھا اور دوسرا خالصتاً فکری جس کا اظہار وہ شروع ہی سے اپنی شعری تخلیقات یا نثری تحریروں میں کرتے چلے آ رہے تھے، مگر اس دور میں انہوں نے الٰہیات اسلامیہ کی تشکیلِ نو کے سلسلے میں یہ اظہار اپنے مقالات کے ذریعے کیا۔

باب:۱۶

دورۂ جنوبی ہند

اقبال نے اپنے سفرِ جنوبی ہند کے دوران میں خطبات کے ذریعے اسلامی معاشرے کی تشکیل نو کے لیے اسلامی تمدن کی قدیم فکری روایات کو فکر جدید کی روشنی میں پیش کیا۔ اقبال کے عقیدے کے مطابق اسلام کا تصورِ حیات جامد نہیں بلکہ متحرک ہے۔ انہوں نے ایک انگریزی مقالہ بعنوانِ ''اسلام میں اجتہاد'' حبیبیہ ہال اسلامیہ کالج، لاہور میں ۱۳ر دسمبر ۱۹۲۴ء کو پڑھا۔ جس پر بعض قدامت پسند علماء نے انہیں کافر قرار دیا۔ انہی ایاّم میں مولوی ابومحمد دیدار علی کے فتوی کفر پر اقبال نے مولانا اکبر شاہ خان نجیب آبادی کو تحریر کیا:

> آپ نے ٹھیک فرمایا ہے پیشہ ور مولویوں کا اثر سر سید احمد خان کی تحریک سے بہت کم ہو گیا تھا، مگر خلافت کمیٹی نے اپنے سیاسی فتوؤں کی خاطر ان کا اقتدار ہندی مسلمانوں میں پھر قائم کر دیا۔ یہ ایک بہت بڑی غلطی تھی، جس کا احساس ابھی تک غالباً کسی کو نہیں ہوا۔ مجھ کو حال ہی میں اس کا تجربہ ہوا ہے۔ کچھ مدت ہوئی میں نے اجتہاد پر ایک انگریزی مضمون لکھا تھا جو یہاں ایک جلسے میں پڑھا گیا تھا ان شاءاللہ شائع بھی ہوگا، مگر بعض لوگوں نے مجھے کافر کہا۔

جنوبی ہند کے بہت بڑے تاجر سیٹھ جمال محمد نے مسلم ایسوسی ایشن قائم کر رکھی تھی، جس کے زیر اہتمام سید سلیمان ندوی مدراس میں سیرت نبویؐ پر اور محمد مارماڈیوک پکتھال تمدنِ اسلام پر عالمانہ خطبے دے چکے تھے۔ سیٹھ جمال محمد نے مسلم ایسوسی ایشن کی طرف سے ۱۹۲۵ء میں اقبال کو مدراس آ کر اجتہاد ہی کے موضوع پر مقالات پڑھنے کی دعوت بھیجی جسے اقبال نے قبول کر لیا، لیکن خطبات کی تعداد یا سفرِ مدراس کی تاریخ کا فیصلہ مستقبل پر چھوڑ دیا۔

دعوت قبول کرنے کے اسباب سلطان ٹیپو شہید کی تُربت کی زیارت اور تمدنِ اسلام کے بعض نہایت اہم مسائل کے متعلق عصری تقاضوں کی روشنی میں اپنی تحقیقات اور نظریات کو یکجا کرنا تھا۔ تاکہ انہیں کتاب کی صورت میں شائع کرا کے دنیا کے سامنے پیش کیا جا سکے۔ اس

ضرورت کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے سید سلیمان ندوی کو لکھا:

میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ میرے دل میں ممالکِ اسلامیہ کے موجودہ حالات دیکھ کر بے انتہا اضطراب پیدا ہو رہا ہے۔ ذاتی لحاظ سے خدا کے فضل و کرم سے میرا دل پورا مطمئن ہے۔ یہ بے چینی اور اضطراب محض اس وجہ سے ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ نسل گھبرا کر کوئی اور راہ اختیار نہ کر لے۔

ان کے خیال میں یورپ کی جدید تہذیب، اسلامی تمدن ہی کی ایک ترقی یافتہ صورت تھی۔ مثلاً یورپ میں فکر کے میدان میں ڈیکارٹ کا جدید فلسفے کا اصول امام غزالی کی احیائے علوم، دانتے کی ڈیوائن کامیڈی، محی الدین ابن عربی کے افکار و تخیلات، استقرائی منطق میں بیکن کے نظریات معروف مسلم منطقی یعقوب کندی اور نصیر الدین طوسی کے افکار و نظریات سے ماخوذ ہیں۔ اسی طرح کانٹ سے پانچ سو سال پہلے مسلم صوفیا تعدّد زمان و مکاں کے قائل تھے اور انہوں نے فکری طور پر اس امکان کا اظہار کر دیا تھا کہ مکان کے ابعاد تین سے زیادہ بھی ہو سکتے ہیں۔ اقبال جدید فکر کی روشنی میں علوم اسلامیہ کے احیاء کے خواہش مند تھے، کیونکہ ان کے نزدیک اگر ایسا نہ کیا گیا تو یورپ کے ''معنوی استیلا'' کا خطرہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے سید سلیمان ندوی کو لکھا:

میرے نزدیک اقوام کی زندگی میں قدیم ایک ایسا ہی ضروری عنصر ہے جیسا کہ جدید مگر میں دیکھتا ہوں کہ اسلامی ممالک میں عوام اور تعلیم یافتہ لوگ دونوں طبقے علومِ اسلامیہ سے بے خبر ہیں۔ اس بے خبری سے آپ کی اصطلاح میں یورپ کے ''معنوی استیلا'' کا اندیشہ ہے جس کا سدِّ باب ضروری ہے۔

اقبال کو یہ بھی یقین تھا کہ ہندوستان کے مسلمان علوم اسلامیہ کے احیا کے ذریعے ممالکِ اسلامیہ کی مدد کر سکتے تھے۔ کیونکہ ایسے احیاء کے ذریعے ہی اسلام اور علومِ جدیدہ کی حیاتِ ذہنی کا ٹوٹا ہوا سلسلہ دوبارہ جوڑ کر مسلمانوں کو سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدانوں میں ترقی کرنے کی ترغیب دی جا سکتی تھی جس کا مقصد مسلم دنیا کی طرف سے یورپ کو دیے جانے والے فکری تسلسل کو ترقی یافتہ شکل میں مزید آگے بڑھانا ہے۔ اقبال سیاسی میدان میں اسلام کی حفاظت کے نصب العین اور علوم اسلامیہ کے ساتھ دینی فکر کو بھی جدید انداز میں پیش کرنے کے آرزومند تھے۔ ان کی نگاہ میں یورپ نے عقل و الہام کو ہم آہنگ بنانے کا طریقہ مسلمانوں سے سیکھا تھا، لہٰذا وہ اس طریق سے اپنی دینیات کو موجودہ فلسفے کی روشنی میں از سرِ نو تعمیر کرنے میں مسلمانوں

سے بہت آگے نکل گئے، لیکن چونکہ اسلام، عیسائیت سے کہیں زیادہ سادہ اور عقلی مذہب ہے، اس لیے اس میں جدید دینیات یا علم کلام کی طرح ڈالنا نسبتاً آسان تھا۔ انہیں اس بات کا احساس تھا کہ دنیائے اسلام میں ایک ذہنی انقلاب کے آثار پیدا ہو رہے ہیں۔ اقبال کی تگ و دو کا مدعا اس آنے والے ذہنی انقلاب کے لیے راہ ہموار کرنا تھا۔

ان کے نزدیک دوسرا اہم مسئلہ فقہ اسلامی کی تشکیل نو تھا۔ اقبال کا عقیدہ تھا کہ جو شخص دور حاضر میں قرآنی نقطہ نظر سے زمانۂ حال کے جورس پرڈونس پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا، وہی اسلام کا مجدد اور بنی نوعِ انسان کا سب سے بڑا خادم ہو گا۔ انہوں نے سید سلیمان ندوی کو تحریر کیا:

> میرا مقصود یہ ہے کہ زمانۂ حال کے جورُس پروڈنس کی روشنی میں اسلامی معاملات کا مطالعہ کیا جائے مگر غلامانہ انداز میں نہیں بلکہ ناقدانہ انداز میں اس سے پہلے مسلمانوں نے عقائد کے متعلق ایسا ہی کیا۔ یونان کا فلسفہ ایک زمانے میں انسانی علوم کی انتہا تصور کیا گیا، مگر جب مسلمانوں میں تنقید کا مادہ پیدا ہوا تو انہوں نے اسی فلسفے کے ہتھیاروں سے اس کا مقابلہ کیا۔ اس عصر میں معاملات کے متعلق بھی ایسا ہی کرنا ضروری ہے۔

اس مقصد کا حصول اجتہاد سے ممکن تھا۔ مگر مغرب کہ نظریاتی اور سیاسی محکومی کے باعث مسلمان اجتہاد فکر کی صلاحیت سے محروم تھے۔ اقبال چاہتے تھے کہ اس سمت میں کوئی قدم اٹھایا جائے تاکہ مسلمانوں میں رفتہ رفتہ ایسے لوگ پیدا کیے جا سکیں جو خود اجتہادِ فکر پر قادر ہوں اور مستقبل میں آنے والے ذہنی انقلاب کے دور میں انہیں صحیح راہنمائی فراہم کرنے کی اہلیت رکھتے ہوں۔

تیسرا اہم مسئلہ جس پر اقبال اظہارِ خیال کرنے کے خواہشمند تھے، مسلم ریاستوں کی طرزِ حکومت اور اتحاد اقوام اسلامیہ کا تھا۔ خلافت کے خاتمے کے بعد برطانیہ ادارۂ خلافت کی صورت میں ایک ایسی کٹھ پتلی شخصیت کی تلاش میں تھا جو ظاہراً خلیفۃ المسلمین مگر درحقیقت وہ انگریزوں کا آلۂ کار ہو۔ لہٰذا اقبال عصر حاضر میں خلافت کا احیاء مسلمانوں کے لیے نقصان دہ سمجھتے تھے۔ جمہوریت کو بھی وہ کسی مناسب نعم البدل کی عدم موجودگی میں ہی محض گوارا کرتے تھے۔ جمہوریت کے متعلق ان کا اعتراض خالصتاً فلسفیانہ یا اخلاقی نوعیت کا تھا۔ اقبال مغرب کے سرمایہ دارانہ جمہوری نظام کو پسماندہ اقوام کا استحصال کرنے کے باعث نفرت کی نگاہ سے دیکھتے

تھے، اس کے ردِّعمل کے طور پر روس میں اشترا کی انقلاب آ چکا تھا اور انہیں اندیشہ تھا کہ مغرب کی نقالی کرتے ہوئے اگر اسی قسم کا نظام دنیائے اسلام میں رائج ہوا تو وہ بھی کسی دن اشترا کی انقلاب کی زد میں آ کر روس کے سوشل استعمار کا نشانہ بن جائے گی۔

ان اہم مسائل کے علاوہ اقبال خدا، کائنات، انسان، عشق و عقل، خودی، تصوف، حیات بعدالموت، زمان و مکاں یا دیگر مابعدالطبیعیاتی، اخلاقی اور تمدنی مسائل کے بارے میں اپنے نظریات کی وضاحت کرنا چاہتے تھے۔ ان مسائل پر غور کے دوران یورپی تمدن اور مغربی ادبیات و فلسفے، اسلامی تمدن، عربی و فارسی ادبیات اور مسلم فلاسفہ کے افکار پر عبور کے باوجود تفسیر، حدیث اور فقہ یا دینی علوم کے حوالے سے اقبال نے اپنے جاننے والے بعض علماء سے خط و کتابت کی یا بحث و مباحثے کیے۔ اس ضمن میں جو سوالات اقبال کے ذہن میں ابھرے اور بالخصوص جو سوالات انہوں نے وقتاً فوقتاً سید سلیمان ندوی سے پوچھے انہیں پیش نظر رکھنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ان سوالات کا خلاصہ مندرجہ ذیل ہے:

قرآن کتابِ کامل ہے اور وہ خود اپنے کمال کا مدعی ہے۔ اس کا کمال عملی طور پر ثابت کرنے کے لیے ضروری ہے کہ معاملات کے اصول پر، جو دیگر اقوام میں اس وقت مروّج ہیں، قرآنی نقطۂ نظر سے تنقید کی جائے۔ اس کے لیے کیا ذرائع اختیار کیے جائیں؛

متکلمین میں سے بعض نے علمِ مناظر و مرایا کی رو سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ خدا تعالیٰ کو دیکھ سکنا ممکن ہے۔ یہ بحث کہاں ملے گی؟ رؤیتِ باری کے متعلق جو استفسار کیا گیا اس کا مقصد یہ تھا کہ شاید اس بحث میں کوئی ایسی بات نکل آئے جس سے آئن سٹائن کے انقلاب انگیز ''نظریۂ نور'' پر کچھ روشنی پڑے، اس خیال کو ابن رُشد کے ایک رسالے سے تقویت ہوئی جس میں انہوں نے ابوالمعالی کے رسالے سے ایک فقرہ اقتباس کیا ہے۔ ابوالمعالی کا خیال آئن سٹائن سے بہت ملتا جلتا ہے، گو اوّل الذکر کے ہاں یہ بات محض ایک قیاس ہے اور مؤخر الذکر نے اس ریاضی کی رو سے ثابت کر دیا ہے۔

کیا اجماع امت، نص قرآنی کو منسوخ کر سکتا ہے؟ مثلاً مدتِ شیر خوارگی جو نص صریح کی رو سے دو سال ہے کم یا زیادہ ہو سکتی ہے، یا حصص میراث میں کمی بیشی کر سکتا ہے؟ بعض حنفاء اور معتزلہ کے نزدیک اجماع امت یہ اختیار رکھتا ہے۔ کیا مسلمانوں کے فقہی لٹریچر میں کوئی ایسا حوالہ موجود ہے؟ آپ نے ارشاد کیا ہے کہ فقہا نے اجماع سے نص کی تخصیص جائز سمجھی ہے۔ ایسی

تخصیص یا تعمیم کی کوئی مثال؛ کیا ایسی تخصیص یا تعمیم صرف اجماع صحابہؓ ہی کر سکتا ہے یا علماء و مجتہدین امت بھی کر سکتے ہیں؟ مسلمانوں کی تاریخ میں صحابہؓ کے بعد کوئی ایسی مثال ہو تو آگاہ کیجیے۔ تخصیص یا تعمیم حکم سے کیا مراد ہے؟ اگر صحابہؓ کا کوئی حکم نص کے خلاف ہو تو اس سے یہ مراد لی جائے گی کہ کوئی ناسخ حکم ان کے علم میں ہوگا۔ کیا کوئی حکم ایسا بھی ہے جو صحابہؓ نے نصِ قرآن کے خلاف نافذ کیا ہو؟

حضور سرورِ کائناتؐ نے کسی دریافت کردہ مسئلے کا جو جواب وحی کی بنا پر دیا وہ تمام امت پر حجت ہے اور وہ وحی بھی قرآن مجید میں داخل ہوگئی، لیکن جو جواب محض استدلال پر دیا گیا، جس میں وحی کو دخل نہیں، کیا وہ بھی تمام امت پر حجت ہے؟ اگر جواب اثبات میں ہو تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ حضور کے تمام استدلالات بھی وحی میں داخل ہیں یا بالفاظ دیگر یہ کہ قرآن و حدیث میں کوئی فرق نہیں؟

نبی کریم ﷺ کی دو حیثیتیں ہیں، نبوت اور امامت، نبوت میں احکامِ قرآنی اور آیاتِ قرآنی سے حضور ﷺ کے استنباط داخل ہیں۔ اجتہاد کی بنا محض عقلِ بشری اور تجربہ و مشاہدہ ہے، کیا یہ بھی وحی میں داخل ہے؟ اگر وحی میں داخل ہے تو اس پر آپ کی دلیل کیا ہے؟ وحی غیر متلو کی تعریف نفسیاتی اعتبار سے کیا ہے؟ کیا وحی متلو اور غیر متلو کے امتیاز کا پتا رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں چلتا ہے یا یہ اصطلاحات بعد میں وضع کی گئیں؟

حضور ﷺ نے اذان کے متعلق صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیا، کیا یہ مشورہ نبوت کے تحت آئے گا یا امامت کے تحت میں؟

آیۂ توریت میں حصص بھی ازلی ابدی ہیں یا قاعدۂ توریث میں جو اصول مضمر ہے، صرف وہی ناقابلِ تبدیل ہے اور حصص میں حالات کے مطابق تبدیلی ہو سکتی ہے؟

آیۂ وصیت کی وضاحت کیجیے۔

کیا امام کو اختیار ہے کہ قرآن کی کسی مقرر کردہ حد (مثلاً سرقہ کی حد) کو ملتوی کر دے اور اس کی جگہ کوئی اور حد مقرر کر دے؟ اس اختیار کی بنا کون سی آیتِ قرآنی ہے؟

امام ایک شخص واحد ہے یا جماعت بھی امام کی قائم مقام ہو سکتی ہے؟ ہر اسلامی ملک کے لیے اپنا امام ہو یا تمام اسلامی دنیا کے لیے ایک امام ہونا چاہیے؟ موخر الذکر صورت موجودہ فرقِ اسلامیہ کی موجودگی میں کیسے بروے کار آ سکتی ہے؟

حضرت عمرؓ نے طلاق کے متعلق جو طریقہ اختیار کیا، اگر اس کا اختیار انہیں شرعاً حاصل تھا تو اس

اختیار کی اساس کیا تھی؟ زمانۂ حال کی زبان میں آیا اسلامی کانسٹی ٹیوشن ان کو ایسا اختیار دیتی تھی؟

فقہا کے نزدیک خاوند کو جو حق اپنی بیوی کو طلاق دینے کا ہے، وہ بیوی کو یا اس کے کسی خویش یا کسی اور آدمی کے حوالے کیا جا سکتا ہے، اس مسئلے کی بنا کوئی آیت قرآنی ہے یا حدیث؟

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک طلاق یا خاوند کی موت کے دو سال بعد بھی اگر بچہ پیدا ہو تو قیاس اس بچے کے ولد الحرام ہونے پر نہیں کیا جا سکتا۔ اس مسئلے کی اساس کیا ہے؟ کیا یہ اصول محض ایک قاعدہ شہادت ہے یا جزوِ قانون ہے؟

''شمس بازغہ'' یا ''صدرا'' میں جہاں زمان کی حقیقت کے متعلق بہت سے اقوال نقل کیے گئے ہیں ان میں ایک قول یہ ہے کہ زمان خدا ہے ''بخاری'' میں ایک حدیث بھی اسی مضمون کی ہے، **لاتسبوا الدھر** الخ، کیا حکمائے اسلام میں سے کسی نے یہ مذہب اختیار کیا ہے؟ اگر ایسا ہے تو یہ بحث کہاں ملے گی؟

قرونِ وسطیٰ کے ایک یہودی حکیم موسیٰ بن میمون نے لکھا ہے کہ خدا کے لیے کوئی مستقبل نہیں ہے بلکہ وہ زمان کو لحظہ بہ لحظہ پیدا کرتا ہے، میمون نے قرطبہ میں مسلم یونیورسٹیوں میں تعلیم پائی، اس لیے کیا اس کا یہ مذہب بھی کسی مسلم حکیم کی خوشہ چینی ہے؟

مولانا شبلی نے ایک فقرہ شعائر و ارتفاقات کے متعلق نقل کیا ہے: **وہ شعائر الدین امر ظاھر تخصیص بہ و یمتاز صاحبہ بہ فی سائر الادیان کالختان و تعظیم المساجد و الاذان و الجمعۃ و الجماعات**۔ کیا یہ شاہ ولی اللہ کی اپنی تشریح ہے؟ اسی طرح ارتفاقات میں شاہ ولی اللہ کی تشریح کے مطابق تمام تدابیر جو سوشل اعتبار سے نافع ہوں، داخل ہیں، مثلاً نکاح و طلاق کے احکام وغیرہ، اگر شاہ ولی اللہ کی یہ تشریح صحیح ہے تو سوسائٹی کا کوئی انتظام نہ رہے گا اور ہر ایک ملک کے مسلمان اپنے اپنے دستور و مراسم کی پابندی کریں گے؟ اس کی وضاحت کیجیے۔

''الکلام'' (یعنی علم کلام جدید) میں مولانا شبلی نے **حجۃ اللہ البالغہ** کے صفحہ ۱۲۳ کا ایک فقرہ عربی میں نقل کیا ہے، جس کے مفہوم کا خلاصہ انہوں نے اپنے الفاظ میں بھی دیا ہے۔ اس کے آخری حصے کا ترجمہ یہ ہے:

اس بنا پر اس سے بہتر اور آسان طریقہ کوئی نہیں کہ شعار تعزیرات اور انتظامات میں خاص اس قوم کے عادات کا لحاظ کیا جائے، جن میں یہ امام پیدا ہوا ہے، اس کے ساتھ آنے والی نسلوں پر ان احکام کے متعلق چنداں سخت گیری نہ کی جائے۔ اس فقرے میں لفظ شعار سے کیا مراد ہے، اور اس کے تحت کون کون سے مراسم یا دستور آتے ہیں؟ کیا **حجۃ اللّٰہ البالغہ** میں کسی جگہ شعائر کی

تشریح شاہ ولی اللہ نے کی ہے؟ شاہ ولی اللہ نے لفظ ارتفاقات استعمال کیا ہے۔مولانا شبلی نعمانی نے ایک جگہ اس کا ترجمہ انتظامات اور دوسری جگہ مسلمات کیا ہے۔ان کا اصل مقصود کیا ہے؟
شاہ ولی اللہ نے ارتفاقات کی چار قسمیں لکھی ہیں، ان چار قسموں میں تمدنی امور مثلاً نکاح طلاق وغیرہ کے مسائل بھی آ جاتے ہیں۔کیا ان کے خیال میں ان معاملات میں بھی سخت گیری نہیں کی جاتی؟ محی الدین ابن عربی کی فتوحات یا کسی اور کتاب میں حقیقت زمان کی بحث کس کس جگہ ہے؟ صوفیہ میں اگر کسی اور بزرگ نے اس مضمون پر بحث کی ہو تو اُس کا حوالہ دیجیے متکلمین کے نقطۂ خیال سے حقیقت زمان یا آنِ سیال پر بحث کون سی کتاب میں ملے گی؟
ہندوستان میں بڑے بڑے اشاعرہ کون کون سے ہیں؟ ملا جونپوری کو چھوڑ کر کیا اور فلاسفہ بھی ہندی مسلمانوں میں پیدا ہوئے؟ ان کے اسماء اور تصانیف سے مطلع فرمائیے۔
ہندی مسلم فلسفی ساکن پھلواروی مصنف تسویلاتِ فلسفہ کا نام کیا ہے؟ کتاب مذکور کا نسخہ کہاں سے دستیاب ہوگا؟
مولوی نور الاسلام کا عربی رسالہ بابت ''مکان'' جو رامپور میں ہے، کس زبان میں ہے؟ قلمی ہے یا مطبوعہ۔مولوی نور الاسلام کا زمانہ کون سا ہے مسئلہ آن کے متعلق ابھی تک مشکلات باقی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فلاسفہ پر جو اعتراض ہمارے متکلمین نے کیے، وہ مسئلہ زمان کے متعلق خود ان کے افکار پر بھی عائد ہوتے ہیں۔مولوی سید برکات احمد نے دہر اور زمان میں امتیاز کر کے کسی قدر مشکلات کو کم کرنے کی کوشش کی ہے، مگر مسئلہ نہایت مشکل ہے۔اس پر مزید روشنی ڈالیے۔اگر دہر ممتد اور مستمر ہے اور حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہی ہے تو پھر مکان کیا چیز ہے؟
جس طرح زمان دہر کا ایک طرح سے عکس ہے، اسی طرح مکان بھی دہر ہی کا عکس ہونا چاہیے، یعنی زمان اور مکان دونوں کی حقیقت اصلیّہ دہر ہی ہے۔کیا یہ خیال محی الدین ابن عربی کے خیال کے مطابق صحیح ہے؟ کیا انہوں نے مکان پر بھی بحث کی ہے اور اگر کی ہے تو مکان اور دہر کا تعلق ان کے نزدیک کیا ہے؟
میں نے زمان و مکان کے مسئلے کے متعلق مطالعہ کیا ہے، جس سے ظاہر ہوا کہ ہندوستان کے مسلم فلسفیوں نے بڑے بڑے مسائل پر غور و فکر کیا ہے اور اس غور و فکر کی تاریخ لکھی جا سکتی ہے۔یہ کام آپ کو کرنا چاہیے۔
آپ نے لکھا ہے کہ اسلامی ریاست کے امیر کو اختیار ہے کہ جب اُسے معلوم ہو کہ بعض شرعی اجازتوں میں فساد کا امکان ہے تو ان اجازتوں کو عارضی طور پر منسوخ کر دے، بلکہ بعض فرائض

کو بھی یونہی منسوخ کرسکتا ہے۔اس کا حوالہ کہاں ملے گا؟
کیا یہ صحیح ہے کہ مُتعہ (نکاح موقت) حضرت عمرؓ سے پہلے مسلمانوں میں مروّج تھا اور حضرت عمرؓ نے اسے منسوخ کردیا؟ کیا زمانۂ حال کا کوئی امیر بھی کسی امر کی نسبت ایسا فیصلہ کرنے کا مجاز ہے؟
ان معاملات کی ایک فہرست دیجیے جن کے متعلق رائے قائم کرنا امام کے سپرد ہے۔ جرائم میں ایسے جرم ہیں جن کی تعزیر قرآن شریف میں مقرر ہے، ان کے متعلق امام کیونکر کوئی رائے دے سکتا ہے۔تواترِ عمل کی ایک مثال آپ کے نزدیک نماز ہے۔ مالکیوں، حنفیوں اور شیعوں میں جو اختلاف صورتِ نماز میں ہے، وہ کیوں کر ہوا؟
احکامِ منصوصہ میں توسیع اختیاراتِ امام کے اصول کیا ہیں؟ اگر امام توسیع کرسکتا ہے تو ان کے عمل کو محدود بھی کرسکتا ہے۔اس کی کوئی تاریخی مثال ہو تو واضح کیجیے؟
زمین کا مالک قرآن کے نزدیک کون ہے؟ اسلامی فقہا کا مذہب اس بارے میں کیا ہے؟ ’’قاضی مبارک‘‘ میں شاید اس کے متعلق کوئی فتویٰ ہے وہ فتویٰ کیا ہے؟
اگر کوئی اسلامی ملک (روس کی طرح) زمین کو حکومت کی ملکیت قرار دے تو کیا یہ بات شرع اسلامی کے موافق ہوگی یا مخالف؟ کیا یہ بات بھی امام کی رائے کے سپرد ہوگی؟
صدقات کی کتنی قسمیں اسلام میں ہیں، صدقہ اور خیرات میں کیا فرق ہے؟ لفظ نبی کے دو معنی ہیں: خبر دینے والا اور مقام بلند پر کھڑا ہونے والا۔ اوّل الذکر نبی ہمزے کے ساتھ اور دوسرا بغیر ہمزے کے۔اس ضمن میں راغب اصفہانی نے مفردات میں ایک حدیث بھی نقل کی ہے، یعنی آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ میں نبی بغیر ہمزے کے ہوں قرآن شریف میں جن انبیاء کا ذکر ہے ان میں کون سے نبی بالہمزہ ہیں اور کون سے بغیر ہمزہ؟ یا سب کے سب بغیر ہمزے کے ہیں؟ اگر قرآنی انبیاء یا آنحضورؐ نبی بغیر ہمزہ ہیں تو لفظ نبی کا مروّجہ انگریزی ترجمہ ’’پرافٹ‘‘، جس کے معنی خبر دینے والا کے ہیں، کیونکر درست ہوسکتا ہے؟
لفظ نار کا رُوٹ عربی زبان میں کیا ہے؟
لفظ نجات کا رُوٹ کیا ہے اور رُوٹ کی رُو سے کیا معنی ہیں؟

سوالات کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ کے موضوع پر خطبات تیار کرتے وقت اقبال کے سامنے کس قسم کے مسائل تھے۔ان مقالات کو تحریر کرنے کے لیے پانچ برس لگے۔ وعدہ چھ مقالات لکھنے کا تھا لیکن جنوری ۱۹۲۹ء تک صرف تین صحیح طور پر لکھے جا سکے اور یہی تین جنوبی ہند کے دورے کے دوران میں مدراس،

بنگلور، میسور اور حیدر آباد دکن میں پڑھے گئے۔ باقی تین خطبے ۱۹۲۹ء ہی میں مکمل ہوئے اور علی گڑھ میں نومبر ۱۹۲۹ء میں دیے گئے۔

اس پانچ سال کے عرصے کے دوران اقبال نے خطبات کی تیاری کے علاوہ انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں تین مرتبہ ''روحِ تمدنِ اسلامی'' کے موضوع پر مقالات پڑھے، پنجاب کونسل کے انتخابات میں حصہ لیا اور اپنی شعری تخلیق زبور عجم شائع کی۔ روزی کمانے کے لیے وکالت کے ساتھ دوسری سرگرمیاں بھی جاری رہیں۔ مختلف ذہنی پریشانیوں کے ایک لامتناہی سلسلے میں بھی انہوں نے ادق فلسفیانہ مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار کیا اور وہ بھی ایسی حالت میں جبکہ اظہار کے لیے انہیں مناسب الفاظ بھی ہاتھ نہ آتے تھے، مثلاً خود ہی تسلیم کرتے ہیں:

بعض خیالات زمانۂ حال کے فلسفیانہ نقطۂ نظر کا نتیجہ ہیں۔ ان کو ادا کرنے کے لیے اور بعض تاثرات کے اظہار کے لیے الفاظ ہاتھ نہیں آتے۔

جنوبی ہند کا سفر اوائل جنوری ۱۹۲۹ء سے شروع ہوا۔ اقبال کے ہمراہ چوہدری محمد حسین، عبداللہ چغتائی اور علی بخش بھی گئے تھے۔ اس سفر کی روز بروز کی روداد انقلاب میں شائع ہوتی رہی۔ اقبال ۳؍جنوری ۱۹۲۹ء کو دوپہر کے وقت کولامبار (بمبئی) پہنچے۔ سیٹھ اسماعیل کے صاحبزادے سیٹھ ہاشم اسماعیل اسٹیشن پر استقبال کے لیے موجود تھے۔ سیٹھ ہاشم اسماعیل کے ہاں قیام کے دوران بیگم ہاشم اسماعیل نے گوئٹے کی تصنیف فاؤسٹ انہیں اس درخواست کے ساتھ بھجوائی کہ اس پر اپنے ہاتھ سے اپنا کوئی شعر لکھ دیں۔ اقبال نے یہ شعر تحریر کیا:

کلام و فلسفہ از لوحِ دل فروشستم
ضمیر خویش کشادم بہ نشتر تحقیق

اور ساتھ فرمایا: یہ وہ نتیجہ ہے جس پر فاؤسٹ کو پہنچنا چاہیے تھا، مگر وہ نہ پہنچ سکا۔ ۵؍جنوری ۱۹۲۹ء کی صبح ساڑھے سات بجے گاڑی مدراس اسٹیشن پر رُکی۔ مدراس اسٹیشن پر عمائد ومعززین اور عوام کے بڑے ہجوم نے ان کا استقبال کیا۔ یہاں سے اقبال سیٹھ جمال محمد کے ساتھ موٹر کار میں اپنی قیام گاہ بوسوٹو ہوٹل پہنچے، جو سیٹھ جمال محمد ہی کی ملکیت تھا۔ ناشتا یہیں کیا گیا۔ دوپہر کا کھانا سیٹھ جمال محمد کی عالی شان رہائش گاہ پر تھا۔ چار بجے شام مدرسہ جمالیہ میں دعوت چائے تھی۔ یہ مدرسہ یتیم اور غریب مسلم طلبہ کے لیے سیٹھ جمال محمد کے والد نے ایک وقف کی صورت میں قائم کیا تھا اور کئی عمارتوں پر مشتمل تھا، جن میں جمالیہ ہوسٹل کی عمارت بھی شامل تھی۔

پانچ بجے شام کو کھلے ہال میں اقبال کا پہلا خطبہ ''دینیاتِ اسلامیہ اور افکارِ حاضرہ'' کے موضوع پر تھا۔ ہال لوگوں سے کچھا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ان میں بیشتر مسلمان تھے، لیکن ہندو بھی کم تعداد میں نہ تھے۔ صدارت کے فرائض ڈاکٹر سبرائن چیف منسٹر مدراس نے انجام دیے۔ جلسے کا آغاز تلاوتِ قرآن مجید سے ہوا۔ اقبال نے ایک گھنٹے سے کچھ منٹ زیادہ اپنا مقالہ پڑھنے میں لیے۔ مقالے کے اختتام پر ڈاکٹر سبرائن نے تقریر کرتے ہوئے کہا:

> میرے لیے باعث عزت ہے کہ ہندو ہونے کے باوجود اسلامی فلسفے پر لیکچر کی صدارت کے لیے منتخب کیا گیا ہوں۔ میں خوش ہوں کہ اس صوبے کے مسلمانوں کا زاویۂ نگاہ صحیح ہے۔ اسلام نے مشرق کو بلکہ ساری دنیا کو اخوت کا سبق دیا ہے۔ ہم ہندو ذات پات اور قومی امتیازات میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ہمیں اسلامی تہذیب اور اسلامی کلچر سے اخوت کا سبق سیکھنا ہے۔ میں یہاں غیر برہمن کی حیثیت سے تقریر نہیں کر رہا اور نہ اس نقطۂ خیال سے ذات پات کے خلاف کہہ رہا ہوں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو یکجا کرنے اور تمام ہندوستانی اقوام میں اتحاد پیدا کرنے کے لیے ہمیں اسلامی اخوت کو دلیل راہ بنانا ہے۔

رات گئے ہوٹل واپسی پر سیٹھ جمال محمد، عبداللہ چغتائی سے اقبال کا مقالہ پڑھنے کی غرض سے لے گئے۔ انہوں نے اقبال کے ساتھ مقالے کے حوالے سے مختلف نکات پر تبادلہ خیال کیا۔ اقبال ان سے بے حد متاثر ہوئے اور ان کی بلند فہمی کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ اس شخص نے مقالہ پڑھ کر بعض ایسے امور کے متعلق سوال کیے جن کا مجھے وہم و گمان بھی نہ تھا۔ پھر فرمایا:

> اللہ اللہ یہ انسان ایک کروڑ سالانہ کی تجارت کرتا ہے۔ تہمد کُرتا پہنتا ہے اور حقیقت روح و مادہ جیسے مسائل پر انگریزی اردو میں گفتگو کرتا ہے۔ اس کو فکر دامنگیر ہے کہ مسلمانوں کی قدیم اور نئی تعلیم کا حقیقی اتصال ہو اور اسلام اپنی اصلی شان میں دنیا پر ظاہر ہو۔ مسلمانوں میں ایسے افراد پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ جب تک یہ قسم پیدا نہ ہوگی، نصب العین تک رسائی محال ہے۔

اقبال ۸؍جنوری ۱۹۲۹ء تک مدراس میں رہے اور یہ چار دن نہایت مصروفیت کے عالم میں گزرے۔ ۶؍جنوری ۱۹۲۹ء کو گوکھلے ہال میں انہوں نے دوسرا مقالہ ''مذہبی تجربات کے کشف والہامات کا فلسفیانہ امتحان'' پڑھا۔ اسی دن صبح اخبار سوراجیہ کے خصوصی نمائندے کو انٹرویو بھی دیا، جس میں فرمایا کہ وہ مذہب کو سوراج پر مقدم خیال کرتے ہیں اور انہیں ایسے سوراج سے کوئی واسطہ نہیں جو مذہب سے بے نیاز ہو، مگر اس کے ساتھ ایشیا کے لوگ یورپ

کے خالص مادی روّیے کو بھی نظرانداز نہیں کر سکتے، اس لیے اُس کے سامنے اصل مسئلہ یہی ہے کہ روحانی اور مادی امور کو کس طرح یکجا جمع کیا جائے۔ اقبال کے نزدیک جدید تُرک روحانیت اور مادیت کے مطلوبہ اجتماع کو حاصل کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ پان اسلامزم سے متعلق سوال کے جواب میں ارشاد کیا کہ اس لفظ کے متعلق یورپ اور ایشیا میں بڑی غلط فہمیاں پیدا ہوئی ہیں۔ سب سے پہلے یہ اصطلاح ایک فرانسیسی اخبار نویس نے وضع کی تھی اور اس کا مقصد یورپ کو مسلم اقوام کے اتحاد کے خیالی اندیشہ سے متنبہ کرنا تھا۔

۷؍جنوری ۱۹۲۹ء کو اقبال نے گوکھلے ہال میں اپنا تیسرا مقالہ پڑھا۔ تینوں لیکچروں میں عظیم الشان اجتماع دیکھنے میں آیا اور مدراس کے اکثر و بیشتر انگریزی اخباروں میں لیکچروں کے اقتباسات شائع ہوتے رہے۔ اقبال کی خدمت میں انجمن خواتین اسلام مدراس کے اجلاس میں ایک سپاسنامہ بھی پیش کیا گیا۔ عبداللہ چغتائی کے بیان کے مطابق تمام مستورات پردہ میں تھیں اور اقبال پردے کے باہر بیٹھے تھے۔ سپاسنامہ میں اقبال کی دینی، علمی اور ادبی خدمات کا ذکر کیا گیا۔ مگر مندرجہ ذیل حصہ غالباً ان کی خصوصی توجہ اور جواب کے لیے شامل کیا گیا تھا:

> آپ سے یہ عاجزانہ التماس کرنا غیر موزوں اور نامناسب نہ ہوگا کہ آپ ہم اسیرانِ قفس کے لیے بھی اپنے قیمتی اوقات سے کچھ تھوڑا سا وقت وقف فرمائیں اور طبقۂ نسوانِ اسلام کی شرعی آزادی کے لیے نغمہ سنجی فرمائیں۔ ہم اسیرانِ قفس کی حالت ناگفتہ بہ ہے، اس کے انسداد کے لیے کوئی ایک پُرجوش نظم لکھ کر سوتے ہوئے جذبات کو بھڑکائیے۔...... ہم کو اس بات کا رنج ہے کہ فرقۂ اناث کے ساتھ بے انصافی کرنے اور ان کے حق تلفی کرنے کی بنیاد خود والدین کے گھروں میں ہی ڈالی جاتی ہے۔ ماں باپ دونوں فریق میں افراط و تفریط و فرق کو ہمارے ساتھ ساتھ پرورش کرتے ہیں۔ لڑکی کو لڑکے کے مقابلے میں کھانے پینے کے علاوہ تقسیمِ املاک میں بھی اس کو محروم کر دیتے ہیں۔ لڑکی اگر بدقسمتی سے بیوہ ہو جاتی ہے تو ظالم ماں باپ اپنی خاندانی عزت و عظمت بچانے کے لیے اس کی شادی نہیں کر دیتے۔ ان کو بھائیوں اور چچاؤں کے دست نگر بنا کے تباہ کر دیتے ہیں۔ اب عصر جدید میں ہر جگہ طبقۂ نسواں کی آزادی کی چیخ و پکار ہے۔ نئی تعلیم و روشنی کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ اسلامی طبقۂ نسواں میں ان کے شرعی اور جائز حقوق آزادی اور مساوات ان کو حاصل ہوں۔ اسلام کی سچی اور زندہ روح اسلامی مستورات میں ہی ہے اور اسلامی صنفِ نازک نے زندہ آگ میں جل جل کر بھسم ہو ہو کر اپنے ایثار کا ثبوت دیا ہے۔

خاتمہ پر آپ کی تضیع اوقات کی معافی چاہتے ہیں اور امید قوی رکھتے ہیں کہ آپ زمانہ قریب میں طبقۂ نسواں کی بہبودی و آزادی کی ترانہ سنجی فرمائیں گے اور فرقۂ اناث اس کار خیر کی ہمیشہ ممنون و شکر گزار رہے گی۔

اقبال نے سپاسنامہ کے جواب میں جو تقریر کی وہ اتفاق سے [illegible]ط ہے۔ آپ نے فرمایا:
میرا یہ عقیدہ رہا ہے کہ کسی قوم کی بہترین روایات کا تحفظ بہت حد تک اس قوم کی عورتیں ہی کر سکتی ہیں۔ اگرچہ انحطاط کے دور میں عورت کے حقوق سے بے پروائی ہوئی، مسلمان مردوں نے مسلمان عورتوں سے تغافل برتا، لیکن عورت باوجود اس تغافل کے اپنا منصب پورا کرتی رہی۔ کوئی ایسا شخص نہ ہوگا جو اپنی ماں کی تربیت کے اثرات اپنی طبیعت میں نہ پاتا ہو یا بہنوں کی محبت اس کے دل پر اپنا نشان نہ چھوڑتی ہو، وہ خوش نصیب شوہر جن کو نیک بیویاں ملی ہیں، خوب جانتے ہیں کہ عورت کی ذات مرد کی زندگی کے ارتقاء میں کس حد تک اس کی ممد و معاون ہے۔ مجھے یہ بتلانے کی ضرورت نہیں کہ اسلام میں مرد و زن میں قطعی مساوات ہے۔ میں نے قرآن پاک کی آیت سے یہی سمجھا ہے۔ بعض علماء مرد کی فوقیت کے قائل ہیں۔ جس آیت سے شک کیا جاتا ہے، وہ مشہور ہے، **الرجال قوامون علی النساء** عربی گرامر کی رو سے قائم کا صلہ جب اعلیٰ پر آئے تو معنی محافظت کے ہو جاتے ہیں۔ ایک دوسری جگہ قرآن حکیم نے فرمایا: **ھن لباس لکم و انتم لباس لھن** لباس بھی محافظت کے لیے ہوتا ہے۔ مرد عورت کا محافظ ہے۔ دیگر کئی لحاظ سے بھی مرد و عورت میں کسی قسم کا فرق نہیں، قرون اولیٰ میں عورتیں مردوں کے دوش بدوش جہاد میں شریک ہوئیں۔ خلفائے عباسیہ کے عہد میں ایک موقع پر خلیفہ کی بہن قاضی القضاۃ کے عہدہ پر مامور تھیں اور خود فتویٰ صادر کرتی تھیں۔ اب یہ مطالبہ ہے کہ عورت کو ووٹ کا حق ملنا چاہیے۔ خلافت اسلامیہ میں خلیفہ کے انتخاب میں ہر شخص کو رائے دینے کا حق حاصل تھا۔ نہ صرف مرد بلکہ عورتیں بھی خلیفہ کے انتخاب میں اپنی آواز رکھتی تھیں۔ اسلام تمام معاملات میں اعتدال کو مدنظر رکھتا ہے۔ عورت کے بحیثیت عورت اور مرد کے بحیثیت مرد بعض خاص علیحدہ علیحدہ فرائض ہیں۔ ان فرایض میں اختلاف ہے، مگر اس سے نتیجہ نہیں نکلتا کہ عورت ادنیٰ ہے اور مرد اعلیٰ۔ فرائض کا اختلاف اور وجوہ پر مبنی ہے۔ مطلب یہ کہ جہاں تک مساوات کا تعلق ہے، اسلام کے اندر مرد و زن میں کوئی فرق نہیں۔ تمدنی ضروریات کی وجہ سے فرائض میں اختلاف ہے۔ اسلام نے عورت کو کسی طرح مرد سے ادنیٰ درجہ پر نہیں رکھا۔ سب سے پہلے یہ دیکھیے کہ ماں بچوں کی وراثت کا حق

رکھتی ہے۔ یورپ کے کئی ملکوں میں اب تک آپ کی بہنوں کو علیحدہ جائداد کا حق حاصل نہیں۔ اولاد کی ولایت کا حق انگریز ماں کو اِس وقت تک بھی نہیں۔ اسلام میں یہ حق ہمیشہ سے موجود ہے۔ ان تمام امور میں یورپین قومیں یا تو اسلام کا تتبع کر رہی ہیں یا خود فطرت نے اب انہیں اس طرف توجہ دلا دی ہے۔ یورپ میں طلاق حاصل کر لینا مشکل تھا۔ مسلمانوں میں یہ شکایت کبھی خاص طور پر پیدا نہیں ہوئی۔ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اسلام میں عورت کو مرد کی طرح طلاق دینے کا حق نہیں۔ آپ کو شاید معلوم نہیں کہ ہمارے علماء نے کبھی اس بات کی توضیح ہی نہیں کی کہ نکاح کے وقت عورت کہہ سکتی ہے کہ جو حق اسلام نے طلاق کا تم کو (مرد کو) دیا ہے، وہی اس وقت مجھے (عورت کو) دے دو تو پھر نکاح ہوگا یا یہ حق میرے کسی قریبی تعلق رکھنے والے کو دے دیا جائے۔ آپ نے اپنے لیے ایڈریس میں اسیران قفس، کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اس سے مجھے مغربی عورتوں کی اس تحریک کا خیال ہوا جسے ترکی میں یا اور جگہ یورپ میں ایمنسی پیشن (مردوں کے غلبہ سے آزادی) کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ جن باتوں کو لفظی قیود سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وہ اپنی اصل میں قیود ہیں یا نہیں۔ پردے کے متعلق اسلام کے احکام واضح ہیں۔ ''غض بصر'' کا حکم ہے اور وہ اس لیے کہ زندگی میں ایسے وقت بھی آتے ہیں جب عورت کو غیر محرم کے سامنے ہونا پڑتا ہے۔ خاص اس وقت کے لیے یہ حکم ہے، دیگر حالات کے لیے اور احکام ہیں۔ پردے کے سلسلے میں اسلام کا عام حکم عورت کو یہ ہے کہ وہ اپنی زینت کو ظاہر نہ کرے۔ پھر اسلام میں تعددِ ازدواج کا حکم نہیں دیا گیا، محض اجازت ہے۔ یہ سچ ہے کہ مسلمان مردوں نے اس اجازت سے بے جا فائدہ اٹھایا۔ اس میں اصول وقوانین کا کیا قصور؟ جب جنگ میں کسی قوم کے مردوں کی تعداد میں خاص کمی واقع ہو جائے تو آئندہ ملکی حفاظت کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ ایک مرد ایک سے زاید بیویاں کرے۔ قرآن پاک نے انہی مصالح کو ملحوظ رکھ کر اس قسم کی اجازت دی ہے اس لیے فقہ میں ''فرض'' اور ''رخصت'' میں فرق کیا گیا ہے۔ رخصت ترک کی جا سکتی ہے۔ فرض ہرگز نہیں۔ اگر نکاح کے وقت عورت مرد سے یہ مطالبہ کرے کہ تم اس رخصت کو اپنے حق میں ترک قرار دو، جو تعددِ ازدواج کے متعلق از روئے قرآن تمہیں حاصل ہے، تو وہ اس مطالبے کا حق رکھتی ہے۔ اس سلسلے میں ایک الزام میں لڑکیوں کے باپوں کو بھی دوں گا کہ وہ نکاح کے وقت عورتوں کے حقوق پر نگاہ نہیں رکھتے۔ مگر ایک الزام خود عورتوں کو بھی دیے بغیر نہیں رہ سکتا، وہ یہ کہ کیوں بوقت ضرورت عورتیں مردوں

سے قانونی ذریعے سے حقوق کا مطالبہ نہیں کرتیں؟ کیوں بھائیوں سے جائداد کا حصہ طلب نہیں کرتیں؟ افسوس ہے کہ ہندوستان میں اسلامی قانون کی عدالتیں قائم نہیں، تاکہ یہ معاملے شریعت اسلامی کے ذریعے طے ہوں۔ گذشتہ پانچ یا چھ سو سال سے شریعت اسلامیہ جامد رہی ہے۔ انگریزی قانون والے شریعت اسلامی کو نہیں سمجھ سکتے۔...... مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ قرآن پڑھیں۔ اس کی تعلیم پر غور کریں۔ پنجاب میں تو اچھی اچھی عدالتوں میں کہہ دیتے ہیں کہ ہم رواج کے پابند ہیں شریعت کے پابند نہیں۔ محض اس لیے کہ بیٹیوں کو جائداد میں حصہ نہ دینا پڑے۔ ہم کو کوشش کرنی چاہیے کہ ہم رواج کی قیود سے آزادی حاصل کریں۔

تقریر ختم ہونے پر خواتین نے اصرار کیا کہ اقبال اپنی کوئی نظم سنائیں، مگر اقبال نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ انہیں اپنا کلام زبانی یاد نہیں اور یہ کہ وہ کوئی کتاب بھی ساتھ نہیں لائے۔ اس پر پردے میں سے بانگِ درا کے کئی نسخے باہر پھینک دیے گئے اور اقبال مجبور ہو گئے۔ چنانچہ انہوں نے بانگِ درا کا ایک نسخہ اُٹھالیا اور نظم ''فاطمہ بنت عبداللہ'' پڑھ کر سنائی۔

۷؍جنوری ۱۹۲۹ء کی رات کو مسلم ایسوسی ایشن کی طرف سے انہیں الوداعی دعوت دی گئی۔ اس دعوت میں شہر کے روسا اور اہلِ علم شریک ہوئے۔ اقبال کے سفرِ مدراس پر علمی اعتبار سے تبصرہ کیا گیا اور بعض لوگوں نے اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا کہ ان کے مدراس آنے سے مسلمانوں میں خالص اسلامی تعلیم کے حصول اور فروغ کا ولولہ پیدا ہوا ہے۔ اس موقع پر عبدالحمید حسن اور سیٹھ جمال محمد نے تقاریر کیں۔ بقول عبداللہ چغتائی اقبال نے جو تقریر کی وہ دل کو ہلا دینے والی تھی۔ اس میں مسلمانوں کے ماضی میں علوم وفنون کی ترقی اور ان کی موجودہ حالت پر تشویش کا اظہار کیا گیا تھا۔ آخر میں انہوں نے سیٹھ جمال محمد کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ مدراس کے مسلمانوں میں ایسے شخص کی موجودگی مغتنماتِ روزگار میں سے ہے۔ ۸؍جنوری ۱۹۲۹ء کی شام بنگلور روانہ ہونے کی خاطر اقبال مدراس چھاؤنی ریلوے اسٹیشن پر پہنچے جہاں لوگوں کا ایک بہت بڑا ہجوم انہیں الوداع کہنے کے لیے موجود تھا۔

۹؍جنوری ۱۹۲۹ء کو صبح سوا چھ بجے گاڑی بنگلور چھاؤنی کے اسٹیشن پر رکی۔ مسلمانانِ بنگلور ہزاروں کی تعداد میں اقبال کے استقبال کے لیے وہاں موجود تھے اقبال حاجی سر اسمٰعیل سیٹھ اور حاجی سیٹھ عبدالغفور کے ساتھ موٹر کار میں سوار ہو کر ان کی رہائش گاہ الکس لاج کی طرف روانہ ہوئے۔ چونکہ لوگوں نے موٹر کار کے ساتھ بھاگنا شروع کر دیا تھا اس لیے تقریباً نصف میل اسے

نہایت آہستہ چلانا پڑا۔

دس بجے صبح مسلم لائبریری معسکر بنگلور کے زیر اہتمام اقبال کے اعزاز میں مہاتما گاندھی روڈ پر واقع اپرا ہاؤس میں ایک جلسہ منعقد ہوا، جس میں انہیں سپاسنامہ پیش کیا گیا۔ جلسے کی صدارت امین الملک سر مرزا اسمٰعیل وزیر اعظم ریاست میسور نے کی۔ اقبال نے اپنی جوابی تقریر میں دنیا کے اسلامی کتب خانوں پر روشنی ڈالی اور مسلم لائبریری کو ترقی دینے پر زور دیا اس کے بعد کتب خانہ میں کتابوں کا معائنہ فرمایا اور کتاب آراء میں تحریر کیا:

جنوبی ہندوستان کے مسلمان نوجوان خصوصاً بنگلور کے مسلمانوں میں اسلامی کلچر کی اشاعت کا پورا احساس پیدا ہو چکا ہے، جس کو میں تمام ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے نیک فال تصور کرتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ بنگلور کی مسلم لائبریری نے اس احساس کے پیدا کرنے میں بڑا حصہ لیا ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ مستقبل قریب میں اس لائبریری کے اثر کا دائرہ اور بھی وسیع ہو جائے گا۔ اراکین کتب خانہ کو چاہیے کہ تاریخ میسور کی قلمی کتابوں کی طرف بالخصوص توجہ فرمائیں۔

اسی شام دوسرا جلسہ آرٹس اینڈ سائنس کالج کے میدان میں ہوا۔ اس موقع پر اقبال نے ایک پُر مغز فلسفیانہ تقریر کی۔ بنگلور میں مختصر قیام کے دوران میں اقبال کی ملاقات وہاں کے بیشتر شرفاء سے ہوئی اور حاجی اسمٰعیل سیٹھ کی کوٹھی میں ملنے والوں کا ایک تانتا لگا رہا۔ اقبال کو اطلاع کر دی گئی تھی کہ اگلے روز بوقت دوپہر مہاراج میسور کی خاص موٹر کار انہیں لینے کے لیے آئے گی۔ چنانچہ ۱۰؍جنوری ۱۹۲۹ء کو تقریباً گیارہ بجے ریاست کے ایک رہنما افسر ایک بڑی موٹر کار لے کر وہاں پہنچ گئے۔ شام کو چھ بجے میسور یونیورسٹی کے زیر اہتمام اقبال نے ایک لیکچر یونیورسٹی ہال میں دینا تھا۔ اس جلسے کی صدارت چاندی، وائس چانسلر کر رہے تھے۔ اقبال نے مدراس میں پڑھے ہوئے تین مقالوں میں سے ایک مقالہ اس موقع پر پڑھا۔

۱۱؍جنوری ۱۹۲۹ء کو ریاست میسور کی طرف سے ان کے لیے سلطان ٹیپو کے قلعہ سرنگاپٹم جانے اور وہاں قریب ہی سلطان ٹیپو کے مزار وغیرہ کی زیارت کرنے کا پروگرام تھا۔ اقبال بارہ بجے کے قریب سلطان ٹیپو کے مقبرے یعنی گنبد سلطانی پر پہنچے۔ مقبرے کے دروازے پر ریاست کی طرف سے ہر وقت نوبت بجتی رہتی ہے۔ روضہ سیاہ سنگ مرمر یا سنگ موسیٰ سے تعمیر کیا گیا ہے۔ اقبال نے مزار کے اندر داخل ہوتے ہی قرآن مجید کی وہ آیت جو شہدا کے ضمن میں ہے (وہ جو اللہ کے راستے میں مارے گئے، انہیں مردہ مت کہو، وہ زندہ ہیں۔ مگر لوگوں کو شعور

نہیں ہے) تلاوت فرمائی۔ گنبدِ سلطانی میں تین قبریں ہیں۔ سیاہ غلاف والی قبر حیدر علی والد سلطان ٹیپو کی ہے۔ اور دائیں طرف دو قبروں میں ایک سنہری قبر فاطمہ والدہ سلطان ٹیپو کی اور دوسری قبر جس پر سُرخ غلاف ہے، سلطان ٹیپو شہید کی ہے۔ سُرخ رنگ دراصل شہید کی نشانی ہے۔ سلطان ٹیپو نے خود اپنے والدین کو یہاں دفن کیا اور یہ مقبرہ تعمیر کرایا تھا۔ مزار کے اندر کی فضا ایسی ہے کہ انسان پر ہیبت طاری ہو جاتی ہے۔ اقبال نے جس عقیدے اور خلوص سے روضہ کے اندر فاتحہ خوانی کی، اسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ روضے کے اندر چاروں طرف دیواروں اور تعویذوں پر کئی فارسی اشعار شہدا کی شان میں کندہ ہیں۔ سلطان ٹیپو ۱۲۱۳ھ بمطابق ۱۷۹۹ء میں شہید ہوئے اور ان کی تاریخ شہادت ''شمشیر گم شد'' کے الفاظ سے برآمد ہوتی ہے۔ یہی تاریخ ان کے بیشتر سوانح نگاروں نے بھی تحریر کی ہے۔ روضے سے باقی لوگ تو باہر چلے گئے، لیکن تنہا اقبال، سلطان شہید کی تربت کے قریب آنکھیں بند کیے دیر تک کھڑے رہے اور سب سے آخر میں باہر نکلے۔ عبداللہ چغتائی لکھتے ہیں کہ میں نے جو منظر اقبال کا یہاں دیکھا اسے الفاظ میں تو ڈھالنا ممکن نہیں۔ پھر بھی اس پر ایک الگ مضمون بعنوان ''شمشیر گم شد'' لاہور واپس آ کر تحریر کیا جو نیرنگ خیال میں طبع ہوا۔

روضے کے قریب ایک چھوٹی سی مسجد ہے۔ اس کے باہر صحن میں سب لوگ جا کر بیٹھ گئے اور علی جان نے نہایت سوز کے عالم میں اقبال کا اردو اور فارسی کلام گانا شروع کر دیا۔ اقبال کے آنسوؤں کا سلسلہ نہ تھمتا تھا اور حاضرین پر بھی رقت طاری تھی۔ علی جان یہ کیفیت دیکھ کر گھبرا گئے اور گاتے گاتے رک گئے۔ اقبال نے بڑے اضطراب کے عالم میں کہا: رک کیوں گئے جاری رکھو۔ سو علی جان گاتے رہے اور اقبال آنسو بہاتے رہے۔ جب وہاں سے رخصت ہوئے تو میسور کے مشہور تاجر سیٹھ محمد ابا (عباس) نے، جو ان کے ساتھ تھے، پوچھا کہ سلطان شہید نے آپ کو کوئی پیغام دیا۔ اقبال نے جواب دیا کہ ان کی معیت میں میرا ایک لمحہ بھی بیکار نہیں گزرا۔ پھر فرمایا کہ ایک پیغام یہ ملا ہے:

در جہاں نتواں اگر مردانہ زیست
ہمچو مرداں جاں سپردن زندگیست

بعد ازاں رستے میں چار اور شعر بھی موزوں ہو گئے، جو اقبال کے انتہائی ذاتی تاثرات پر مبنی تھے اور ان کے کسی مجموعۂ کلام میں شامل نہیں:

آتشے در دل دگر بر کردہ ام   داستانے از دکن آوردہ ام
در کنارم خنجر آئینہ فام   می کشم اورا بتدریج از نیام
نکتۂ گویم ز سلطانِ شہید   زاں کہ ترسم تلخ گردد روز عید
پیشتر رفتم کہ بوسم خاک او   تا شنیدم از مزارِ پاک او

در جہاں نتواں اگر مردانہ زیست
ہمچو مرداں جاں سپردن زندگیست

مزار سے سرنگا پٹم قلعے کی طرف روانہ ہوئے۔ کھانے سے فراغت کے بعد اقبال سرنگا پٹم قلعے کی سیر کو نکل گئے وہاں انہوں نے قلعے کی مسجد اعلیٰ، وہ مقام جہاں سلطان ٹیپو کی شہادت واقع ہوئی، زندان، میر جعفر کی مفروضہ قبر، لنگڑے غلام علی کا مقبرہ، وہ مندر جسے حیدر علی نے مرمت کر کے ہندوؤں کے لیے واگزار کیا تھا اور دیگر آثارِ سلطانی دیکھے۔ اقبال عصر کے قریب واپس میسور پہنچے۔

مہمان خانے میں تھوڑا آرام کرنے کے بعد چھ بجے شام اقبال ٹاؤن ہال گئے، کیونکہ وہاں انہیں مسلمانان میسور کی طرف سے سپاسنامہ پیش کیا جانا تھا اور ہزاروں کی تعداد میں لوگ ان کے منتظر تھے۔ سیٹھ محمد ابا (عباس) نے سپاسنامہ پیش کیا۔ اقبال نے جواب میں نہایت موثر تقریر کی۔ ان کے بعد میسور یونیورسٹی کے فلسفے کے پروفیسر واڈیا نے منتظمین کی طرف سے چند اختتامی کلمات کہے جس میں اقبال کے پچھلے دن کے لکچر کی خوب تعریف کی اور کہا کہ اقبال کو مسلمان ہزار اپنا کہیں مگر وہ سب کے ہیں، کسی ایک مذہب یا جماعت کی ملکیت نہیں۔ اگر مسلمانوں کو یہ ناز ہے کہ اقبال ان کا ہم مذہب ہے تو ہم ہندوؤں کو یہ فخر کچھ کم نہیں کہ وہ ہندوستانی ہے۔

۱۲ر جنوری ۱۹۲۹ء کی صبح کو اقبال میسور یونیورسٹی کا شعبۂ نفسیات عملی دیکھنے گئے۔ ڈاکٹر گوپال سوامی صدر شعبہ نے انہیں طلبہ سے ملوایا اور چند دلچسپ تجربے دکھلائے ان میں سے ایک تجربہ یہ تھا: ڈاکٹر گوپال سوامی نے اقبال کی نبض پر اپنے نفسیاتی آلہ کا تار باندھ دیا اور انہیں کہا کہ ایک سے دس تک کسی عدد کو اپنے ذہن میں رکھ لیں۔ اقبال نے چھ کا عدد اپنے ذہن میں چن لیا۔ ڈاکٹر گوپاک سوامی ایک دو گننے لگے۔ جب چھ پر پہنچے تو آلے کا کانٹا زور سے حرکت کرنے لگا۔ اس تجربے پر تبصرہ کرتے ہوئے اقبال نے بتایا کہ مثنوی رومی کی پہلی حکایت میں طبیب الٰہی بھی نبض کی رفتار میں فرق آ جانے کے ذریعے کنیزک کے مرض کی نوعیت معلوم کر لیتا

ہے۔ اور اسی طرح بوعلی سینا نے بھی قابوس بن وشمگیر کے مرض کی تشخیص کی تھی۔ سو آج سے کئی صدیاں قبل حکماء اسی اصول سے کام لیتے تھے۔

۱۳؍ جنوری ۱۹۲۹ء کو صبح ساڑھے آٹھ بجے اقبال بنگلور سے میٹر گیج ریل پر حیدر آباد روانہ ہوئے۔ عثمانیہ یونیورسٹی نے انہیں لکچروں کے لیے دعوت دے رکھی تھی جو قبول کر لی گئی تھی۔ سید غوث محی الدین مدیر الکلام بھی میسور سے ساتھ گئے۔ اگلے روز یعنی ۱۴؍ جنوری ۱۹۲۹ء کو صبح جب گاڑی فلک نما سے گزر کر حیدر آباد کے اسٹیشن پر رکی تو پلیٹ فارم پر سیکڑوں مسلمان بچے قطاروں میں کھڑے ''چین و عرب ہمارا ہندوستان ہمارا'' خوش الحانی سے پڑھ رہے تھے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے رجسٹرار انصاری اور دیگر اصحاب یہیں سے ساتھ ہوئے۔ انہوں نے اقبال کو مطلع کیا کہ وہ حیدر آباد میں حکومتِ نظام کے مہمان ہوں گے، اس لیے انہیں سرکاری گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرنا ہوگا۔ اس سے پیشتر دلکشا میں ان کے ٹھہرنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ چائے گاڑی ہی میں آ گئی۔ اگلے اسٹیشن سکندر آباد پر اترنا تھا۔ جب وہاں پہنچے تو سر اکبر حیدری، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، مولانا عبداللہ عمادی، سید ابراہیم، ڈاکٹر مظفر الدین قریشی اور عثمانیہ یونیورسٹی کے دیگر اساتذہ استقبال کے لیے موجود تھے۔ دستور کے مطابق اقبال کو پھولوں کے ہار پہنائے گئے۔ اس کے بعد وہ سر اکبر حیدری کے ہمراہ بیلا وسٹا گیسٹ ہاؤس پہنچ گئے۔

اقبال نے ۱۴؍ جنوری ۱۹۲۹ء سے لے کر ۱۸؍ جنوری ۱۹۲۹ء تک حیدر آباد میں قیام کیا۔ اپنی آمد کے پہلے ہی دن وہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کے ساتھ جا کر محل کی کتابِ حضوری میں اپنا نام لکھ آئے۔ اگلے روز یعنی ۱۵؍ جنوری ۱۹۲۹ء کی شام کو باغِ عامہ کے ہال میں اقبال کا پہلا لیکچر تھا۔ صدارت مہاراجہ سرکشن پرشاد نے کی اور حاضرین میں عثمانیہ یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبہ شامل تھے۔ رات کو مہاراجہ سرکشن پرشاد کے ہاں ایک پر تکلف ضیافت اور مشاعرے کا اہتمام کیا گیا تھا وہاں اقبال نے مہاراجہ سرکشن پرشاد کے اصرار پر مندرجہ ذیل فارسی اشعار پڑھے:

زندگی انجمن آراء و نگہدارِ خود است
اے کہ در قافلہ بے ہمہ شو باہمہ رو
آں نگینے کہ تو با اہرمناں ساختہ
ہم بہ جبریل امیں نتواں کرد گرو

۱۶؍ جنوری ۱۹۲۹ء کا دن گیسٹ ہاؤس ہی میں یونیورسٹی کے اساتذہ طلبہ اور دیگر ممتاز شخصیات

سے ملاقاتوں میں گزرا۔ ۱۷ر جنوری ۱۹۲۹ء کی صبح اقبال نے دوسرا لیکچر زیر صدارت نواب اعظم جاہ ولی عہد سلطنت، باغ عامہ کے ہال میں دیا۔ دونوں مقالے وہی تھے جو مدراس میں پڑھے جا چکے تھے۔ ۱۸ر جنوری ۱۹۲۹ء کو صبح گیارہ بجے اقبال نظام سے ملے۔ ۱۹ر جنوری ۱۹۲۹ء کو اقبال، حیدرآباد سے لاہور روانہ ہوئے اور یوں جنوبی ہند کا یہ دلچسپ علمی دورہ اختتام پذیر ہوا۔

برصغیر کے مسلم علمی حلقوں میں اقبال کے خطباتِ مدراس کی خاصی تشہیر ہوئی۔ سر راس مسعود (وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی) کی درخواست پر اقبال نے چھ مقالات علی گڑھ میں پڑھنے منظور فرما لیے۔ چنانچہ ۱۷ر نومبر ۱۹۲۹ء کو اقبال، عبداللہ چغتائی کے ساتھ علی گڑھ روانہ ہوئے۔ علی گڑھ میں اقبال کا بیشتر وقت علمی مجلسوں یا علمی صحبتوں میں گزرا۔ سر راس مسعود، ڈاکٹر سید ظفر الحسن، خواجہ غلام السیدین، ڈاکٹر ضیاء الدین، بشیر حسین زیدی اور ڈاکٹر عطا اللہ بٹ نے ان کے اعزاز میں دعوتیں دیں۔ اقبال صاحبزادہ آفتاب احمد خان کی عیادت کے لیے گئے، جو ان ایام میں بعارضۂ فالج بیمار تھے۔ اسی طرح رشید احمد صدیقی کی بیمار پُرسی کے لیے بھی ان کے ہاں گئے۔

اقبال، اپنی تمام مصروفیات کے باوجود خطبات کو کتاب کی صورت میں مکمل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ خطبات کے عنوانات اور متن میں کچھ تبدیلیاں کیں اور بالآخر چھ خطبوں پر مشتمل یہ کتاب پہلی بار وسط ۱۹۳۰ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔ بعد ازاں اس میں ایک خطبہ بعنوان ''کیا مذہب ممکن ہے'' کا اضافہ کیا گیا۔ ساتواں مقالہ انگلستان کی ارسطاطلین سوسائٹی کی درخواست پر تحریر کیا گیا تھا، جو ۱۹۳۲ء میں وہیں پڑھا گیا۔ لہٰذا سات خطبات پر مشتمل یہ مجموعہ دوسری بار آکسفورڈ یونیورسٹی پریس انگلستان نے ۱۹۳۴ء میں شائع کیا۔ اس طرح خطبات کا جو سلسلہ ۱۹۲۵ء سے شروع ہوا تھا، ۱۹۳۲ء میں اختتام کو پہنچا۔ جرمنی کے مستشرق پروفیسر ہبل نے جب اس تصنیف کا مطالعہ کیا تو اس نے اقبال کو لکھا کہ کتاب عصر حاضر کے اہم ترین مظاہر میں سے ہے۔

اقبال نے سید نذیر نیازی کو اردو ترجمہ کرنے کی ترغیب دی۔ چوہدری محمد حسین خطبات کے اردو ترجمہ کے خلاف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو مسائل فلسفہ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور ویسے بھی یہ مسائل ضمنی تھے، اصولی نہ تھے۔ انہیں یہ بھی اندیشہ تھا کہ کہیں اردو ترجمے سے خطبات کے متعلق غلط فہمیاں پیدا نہ ہو جائیں یا پیدا کر دی جائیں۔ اس کے علاوہ چونکہ

خطبات کے مباحث خالصتاً فلسفیانہ نوعیت کے تھے، اس لیے امکان تھا کہ اقبال کے افکار کے متعلق کوئی نیا فتنہ نہ کھڑا کر دیا جائے۔ چنانچہ اس سلسلے میں سید نذیر نیازی تحریر کرتے ہیں:

دراصل خطبات میں حضرت علامہ نے اساسی طور پر جو بحث اٹھائی ہے اس کا تقاضا ہے کہ مغربی فلسفہ اور علوم و معارف کے ساتھ ساتھ ہمیں اسلام، اسلامی تہذیب و ثقافت اور علم و حکمت پر بھی پورا پورا عبور حاصل ہو۔ محض فلسفہ یا علوم طبیعی یا تاریخ تہذیب و تمدن یا مذاہب، الٰہیات اور علوم دینیہ کا مطالعہ کافی نہیں۔ پھر اس سے بڑھ کر یہ کہ ہماری نظر فکر انسانی کے ان تغیرات پر بھی ہونی چاہیے جو مشرق و مغرب، بالخصوص مغرب میں بڑی تیزی سے رونما ہو رہے ہیں اور جن سے اس امر کا تھوڑا بہت اندازہ ہو جاتا ہے کہ موجودہ تمدن کا رُخ آئندہ کس جانب ہو گا اور انسان کس قسم کے عالم کی تعمیر کا آرزومند ہے۔ لیکن نہ خطبات کا مطالعہ اس نقطۂ نظر سے کیا گیا نہ ان کی اشاعت پر یہ توقع پوری ہو سکی کہ ارباب فن اقبال کا حقیقی مقصد سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ لہٰذا خطبات کا مطالعہ بہت کچھ سطحی رہا بلکہ ان پر بہت کم توجہ کی گئی۔

چونکہ خطبات کا مطالعہ سطحی تھا، اس لیے بعض انگریز مستشرقین نے ڈکنسن کی تقلید میں یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ اقبال تو یورپی فلسفیوں بالخصوص نطشے اور برگساں کے نظریات سے متاثر تھے۔ علماء بحیثیت مجموعی خطبات کی طرف متوجہ نہ ہوئے، مگر جنہوں نے اظہار خیال کی ضرورت محسوس کی، ان کے نزدیک بھی اقبال کا نظامِ فکر مغربی فلسفیوں کے تخیلات پر مبنی تھا، اس لیے ان کے افکار کفریات کے سوا کچھ نہ تھے۔ خطبات کا اردو ترجمہ سید نذیر نیازی نے اقبال کی زندگی ہی میں کر دیا تھا، بقول ان کے اس کا نام ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' اقبال ہی کا تجویز کردہ ہے، لیکن ترجمے کی اشاعت اقبال کی وفات کے بیس سال بعد ۱۹۵۸ء میں ہوئی۔

خطبات کے مقصد کی وضاحت کرتے ہوئے اقبال اپنے دیباچے میں تحریر کرتے ہیں کہ قرآن حکیم فکر کے مقابلے میں عمل پر زیادہ زور دیتا ہے۔ مسلمانوں نے اپنے ابتدائی دور میں اس زاویۂ نگاہ کو ترقی دی اور علماء و صوفیا نے دین و ایمان کی اساس باطنی وجدان پر رکھی، لیکن آج کا انسان جدید تعلیم کے زیر اثر، احوال باطن کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور علماء و صوفیا چونکہ عصر حاضر کی نفسیات سے ناآشنا ہیں، اس لیے روحانیت کے میدان میں اسے مؤثر ہدایت دینے سے قاصر ہیں۔ ان کی ہدایت ایک ایسے زمانے کی نفسیات کے مطابق تھی جو گزر گیا۔ آج کے انسان کی نفسیات چونکہ مختلف ہیں، اس لیے پرانا اندازِ ذکر و فکر اس کے لیے جاذب توجہ نہیں

رہا۔ پس ضرورت پیدا ہو گئی ہے کہ علمِ دین کو سائنٹیفک یا فلسفیانہ استدلال کے طور پر پیش کیا جائے۔ آخر میں اقبال فرماتے ہیں:

بایں ہمہ یاد رکھنا چاہیے کہ فلسفیانہ غور و فکر میں قطعیت کوئی چیز نہیں۔ جیسے جیسے جہان علم میں ہمارا قدم آگے بڑھتا ہے اور فکر کے لیے نئے نئے راستے کُھل جاتے ہیں، کتنے ہی اور شاید ان نظریوں سے جو خطبات میں پیش کیے گئے ہیں، زیادہ بہتر نظریے ہمارے سامنے آتے جائیں گے۔ ہمارا فرض بہرحال یہ ہے کہ فکر انسانی کی نشو و نما پر باحتیاط نظر رکھیں اور اس باب میں آزادی کے ساتھ نقد و تنقید سے کام لیتے رہیں۔

پہلے مقالے کا موضوع ''علم اور مذہبی مشاہدات'' ہے۔ اس بحث کو پوری طرح سمجھنے کے لیے یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ انسان کن ذرائع سے علم حاصل کرتا ہے۔ اس مقالے میں بحث کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ اگر حواس کے ذریعے حاصل کردہ معلومات کی صحت کی جانچ پڑتال عقل سے کی جاسکتی ہے اور منطقی استدلال میں خامی کا سراغ مشاہداتی تجربے کے ذریعے لگایا جا سکتا ہے تو وجدان کی وساطت سے حاصل کردہ معلومات یا مذہبی مشاہدات (جنھیں معرفت کا نام بھی دیا جاتا ہے) کی صحت کو پرکھنے کے لیے بھی دو ایسے معیار موجود ہیں جن پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ ان دو معیاروں کو اقبال عقلی معیار اور عملی معیار کا نام دیتے ہیں۔ عقلی معیار سے مراد وہ ناقدانہ تعبیر ہے جو قطع نظر کسی انسانی تجربے کے پہلے سے قائم شدہ مفروضے کے، یہ ثابت کرتی ہے کہ وجدان سے حاصل کردہ معلومات یا مذہبی مشاہدات بعینہٖ اسی حقیقت تک پہنچاتے ہیں، جس کی طرف بالآخر انسان کی ناقدانہ تعبیر اس کی رہنمائی کرتی ہے۔ مگر عملی معیار ایسی معلومات یا مشاہدات کی صحت کو ان کے نتائج کے حوالے سے جانچتا ہے۔ اقبال کی رائے میں اوّل الذکر طریقے سے فلسفی کام لیتا ہے اور مؤخر الذکر طریقے سے نبی۔

اقبال کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ گذشتہ پانچ سو برس سے علوم اسلامیہ پر جمود کی کیفیت طاری ہے۔ ایک وہ زمانہ تھا۔ جب یورپ کے افکار دنیائے اسلام سے متاثر ہوتے تھے۔ مگر قرون وسطیٰ میں دینی علوم کی تکمیل کے بعد جب سے عالم اسلام بیہوشی کی نیند سو گیا، یورپ نے انھیں مسائل پر غور و فکر کیا جن میں کبھی مسلم فلسفی اور سائنس دان گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ ان حالات میں ایشیا اور افریقہ کے مسلمانوں کی نئی نسل یہ مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہے کہ ان کے دینی عقائد کو تازگی اور شگفتگی کے ساتھ اجاگر کیا جائے۔ اقبال تحریر کرتے ہیں:

احیائے اسلام کے اس دور میں نہایت ضروری ہے کہ اس امر کی آزادنہ تحقیق کی جائے کہ یورپ فکر کے میدان میں کن نتائج پر پہنچا ہے اور یہ نتائج کس حد تک علوم دینیہ کی نظرثانی یا تشکیل نو کے لیے ہمیں مدد دے سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہمیں وسط ایشیا (یعنی اشتراکی روس) کے خلاف مذہب اور بالخصوص خلافِ اسلام اس پراپیگنڈے سے بھی غافل نہیں رہنا چاہیے جو اب تک ہندوستان کی سرحد عبور کر چکا ہے۔

اقبال آیاتِ قرآنی کے حوالے سے ثابت کرتے ہیں کہ کائنات اس لیے وجود میں نہیں آئی کہ تخلیق کا عمل خدا کے لیے محض ایک کھیل ہے۔ دراصل وہ بامقصد ہے اور اس کی ترکیب بھی ایسے ہوئی کہ اس میں مزید اضافے کے ذریعے وسعت کی گنجائش ہے۔ انسان ایک تخلیقی فعلیت ہے اور اپنے گردونواح کی قوتوں کی بہتری کی خاطر گہری سے گہری آرزوؤں میں شریک ہو کر، کبھی ان قوتوں سے توافق پیدا کر کے اور کبھی ان کو اپنے مقاصد کے مطابق ڈھال کر، اپنی اور ساتھ ہی کائنات کی تقدیر متشکل کر سکتا ہے اور اس بتدریج تغیر پذیر سلسلۂ عمل میں وہ خدا کا معاون بن سکتا ہے، بشرطیکہ ایسے انقلاب کی ابتدا انسان کی طرف سے ہو۔

اقبال کی نگاہ میں قرآن حکیم جگہ جگہ مطالعۂ فطرت اور مشاہدۂ موجودات پر اصرار کرتا ہے۔ اسی سبب مسلمانوں کی توجہ فطرت یا عالم موجودات کی طرف مبذول ہوئی اور انہوں نے آگے چل کر طبعی علوم کی بنیاد رکھی۔ اقبال فرماتے ہیں:

قرآن حکیم ہمیں تغیر ایسی زبردست حقیقت کی طرف متوجہ کرتا ہے کیونکہ اس حقیقت کو سمجھنے اور قابو میں رکھنے ہی سے ایک زندہ اور پائیدار تمدن کی تعمیر ممکن ہو سکتی ہے۔ واقعاتی طور پر ایشیا اور دنیائے قدیم کے سارے تمدن اس لیے ناکام رہے کہ انہوں نے حقیقت کو پانے کے لیے خالصتاً باطن (تخیل یا قیاس) سے ظاہر (عالم موجودات) کا رستہ اختیار کیا۔ یوں انہوں نے مفروضے تو قائم کر لیے لیکن قوت سے محروم رہے اور ظاہر ہے صرف مفروضوں کی بناء پر کوئی پائیدار تمدن قائم نہیں ہو سکتا۔

دوسرے مقالے کا موضوع ''مذہبی مشاہدات کا فلسفیانہ معیار'' ہے۔ اس بحث میں اقبال واضح کرتے ہیں کہ عقل کے لیے کس حد تک مذہبی مشاہدات کی تائید ممکن ہے اور اس حد سے وہ کیوں آگے نہیں بڑھ سکتی۔ بحث کا آغاز خدا کے وجود کو ثابت کرنے کے لیے ان تین عقلی دلیلوں سے ہوتا ہے جو عیسوی علم الکلام نے قائم کر رکھی ہیں یعنی کونی، غائی اور وجودی۔ تینوں دلیلوں

سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عقل انسانی نے ذاتِ مطلق کی جستجو کے لیے حقیقی طور پر تحریک کی لیکن منطقی اعتبار سے تینوں ناقص ہیں: گویا عقل نے ان کے لیے جو اساس قائم کی ہے وہ عقل ہی کے اوزاروں سے منہدم ہو جاتی ہے۔

اس کے بعد قرآن حکیم کی اس آیت کے حوالے سے کہ خدا اوّل بھی ہے اور آخر بھی، ظاہر بھی اور باطن بھی، اقبال محسوسات و مدرکات کے تین مراتب یعنی مادہ، حیات اور شعور پر بحث کے لیے طبیعیات، حیاتیات اور نفسیات ایسے علوم کے نتائج فکر پر تبصرہ کرتے ہیں اور ثابت کرتے ہیں کہ سائنس کے ہاں حقیقت کا کوئی مبسوط نظریہ نہیں، صرف الگ الگ اجزا کے متعلق علیحدہ علیحدہ تصورات قائم کیے گئے ہیں اور ان تصورات میں بھی کوئی ایسا ربط نہیں کہ انہیں آپس میں جوڑ کر حقیقت کی شکل کا سراغ لگایا جا سکے۔ مذہب چونکہ کل حقیقت کا طلب گار ہے، اس لیے اسے جزئی نظریات سے کوئی خوف نہیں۔

اقبال کہتے ہیں کہ قرآنی تعلیمات کے مطابق خدا، کائنات اور حیات متحرک ہیں۔ اس لیے ان کے ہاں زمان کی ماہیت کا مسئلہ بہت زیادہ اہمیت اختیار کر لیتا ہے۔ اقبال کے مطابق انسان جب اپنی خودی کی انتہائی گہرائیوں میں ڈوبتا ہے تو اسے زمان خالص (بلا شائبہ مکان) کا تجربہ ہوتا ہے۔ قرآن حکیم کی رُو سے خدا کا تخلیقی عمل بھی ایسا ہی تیز ہے جیسے آنکھ کا جھپکنا (کلمح بالبصر) پس خدا کا زمان زمانِ خالص یا ایک طرح کی عدم زمانِ مسلسل کی کیفیت ہے، البتہ وہ اپنے تخلیقی عمل کے ساتھ زمان مسلسل لحظہ بہ لحظہ تخلیق کرتا چلا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے کائنات خلا میں اشیاء کے مجموعے کا نام نہیں بلکہ ایک مسلسل تخلیقی عمل ہے۔

اقبال کے خیال میں زندگی پے در پے تبدیلی اور کارفرمائی سے اغراض و مقاصد کی تشکیل کرتی ہے اور جوں جوں اس کا عمل بڑھتا ہے نئے نئے عزائم وضع ہوتے ہیں۔ اس تسلسل میں ہم جو کچھ ہیں وہ نہیں رہتے۔ زندگی کا رستہ گویا موت در موت سے گزرتا ہے، مگر اس کے باوجود یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس رستے کا تسلسل بے قاعدہ ہے۔ حیات و کائنات کا عمل زمان کے تسلسل میں اس لحاظ سے مقصد سے خالی ہے کہ وہ کسی پہلے سے متعین منزل کی طرف نہیں بڑھ رہا۔ پس زمان کی حرکت کسی پہلے سے کھنچے ہوئے خط کی شکل میں نہیں، کیونکہ یہ خط ابھی کھنچ رہا ہے اور اس سے مراد وہ امکانات ہیں جو ہو سکتا ہے، وقوع میں آئیں اور ہو سکتا ہے، نہ آئیں۔ اقبال کے نزدیک مستقبل انہیں معنوں میں بامقصد ہے اور وہ قرآنی اصطلاح ''تقدیر'' کی تشریح بھی اس

انداز میں کرتے ہیں۔

آخر میں اقبال فرماتے ہیں کہ صرف وجدان کے ذریعے یہ علم حاصل ہوتا ہے کہ حیات دراصل ایک اپنی ذات پر مرتکز خودی ہے۔ حقیقت مطلق اپنی اصل میں روحانی ہے۔ اس لیے اس کا تصور ایک خودی کے طور پر ہی کیا جا سکتا ہے۔ اقبال کے نزدیک مذہب کے عزائم فلسفے سے بلندتر ہیں۔ فلسفہ حقائق کا محض عقلی ادراک ہی کر سکتا ہے۔ لہٰذا وہ کسی ایسے تصور سے آگے نہیں بڑھ سکتا جو محسوسات یا عقل ایسے ذرائع سے حاصل کردہ مختلف جزئی قسم کی معلومات کو سمیٹ کر کسی نہ کسی نظام میں مدغم کر دے۔ بالفاظ دیگر فلسفہ دور ہی سے حقیقت کا مشاہدہ کرتا ہے، مگر اس کے برعکس مذہب حقیقت سے قرب و اتصال کا آرزومند ہے۔ ایک صرف مفروضہ ہے اور دوسرا تقرب اور اتصال کا زندہ تجربہ۔ عقل کے لیے ایسا تقرب تبھی ممکن ہے کہ وہ اپنے حدود سے آگے بڑھنے کی کوشش کرے اور تکمیل آرزو کی خاطر ایسی ذہنی روش اختیار کرے جسے مذہب دعا سے تعبیر کرتا ہے۔

تیسرے مقالے کا موضوع ہے ''ذات الٰہیہ کا تصور اور حقیقت دعا'' اس مقالے میں اقبال فلسفے کی روشنی میں خدا کے اسلامی تصور کی وضاحت کرتے ہیں۔ ان کی رائے میں انسانی ذرائع علم کے اجتماعی تجربے سے ہم پر منکشف ہوتا ہے کہ ان ذرائع کی اساس کوئی بابصر تخلیقی مشیت ہے۔ جسے ایک خودی ہی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ خودی مطلق کی انفرادیت کے پیش نظر قرآن حکیم نے اس کے لیے اللہ کا اسم معرفہ استعمال کیا۔ خودی مطلق اپنی تخلیقی فعلیت کے ممکنات میں، جو اس کے وجود کے اندر مضمر ہیں، لامتناہی ہے۔ یعنی اس کی لامحدودیت وسیع ہونے کے بجائے عمیق ہے بعدازاں وہ اس سوال کی طرف رجوع کرتے ہیں کہ خدا کی تخلیقی فعلیت سے عملِ تخلیق کی ابتدا کس طرح ہوتی ہے۔ اس مرحلے پر قرآنی آیات کی روشنی میں اقبال اشاعرہ کے افکار پیش کرتے ہیں۔ ان کی رائے میں اشاعرہ کا تخلیقِ کائنات کا نظریہ عہد حاضر کے طبیعی علوم میں موجود رجحانات سے زیادہ قریب ہے۔

اقبال کے نزدیک ان افکار کی روشنی میں خدا کا تخلیقی عمل وحدتوں کی صورت ہی میں ہوتا ہے۔ جن کو وہ 'خودیوں' سے تعبیر کرتے ہیں۔ سب کی حقیقت صرف خودیِ مطلق کے انکشاف ذات کے سوا اور کچھ نہیں۔ پس کائنات کا ہر جوہر خودی ہی کی پست و بالا صورت ہے البتہ وہ ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی ذات انسانی میں اپنے معراج کمال کو پہنچتی ہے۔ اسی سبب قرآن

حکیم نے خودیِ مطلق کو انسان کی شہ رگ سے قریب تر ٹھہرایا ہے۔

اقبال کی نگاہ میں فلسفہ تو صرف تصورات پر قناعت کرتا ہے، لیکن مذہب اپنے مقصود کا زیادہ گہرا علم حاصل کرنے کے لیے اس کے قریب تر ہونے کی خواہش رکھتا ہے اور یہ قرب دعا کے ذریعے ہی میسر ہوتا ہے۔ دعا کا تعلق روحانی تجلیات سے ہے اور اس سے مختلف طبیعتیں مختلف اثرات قبول کرتی ہیں۔ اقبال فرماتے ہیں:

اسلام نے عبادت کے لیے ایک مخصوص سمت انتخاب کی تو محض اس لیے کہ جماعت کے اندر ایک ہی قسم کے جذبات موج زن ہوں۔ بعینہٖ جس طرح اس کی ظاہری شکل سے مساوات اجتماعی کی حس بیدار ہوتی اور پرورش پاتی ہے، کیونکہ صلوٰۃ با جماعت سے مقصود ہی یہ ہے کہ شرکائے جماعت میں اپنے مرتبہ و مقام یا نسلی حیثیت کا کوئی احساس باقی نہ رہے۔...... حاصل کلام یہ کہ اسلام میں صلوٰۃ با جماعت حصولِ معرفت ہی کا سرچشمہ نہیں، اُس کی قدر و قیمت اس سے بڑھ چڑھ کر ہے صلوٰۃ با جماعت سے اس تمنا کا اظہار بھی مقصود ہے کہ ہم ان سب امتیازات کو مٹاتے ہوئے جو انسان اور انسان کے درمیان قائم ہیں، اپنی اس وحدت کی ترجمانی، جو گویا ہماری خلقت میں داخل ہے، اس طرح کریں کہ ہماری عملی زندگی میں اس کا اظہار سچ مچ ایک حقیقت کے طور پر ہونے لگے۔

چوتھے مقالے میں اقبال نے ''خودی، جبر و اختیار، حیات بعد الموت'' کے موضوع پر بحث کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ قرآن حکیم نے انسان کی انفرادیت پر زور دیا ہے۔ اسلامی تصوف میں بعض صوفیہ کی واردات سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ خودی ایک حقیقت ہے اور اگر ایک عمیق اور پختہ شخصیت پیدا کر لی جائے تو وہ روحانی طور پر ثبات و استحکام حاصل کر سکتی ہے۔ قرآن حکیم کے نزدیک ایسی واردات علم کا ایک ذریعہ ہیں۔ اقبال اس سلسلے میں منصور حلاج کی مثال پیش کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ مسلمانوں نے صوفیہ کے اس قسم کے احوال اور مشاہدات کی علمی نہج پر تحقیق نہیں کی۔ اس لیے ان سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا جا سکا۔ وہ کہتے ہیں:

ہمارا فرض ہے ماضی سے اپنا رشتہ منقطع کیے بغیر اسلام پر بحیثیت ایک نظام فکر از سرِ نو غور کریں۔ ...... بہر حال اب ہمارے سامنے کوئی رستہ ہے تو یہ کہ علم حاضر کے احترام اور قدر و منزلت کے باوجود ہم اپنی آزادیِ رائے برقرار رکھتے ہوئے یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ اسلامی تعلیمات کی تعبیر اب علم حاضر کے پیش نظر کس رنگ میں کرنی چاہیے، خواہ ایسا کرنے میں ہمیں اپنے

اسلاف سے اختلاف ہی کیوں نہ ہو۔

اقبال انسانی خودی کے اختیار یا اس کے کلی طور پر ذمے دار ہونے کے متعلق خدا کی تخلیقی فعلیت کے دو پہلوؤں کا ذکر کرتے ہیں، خلق، جس کے معنی پیدا کرنے کے ہیں اور امر، جس کے معنی ہدایت کے ہیں، قرآن حکیم واضح کرتا ہے کہ دونوں قسم کی تخلیق یعنی خلق اور امر خدا کے ہاتھ میں ہے۔ روح کی حقیقی ماہیئت کا اظہار اصطلاع امر ہی سے کیا گیا ہے۔ اسلامی تعلیمات کا مقصد یہی ہے کہ آزادی واختیار کی قدرت خودی کی زندگی کا ایک مستقل عنصر بن جائے۔ سو خودی کی زندگی اختیار کی زندگی ہے۔ اقبال کے ہاں حیات بعد الموت انسان کا حق نہیں بلکہ اس کے لیے اپنے آپ کو مستحق بنانا پڑتا ہے اور اس کی تحصیل کا دارومدار مسلسل جدوجہد پر ہے۔ انسان حیات بعد الموت کا امیدوار ہے اور اسے خدا کی طرف سے انعام کی صورت ہی میں حاصل کر سکتا ہے، بشرطیکہ وہ اس کا اہل ہو۔ حیات ایک تسلسل ہے اور انسان خدا کی نو بہ نو تجلیات کے لیے ہمیشہ آگے ہی آگے بڑھتا رہے گا۔

پانچویں مقالے کا موضوع ''اسلامی ثقافت کی روح'' ہے۔ اس مقالے میں اقبال نے شعور ولایت میں امتیاز کو واضح کیا ہے اس بحث کے دوران میں اقبال عقیدۂ ختم نبوت کی ثقافتی اہمیت پر ہماری توجہ مبذول کراتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن حکیم نے لفظ وحی کا استعمال جن معنوں میں کیا ہے ان سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ وحی خاصۂ حیات ہے اور جوں جوں وہ ارتقاء حاصل کرتی ہے اس کی ماہیت بھی بدلتی جاتی ہے، حتیٰ کہ جب وہ اپنے معراج کمال کو پہنچتی ہے تو اس کا خاتمہ ضروری ہو جاتا ہے۔ اقبال فرماتے ہیں:

> اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یوں نظر آئے گا جیسے پیغمبر اسلام صلعم کی ذاتِ گرامی کی حیثیت دنیائے قدیم اور جدید کے درمیان ایک واسطہ کی ہے۔ بہ اعتبار اپنے سر چشمۂ وحی کے آپ کا تعلق دنیائے قدیم سے ہے، لیکن بہ اعتبار اس کی روح کے دنیائے جدید سے۔ یہ آپؐ ہی کا وجود ہے کہ زندگی پر علم وحکمت کے وہ تازہ چشمے منکشف ہوئے جو اس کے آئندہ کے رُخ کے عین مطابق تھے۔ لہٰذا اسلام کا ظہور استقرائی عقل کا ظہور ہے۔ اسلام میں نبوت چونکہ اپنے معراج کمال کو پہنچ گئی لہٰذا اس کا خاتمہ ضروری ہو گیا۔ اسلام نے خوب سمجھ لیا تھا کہ انسان ہمیشہ سہاروں پر زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ اس کے شعورِ ذات کی تکمیل ہو گی تو یونہی کہ وہ خود اپنے وسائل سے کام لینا سیکھے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اگر دینی پیشوائی کو تسلیم نہیں کیا یا موروثی بادشاہت کو جائز نہ رکھا یا بار بار عقل اور

تجربے پر زور دیا، یا عالم فطرت اور عالم تاریخ کو علمِ انسانی کا سرچشمہ ٹھہرایا تو اس لیے کہ ان سب کے اندر یہی نکتہ مضمر ہے، کیونکہ یہ سب تصورِ خاتمیت ہی کے مختلف پہلو ہیں۔

اقبال کی رائے میں قرآن حکیم نے مشاہدات باطن کے علاوہ علم انسانی کے لیے دو سرچشموں کا ذکر کیا ہے۔ ایک عالمِ فطرت اور دوسرا عالمِ تاریخ۔ اقبال کے خیال میں ان دو سرچشموں سے استفادہ کرنے میں دنیائے اسلام کی بہترین روح کا اظہار ہوا۔ اسی طرح دنیائے اسلام میں حسِ تاریخ کی پرورش بھی قابل مطالعہ موضوع ہے۔ اس کی ابتدا ادیانِ حدیث سے ہوئی اور رفتہ رفتہ تاریخِ تنقید کے اصول مرتب ہوتے چلے گئے۔ ابن اسحاق، طبری اور مسعودی جیسے مورّخ پیدا ہوئے۔ بعد ازاں تاریخ کا نشوونما ایک علم کے طور پر ہوا۔ بالآخر ابن خلدون نے تعلیمات قرآنی ہی کی روشنی میں فلسفۂ تاریخ پیش کرتے ہوئے اس کی بنیاد و اصولوں پر رکھی۔ وحدتِ انسانیت اور حیاتِ انسانی کی مسلسل اور مستقل حرکت۔

چھٹا مقالہ ''الاجتہاد فی الاسلام'' کے موضوع پر ہے۔ مقالے کی ابتداء بھی اسی نقطۂ نظر سے کرتے ہیں کہ تحریک اسلام نے کائنات کو متحرک قرار دیا اور تاریخ انسانی کے ایک ایسے مرحلے پر نمودار ہوئی جب رنگ وخون کے زمینی پیوستگی کے رشتے توڑ کر حیات انسانی کے لیے اساس فراہم کرنے کی ضرورت تھی یا ایک قریب المرگ تمدن کی جگہ لینے کے لیے، جس کی بنا بادشاہت پر قائم تھی، دنیا کو نئی تہذیب کی حاجت تھی۔ اقبال فرماتے ہیں:

> اس نئی تہذیب نے اتحاد عالم کی بنا اصول توحید پر رکھی۔ اسی اصول کا تقاضا ہے کہ ہم صرف اللہ کی اطاعت کریں، نہ کہ ملوک وسلاطین کی۔ اسلام کے نزدیک حیات کی روحانی اساس ایک قائم ودائم وجود ہے اب اگر کوئی معاشرہ حقیقت مطلقہ کے اس تصور پر مبنی ہے تو پھر یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی زندگی میں ثبات اور تغیر دونوں خصوصیات کا لحاظ رکھے۔ اس کے پاس کچھ تو اس قسم کے دوامی اصول ہونا چاہئیں جو حیات اجتماعیہ میں نظم وانضباط قائم رکھیں، لیکن دوامی اصولوں کا یہ مطلب تو ہے نہیں کہ اس سے تغیر اور تبدیلی کے جملہ امکانات کی نفی ہو جائے۔ اسلام کی ہیئت ترکیبی میں وہ کون سا عنصر ہے جو اس کے اندر حرکت اور تغیر قائم رکھتا ہے؟ اس کا جواب ہے، اجتہاد۔

اقبال واضح کرتے ہیں کہ اہل سنت والجماعت نے اجتہاد کی ضرورت سے کبھی انکار نہیں کیا، مگر جب سے فقہ کے چار مکاتب فکر قائم ہوئے ہیں انہوں نے عملاً اس کی کبھی اجازت بھی نہیں دی، کیونکہ انہوں نے اجتہاد پر ایسی کڑی شرطیں لگا دی ہیں جن کا پورا کرنا محال ہے۔

اقبال اس روش کے اسباب گنواتے ہوئے کہتے ہیں کہ سیاسی زوال اور انحطاط کے دور میں ایسا کرنا اسلام کی ہیئتِ اجتماعیہ [illegible]ط رکھنے کے لیے ضروری تھا، تاہم وہ قدامت پسند علماء کے رویے کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

لیکن وہ نہیں سمجھے اور ہمارے زمانے کے علماء نہیں سمجھتے، تو یہ کہ قوموں کی تقدیر اور ہستی کا دارومدار اس امر پر نہیں کہ ان کا وجود کہاں تک منظم ہے بلکہ اس بات پر کہ افراد کی ذاتی خوبیاں کیا ہیں، اگر قوم کے زوال وانحطاط کو روکنا ہے تو اس کا یہ طریق نہیں کہ ہم اپنی گذشتہ تاریخ کو بے جا احترام کی نظر سے دیکھنے لگیں یا اس کا احیا، خودساختہ ذرائع سے کریں۔ قوائے انحطاط کے سدِباب کا کوئی ذریعہ فی الواقع موثر ہے تو یہ کہ معاشرے میں اس قسم کے افراد کی پرورش ہوتی رہے۔ جو اپنی ذات اور خودی میں ڈوب جائیں، کیونکہ ایسے ہی افراد ہیں جن پر زندگی کی گہرائیوں کا انکشاف ہوتا ہے اور ایسے ہی افراد وہ نئے نئے معیار پیش کرتے ہیں جن کی بدولت اس امر کا اندازہ ہونے لگتا ہے کہ ہمارا ماحول سرے سے ناقابل تغیر وتبدل نہیں اس میں اصلاح اور نظرِثانی کی گنجائش ہے۔ یہ کہنا کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے، محض ایک افسانہ ہے۔ عہدِ حاضر کے مسلمان کبھی یہ گوارا نہیں کریں گے کہ اپنی آزادی ذہن کو خود اپنے ہاتھوں قربان کر دیں۔ اگر ہمارے افکار میں وسعت اور دقتِ نظر موجود ہے اور ہم نئے نئے تجربات سے فائدہ بھی اٹھا رہے ہیں تو ہمیں چاہیے کہ فقہ اسلامی کی تشکیل نو میں جرأت سے کام لیں۔ لیکن یہ کام محض اس زمانے کے احوال وظروف سے مطابقت پیدا کرنے کا نہیں ہے، بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ اہم یورپ کی جنگ عظیم نے بیداری کی لہر دوڑا دی ہے، علٰی ہذا وہ نیا معاشی تجربۂ اشتراکیت، جو اسلامی ایشیا کے حوالی میں کیا گیا، یہ دونوں باتیں ایسی ہیں جن کے پیشِ نظر ہمیں خوب سمجھ لینا چاہیے کہ اسلام کا معنی ومنشا اور اس کی تقدیر فی الحقیقت کیا ہے۔

اقبال اجتہاد کا حق بحیثیت افراد علماء یا مجتہدین کے ہاتھ میں نہیں دیتے۔ ان کی رائے میں یہ حق دنیائے اسلام کے ممالک میں مجالسِ آئین ساز کو سونپا جانا چاہیے۔ کیونکہ عہدِ حاضر میں فقۂ اسلامی کے مآخذ اجماع کا اسی صورت میں احیاء ممکن ہے۔ اس مقالے میں اقبال جدید اسلامی ریاست کے متعلق اپنا تصور بھی پیش کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک اسلامی ریاست حُریّت، مساوات اور استحکام کی ابدی صداقتوں پر قائم ہوتی ہے اور جمہوری طرزِ حکومت کا اصول نہ صرف اسلام کی روح کے عین مطابق ہے، بلکہ جو قوتیں دنیائے اسلام میں کام کر رہیں، ان کے لحاظ سے بھی وہ ناگزیر ہے۔ وہ ترکوں کے اس اجتہاد کو درست خیال کرتے ہیں کہ

اسلامی تعلیمات کی رو سے خلیفہ یا امام کا منصب فردِ واحد کی بجائے افراد کی ایک جماعت بلکہ منتخب شدہ مجلس کے ذمے بھی کیا جا سکتا ہے۔ ان کی رائے میں عالمگیر خلافت یا امامت کا تصور تبھی قابل عمل تھا جب سارا عالمِ اسلام ایک سلطنت کی صورت میں تھا۔ لیکن متعدد خودمختار مسلم ریاستوں کی موجودگی میں ایسا تصور نہ صرف نا قابل عمل ہے بلکہ ان ریاستوں کے اتحاد میں حائل ہوسکتا ہے۔

اقبال کے نزدیک فقۂ اسلامی کے ماخذوں میں اجماع کی اہمیت سب سے زیادہ ہے، گو ممالک اسلامیہ میں وہ کبھی ایک مستقل ادارے کی صورت اختیار نہ کر سکا۔ غالباً اس لیے کہ خلفاء راشدینؓ کے دور کے خاتمے پر عالم اسلام میں مطلق العنان ملوکیت رائج ہوئی اور اجماع کا ایک مستقل ادارے کی شکل اختیار کرنا اس کے مفاد کے خلاف تھا۔ اموی اور عباسی خلفاء کا فائدہ تو اسی میں تھا کہ اجتہاد کا حق افراد کے ہاتھ میں رہے تا کہ حسب ضرورت ان پر ریاست کی طرف سے دباؤ ڈالا جا سکے، بجائے اس کے کہ وہ ایک مستقل قانون ساز یا بااختیار مجلس کی صورت میں قائم ہو جو انجام کار ان سے بھی زیادہ اقتدار حاصل کر لے اقبال کے ہاں عہد حاضر میں اجماع کا تصور مجلس شوریٰ کے طور پر نہیں بلکہ ایک قانون ساز اور بااختیار ''پارلیمنٹ'' کی شکل میں ہے۔

اس مرحلے پر اقبال خود ہی ایک سوال اٹھاتے ہیں اور وہ یہ کہ موجودہ زمانے میں تو جہاں کہیں مسلمانوں کی کوئی قانون ساز مجلس قائم ہوگی اس کے ارکان زیادہ تر وہی لوگ ہوں گے، جو فقہ اسلامی کی نزاکتوں سے ناواقف ہیں اور یوں اس قسم کی مجالس شریعت کی تعبیر میں شدید غلطیوں کی مرتکب ہوسکتی ہیں، لہٰذا اس کا طریق کار کیا ہوگا؟ وہ ۱۹۰۶ء کے ایرانی دستور کے حوالے سے جواب دیتے ہیں، کہ قانون ساز مجلس کے اندر اس امر کی گنجائش رکھی جا سکتی ہے کہ امور دینی کے معاملات میں علماء کی ایک الگ مجلس قائم ہو جو قانون ساز مجلس کی سرگرمیوں پر نظر رکھے اور شریعت کی تعبیر میں غلطیاں نہ ہونے دے۔ لیکن ساتھ ہی وہ خبردار کرتے ہیں کہ ایرانی نظریۂ دستور کا یہ طریق کار بجائے خود نہایت خطرناک ہے، اس لیے سنّی ممالک اسے اختیار کریں تو صرف عارضی طور پر۔ اسی مقالے کے اختتامی پیرے میں اقبال واضح کرتے ہیں کہ اس کا اصل مقصد ''روحانی جمہوریت'' کا قیام ہے۔ فرماتے ہیں:

اسلام کا یہ بنیادی تصور کہ آئندہ کا انسان کسی بھی وحی کا پابند نہیں ہوگا، ظاہر کرتا ہے کہ ہم مسلمان روحانی طور پر دنیا کے آزاد ترین لوگ ہیں۔ ابتدائی زمانہ کے مسلمان جنھوں نے قبل اسلامی

ایشیا کی روحانی غلامی سے نجات حاصل کی تھی، اس بنیادی نکتہ کی حقیقی اہمیت کو نہ سمجھ سکے۔ لیکن آج کے مسلمان کے لیے لازم ہے کہ اپنی حیثیت کو پہچانے اور اپنی معاشرتی زندگی کو بنیادی اصولوں کی روشنی میں، از سرِ نو تعمیر کر کے اسلام کے اصل مقصد، یعنی ''روحانی جمہوریت'' جس کا ابھی صرف ایک محدود حد تک اظہار ہوا ہے، مکمل طور پر نافذ کر کے دکھائے۔

ساتویں مقالے کا موضوع ہے ''کیا مذہب کا امکان ہے''۔ اس مقالے میں اقبال نے مذہب اور سائنس کی جستجوؤں کا موازنہ کیا ہے، بقول اقبال مذہبی زندگی کے تین ادوار ہیں: ایمان، فکر اور معرفت۔

اقبال سائنس کے جدید اکتشافات کے حوالے سے واضح کرتے ہیں کہ وہ ایک ایسی سمت میں بڑھ رہی ہے کہ اب عقلاً بھی الٰہیات کا ایک نظام تشکیل دے سکنا مشکل نہیں رہا۔ لیکن اس کے باوجود عصرِ حاضر کا مغربی انسان اپنے تصورات کے اعتبار سے خود اپنی ذات سے اور سیاسی اعتبار سے افراد افراد سے متصادم ہیں۔ دورِ حاضر کا مسلمان بحیثیت مجموعی یہ یقین کھو بیٹھا ہے کہ اس کی روحانی زندگی کا احیاء دراصل مذہب ہی کے ذریعے ممکن ہے۔ اسے اس حقیقت کا احساس نہیں رہا کہ مذہب ہی وہ ذریعہ ہے، جس سے افکار و خیالات کی دنیا میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور جس کے سہارے وہ زندگی، طاقت اور قوت کے دائمی سرچشمے تک پہنچ سکتا ہے۔

پس دنیائے جدید کی مایوسی اور دل گرفتگی کا مداوا نہ تو تصوف ہے، نہ علاقائی وطنیت اور نہ ملحدانہ اشتراکیت۔ عصر حاضر کا انسان اگر پھر سے وہ اخلاقی ذمہ داری اٹھا سکے گا جو سائنس یا علوم جدیدہ کی ترقی نے اس کے کندھوں پر ڈال رکھی ہے، تو صرف مذہب کی بدولت۔ جب تک انسان کو اپنی ابتدا اور انتہا کی کوئی نئی جھلک نظر نہیں آتی، وہ کبھی اس معاشرے پر غالب نہیں آ سکتا، جس کی روحانی وحدت اس کی مذہبی اور سیاسی قدروں کے اندرونی تصادم سے پارہ پارہ ہو چکی ہے، اور جس میں ہمہ گیر مقابلے اور مسابقت کی دوڑ نے ایک انتہائی غیر انسانی شکل اختیار کر رکھی ہے اقبال کے خطبات میں بعض ایسے افکار ہیں جو ارتقائی مراحل سے گزرے اور بعض ایسے نظریات ہیں، جن پر مختلف اہل علم نے تبصرے بھی کیے ہیں، مگر ان میں سے بعض امور پر بحث آگے چل کر کی جائے گی۔ خطبات کے اس مختصر جائزے سے یہ بخوبی ظاہر ہو جاتا ہے کہ برصغیر

میں مسلم ریاست کے قیام کا تصور پیش کرنے سے قبل اقبال نے اس کے لیے ایک دینی، تمدنی، معاشرتی یا نظریاتی بنیاد فراہم کرنے کی کوشش کی۔

باب: ۱۷

مسلم ریاست کا تصور

برصغیر میں دو قومی نظریے کا آغاز اسلام کے ورود کے ساتھ ہی ہو گیا۔ ہندو مسلم اختلافات کے متعلق تاریخی شہادت پہلی بار، آج سے تقریباً نو سو برس قبل، البیرونی کی تصنیف کتاب الہند فراہم کرتی ہے۔ ان اختلافات کو ختم کرنے اور قومیت متحدہ کی داغ بیل ڈالنے کے لیے پہلی شعوری کوشش سولہویں صدی عیسوی میں شہنشاہ اکبر نے دین الٰہی کے ذریعے کی۔ لیکن مسلمانوں میں شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ اور ہندووں میں راجہ مان سنگھ نے اس تحریک کی شدید مخالفت کی۔ سترھویں صدی عیسوی میں شہنشاہ اکبر ہی کے خطوط پر قومیت متحدہ کو وجود میں لانے کی دوسری شعوری کوشش داراشکوہ نے کی۔ جسے شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے ناکام بنا دیا۔ پس انہی تاریخی شہادتوں کی بنا پر اقبال شیخ احمد سرہندی اور اورنگ زیب عالمگیر کو ہندوستان میں مسلم قومیت کے بانیوں میں شمار کرتے تھے۔

برصغیر میں اسلام کا جدید احیاء اٹھارہویں صدی عیسوی سے شروع ہوتا ہے، جب جنگ پلاسی ۱۷۵۲ء اور بالخصوص سلطان ٹیپو کی شہادت ۱۷۹۹ء کے بعد مسلم علماء وفقہا نے ہندوستان کے دارالحرب بننے اور مسلمانوں کے لیے جہاد یا ہجرت اختیار کرنے کے فتوے دیے۔ انہی فتووں کی اساس پر سید احمد بریلوی شہید، شاہ اسمٰعیل شہید نے شمال مغربی سرحد پنجاب اور کشمیر میں، مولوی شریعت اللہ، دودو میاں، میر نثار علی شہید اور غلام معصوم شہید نے مشرقی بنگال میں دعوت اصلاح و تنظیم جہاد کی تحریکیں چلائیں۔ مگر برصغیر کے شمال مغربی اور مشرقی خطوں میں اسلامی ریاستوں کے قیام کے لیے مسلمانوں کی یہ کوششیں اس لیے ناکام رہیں کہ انگریزوں کے جدید اندازِ جنگ کا مقابلہ فرسودہ طور طریقوں سے نہ کیا جا سکتا تھا۔

بہر حال اسلام کے احیائے جدید کے حوالے سے برصغیر کے مسلمانوں نے پہلے اسلامی عصبیت کے تحت حصولِ آزادی اور پھر شمال مغربی اور مشرقی علاقوں میں اسلامی ریاستوں کے

قیام کی جدوجہد کی۔ جب انگریزی غلبے کے تحت برصغیر میں نئے مغربی تصورات داخل ہوئے تو سرسید احمد خان ہی پہلی شخصیت تھے جنھوں نے محسوس کیا کہ مغربی طرز کے جمہوری اداروں کے قیام سے برصغیر کے مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ ممکن نہ ہو سکے گا، لہٰذا انہوں نے مسلمانوں کو کانگرس میں شامل ہونے سے باز رکھا۔ بالآخر ان کے معتقدین محسن الملک اور وقار الملک کی کوششوں سے بیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخاب کا اصول مان لیا گیا۔

اقبال ۱۹۰۷ء سے ہی مسلمانانِ ہند کے حقوق کے تحفظ کے بارے میں سرسید کے نظریات کے قائل تھے جس کا اظہار ان کی نظم ونثر سے ہوتا ہے۔ ۱۹۲۷ء سے لے کر ۱۹۳۰ء تک اسی نظریاتی اساس پر انہوں نے مسلمانوں کی کُل ہند سیاسیات میں عملی طور پر حصہ لیا اور بالآخر برصغیر میں مسلم ریاست کے قیام کا تصور پیش کیا۔ برصغیر میں ہندو مسلم اختلافات کے مسئلے کے حل کے لیے اقبال سے پہلے بھی کئی شخصیات نے ہندوستان کی تقسیم کی تجاویز پیش کیں۔ شریف الدین پیرزادہ نے اپنی انگریزی تصنیف ارتقائے پاکستان میں سرسید، حالی اور عبد الحلیم شرر (دونوں سرسید کے معتقدین میں سے تھے) کے علاوہ انیس ایسی شخصیتوں کا ذکر کیا ہے۔

شریف الدین پیرزادہ کی تحقیق کے مطابق ۱۸۵۷ء میں جان برائیٹ نے برطانوی پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے ہندوستان میں پانچ یا چھ آزاد ریاستوں کے قیام اور ۱۸۸۱ء میں جمال الدین افغانی نے وسطی ایشیا کے روسی مسلم علاقوں افغانستان اور ہندوستان کے شمال مغرب میں مسلم اکثریتی صوبوں پر مشتمل ایک مسلم ری پبلک کے قیام کی تجویز دی۔ ۱۸۸۳ء میں ولفرڈ بلنٹ نے شمالی ہندوستان میں مسلم اور جنوبی ہندوستان میں ہندو حکومتوں کے قیام کی تجویز دی۔ ۱۹۰۵ء میں وائسرائے لارڈ کرزن نے تقسیم بنگال کا نفاذ کیا۔ ۱۹۱۱ء میں سید امیر علی نے سر محمد شفیع کو ایک خط میں ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے علیحدہ علیحدہ دستوری نظام کی تجویز دی۔ ۱۹۱۳ء میں ولایت علی بمبوق نے اخبار کامریڈ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے علیحدہ علیحدہ ممالک بنانے کا ذکر کیا۔ ۱۹۱۷ء میں ڈاکٹر عبدالجبار خیری اور پروفیسر عبدالستار خیری نے یورپ میں سٹاک ہوم کی سوشلسٹ انٹرنیشنل کانفرنس میں علیحدہ علیحدہ ہندو مسلم وفاق کے قیام کے بارے میں بیان دیا۔ ۱۹۲۰ء میں محمد عبد القادر بلگرامی نے اخبار ذوالقرنین

بدایوں میں مہاتما گاندھی کے نام ایک خط میں ہندوستان کی تقسیم کا ذکر کیا۔ ۱۹۲۱ء میں نادر علی نے حکومت برطانیہ کو مشورہ دیا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے تنازعوں کے حل کے لیے ہندوستان کی تقسیم لازمی ہے۔ ۱۹۲۳ء میں سردار گل محمد خان، صدر انجمن اسلامیہ ڈیرہ اسماعیل خان نے تقسیم ہند سے متعلق تجویز دیتے ہوئے کہا کہ دونوں قومیں آپس میں اپنی اپنی آبادیوں کا تبادلہ کرلیں۔ ۱۹۲۴ء میں مولانا حسرت موہانی نے تجویز پیش کی تھی کہ شمال مغرب کے مسلم اکثریتی صوبوں کو مدغم کر کے ایک صوبہ بنا دیا جائے اور اسے ہندوستان کے وفاقی نظام میں ایک وحدت کی پوزیشن حاصل ہو۔ یہ تجویز نہرو کمیٹی نے رد کر دی تھی۔ ۱۹۲۴ء میں لالہ لاجپت رائے نے بھی ہندو مسلم بناد پر تقسیم ہند کی تجویز دی، مگر بعد میں لالہ لاجپت رائے مُکر گئے اور کہا کہ انہوں نے ایسے کسی خیال کا اظہار نہیں کیا تھا۔ ۱۹۲۴ء ہی میں اسٹالن (روسی آمر) نے بھی اسی طرح کے خیالات کا اظہار کیا۔ ۱۹۲۴ء میں مولانا محمد علی نے کہا کہ مسلمانوں کے لیے قسطنطنیہ سے لے کر دہلی تک ایک ''کارے ڈور'' (رستہ کی شکل میں علاقے کا ٹکڑا) بنا دینا چاہیے۔ ۱۹۲۵ء میں دست شناس کیرو نے پیشگوئی کی تھی کہ ہندوستان سے انگریزوں کو بالآخر نکلنا پڑے گا اور وہ مسلمانوں اور بدھ مت کے ماننے والوں میں برابر برابر تقسیم ہو جائے گا۔ ۱۹۲۸ء میں ''ایک ہندی مسلمان'' نے بھی اسی طرح کے خیالات کا اظہار کیا۔ ۱۹۲۸ء میں ہی مرتضیٰ احمد خان نے اخبار انقلاب میں تقسیم ہند کے بارے میں مضامین کا ایک سلسلہ شائع کیا۔ ۱۹۲۹ء میں دُرانی نے اپنی کتاب میں تحریر کیا کہ ہندو اور مسلمان دو مختلف قومیں ہیں، اس لیے مسلمان یا تو خودکشی کرلیں یا ہندو بن جائیں اور یا ہندوستان کی حکومت میں اپنا حصہ طلب کریں۔

اشتیاق حسین قریشی نے اپنی انگریزی تصنیف پاکستان کے لیے جدوجہد میں اقبال سے پیشتر برصغیر میں مسلم ریاست کا تصور پیش کرنے والی جن شخصیات کا ذکر کیا ہے ان سب اور اقبال میں وہ یہ فرق روا رکھتے ہیں کہ اقبال نے مسلم ریاست کا تصور ایک اہم عوامی شخصیت کے طور پر مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے پیش کیا۔ گویا اس سلسلے میں اقبال کی فکری اور نظریاتی خدمات ان کی نگاہوں سے اوجھل رہیں۔

دونوں مصنف یعنی شریف الدین پیرزادہ اور اشتیاق حسین قریشی اپنی تصانیف میں ذکر کرتے ہیں کہ جمال الدین افغانی نے وسطی ایشیا کے روسی مسلم علاقوں، افغانستان اور ہندوستان کے شمال مغرب میں مسلم اکثریتی صوبوں پر مشتمل ایک مسلم ری پبلک کے قیام کا

خواب دیکھا تھا۔ اس ضمن میں شریف الدین پیرزادہ، اشتیاق حسین قریشی کی تحریر پر انحصار کرتے ہیں اور اشتیاق حسین قریشی کا انحصار کتاب تاریخ تحریک آزادی جلد اوّل (انگریزی) کے صفحات ۴۸، ۴۹، ۴۹ پر ہے، مگر تحریک آزادی (جلد اوّل) کا مصنف اس روایت کی تائید میں کوئی مستند ماخذ یا حوالہ پیش نہیں کرتا۔ تاریخ تحریک آزادی کی جلدیں اس لیے نامکمل رہیں کہ یہ سلسلہ ہائے کتب تحقیقی طور پر ناقابل اعتماد قرار دیا گیا تھا۔ بلاشبہ جمال الدین افغانی ترکی کے سلطان خلیفہ کی سربراہی میں جمہوریت کی بنیادوں پر ایک دستوری وفاق کی صورت میں ممالک اسلامیہ کے اتحاد کے داعی تھے اور ملت اسلامیہ کے لیے ان کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے اقبال انہیں عصر حاضر کا مجدد سمجھتے ہیں۔ تاہم افغانی سرسید احمد خان کو تارک الدین اور انگریزوں کا وفادار سمجھتے تھے اس لیے انہوں نے اپنے اخبار العروۃالوثقٰی میں ان کے رد میں ایک تحریر ''ردّ نیچریہ'' شائع کی۔

چودھری خلیق الزمان کی انگریزی تصنیف شاہراہ پاکستان میں مسلم ریاست کے تصور کے خالقوں میں سرتھیوڈ ور ماریسن وغیرہ کے ناموں کا اضافہ ہوا ہے، لیکن اقبال کے بارے میں ایک مقام پر غلط بیانی سے کام لیا گیا ہے۔ مصنف فرماتے ہیں کہ ۱۹۳۰ء میں لندن میں ہونے والی پہلی گول میز کانفرنس میں چوہدری رحمت علی نے کئی مسلم قائدین کو تقسیم ہند والی اسکیم سمجھائی، جس کو انہوں نے پہلی مرتبہ پاکستان کا نام دیا اور آخر کار دسمبر ۱۹۳۰ء میں اقبال نے خود اسی کو کُل ہند مسلم لیگ کے اجلاس الہ آباد کے صدر کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔ چوہدری خلیق الزمان پہلی گول میز کانفرنس کے موقع پر لندن میں موجود بھی نہ تھے۔ سو یہ ان کا چشم دید واقعہ نہیں، مگر عین ممکن ہے کہ یہ غلط بات انہوں نے اپنے قیاس سے تحریر کی ہو، اور ان کے قیاس نے انہیں دھوکا دیا ہو۔ بات یہ ہے کہ برصغیر میں مسلم ریاست یا پاکستان کے لیے تحریک کے متعلق اب تک اسلامی یا نظریاتی نقطۂ نظر سے کوئی مستند کتاب تحریر نہیں کی گئی۔ مسلمانوں یا غیر مسلموں نے اس موضوع پر جو کتب انگریزی یا اردو میں لکھی ہیں ان میں یہ تاثر غالب ہے کہ دو قومی نظریہ کو تحریک آزادی کے دوران ایک موثر اور طاقتور ہتھیار کے طور پر استعمال کیا گیا جس کی کوئی اسلامی اور نظریاتی اہمیت نہ تھی لہٰذا حصول آزادی کے ساتھ ہی دو قومی نظریہ اور تحریک آزادی کی مقصدیت ختم ہوگئی۔ تحریک آزادی کا اس تناظر میں مطالعہ اقبال کی خدمات کو نظر انداز کرنے کے مترادف ہے۔ المیہ تو یہ ہے کہ اس احسان فراموشی کے مرتکب تحریک آزادی کے کئی لیڈر خود ہیں۔ مثلاً ایم۔ اے۔ ایچ۔ اصفہانی لکھتے ہیں:

اس بات سے بلاشبہ انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ڈاکٹر اقبال کا فکر، شاعری اور خطبات بھی اسی سمت میں اشارہ کرتے تھے (یعنی مسلم ریاست کے قیام کی ضرورت کی طرف) لیکن یہ کہنا کہ وہ مسلم ریاست کے تصور کے خالق تھے تاریخ کو مسخ کرنا ہے۔

اقبال کے بارے میں پنڈت جواہر لعل نہرو، ڈاکٹر راجندر پرشاد اور ڈاکٹر امبید کر نے بھی کچھ ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا۔ وہ اپنی اپنی تصانیف میں فرماتے ہیں کہ پاکستان کے قیام کے لیے تحریک سے اقبال کا کوئی تعلق نہ تھا۔ ہندو لیڈروں نے تحریک پاکستان کو ایک جامع نظریاتی اساس یا مقصدیت سے محروم کرنے کے لیے ایسا کیا۔ بہرحال پاکستان ایک مسلم نیشنل ریاست کی صورت میں تو قائم ہو گیا، مگر اسلامی ریاست نہ بن سکا۔ پس اسلامی عصبیّت کی بجائے علاقائی تعصّب نے زور پکڑا اور اقبال کے عقابی فکر کے پر اس تعصّب کی قینچی کی نذر ہو گئے:

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ!

پاکستان کے تصور کے متعلق محمد احمد خان تحریر کرتے ہیں:

تصور پاکستان کو جن اشخاص سے منسوب کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، ان میں سے کسی کو بھی تصوّرِ پاکستان کا بانی اوّل قرار دینا درست نہیں ہے۔ ان میں سے بعض (جیسے سر سید، تھیوڈ ور ماریسن) نے صرف دو قومی نظریے کا اظہار کیا، بعض (بلنٹ، شرر، بمبوق، خیری برادران، سردار گل خان، مولانا حسرت موہانی، لاجپت رائے، مرتضیٰ احمد خان) نے مسلم اضلاع یا مسلم صوبوں کے قیام کا خیال ظاہر کیا اور بعض (جیسے عبدالقادر بلگرامی اور نادر علی) نے حلقۂ اثر یا تقسیم ہند کی مبہم تجویز پیش کی۔ یہ صحیح ہے کہ یہ سب تجاویز ۱۹۳۰ء سے قبل (یعنی علامہ اقبال کے تصوّر پاکستان پیش کرنے سے پہلے) کی ہیں، لیکن ان میں کسی تجویز میں بھی واضح طور پر مسلم صوبوں کے ایک علیحدہ وفاق یا ایک آزاد، مقتدر مسلم مملکت کے قیام کا ذکر نہیں ہے ان تجاویز کی حمایت میں زیادہ سے زیادہ کہا جا سکتا ہے کہ جب ہم ان تجاویز کو پڑھتے ہیں تو ہمارے متخیلہ میں پاکستان کا موہوم سا تصور یا ہلکی سی جھلک پیدا ہوتی ہے، لیکن اقبال کی پوری سیاسی فکر اور عملی جدوجہد کے پس منظر میں، جب ہم ان کے خطبۂ صدارت مسلم لیگ اور قائداعظم کے نام ان کے دونوں خطوط (مورخہ ۲۸ رمئی ۱۹۳۷ء اور ۲۱ رجون ۱۹۳۷ئ) کو بنظرِ غائر دیکھتے ہیں تو ہماری آنکھوں کے سامنے پاکستان کی نہایت واضح، بہت ہی صاف اور کاملاً جامع تصویر اجاگر ہوتی

ہے۔حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ بالا تمام تجاویز میں صرف ایک ہی قدر مشترک ہے اور وہ قدر مشترک یہ ہے کہ ان میں ایک تاثر یا ایک احساس پایا جاتا ہے۔مسلمانوں کی ہندوؤں سے علیحدگی کا تاثر یا مسلمانوں کی ہندوؤں سے مغائرت کا احساس لیکن پاکستان کا تصور کسی مبہم احساس یا سرسری تاثر کا نام نہیں ہے۔ اقبال کا کارنامہ یہ ہے کہ وہ اپنی نغمہ سرائی کے ذریعے اس احساس کو مسلمانانِ برصغیر کے لاشعور سے نکال کر ان کے شعور میں لے آئے۔ پھر اپنی صوت سرمدی سے اس شعور کو پختہ کیا اور اپنی سیاسی بصیرت سے اس کی عملی تجسیم و تشکیل کا خاکہ پیش کیا اور یہی ان کی اوّلیت ہے۔

اقبال ۱۹ر دسمبر ۱۹۳۰ء کی صبح کو الٰہ آباد پہنچے۔ اسٹیشن پر ان کے میزبان نواب سر محمد یوسف اور چند دوسرے مسلم لیگی لیڈر موجود تھے۔ لوگوں کے ایک بڑے ہجوم نے اقبال کا استقبال کیا اور انہیں ایک جلوس کی شکل میں اسٹیشن سے نواب سر محمد یوسف کی کوٹھی لے جایا گیا۔

لیگ کا اجلاس کالیون ہسپتال (اب موتی لعل نہرو ہسپتال) کے بالمقابل مسلمانوں کے محلہ یاقوت گنج میں واقع دوازدہ منزل میں منعقد ہوا۔ اجلاس میں لیگ کے صرف چند نمائندوں نے شرکت کی اور اس کا کورم بھی بڑی مشکل سے پورا ہوا۔ سید حسین امام، مولوی عبدالقادر قصوری، سر محمد یعقوب، مولانا عبدالماجد بدایونی، سید حبیب اور ذاکر علی اجلاس میں موجود تھے۔ مفتی فخر الاسلام وکیل کے مطابق، جو اس جلسے میں موجود تھے، حاضرین کی تعداد مشکل سے چار یا پانچ سو ہوگی یا شاید اس سے بھی کم۔ ان میں بہت سے اسکول کے لڑکے بھی شامل تھے، جو تفریحاً شریک ہو گئے۔ اقبال، نواب سر محمد یوسف کے ساتھ موٹر کار میں بیٹھ کر جلسہ گاہ میں تشریف لائے۔

اقبال کا خطبہ انگریزی میں تھا اور غالباً چند لوگ ہی اسے سمجھ سکے، باقیوں کے پلّے کچھ نہ پڑا۔ اقبال نے اپنے خطبے میں جن امور کا ذکر کیا، ان پر زیادہ توجہ نہ دی گئی۔ خطبے میں پیش کردہ تجویز کی حمایت میں کوئی قرارداد منظور نہ ہوئی۔ مقامی اخباروں نے بھی خطبے کی تفصیل شائع کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی، کسی کو بھی یہ احساس نہ ہوا کہ خطبے میں جو خیال پیش کیا جا رہا ہے، اس کے سبب ہزاروں انسان اپنی جانیں قربان کر دیں گے، لاکھوں انسانوں کی زندگیاں متاثر ہوں گی اور کروڑوں انسانوں کی آبادی پر مشتمل ایک نیا ملک معرضِ وجود میں آ جائے گا۔

اقبال نے دو دن الٰہ آباد میں قیام کیا۔ دریں اثنا انہوں نے اکبر الٰہ آبادی کی قبر پر فاتحہ پڑھی۔ ۳۱ر دسمبر ۱۹۳۰ء کو لاہور واپسی تھی۔ پلیٹ فارم پر ایک سکول کے مدرس ریاض الٰہ آبادی نے اقبال سے ان کے اس شعر کا مطلب پوچھا:

اجل ہے لاکھوں ستاروں کی اک ولادتِ مہر
فنا کی نیند مئے زندگی کی ہستی ہے

اقبال نے مطلب سمجھاتے ہوئے کہا، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ قومیں فنا نہیں ہوتیں، آئندہ نسلوں کی صورت میں اپنا قائم مقام پیش کر دیتی ہیں اور ان کی حالت پہلے سے بہتر ہو جاتی ہے، جس طرح ستارے فنا نہیں ہوتے بلکہ اپنا قائم مقام آفتاب کی صورت میں پیش کر دیتے ہیں جو تابانی میں ستاروں سے کہیں زیادہ برتر ہے۔ اتنے میں پنجاب میل آ گئی اور وہ چلے گئے۔

خطبۂ الہ آباد میں شمال مغربی ہند میں ایک نصب العین کے تحت مسلم ریاست کا تصور پیش کیا گیا جبکہ مسلم اکثریتی صوبہ بنگال کا ذکر نہیں کیا گیا کیونکہ شمال مغربی ہند میں مسلم ریاست کے قیام سے اس اصول کا بنگال میں اطلاق بھی خود بخود ہو جاتا۔ خطبے میں پیش کردہ تجویز کی تائید میں کوئی قرارداد منظور نہ ہوئی۔ کیونکہ لیگ کے سرکردہ لیڈر محمد علی جناح سمیت گول میز کانفرنس میں شرکت کی غرض سے لندن گئے ہوئے تھے۔ علاوہ ازیں ہندوؤں کے ساتھ مفاہمت کے لیے مسلمانوں کی طرف سے محمد علی جناح کے چودہ نکات بھی زیر غور تھے۔ اگرچہ اقبال مسلم لیگ کے منتخب صدر کے طور پر اجلاس کی صدارت فرما رہے تھے لیکن انہوں نے یہ تجویز اپنی ذاتی حیثیت میں ایک متبادل بلکہ ایک قدم آگے بڑھانے کے لیے دی، یعنی اگر چودہ نکات رد کر دیے گئے یا ہندوستان کے اندر مسلم انڈیا قائم کرنے کی تجویز منظور نہ ہوئی تو پھر یہ لائحہ عمل اختیار کرنا پڑے گا۔ اقبال نے خطبے کے آخری حصے میں اسی امر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا:

> میں کسی فرقہ وارانہ سمجھوتے کے امکان کے متعلق ناامید نہیں ہوں، لیکن میں اپنا یہ احساس بھی آپ سے مخفی رکھنا نہیں چاہتا کہ موجودہ سیاسی بحران سے نپٹنے کی خاطر ملّت اسلامیہ کو مستقبل قریب میں ایک آزادانہ راہ عمل اختیار کرنی پڑے گی اور ایسے نازک وقت میں آزادانہ سیاسی راہ عمل اختیار کرنا صرف انہی لوگوں کے لیے ممکن ہے جو باعزم ہوں اور اپنی قوت ارادی ایک مخصوص مقصد پر مرتکز کر سکیں۔

اقبال کی احتیاط کے باوجود، حکومت برطانیہ کے سرکردہ لیڈروں نے اقبال کے خطبے کو پسند نہ کیا۔ بمبئی کے انگریزی اخبار انڈین ڈیلی میل کے مطابق وزیر اعظم برطانیہ ریمزے میکڈانلڈ سخت برہم ہوئے۔ الہ آباد کے انگریزی اخبار لیڈر اور ہندوستان کے دو اینگلو انڈین اخباروں پاؤنیر اور ٹائمز آف انڈیا نے بھی اپنے اداریوں میں اقبال کی تجویز پر تبصرہ کرتے

ہوئے اسے رجعت پسند اور نا قابل عمل قرار دیا ہے۔

ہندو پریس خطبے پر تبصرہ کرتے وقت گالی گلوچ اور بہتان تراشی پر اتر آیا۔ اخبار ٹریبیون لاہور نے اقبال پر تنقید کی۔ پرتاپ نے ایک مضمون بعنوان ''شمالی ہند کا ایک خوفناک مسلمان، ڈاکٹر اقبال کی گستاخیوں پر چند خیالات'' شائع کیا، جس میں اقبال کو جنونی، شرانگیز، احمق، خوفناک، زہریلا، تنگ خیال، پست نظر، متعصب، قابلِ نفرت، کمینہ اور نالائق کے القاب سے نوازا گیا۔ لیکن ''ایک روشن خیال ہندو'' کے قلمی نام سے ایک ہندو نے ٹائمز آف انڈیا میں اقبال کی تجویز کے بارے میں مثبت خیالات کا اظہار کیا۔

مسلم پریس اقبال کا ہمنوا تھا۔ مسلم آؤٹ لک، سیاست، ہمدم لکھنؤ اور انقلاب وغیرہ سب نے اقبال کی تجویز کا خیر مقدم کیا۔ انقلاب نے جنوری ۱۹۳۱ء میں خطبے کے حق میں تقریباً بارہ اداریے تحریر کیے۔ ایک اداریے میں یہ مؤقف اختیار کیا گیا کہ اگر ہندو لیڈر تقسیم ہند کے متعلق سوچ سکتے ہیں، تو پھر اقبال کو ایسی تجویز پیش کرنے کا حق کیوں نہیں دیا جاتا۔ لالہ لاجپت رائے کے تصورِ تقسیم ہند کا ذکر اقبال نے بھی اپنے خط بنام سید نذیر نیازی محررۃ ۱۱رجنوری ۱۹۳۱ء میں کیا ہے، جس میں اپنی تجویز کی وضاحت کے سلسلے میں فرماتے ہیں:

> مجوزہ اسلامی ریاست ایک نصب العین ہے۔ اس میں آبادیوں کے تبادلے کی ضرورت نہیں۔ یہ خیال آبادیوں کے تبادلے کا مدت ہوئی لالہ لاجپت رائے نے ظاہر کیا تھا۔ اس ایک یا متعدد اسلامی ریاستوں میں جو شمال مغربی ہند میں اس اسکیم کے مطابق پیدا ہوں گی، ہندو اقلیت کے حقوق کا پورا پورا تحفظ کیا جائے گا۔

انقلاب نے ایک طویل اداریے کے آخر میں اقبال کو خراجِ تحسین ادا کرتے ہوئے لکھا:

> خدا اس مبارک ہستی کو زندہ رکھے جس نے پراگ (الہ آباد کا پرانا ہندو نام) میں سب سے پہلی مرتبہ راہ گم کردہ اور قومیت و جمہوریت کے فریب کارانہ دعاوی سے مسحور ملت کے لیے ہدایت کی حقیقی روشنی کا بندوبست کیا۔ خدا کو منظور ہوا تو یہ روشنی زندگی کی صحیح منزل مقصود تک اسلامیان ہند کی رفیق رہے گی۔

ہمدم لکھنؤ نے تجویز کی حمایت میں تحریر کیا:

> اقبال کا یہ مطالبہ نہایت حق بجانب ہے کہ مسلمانوں کو ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہند کے قیام کا موقع ملنا چاہیے اور اس کی بہترین تشکیل اس صورت سے ہو سکتی ہے کہ پنجاب، صوبہ

سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد سلطنت قائم کر دی جائے۔ حق یہ ہے کہ ہندو مسلم تنازعات کا یہ بہترین حل ہے اور اس قابل ہے کہ ہندوستان کے تمام مسلمان متحد ہو کر اس کے لیے جدوجہد کریں اور اپنی قوتِ عمل کا مظاہرہ کر کے اس کو حاصل کر کے چھوڑیں۔

خطبۂ الہ آباد کی دھوم لندن میں بھی پہنچی اور وہاں کے اخبارات نے اس کے بعض حصّے شائع کیے۔ پہلی گول میز کانفرنس کی اقلیتوں کی سب کمیٹی میں ڈاکٹر مونجے نے بھی اپنی تقریر کے دوران خطبۂ الہ آباد پر برہمی کا اظہار یوں کیا:

میں نہیں کہہ سکتا کہ اس مرحلے پر جو کچھ کل کے پریس میں سر محمد اقبال کی تقریر کی رپورٹ کی صورت میں شائع ہوا ہے، اس کا ذکر کرنا مناسب ہے یا نہیں...... وہ ہندوستان میں مسلم لیگ کے صدر ہیں اور مجھے اس امر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سخت کوفت ہوتی ہے، لیکن چونکہ انہی خطوط پر مطالبات متواتر پیش کیے جا رہے ہیں، اس لیے مجھے نہایت تکلیف دہ احساس کے ساتھ ان کی طرف رجوع کرنا پڑا ہے۔ میں اپنے مسلم دوستوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ جذبات کی رو میں نہ بہ جائیں۔ ہم سب لوگ ہندوستان کے باشندے ہیں۔ ہمارے اور تمہارے خون اور ہڈیوں میں کوئی فرق نہیں۔ ہم سب ایک ہی قوم کی اولاد ہیں اور ہم تمہارے مذہب، تمدن اور نسل کی ترقی کے لیے ہر وہ تحفظ دینے کو تیار ہیں جس کا تم مطالبہ کرتے ہو۔ میں تم سے اپیل کرتا ہوں کہ جرأت اور حوصلے سے کام لیتے ہوئے اپنے آپ کو ہندوستان کی متحدہ قومیت میں مستغرق کر دو اور مجھے یقین ہے کہ اگر تم اگلے دس برس کے لیے یہ تجربہ کر دیکھو تو تمہیں کبھی کسی قسم کی کوئی شکایت نہ رہے گی۔

اس کا جواب سر محمد شفیع نے سب کمیٹی کے اجلاس منعقدہ یکم جنوری ۱۹۳۱ء کو دیا۔ آپ نے فرمایا:

ڈاکٹر مونجے نے اس تقریر کا خصوصی طور پر حوالہ دیا ہے جو کہتے ہیں سر محمد اقبال نے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے الہ آباد میں تین چار روز ہوئے کی تھی۔ اے کاش! ڈاکٹر مونجے اس امر کی طرف اشارہ کر کے مجھے ایسے مسئلے پر زبان کھولنے کے لیے مجبور نہ کرتے جس کے متعلق بحث کرنے کا میرا قطعی کوئی ارادہ نہ تھا۔ میں کمیٹی کو یقین دلاتا ہوں کہ کل صبح جب میں یہاں آیا تو ایسی نیت کے ساتھ نہ آیا تھا۔ اب سب سے پہلے تو یہ بات ہے کہ جب تک اس تقریر کا پورا متن میرے سامنے نہ ہو، میں اس کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں دے سکتا...... اگر سر محمد اقبال نے کہا ہے کہ ہندوستان کی مرکزی حکومت میں ہندوؤں کی پائدار اور غیر متغیر اکثریت کے سبب سارے ہندوستان میں ہندو ریاست قائم ہو گی، یا ایسی غیر متغیر اور پائدار اکثریت کے سبب

آٹھ گورنری صوبوں میں سے چھ میں ہندو ریاستیں قائم ہوں گی، تو پھر ان چار مسلم صوبوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، چار مسلم ریاستیں کیوں نہ قائم کی جائیں؟ مجھے تو اس تجویز میں کوئی بری بات دکھائی نہیں دیتی اور میں بذات خود اس کمیٹی کے سامنے یہی تجویز دہرانے کے لیے تیار ہوں ...... ہر صوبائی وحدت ایک ریاست بنا دی جائے۔ اگر انہوں نے (اقبال نے) یہ کہا ہے تو اس میں کچھ بھی نہیں اور اس پر اعتراض کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ البتہ اگر انہوں نے مروجہ اصطلاح کے مطابق برٹش کامن ویلتھ سے باہر کسی آزاد مسلم ریاست کے قیام کا ذکر کیا ہے تو میں سارے مسلم ڈیلی گیشن کی طرف سے ایسی تجویز کو رد کرتا ہوں۔ جناب وزیر اعظم! میں ایک مسلمان کے پیمانۂ صبر کے لبریز ہو جانے کا بخوبی تصور کر سکتا ہوں، جبکہ میرے دوست ڈاکٹر مونجے ہندوستان کے مختلف حصوں میں، بغیر سوچے سمجھے مختلف قسم کے ایسے ہی متضاد اعلانات کرتے پھرتے ہیں۔

تاہم دیگر مسلم سیاسی رہنماؤں نے دوسری گول میز کانفرنس کے انعقاد کے اعلان، چودہ نکات کی بنیاد پر ہندو مسلم سمجھوتے کے امکان یا چودہ نکات کی ناکامی کے انتظار کے باعث خطبۂ الہ آباد کے حق میں یا خلاف اپنی زبان نہ کھولی۔ اقبال نے بھی خطبۂ الہ آباد کے بعد اپنی تجویز کردہ مسلم ریاست کے قیام کی خاطر اندرون خانہ اپّر انڈیا مسلم کانفرنس کے انعقاد کے لیے کوششیں جاری رکھیں۔ جس کے لیے وہ خطبہ بھی تحریر کر رہے تھے۔ (یہ خطبہ بالآخر آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے اجلاس منعقدہ لاہور بتاریخ ۲۱/ مارچ ۱۹۳۲ء میں پڑھا گیا) لیکن اپر انڈیا مسلم کانفرنس کا انعقاد نہ ہوا۔

حقیقت یہ ہے کہ اپر انڈیا مسلم کانفرنس کے انعقاد کا خیال آخری دم تک اقبال کے ذہن میں رہا۔ اس کانفرنس کا ذکر ان کے ایک خط بنام محمد علی جناح محررہ ۲۱/ جون ۱۹۳۷ء میں موجود ہے، اور پھر اپنے ایک دوسرے خط محررہ ۱۱/ اگست ۱۹۳۷ء میں انہیں مشورہ دیتے ہیں کہ شمال مغربی ہند کے مسلمانوں کو مسلم لیگ کی سرگرمیوں کا محور بنایا جائے۔

سو خطبۂ الہ آباد کے متعلق بیشتر مسلم سیاسی رہنماؤں نے تو مکمل خاموشی اختیار کی، البتہ سندھی مسلمانوں کے نامور رہنما حاجی سیٹھ عبداللہ ہارون نے اقبال کے ساتھ تعاون کیا اور خطبے کی روشنی میں اپر انڈیا مسلم کانفرنس کے انعقاد کے بارے میں اقبال سے خط و کتابت کرتے رہے۔ خطبہ کچھ پڑھے لکھے مسلمانوں اور طلبہ کی توجہ کا مرکز ضرور بنا۔ رسالہ صوفی (منڈی بہاء الدین) نے اس کا اردو بھی شائع کیا۔ جہاں تک کانگرسی ذہنیت رکھنے والے مسلمانوں کا

تعلق ہے انہوں نے خطبۂ الہ آباد کو ایک ''سیاسی غزل'' سے تعبیر کیا۔

اقبال کے مخالفین نے بہت پہلے ان کے خلاف پراپیگنڈا سروع کر رکھا تھا۔ ان اس میں کئی نئے الزامات کا اضافہ ہو گیا۔ محمد احمد خان نے اپنی معروف تصنیف اقبال کا سیاسی کارنامہ میں اس طویل فہرست کے تین جلی عنوانات مرتب کر کے حق وصداقت کی عدالت میں تحقیق وتلاش کی فضا میں اقبال کی نہایت موثر دادرسی کی ہے۔ اقبال پر انگریزی دوستی اور انگریز حکام کی مدح سرائی کا الزام لگایا گیا۔ مگر اقبال کا تعلق سرسید کے سیاسی مکتبۂ فکر سے تھا۔ وہ کلمۂ حق کہنے سے باز نہ رہ سکتے تھے لیکن ایجی ٹیشنل یا احتجاجی سیاست ان کی فطرت کے خلاف تھی۔ انگریزی حکومت اور ہندو اکثریت کے مقابلے میں مسلمانوں کی نازک سیاسی پوزیشن کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ مسلمانوں سے بھی یہی چاہتے تھے کہ ایجی ٹیشنل سیاست سے گریز کریں۔ مسلمانان ہند کی جدید تاریخ کے مطالعے سے ظاہر ہے کہ انہوں نے جب انگریزی حکومت کے خلاف کھلم کھلا جنگ کا رویہ اختیار کیا تو نقصان ہندو اکثریت کی بجائے مسلم اقلیت ہی کو اٹھانا پڑا۔ سو ایجی ٹیشنل یا کھلم کھُلا جنگ اقبال کے مصالح کے بھی خلاف تھی۔ اسی ذہنی پس منظر کے ساتھ اقبال نے جو پانچ نظمیں لکھیں وہ انگریز دوستی کے جذبے کے تحت نہیں بلکہ اپنے سیاسی مسلک سے مطابقت رکھتے ہوئے مصلحتاً تحریر کی تھیں۔

اقبال نے اصولی طور پر خلافت یا ترکِ موالات کی تحریکوں میں حصہ نہ لیا کیونکہ وہ مسلمانوں کا ہندوؤں کے ساتھ مل کر تحریک ترکِ موالات میں شامل ہونا پسند نہ کرتے تھے۔ محمد علی جناح بھی ان تحریکات کے خلاف تھے اور انہوں نے کانگرس سے ترک تعلق محض ان تحریکات ہی کی وجہ سے کیا۔ اسی طرح پنڈت مدن موہن مالویہ نے ان تحریکوں کی مخالفت کی اور بنارس ہندو یونیورسٹی کو ان کے مضر اثرات سے محفوظ رکھا۔

اقبال کو سر کا خطاب ان کی علمی وادبی خدمات کے سبب دیا گیا۔ اقبال کے نزدیک ایسے خطابات یا دنیوی اعزازات کی کوئی وقعت نہ تھی۔ وہ خطاب کے خواہشمند نہ تھے اور نہ اس کے لیے انہوں نے انگریزی حکومت سے کوئی سودا کیا۔ اس لیے خطاب یابی کے بعد جیسا کہ ان کی تحریروں سے ظاہر ہے، آزادی اظہار میں کمی کی بجائے زیادہ شدت سے اضافہ ہوا اور دنیا کی کوئی طاقت بھی انہیں حق کہنے سے باز نہ رکھ سکی۔

کونسل کی رکنیت اقبال نے انتخاب لڑ کر حاصل کی اگر محض کونسل کی رکنیت حاصل کرنے سے

انگریز کے نظام حکومت سے تعاون کا پہلو نکلتا ہے تو عدم تعاون یا سول نافرمانی کے حامی سوراجیوں نے بھی صوبائی کونسلوں کے انتخابات میں حصہ لیا یا کونسلوں کے رکن بنے اور کانگریس نے ۱۹۳۶ء میں نہ صرف انتخابات میں حصہ لیا بلکہ انگریز کے نظام حکومت میں وزارتیں بھی تشکیل دیں۔

الزام کی اس شق کا تعلق اقبال کی کونسل میں تقریر مورخہ ۱۹/ جولائی ۱۹۲۷ء سے ہے، جب انہوں نے سردار اجل سنگھ کی اس تحریک کی مخالفت کی تھی کہ سرکاری عہدوں کو کھلے مقابلے کے امتحان کے ذریعے پُر کیا جائے۔ لہٰذا انہوں نے طنزاً ارشاد فرمایا کہ سرکاری عہدوں کو مقابلے کے امتحان کے ذریعے پُر کرنے کی بجائے اگر برطانوی عہدہ داروں کی تعداد بڑھا دی جائے تو بہتر ہوگا۔ یعنی اگر مسلمانوں کو انتظامیہ سے بے دخل کرنا مقصود ہے تو پھر سرکاری عہدوں پر ہندوؤں کی بجائے انگریز عہدہ دار زیادہ تعداد میں فائز کیے جائیں تاکہ مسلمان ہندو عہدہ داروں کے تعصب کا نشانہ نہ بنیں۔

سائمن کمیشن سے تعاون کی اصل وجہ بھی مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ تھا۔ مولانا حسرت موہانی بھی، جنہوں نے آزادی کی راہ میں کئی قربانیاں دیں، سائمن کمیشن سے تعاون کے حق میں تھے۔

سر محمد شفیع کو برطانیہ کا حاشیہ بردار سمجھا جاتا ہے، لیکن جداگانہ انتخاب کے اصول پر قائم رہ کر انہوں نے مسلمانوں کی جو خدمت انجام دی اس کا ابھی تک صحیح طور پر اندازہ نہیں کیا گیا۔ اقبال نے ان کا صرف اس حد تک ساتھ دیا جس حد تک مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کا تقاضا تھا۔

اگر اقبال نے انگریز کے اشارے پر خطبۂ الہ آباد میں مسلم ریاست کا تصور پیش کیا تھا تو پھر ریمزے میکڈانلڈ اس خطبے پر اتنا برہم کیوں ہوا؟ اگر یہی صورت تھی تو وہ انگریزوں کے ایما سے مسلم ریاست کا تصور کیونکر پیش کر سکتے تھے؟

گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے ہر نمائندے کو انگریزی حکومت ہی نامزد کرتی تھی۔ مولانا محمد علی، مہاتما گاندھی اور محمد علی جناح بھی انگریزی حکومت ہی کی نامزدگی کی بنا پر گول میز کانفرنسوں میں شریک ہوئے۔ تاہم اقبال نے مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے حکومت برطانیہ پر شدید نکتہ چینی کی۔ تیسری گول میز کانفرنس ابھی جاری تھی کہ انہوں نے اختلافات کی بنا پر اس سے استعفا دے دیا۔ ہندوستان واپس چلے آئے اور یہاں پہنچ کر پھر حکومت برطانیہ کی شدید مذمت کی۔

حقیقت یہ ہے کہ اقبال کو یہ یقین کبھی نہ آیا کہ ایسی ہندو مسلم مفاہمت ہو سکتی ہے جو دونوں فریقوں کے لیے قابل قبول ہو،لیکن اس کے باوجود انہوں نے ایسی ہر کوشش میں مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کا خیال یا جداگانہ انتخاب کا اصول چھوڑے بغیر گفت وشنید کرنے والے مسلم لیڈروں کا ساتھ دیا۔ اقبال نے نفسِ مفاہمت کی مخالفت کبھی نہیں کی۔ البتہ مسلمانوں کے مفادات کے پیش نظر مفاہمت کے طریقِ کار پر معترض ضرور ہوئے۔

اگر اقبال انگریز دوست ہوتے تو بڑے اہم مراتب حاصل کر کے اپنی زندگی کو مالی اعتبار سے کامیاب بنا سکتے تھے،لیکن ان کی زندگی کا سرسری مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ کسی صورت میں بھی انگریزوں کی ملازمت کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔انگلستان سے واپس آ کر گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفے کے پروفیسر مقرر ہوئے،مگر کچھ مدت کے بعد ملازمت سے استعفادے دیا۔علی بخش کے بیان کے مطابق جس روز وہ استعفادے کر واپس آئے تو اس نے پوچھا کہ نوکری کیوں چھوڑ دی۔ جواب دیا:

علی بخش!انگریز کی ملازمت میں بڑی مشکل یہ ہے کہ میرے دل میں کچھ باتیں ہیں جنہیں میں لوگوں تک پہنچانا چاہتا ہوں مگر انگریز کا نوکر رہ کر انہیں کھلم کھلا نہیں کہہ سکتا۔ میں اب بالکل آزاد ہوں جو چاہے کروں، جو چاہے کہوں۔

اسی آزادی کی خاطر انگریزی حکومت کا انڈین ایجوکیشن سروس میں پیش کردہ عہدہ قبول نہ کیا۔قید ملازمت کے خیال سے علی گڑھ میں فلسفے کی پروفیسری اور گورنمنٹ کالج لاہور میں تاریخ کی پروفیسری ٹھکرا دی۔فرماتے ہیں:

لفٹنٹ گورنر (پنجاب) گورنمنٹ کالج لاہور کی پروفیسری کے لیے سیکرٹری آف سٹیٹ سے میری سفارش کرنے پر آمادہ تھے،لیکن میں نے اپنے میلانِ طبع کے خلاف اس اسامی کی امیدواری سے دست برداری کا فیصلہ کر لیا ہے۔

اقبال کی آمدنی کے ذرائع محدود تھے۔ دولت اکٹھی کرنا یا اپنی زندگی کو آسائشوں کے ذریعے آرام دہ بنانا ان کی فطرت کے خلاف تھا۔ وکالت میں کام بھی اتنا لیتے تھے، جس کے معاوضے سے ان کے ماہ دو ماہ کے اخراجات پورے ہو سکیں مہینے میں کم از کم پانچ سو روپے تک کا کام مل جائے تو مزید نہ لیتے تھے، اور اگر کوئی موکل آ پہنچتا تو اسے اگلے ماہ آنے کو کہتے۔ پیشہ وکالت کے اخلاقی پہلو کو ہمیشہ ملحوظ رکھتے۔ ایک مرتبہ غالباً پٹنہ میں عدالت عالیہ کے سامنے کوئی

اہم مقدمہ زیر بحث تھا۔ اس مقدمے میں ایک طرف سے سی۔ آر۔ داس اور دوسری طرف سے پنڈت موتی لعل نہرو اور عبداللہ سہروردی وغیرہ پیش ہوئے۔ اس مقدمے میں اقبال کو بھی عدالت کی معاونت کے لیے لاہور سے بلوایا گیا ایک ہزار روپیہ روزانہ ان کی فیس منظور ہوئی، اگر اقبال چاہتے تو ماہ دو ماہ تک وہاں قیام پذیر رہ کر فیس وصول کر سکتے تھے مگر انہوں نے اگلے روز ہی اپنے بیان کو قطعی صورت دے کر عدالت کے سپرد کر دیا اور پہلی ٹرین سے واپس لاہور روانہ ہو گئے۔ اسی طرح ان کی سادہ زندگی اور فقیرانہ طبیعت کے متعلق آتش فشاں لاہور شمارہ نومبر ۱۹۷۹ء میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے بھی ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے۔

وکالت کے ساتھ ساتھ اقبال مختلف یونیورسٹیوں کے لیے پرچے بناتے اور دیکھتے تھے، تب کہیں جا کر اخراجات پورے ہوتے تھے۔ بعد میں کتب کی اشاعت سے بھی کچھ آمدنی ہو جاتی تھی۔ آمدنی کی بے قاعدگی یا خرچ کی تنگی کے سبب بیوی نے کئی بار ملازمت اختیار کرنے کے لیے کہا لیکن انہوں نے مسکرا کر بات ٹال دی۔ کسی امیر گھرانے سے تعلق نہ تھا۔ بڑے بھائی کی اعانت میسر نہ ہوتی تو تعلیم بھی حاصل نہ کر سکتے تھے۔ ہندوستان میں غریب ترین نائٹ (سر کے خطاب یافتہ کو نائٹ کہا جاتا تھا) کے طور پر مشہور تھے۔ اسی تناظر میں محمد احمد خان نے لکھا:

> کیا انگریز کے ہوا خواہوں اور سرکار کے نیاز مندوں کی زندگی کا بھی یہی حال رہا ہے؟ ...... مگر اس کے باوجود نکتہ چین اور معترضین یہی کہتے رہے کہ اقبال برطانیہ کا ہوا خواہ، انگریز کا نیاز مند اور امپریلزم کا ایجنٹ ہے۔ واہ رے سرکار کے اقبال۔

ایسا سوچنے والے ایک نہیں کئی تھے۔ مسلم ہند کے برگزیدہ عالم مولانا حسین احمد مدنی بھی تمام عمر اقبال کو غلط فہمیوں کا شکار اور ’’ساحرین برطانیہ کے سحر میں مبتلا سمجھتے رہے۔

اقبال کے خلاف دوسرا بڑا الزام یہ تھا کہ وہ ایک متعصّب فرقہ پرست تھے۔ یہ الزام ان کی شاعری اور سیاست دونوں پر لگایا گیا۔ اقبال ایک خط میں عصبیت اور تعصب میں امتیاز کے متعلق تحریر کرتے ہیں:

> عصبیّت اور چیز ہے اور تعصّب اور چیز ہے۔ عصبیت کی جڑ حیاتی ہے اور تعصّب کی نفسیاتی۔ تعصب ایک بیماری ہے جس کا علاج اطباء روحانی اور تعلیم سے ہوسکتا ہے۔ عصبیت زندگی کا ایک خاصہ ہے، جس کی پرورش اور تربیت ضروری ہے۔ اسلام میں انفرادی اور اجتماعی عصبیت دونوں کے حدود مقرر ہیں۔ انہی کا نام شریعت ہے۔ میرے عقیدے کی رو سے بلکہ ہر مسلمان کے

عقیدے کی رو سے ان حدود کے اندر رہنا باعث فلاح ہے اور ان سے تجاوز کرنا بربادی۔

خطبۂ الٰہ آباد میں ایک مقام پر فرماتے ہیں:

فرقہ پرستی کی بھی کئی قسمیں ہیں۔ جو فرقہ دوسرے فرقوں کے لیے بدخواہی کے جذبات رکھتا ہو۔ وہ نیچ اور کمینہ فطرت ہے۔ میں دوسرے فرقوں میں رسوم، قوانین، مذہبی اور معاشرتی اداروں کا بے حد احترام کرتا ہوں اور یہی نہیں بلکہ قرآنی تعلیمات کے مطابق ضرورت پڑنے پر ان کی عبادت گاہوں کی حفاظت کرنا میرا فرض ہے، اس کے باوجود مجھے اس فرقے سے محبت ہے جو میری زندگی اور کردار کا سرچشمہ ہے اور جس نے مجھے اپنا مذہب، ادب، فکر اور تمدن دے کر میری تشکیل اس صورت میں کی ہے جیسا کہ میں ہوں اور اس طرح اپنے سارے ماضی کی تعمیر نو کر کے اسے میرے شعور میں ایک زندہ و فعال عنصر بنا دیا ہے۔

اقبال کے دوستوں میں مسلمان بھی تھے اور ہندو اور سکھ بھی۔ مہاراجہ کشن پرشاد سے تمام عمر ان کے گہرے روابط قائم رہے۔ یہاں تک کہ وہ اقبال سے اپنی بیٹیوں کی شادی بیاہ کے معاملات میں مشورہ بھی کرتے تھے۔ اسی طرح سوامی رام تیرتھ، پنڈت شیونارائن شمیم، سرتیج بہادر سپرو، نہرو خاندان، بالخصوص پنڈت جواہر لعل نہرو، سکھوں میں سرجوگندر سنگھ اور امراؤ سنگھ شیرگل سے بہت قریبی مراسم تھے۔ وہ راجکماری بامبا کی اس لیے عزت کرتے تھے کہ وہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی پوتی تھیں۔ گھر کے نجی ماحول میں اقبال نے راقم کی ابتدائی تعلیم کے لیے اسے ایک ہندو استاد جناب ماسٹر تاراچند کے سپرد کر رکھا تھا، جن پر انہیں بہت اعتماد تھا۔ زندگی کے آخری چار پانچ سالوں میں اقبال کے معالج ایک ہندو ڈاکٹر جمعیت سنگھ تھے۔ اور اقبال کی وفات کے بعد جب تک وہ زندہ رہے، بغیر کسی معاوضے کے خاندان اقبال کی خدمت کرتے رہے۔ میکلوڈ روڈ والی رہائش گاہ ایک بوسیدہ کوٹھی تھی، جس کا ایک سو تیس روپے کرایہ ادا کرتے تھے۔ کسی نے سوال کیا کہ اتنے گراں کرائے میں تو بہت نفیس کوٹھی مل سکتی ہے جواب دیا:

ٹھیک ہے، مگر میں یہاں سے جانا نہیں چاہتا۔ بات دراصل یوں ہے کہ یہ کوٹھی دو ہندو یتیم بچوں کی وراثت ہے۔ میرے چلے جانے سے ان کو بہت تکلیف ہوگی۔ اتنا کرایہ شاید اور کوئی نہ دے۔

انہیں ہندوؤں سے من حیث القوم یا فرقہ بھی کوئی تعصب دشمنی یا عناد نہ تھا، بلکہ ان کی ترقی اور کامیابی پر خوش ہوتے تھے۔ سر فرانسس ینگ ہسبنڈ کے نام ایک خط میں تحریر کرتے ہیں:

براہ کرم یہ نہ سمجھیے کہ مجھے ہندوؤں سے کوئی تعصب ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حالیہ سالوں میں ایثار و جرأت کی جو اسپرٹ انہوں نے دکھائی ہے، اس کی میں بڑی قدر کرتا ہوں۔ انہوں نے زندگی کے

میدان میں ممتاز افراد پیدا کیے ہیں اور معاشی اور معاشرتی راستوں پر تیزی سے گامزن ہیں۔

اس کے علاوہ ہندوؤں اور سکھوں کے مذہبی اوتاروں اور بانیوں سے انہیں دلی عقیدت تھی۔ رام چندر جی کی مدح میں نظم لکھی اور انہیں امام ہند، چراغ ہدایت اور ملک سرشت کہا۔ اسی طرح بابا گورونانک کو پیغامبر توحید وحق، توحید پرست اور نور ابراہیم کہہ کر خطاب کیا۔ گوتم بدھ کو بھی پیغامبر کا مرتبہ دیا۔ رام چندر جی کی مدح میں نظم تو بالآخر کفر کے فتوے پر منتج ہوئی۔ رامائن اور گیتا کا منظوم اردو ترجمہ کرنا چاہتے تھے۔ مثنوی اسرارِ خودی کے پہلے ایڈیشن کے ساتھ منسلک دیباچے کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ وہ ہندو مذہب کے دشمن کبھی بھی نہ تھے۔ بلکہ اُنہوں نے ہندو ادبیات اور مابعدالطبیعیات کا عمیق مطالعہ کیا تھا اور وشوامتریا بھرتری ہری کے علاوہ سری کرشن اور رامانج ایسی عظیم ہستیوں سے تو نہ صرف عقیدت تھی بلکہ ایک طرح کی محبت تھی۔ اقبال جس اسلام پر ایمان رکھتے تھے اس میں تعصب کا شائبہ تک بھی نہ تھا۔ جگن ناتھ آزاد نے ان کے عقیدۂ اسلام پر بڑے فاضلانہ انداز میں روشنی ڈالی ہے۔

اقبال کے ہاں مذہب کا تصور، ہندوؤں یا قدیم یونانیوں اور مصریوں کے مذہب کی طرح قومی ہے نہ یہودیوں کے مذہب کی طرح نسلی، نہ عیسائیوں کے مذہب کی طرح نجی، ذاتی یا انفرادی۔ ان کا تصور اسلام خالصتاً انسانی ہے بالفاظ دیگر وہ اسلام کو ہیبت اجتماعیۂ انسانیہ کا ایک اصول سمجھتے تھے۔ اور مسلمانوں کو وہ جماعت جو اس اصول کی علمبردار ہو۔ لیکن انہیں متعصّب فرقہ پرست ثابت کرنے کے لیے معترضین کتنی دور کی کوڑی لائے؟ اس کی ایک مثال محمد احمد خان دیتے ہیں: ڈاکٹر سچد انندا اپنی انگریزی تصنیف اقبال بحیثیت شاعر اور اس کا پیغام میں تحریر کرتے ہیں کہ نظم ''ہندوستاں ہمارا'' اس لیے قوم پرستی کے جذبات سے خالی ہے کہ اس میں اقبال نے فارسی کے الفاظ استعمال کیے ہیں اور نظم ''نیا شوالہ'' میں انہوں نے برہمن کی بت پرستی پر طنز کر کے ہندوؤں کے خلاف اپنے تعصّب کا اظہار کیا ہے۔ حالانکہ اقبال کے ہاں فارسی کوئی مذہبی زبان نہ تھی اور ''نیا شوالہ'' میں وہ برہمن کے بت اور واعظ کے خدا دونوں سے بیزار معلوم ہوتے ہیں۔ دراصل اقبال کی شخصیت پہلو دار تو تھی، مُعمانہ تھی۔ لیکن ہندوستان میں اسے معما بنا دیا گیا۔ ہندوؤں نے انہیں متعصب مسلم قوم پرست سمجھا اور مسلمانوں کے بعض حلقوں نے انہیں کافر گردانا۔ شاید اسی احساس کے تحت اقبال اپنے متعلق یہ کہنے پر مجبور ہوئے:

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے، مسلمان ہوں ہیں

بہرکیف ان میں اسلامی عصبیت ضرور تھی اور اپنی جماعت یا فرقے سے وہ محبت کرتے تھے، لیکن دوسروں سے نفرت نہیں۔ ان کی آرزو تھی کہ ہندو اور مسلمان دونوں اپنا اپنا قومی تشخص قائم رکھتے ہوئے ترقی کریں۔ اقبال نے مسلم ریاست کا تصور اس لیے پیش نہیں کیا تھا کہ وہ ہندوؤں سے کوئی بغض یا عناد رکھتے تھے وہ برصغیر کے سیاسی حالات کے ذاتی مشاہدے اور تجربے سے اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ دونوں مذہبی فرقوں میں اشتراک اقتدار کا کوئی قابل قبول سمجھوتا ہوسکنا ممکن نہیں۔ مسلم ریاست کا تصور پیش کرتے وقت اقبال نے واضح کیا کہ ہندوستان کے نقطۂ نظر سے اس کا مطلب اندرونی توازن قوت کے باعث، امن اور سلامتی ہو گا اور جہاں تک بیرونی حملے کا تعلق ہے، ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترک بری، فضائی اور بحری افواج برصغیر کے دفاع کے لیے اس کی سرحدوں پر متعین کی جاسکتی ہیں۔ اگر اقبال ایک متعصب فرقہ پرست تھے یا ہندوؤں کے دشمن تھے تو برصغیر کے تحفظ کے لیے مشترکہ دفاع کا تصور پیش کرنے کی انہیں کیا ضرورت تھی۔

تیسرا الزام یہ ہے کہ وہ ایک بے عمل اور مایوس انسان تھے۔ اس الزام کی دو شقیں ہیں۔

۱۔ اقبال بنیادی طور پر شاعر و مفکر تھے اس لیے ان کی سیاست بے عملی کی سیاست تھی۔ دراصل وہ سیاست دان نہ تھے۔

۲۔ مسلم ریاست کا تصور اقبال کی ذہنی مایوسی کی پیداوار تھا۔

جہاں تک اس الزام کی پہلی شق کا تعلق ہے، اقبال اگرچہ روایتی معنوں میں انتخابی میدان کے سیاستدان نہ تھے، لیکن بایں ہمہ عزلت نشین اقبال کو اپنی افتادطبع کے خلاف اگر کوئی سیاسی ہنگاموں میں کھینچ لانے کا محرک ہوا تو مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ یا ان کے سیاسی استحکام کا جذبہ تھا۔ ۱۹۲۶ء سے لے کر ۱۹۳۴ء تک انہوں نے برصغیر کی مسلم سیاسیات میں عملی جدوجہد کی اور اس کے بعد علالت کے دور میں بھی جو ان کی زندگی کے بقیہ چار برس تک مسلسل طاری رہا، بے عملی کے طعنوں سے بے پروا وہ بستر مرگ پر لیٹے لیٹے بلکہ آخری دم تک مسلم قائدین کو اسلامی ریاست کی تجویز قبول کرلینے پر آمادہ کرتے رہے اور جب کسی نے ان کی خدمات کو سراہنے کی کوشش کی تو عجز و انکسار سے فقط یہی کہا:

میں نے اسلام کے لیے کیا کیا؟ میری خدمتِ اسلامی تو بس اس قدر ہے جیسے کوئی شخص فرط محبت میں سوتے ہوئے بچے کو بوسہ دے۔

سید نذیر نیازی اس ضمن میں تحریر کرتے ہیں:

انہیں اپنی قوم سے بے عملی کے طعنے سننے پڑتے، حالانکہ ان کے نکتہ چین اس امر کو فراموش کر دیتے کہ ان کی فکر بھی ایک طرح کا عمل ہے اور اگر عمل کے معنی ہیں نصب العین حیات کے لیے ترغیبات اور ترہیبات دنیوی کے باوجود ایک خاص قسم کی سیرت و کردار کی بالا رادہ پرورش، تو حضرت علامہ کسی صاحب عمل سے پیچھے نہ تھے۔

جہاں تک دوسری شق کا تعلق ہے، اقبال کسی صورت میں بھی ہندو مسلم مفاہمت کے خواہشمند نہ تھے۔ ان کا نصب العین بالکل مختلف تھا۔ وہ ابتدا ہی سے مسلمانوں کو مسلم ریاست کی طرف لے جانے کے لیے فکری اور عملی جدوجہد میں مصروف تھے۔ پس دونوں صورتوں میں اقبال کے نقطۂ نظر سے مسلم ریاست کے قیام میں مایوسی یا ناامیدی کا کوئی پہلو نہیں نکلتا۔

ہندوستان میں اور انگلستان کے بعض حلقوں میں اقبال کے خطبۂ الہ آباد پر تبصرے جاری رہے۔ ۱۹۳۱ء کے چند ابتدائی مہینوں میں زور شور کچھ زیادہ ہی تھا، لیکن ۱۹۳۲ء تک بات آئی گئی ہو گئی۔ ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو اقبال نے وفات پائی۔ ان کی وفات سے تقریباً دو سال بعد ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو مسلم لیگ نے قراردادِ لاہور (جسے بعد میں قرارداد پاکستان کا نام دیا گیا) منظور کی اور اقبال کا خطبۂ الہ آباد پھر موضوع بحث بن گیا۔ اسے کئی اداروں نے دوبارہ شائع کیا اور لاکھوں کی تعداد میں تقسیم ہوا۔ اقبال کی وفات کے بعد اس نئی بحث میں پرانے سوالات کے ساتھ جو اقبال کی زندگی میں بھی زیر بحث آئے تھے بعض نئے سوالات بھی اٹھائے گئے۔

مسلم لیگ نے قرارداد لاہور میں چونکہ برصغیر کے شمال مغرب اور مشرق کے مسلم اکثریتی خطوں میں آزاد اور مقتدر مسلم ریاست یا ریاستوں کے قیام کا مطالبہ کیا تھا اس لیے اس کی تعبیر دس سال قبل مسلم لیگ ہی کے پلیٹ فارم سے اقبال کے خطبۂ الہ آباد کی روشنی میں کی گئی۔ ہندو لیڈروں میں ڈاکٹر راجندر پرشاد نے خطبۂ الہ آباد کا تجزیہ کرتے ہوئے اپنی انگریزی تصنیف منقسم ہندوستان میں تحریر کیا کہ اقبال نے تو ہندوستان کے وفاق کے اندر مسلم ریاست کے قیام کی تجویز پیش کی تھی۔ یہی موقف آر۔ کوپ لینڈ نے بھی اپنی تصنیف ہندوستانی سیاست ۱۹۳۶ء تا ۱۹۴۲ء (انگریزی) میں اختیار کیا۔

یہ غلط فہمی بھی پھیلانے کی کوشش کی گئی کہ اقبال نے گو برصغیر میں خودمختار مسلم ریاست کے

قیام کی تجویز پیش کی تھی، مگر بعد میں اس کی لغویت کا احساس کرتے ہوئے اس تجویز کو واپس لے لیا تھا یا اس سے منحرف ہو گئے تھے۔ یہ من گھڑت افسانہ آکسفورڈ یونیورسٹی میں بنگالی زبان کے پروفیسر اخبار مانچسٹر گارڈین کے نامہ نگار اور ہندو کانگرس کے زبردست حامی ایڈورڈ ٹامسن کے ذہن کی اختراع تھا۔ اس نے کتاب بعنوان ہندوستان کو آزادی کے لیے تیار کرو (انگریزی) میں جو لندن سے ۱۹۴۰ء میں شائع ہوئی، اس غلط فہمی کو بیان کیا۔

دو سال بعد یعنی ۱۹۴۲ء میں اسی مصنف نے ایک اور کتاب بعنوان عصر حاضر کے ہندوستان میں اخلاقی تخیلات (انگریزی) شائع کی، جس میں لکھا:

اقبال بیک وقت ایک فلسفی، شاعر، عالم دین اور سیاستدان تھے۔ انہیں اپنے انتقال سے کچھ عرصہ پہلے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ اس دنیا سے رخصت ہو رہے ہیں، مجھ کو ایک خط میں نہایت دل شکستگی اور رنج و افسوس کے ساتھ لکھا تھا کہ میرے وسیع، غیر منظم اور فاقہ کش ملک میں طوائف الملوکی برپا ہوتی نظر آتی ہے۔

خطبۂ الہ آباد کے بعد جب اقبال ستمبر ۱۹۳۱ء میں دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن گئے تو اسی ایڈورڈ ٹامسن نے لندن ٹائمز مورّخہ ۱/۳ اکتوبر ۱۹۳۱ء میں ''پان اسلامی سازش'' کے زیر عنوان ایک مراسلہ میں خطبۂ الہ آباد میں اقبال کی پیش کردہ مسلم ریاست کے قیام کی تجویز پر تنقید کی۔ اس کے جواب میں اقبال کا ایک خط بعنوان ''شمال مغربی مسلم صوبے'' لنڈن ٹائمز مورّخہ ۱۲/ اکتوبر ۱۹۳۱ء میں شائع ہوا۔ جس میں انہوں نے اس غلط فہمی کو رد کیا۔

سو اقبال نے اپنی زندگی میں ایڈورڈ ٹامسن کی شر انگیزی کی تردید کی تھی، جب اس نے ان کی مسلم ریاست کے قیام کی تجویز کو پان اسلامی سازش قرار دیا تھا۔ بہر حال ان سب باتوں کے باوجود پنڈت جواہر لعل نہرو نے اپنی انگریزی تصنیف ہندوستان کی دریافت ڈاکٹر امبید کر نے اپنی انگریزی تصنیف پاکستان پر خیالات یا دیگر ہندو مصنفین نے اپنی اپنی کتابوں میں ایڈورڈ ٹامسن کی علمی دیانت داری پر انحصار کرتے ہوئے اقبال کے متعلق اسی جھوٹ کو بار بار دہرایا ہے۔ واضح رہے کہ یہ سب کتب اقبال کی وفات کے بعد شائع ہوئیں، جب وہ ان کی تردید نہ کر سکتے تھے۔

انگریز اور ہندو پریس نے خطبۂ الہ آباد میں پیش کردہ مسلم ریاست کے قیام کی تجویز پر تبصرہ کرتے ہوئے اسے قابل اعتراض، رجعت پسند اور ناقابل عمل قرار دیا۔ وزیر اعظم برطانیہ

نے اس پر برہمی کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر مونجے نے پہلی گول میز کانفرنس کی اقلیتوں کی سب کمیٹی میں اس کی مخالفت کی اور ایڈورڈ ٹامسن نے اسے پان اسلامی سازش قرار دیا۔ مگر اقبال نے اپنی تجویز کی وضاحت کے سلسلے میں پہلی بار اپنے ایک خط محررہ ۱۱/جنوری ۱۹۳۱ء بنام سید نذیر نیازی میں فرمایا کہ مجوزہ اسلامی ریاست ایک نصب العین ہے۔ اس میں آبادیوں کے تبادلے کی ضرورت نہیں۔ اس ایک یا متعدد اسلامی ریاستوں میں جو شمال مغربی ہند میں اس اسکیم کے مطابق وجود میں آئیں گی۔ ہندو اقلیت کے حقوق کا پورا پورا تحفظ کیا جائے گا۔ پھر دوسری گول میز کانفرنس کے دوران میں انگلستان میں ایڈورڈ ٹامسن کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے لندن ٹائمز مورّخہ ۱۲/اکتوبر ۱۹۳۱ء میں اپنے مراسلے میں تحریر کیا کہ میں نے برطانوی سلطنت یا دولت مشترکہ سے باہر مسلم ریاست کو قائم کرنے کا منصوبہ پیش نہیں کیا۔ ۲۱/مارچ ۱۹۳۲ء کو آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے اجلاس لاہور کے صدارتی خطبے میں ارشاد کیا کہ میں نے خطبۂ الہ آباد میں آل انڈیا فیڈریشن کے تصور کے خلاف اپنی آواز بلند کی تھی۔

ہندو مہا سبھائی لیڈروں ڈاکٹر مونجے اور پنڈت مدن موہن مالویہ کے ایک نمائندے ایس وی للت کا ایک خط محررہ ۲۸/مئی ۱۹۳۲ء اقبال کو بمبئی سے موصول ہوا۔ اقبال نے ایس۔ وی۔ للت کو کیا جواب دیا؟ یہ تو معلوم نہیں ہوسکا، مگر انہوں نے مولانا شوکت علی سے اس سلسلے میں ہندو مہا سبھائی لیڈروں سے بات چیت کرنے کے لیے ضرور کہا، چنانچہ اپنے ایک خط محررہ ۸ جون ۱۹۳۲ء بنام مولانا محمد عرفان خان، میں تحریر کرتے ہیں:

> کچھ روز ہوئے میں نے ان (مولانا شوکت علی) کی خدمت میں لکھا تھا کہ ایک ہندو بزرگ مسٹر للت کا خط میرے پاس آیا تھا۔ اس کا مضمون یہ تھا کہ مونجے تمہاری اسکیم کو جو تم نے لیگ کے صدارتی ایڈریس میں پیش کی تھی، تسلیم کرتے ہیں۔ پنڈت مالوی سے بھی مشورہ کرنے جا رہا ہوں۔ وہ بھی ہندو مسلمانوں کی صلح کی خاطر اس کو تسلیم کرلیں گے، گو اس وقت اعلانیہ طور پر اس اسکیم کو تسلیم کرنا مصلحت نہیں ہے یہ خط بصیغہ راز تھا اور اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ مولانا شوکت علی صاحب سے بھی گفتگو کی ہے وہ بھی صلح پر آمادہ ہیں۔ اسکیم جس کی طرف اشارہ کیا ہے آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ یعنی شمالی ہندوستان میں مسلم صوبوں کا ایک ہوجانا۔

ہندوستان کے وفاق کے اندر خود مختار مسلم ریاست یا صوبے کے قیام کی بنا پر ہندو مسلم مفاہمت کے سلسلے میں مولانا شوکت علی جیسے مسلم قائدین اور ہندو مہا سبھائی لیڈروں میں خفیہ

مذاکرات جاری رہے۔ اسی دوران اقبال تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے انگلستان چلے گئے اور کانفرنس میں اپنی واحد تقریر کے دوران میں انھوں نے اس رائے کا اظہار کیا کہ ہندوستان کے لیے کوئی مرکزی حکومت نہ ہو اور صوبے خود مختار اور کلی طور پر آزاد ڈومینین ہوں جن کا براہ راست تعلق وزیر ہند سے لندن میں ہو۔ ۲۴ نومبر ۱۹۳۲ء کو لندن میں نیشنل لیگ کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے واضح کیا:

> چار پانچ سال ہوئے بحیثیت صدر آل انڈیا مسلم لیگ میں نے فرقہ وارانہ مسئلے کے ممکنہ حل کے طور پر مغربی ہند میں ایک وسیع مسلم ریاست کے قیام کی تجویز پیش کی تھی۔ اگرچہ یہ تجویز مسلمانان ہند کے مطالبات میں شامل نہ تھی، لیکن میری ذاتی رائے اب بھی یہی ہے کہ صرف یہی ایک ممکنہ حل اس مسئلے کا ہے۔ میں اتنی دیر انتظار کرنے کو تیار ہوں۔ جب تک تجربہ اس تجویز کی معقولیت یا غیر معقولیت ثابت کر کے نہیں دکھا دیتا۔

تیسری گول میز کانفرنس میں شریک مسلم مندوبین کے رویّے پر پنڈت جواہر لعل نہرو نے سخت تنقید کی۔ اقبال نے اپنے جوابی بیان مورّخہ ۶ دسمبر ۱۹۳۳ء میں فرمایا کہ ہندوستان کے مسئلے کا واحد حل یہی ہے کہ ملک کو مذہبی تاریخی اور تمدنی میلانات کی بنیادوں پر تقسیم کر دیا جائے۔

انھی ایام میں چوہدری رحمت علی نے اپنا انگریزی پمفلٹ اب اور کبھی نہیں کیمبرج سے شائع کیا، جس میں انھوں نے شمال مغربی ہند میں مسلم اکثریتی صوبوں اور کشمیر پر مشتمل ایک علیحدہ فیڈریشن کے قیام کا مطالبہ کیا اور اس مسلم ریاست کا نام پاکستان رکھا۔ چوہدری رحمت علی نے کیمبرج میں پاکستان کے حصول کے لیے پاکستان نیشنل موومنٹ بھی قائم کی۔ تاہم اقبال کے مسلم ریاست کے قیام کے تصور اور چوہدری رحمت علی کی پاکستان اسکیم میں واضح فرق تھا۔ اقبال نے مسلم ریاست کے قیام کی تجویز ہندوستان میں ایک ذمہّ دار مسلم سیاسی شخصیت کی حیثیت سے آل انڈیا مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے پیش کی تھی۔ چوہدری رحمت علی نے ایک مسلم طالب علم کی حیثیت سے انھی مسلم اکثریتی صوبوں اور کشمیر پر مشتمل ریاست کا نام پاکستان تجویز کر کے اپنا پمفلٹ انگلستان سے شائع کرایا۔ اقبال کی خود مختار مسلم ریاست کسی قابل قبول ہندو مسلم مفاہمت کی بنیادوں پر ہندوستان کے وفاق، برطانوی سلطنت یا برطانوی دولت مشترکہ کے اندر قائم ہو سکتی تھی اور اس کا علیحدہ طور پر ایک آزاد مملکت کی حیثیت سے قائم ہونے

کا امکان صرف اسی صورت میں تھا جب ہندو مسلم مفاہمت کی کوئی امید نہ رہے، لیکن چوہدری رحمت علی کی پاکستان اسکیم کا مقصد شمال مغربی ہند کے مسلم اکثریتی صوبوں اور کشمیر پر مشتمل ایک علیحدہ فیڈریشن قائم کرنا تھا۔ اقبال کی مسلم ریاست کے قیام کی تجویز میں آبادیوں کے تبادلوں کی ضرورت نہ تھی مگر چوہدری رحمت علی کے تصور پاکستان میں آبادیوں کا تبادلہ لازمی تھا۔

انہی سالوں یعنی ۱۹۳۳ء اور ۱۹۳۴ء میں اقبال نے ایڈورڈ ٹامسن کے نام نو خطوط تحریر کیے جو حال ہی میں شائع ہوئے ہیں۔ ان خطوط میں انہوں نے سیاسیات سے اپنے تعلق اور مسلم ریاست کے قیام کی تجویز کے بارے میں اپنے نظریات کی وضاحت کی ہے۔ ایک خط محررہ ۲۰؍جون ۱۹۳۳ء میں تحریر کرتے ہیں:

آپ اطمینان رکھیے، خالص سیاسیات میں مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ میری دلچسپی دراصل اسلام بحیثیت ایک اخلاقی نظام میں ہے، جس نے مجھے سیاسیات کی طرف دھکیل دیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ ہندو نیشنلزم بالآخر الحاد کی سمت لے جائے گا، اور میرے علم کے مطابق مسلمان اسلامی تعلیمات سے بے بہرہ ہونے کے سبب اس نام نہاد نیشنلزم کے سیلاب میں تنکوں کی طرح بہ جائیں گے۔

۲۶؍جولائی ۱۹۳۴ء کے خط میں تحریر کرتے ہیں:

مسلم کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے سندھ کی علیحدگی کی حمایت کرنا میرا فرض تھا۔ ذاتی طور پر میرا ہمیشہ یہ عقیدہ رہا ہے کہ ہندوستان کے شمال مغرب میں تینوں صوبوں کا ادغام انگلستان اور اسلام کے لیے بہت فائدہ مند ثابت ہوگا۔ آپ کو علم ہے کہ جمہوریت پر میرا اعتقاد نہیں ہے لیکن جمہوریت کی طرف قدم (میری رائے میں مہلک قدم) بہرحال اٹھایا جا چکا ہے۔ اب ہمیں معاشی تباہ حالی، سیاسی عدم استحکام اور ہندوؤں کے انتشار کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ کیونکہ اس وسیع، غیر منظم اور فاقہ کش ملک میں جمہوریت کے انعقاد سے ایسے ہی نتائج برآمد ہوں گے۔

انہی ایام میں مسلم ریاست کے قیام کی تجویز کی وضاحت کے سلسلے میں انہوں نے راغب احسن کو بھی لکھا اور فرمایا کہ میری تجویز پاکستان اسکیم سے مختلف ہے۔ راغب احسن کے نام ایک خط محررہ ۶؍مارچ ۱۹۳۴ء میں ارشاد ہوتا ہے:

میری تجویز انڈین فیڈریشن کے اندر ایک مسلم صوبے کی تخلیق ہے، لیکن پاکستان اسکیم انڈین فیڈریشن سے باہر ہندوستان کے شمال مغرب میں مسلم صوبوں کی ایک علیحدہ فیڈریشن قائم کرنے کی سفارش کرتی ہے۔ جس کا تعلق براہ راست انگلستان سے ہوگا۔

ہندوؤں نے نہ تو چودہ نکات کی صورت میں مسلمانوں کے مطالبات تسلیم کیے اور نہ

ہندوستان کے وفاق کے اندر خود مختار مسلم ریاست یا صوبے کی بنا پر ہندو مسلم مفاہمت کے لیے کوششوں کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا۔ اقبال نے اپنے ایک خط بنام محمد علی جناح محررہ ۲۸/ مئی ۱۹۳۷ء میں فرمایا:

برصغیر میں شریعت اسلام کا نفاد اور ارتقاء اتنی دیر تک ممکن نہیں جب تک کہ یہاں ایک آزاد مسلم ریاست یا ریاستیں وجود میں نہ لائی جائیں۔ کئی برسوں سے یہی میرا عقیدہ رہا ہے...... کیا آپ کے خیال میں اس مطالبے کا وقت آن نہیں پہنچا؟

پھر اپنے ایک خط محررہ ۲۱ جون ۱۹۳۷ء میں محمد علی جناح کو لکھا:

ہندوستان میں صرف آپ ہی ایک مسلمان ہیں جن کی جانب صحیح راہنمائی کے لیے ملت اسلامیہ کو رجوع کرنے کا حق حاصل ہے۔ ہندوستان میں قیام امن اور مسلمانوں کو غیر مسلموں کے غلبے اور تسلط سے بچانے کی واحد ترکیب وہی ہے جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ یعنی مسلم صوبوں کی ایک علیحدہ فیڈریشن میں اسلامی اصلاحات کا نفاذ۔ شمال مغربی ہندوستان اور بنگال کے مسلمانوں کو ہندوستان یا بیرون ہندوستان کی دوسری اقوام کی طرح حق خود اختیاری سے کیونکر محروم رکھا جا سکتا ہے۔

سو اقبال ہندوستان کے وفاق کے اندر خود مختار مسلم ریاست یا صوبے کے قیام کی تجویز سے آگے نکل کر اب شمال مغربی اور شمال مشرقی ہندوستان میں مسلم اکثریتی صوبوں پر مشتمل ایک ایسی علیحدہ فیڈریشن کی تخلیق کا ذکر کر رہے تھے جو نہ صرف آزاد اور مقتدر ریاست کی صورت ہی میں وجود میں لائی جا سکتی تھی بلکہ اس میں اسلامی اصطلاحات یا اسلامی شریعت نافذ کر کے اسے حقیقی معنوں میں اسلامی مملکت بھی بنانا تھا۔

اقبال کے خطوط بنام جناح کا پس منظر بیان کرتے ہوئے محمد علی جناح تحریر کرتے ہیں:

ان کے خیالات اور میرے اپنے خیالات میں ہم آہنگی تھی، اور ہندوستان کے دستوری مسائل کے محتاط مطالعے اور تجربے کے دوران، ان کے خیالات نے بالآخر مجھے انہی نتائج پر پہنچا دیا جن پر اقبال خود پہنچے تھے۔ رفتہ رفتہ انہی خیالات کا اظہار مسلمانان ہند کے متحدہ مطالبے کے طور پر آل انڈیا مسلم لیگ کی قرارداد لاہور میں جو عام طور پر قرارداد پاکستان کے نام سے مشہور ہے، کیا گیا۔

ایک اور مقام پر محمد علی جناح اقبال کے تصور مسلم ریاست کے متعلق ارشاد کرتے ہیں:

ایک عظیم شاعر اور مفکر ہوتے ہوئے وہ کسی سیاستدان سے کم نہ تھے۔ اسلام کے اصولوں پر

ان کے پختہ عقیدے اور ایمان کی بدولت وہ اُن چند ہستیوں میں سے ایک تھے جس نے ہندوستان کے شمال مشرقی خطوں، جو مسلمانوں کے تاریخی اوطان ہیں، میں ایک اسلامی ریاست کے ممکنہ انعقاد پر غور کیا۔

یہ بات واقعی دلچسپ ہے کہ اقبال نے نہ صرف برصغیر میں مسلم ریاست کو وجود میں لانے کی خاطر عملی طور پر سیاسی جدوجہد میں حصہ لیا بلکہ مسلمانوں کی نیشنلیٹی اور ایک جدید اسلامی فلاحی ریاست کے قیام کے لیے بنیادی اصول بھی وضع کر دیے۔ مثلاً اُن کے نزدیک مسلم قومیت اور وطنیت کی بنیاد مسلمانوں کے ایمان یا عقیدے پر استوار ہے نہ کہ اشتراک لسان، نسل یا علاقہ پر۔ اسی طرح اُن کی جدید اسلامی ریاست کا ماڈل بھی مختصراً مندرجہ ذیل اصولوں پر قائم ہے:

۱۔ جمہوریت اسلام کی اصل پاکیزگی کی طرف رجوع ہے۔
۲۔ اسلام کا اصل مقصد روحانی جمہوریت کا قیام ہے۔
۳۔ ریاست قانون کی حاکمیت اور حقوق بشر کے تحفظ کی ضمانت دے۔
۴۔ پارلیمنٹ صرف شوریٰ ہی نہیں بلکہ اسلامی قانون سازی کے معاملہ میں کلی طور پر بااختیار ادارہ ہے۔
۵۔ صرف پارلیمنٹ کو اجتہاد کا عمل جاری رکھنے کا اختیار ہے۔
۶۔ مسلم اکثریتی ریاست میں مخلوط انتخابات کا نظام رائج کیا جاسکتا ہے۔
۷۔ مذہبی امور کے شعبے کو ریاست کے دیگر شعبوں سے الگ کرنا دین اور سیاست کی علیحدگی نہیں۔
۸۔ اسلامی تعزیرات (حدود) کا سختی سے اطلاق کرنے کی ضرورت نہیں۔
۹۔ کثرت ازدواج کی قرآنی اجازت کی تحدید اور خاندانی منصوبہ بندی سے متعلق قانون سازی منتخب پارلیمنٹ کرسکتی ہے۔
۱۰۔ اراضی کی ملکیت کی حد مقرر کر دی جائے۔ ایگریکلچرل انکم ٹیکس نافذ اور بے زمین کاشتکاروں کو سرکاری اراضی آسان قسطوں پر دی جائے۔
۱۱۔ قرآنی احکام کہ ''امیروں کی دولت میں غریبوں کا حصہ ہے'' اور ''جو ضرورت سے زاید ہے وہ دے دیا جائے'' کے تحت مزدوروں کے لیے قانون سازی کی جاسکتی ہے۔
۱۲۔ اسلامی فلاحی قوانین (زکوٰۃ، عشر وغیرہ) اور خصوصی طور پر اسلامی قانون وراثت سختی سے نافذ کئے جائیں۔
۱۳۔ ریاست فلاح عامہ کے خاطر شریعت کے مطابق بذریعہ اجتہاد (بطور اجماع) قانون سازی کرسکتی ہے۔

ایک الگ اسلامی ریاست کے باب میں چوہدری رحمت علی کا دعوی سبقت عناد اور تعصب

پر مبنی ہے۔ اس کا اظہار اقبال کے بارے میں خواجہ عبدالرحیم مرحوم کے نام ان کے تحریر کردہ سو سے زائد خطوط اور محمد علی جناح کے خلاف ان کے کتابچہ عظیم غداری - ملت کو کس طرح بچایا جائے (انگریزی) سے ہوتا ہے۔ چوہدری رحمت علی کی پاکستان اسکیم سے مراد کسی معقول بنیاد پر تقسیم ہند نہ تھی، بلکہ ہندوستان کی 'بلقانائزیشن' (یا چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر دینا) تھی جس کے سبب مسلمانوں کا جائز مطالبہ بھی مسترد کیا جا سکتا تھا یا ان کے سیاسی مفاد کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ سکتا تھا۔ اسی بنا پر اقبال نے مسلم ریاست کے قیام سے متعلق اپنی تجویز کو چوہدری رحمت علی کی پاکستان اسکیم سے مختلف قرار دیا۔ بعدازاں مارچ ۱۹۴۰ء میں جب قرارداد لاہور منظور ہوئی تو اس میں بھی پاکستان کا ذکر نہ تھا، بلکہ محمد علی جناح نے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس دہلی بتاریخ ۲۴/اپریل ۱۹۴۳ء میں واضح طور پر فرمایا:

> میرا خیال ہے کہ آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ جب ہم نے قرارداد لاہور منظور کی تو ہم نے اس میں لفظ پاکستان استعمال نہ کیا تھا۔ یہ لفظ ہمیں کس نے دیا؟ (شور: ہندوؤں نے) میں آپ کو بتاتا چلوں کہ یہ انہی کی غلطی تھی۔ وہ قرارداد لاہور کو پاکستان کہہ کر معتوب قرار دینے لگے۔ انہیں مسلم تحریک کے متعلق کوئی واقفیت نہ تھی۔ سو انہوں نے یہ لفظ ہم پر ٹھونسا۔ گویا کتے کو گالی دو اور پھر اسے پھانسی پر چڑھا دو۔ آپ خوب جانتے ہیں کہ لفظ پاکستان دراصل ہندو اور برٹش پریس کے بعض حلقوں نے ہمارے سروں پر تھوپا ہے ...... اب میں اپنے ہندو اور انگریز دوستوں سے کہتا ہوں کہ ہمیں ایک طویل اصطلاح (قرارداد لاہور عام طور پر مشہور بہ پاکستان) کے بجائے ایک لفظ دینے کا شکریہ (مرحبا مرحبا)۔

چوہدری رحمت علی کی پاکستان اسکیم کے متعلق محمد علی جناح کا ردعمل کیا تھا؟ فرینک موراییسن تحریر کرتا ہے:

> میں نے جب کبھی رحمت علی کا نام جناح کے سامنے لیا تو انہوں نے ایک مخصوص انداز میں اپنے ابرو اوپر اٹھا دیے۔ گویا وہ رحمت علی کے تصور پاکستان کو ایچ۔ جی۔ ویلز کا ڈراؤنا خواب نہیں تو کم از کم والٹ ڈزنی کا ڈریم لینڈ ضرور سمجھتے ہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ (رحمت علی کے بارے میں) ان کا احساس کچھ ایسی حقارت کا تھا، جس کا اظہار پیشہ ور کھلاڑی ایک اناڑی کی غلطی پر کرتا ہے جو ترپ ظاہر کیے بغیر ہاتھ کے تمام پتے دکھا دے۔

اقبال اپنی زندگی بھر کے تفکر اور عملی سیاسی مشاہدات سے اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ہندوستان کے شمال مغربی اور شمال مشرقی مسلم اکثریتی صوبوں پر مشتمل ایک ایسی علیحدہ آزاد

ومقتدر فیڈریشن بنائی جائے جس میں اسلامی اصلاحات یا اسلامی شریعت کا نفاذ ہو۔ گویا اقبال کے ذہن میں مجوزہ آزاد و مقتدر مسلم ریاست کا تصور بطور ایک اسلامی مملکت کے تھا۔ محمد علی جناح کے بیان کے مطابق اقبال کے خیالات نے محمد علی جناح کو بھی انہی نتائج پر پہنچا دیا جن پر وہ خود پہنچے تھے۔ اور رفتہ رفتہ انہی خیالات کا اظہار مسلمانان ہند کے متحدہ مطالبے کے طور پر مسلم لیگ کی قرارداد لاہور میں کیا گیا۔ پس ظاہر ہے اقبال اس مسلم ریاست کو اسلامی ریاست کی صورت میں دیکھنا چاہتے تھے۔ اور اس بات کا احساس محمد علی جناح کو بھی تھا، جو ان سے متفق تھے۔ بعدازاں بقول محمد علی جناح اس اسلامی ریاست کے تصور کو مسلمانان ہند کے متحدہ نصب العین کے طور پر مسلم لیگ کی قرارداد لاہور پیش کیا گیا۔ حصول پاکستان کے ایک سال بعد محمد علی جناح تو وفات پا گئے۔ ان کے بعد گو لیاقت علی خان کے دور میں قرارداد مقاصد منظور کی گئی، لیکن مسلم لیگی یا دیگر سیاسی لیڈروں میں سے بیشتر اس اعلان کے باوجود کہ پاکستان ایک اسلامی ری پبلک ہے، پاکستان کو اسلامی مملکت ہرگز نہ بنانا چاہتے تھے۔ ان حالات میں ایسی تحقیق جو اقبال کو ان انگریز، ہندو یا مسلم ہستیوں میں سے ایک شمار کرے، جنہوں نے تقسیم ہند کی تجاویز پیش کی تھیں، مصلحت کے تحت نہایت مناسب تھی۔ ایم۔ اے۔ ایچ۔ اصفہانی نے جب یہ لکھا کہ یہ کہنا کہ اقبال مسلم ریاست کے تصور کے خالق تھے، تاریخ کو مسخ کرنا ہے، تو آخر ان کا ذہن کس بات کی غمازی کر رہا تھا؟ نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں اسلامی عصبیت کی بجائے علاقائی تعصب کو فروغ حاصل ہوا۔ سیاستدان ناکارہ ثابت ہوئے تو بیوروکریسی نے اقتدار سنبھالا اور بیوروکریسی کی نااہلی کے سبب فوج اقتدار میں آئی۔ انتخابات ہوئے تو غیر اسلامی نظریات کے حامل یا علاقائی تعصب کے بل بوتے پر اپنی سیاسی دکان چمکانے والے سیاستدانوں نے بالآخر ایک پاکستان کے دو ٹکڑے کر دیے۔ اقبال نے غلاموں کو اسلامی اتحاد کا سبق دے کر آزادی کا رستہ دکھایا تھا۔ وہ برصغیر میں اس اسلامی انقلاب کے داعی تھے، جو بالآخر پاکستان کے قیام پر منتج ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ قیام پاکستان جدید عالم اسلام میں احیائے اسلام کی بنا پر پہلا اسلامی انقلاب تھا، لیکن اس کی تکمیل نہ ہوسکی۔ پاکستان میں علاقائی تعصب کے فروغ کے نتیجے میں اقبال کو جو اس اسلامی انقلاب کے شاعر و مفکر تھے، محض ایک پنجابی شاعر قرار دے کر پنجاب کے پنجرے میں بند کر دیا گیا۔ اقبال کو شاید اپنے گناہ کی سزا کا علم تھا۔ اسی لیے وہ فرما گئے:

تیرا گناہ ہے اقبال مجلس آرائی

اگرچہ تو ہے مثال زمانہ کم پیوند!
جو کوکنار کے خوگر تھے ان غریبوں کو
تری نوا نے دیا ذوق جذبہ ہائے بلند!
تڑپ رہے ہیں فضا ہائے نیلگوں کے لیے
وہ پرشکستہ کہ صحن سرا میں تھے خورسند!
تری سزا ہے نوائے سحر سے محرومی
مقام شوق و سرور و نظر سے محرومی

اقبال کو یہ صلہ تو پاکستان کی طرف سے ملا جو اس کے قائم کردہ جدید اسلامی ریاست کے معیار پر پورا نہ اتر سکا، لیکن اقبال کو ہندوستان سے بھی نسبت تھی، کیونکہ بیسیویں صدی کے عالم اسلام کو ایک ہزار سال بعد تجدید دین کے ذریعے انقلاب کا پیغام دینے والے اس ''برہمن زادے'' یا ''کافر ہندی'' کا تعلق اسی سرزمین سے تھا، تو ہندوستان میں اسے ایک ایسا متعصب مسلم قوم پرست قرار دیا گیا، جس نے اپنے افکار کے ذریعے بھارت ماتا کے ٹکڑے کرنے کی ترغیب دی تھی۔ لہٰذا ہندوستان میں اس کا نام تک لینا جرم کے مترادف تصور کیا گیا۔

بہرحال ۱۹۷۷ء میں حالات نے پلٹا کھایا۔ ولادت اقبال کی صد سالہ تقریبات کے بعد ہندوستان میں اقبال شناسی کے سلسلے میں کاوش و تحقیق کا نیا دور شروع ہوا۔ اسی طرح پاکستان میں بھی تجدید دین یا احیائے اسلام کے نئے جذبہ کے تحت اقبال کو پنجاب کے پنجرے سے آزاد کر کے اسے اس کا صحیح مقام دلانے کی خاطر کوششیں جاری ہوئیں۔ اسی دوران میں ایران میں انقلاب آیا اور علی شریعتی اور دیگر اہل علم کی اقبال سے متعلق تحریروں کے سبب اسے تعظیماً ایران کے اسلامی انقلاب کے مفکروں کی صف میں کھڑا کر دیا گیا۔

باب: ۱۸

گول میز کانفرنسیں

لندن میں پہلی گول میز کانفرنس ۱۹؍جنوری ۱۹۳۱ء کو اختتام پذیر ہوئی۔ پہلی گول میز کانفرنس کے تحت کل آٹھ سب کمیٹیاں بنائی گئیں۔ لیکن اقلیتوں کے حقوق کے تحفظات کے بارے میں کوئی فیصلہ نہ ہوسکا۔ البتہ آئندہ طرز حکومت کے سلسلے میں طے ہوا کہ طرز حکومت وفاقی ہوگا جس میں برطانوی ہند کے صوبوں کے ساتھ دیسی ریاستیں بھی شریک ہوں گی اور یہ کہ صوبائی اور مرکزی حکومتوں کو دفاع و امور خارجہ کے علاوہ باقی تمام اختیارات دے دیے جائیں گے۔ پہلی گول میز کانفرنس کے سولہ مسلم مندوبین میں قابل ذکر مولانا محمد علی جوہر، سر آغا خان، محمد علی جناح، سر محمد شفیع یا مولوی فضل الحق ہی تھے۔ اقبال کو شرکت کی دعوت نہ دی گئی تھی۔

۱۹۳۱ء میں ارون کی جگہ ولنگڈن ہندوستان کا وائسرائے بن کر آیا۔ انہی ایام میں ہندو مسلم مفاہمت کے لیے آل انڈیا مسلم کانفرنس کا اجلاس دہلی میں طلب کیا گیا۔ اقبال ۳؍اپریل ۱۹۳۱ء کو آل انڈیا مسلم کانفرنس کے اجلاس میں شرکت کے لیے دہلی پہنچے۔ مولانا شوکت علی نے مسلم نیشنلسٹ پارٹی کے لیڈروں سے بات چیت کی تجویز پیش کی تاکہ باہمی اختلافات کے خاتمے کے لیے کوئی فارمولا تلاش کیا جائے۔ آل انڈیا مسلم کانفرنس اور مسلم نیشنلسٹ پارٹی کے لیڈروں میں چودہ نکات میں سے تیرہ پر تو قریب قریب اتفاق تھا۔ ان کے مابین اگر کوئی نزاعی مسئلہ تھا تو جداگانہ یا مخلوط انتخاب کا تھا۔ لیکن اس مسئلے سے قطع نظر بظاہر گفت وشنید حوصلہ افزا معلوم ہوئی۔ چنانچہ مولانا شوکت کی تحریک پر نواب صاحب بھوپال حمید اللہ خان نے آل انڈیا مسلم کانفرنس اور مسلم نیشنلسٹ پارٹی کے، قائدین کو بھوپال مدعو کیا۔ بھوپال روانہ ہونے سے بیشتر ۳؍مئی ۱۹۳۱ء کو جداگانہ انتخاب اور دیگر مسلم مطالبات کی حمایت میں مسلمانانِ لاہور کا ایک عظیم الشان جلسہ بیرون موچی دروازہ زیر صدارت اقبال منعقد ہوا۔ اقبال نے اپنی افتتاحی

تقریر میں واضح کیا کہ یہ جلسہ متعدد جلسوں کے سلسلے کی پہلی کڑی ہے جو اس نازک زمانے میں مسلمانوں کو بیدار کرنے کے بعد ان میں روح حیات پھونکنے کے لئے کیے جائیں گے۔ تاکہ وہ سیاسیات کے میدانِ عمل میں اپنے پاؤں پر کھڑے ہوسکیں۔ آپ نے فرمایا:

گاندھی جی نے مسلم کانفرنس دہلی کے متعلق کہا تھا کہ مسلمانوں کا مطالبہ متحدہ نہیں۔ لیکن وہ حق بجانب نہ تھے۔ میں اس صحبت میں موجود تھا اور میں نے کہا تھا کہ ہندوؤں کا ایک طبقہ جداگانہ انتخاب مانگتا ہے، دوسرا مخلوط انتخاب کا حامی ہے اور تیسرا سوشل ڈیموکریسی چاہتا ہے۔ جب ہندوؤں میں اس قدر اختلاف ہے تو مسلمانوں کے معمولی اختلاف پر ایک بہانہ بنا لینا اگر منافقت نہیں تو کیا ہی ...... پہلے معلوم کرنا چاہیے کہ قوم پرستی کا مفہوم کیا ہے۔ نیشنلزم کا جو تجربہ یورپ میں ہوا اس کا نتیجہ بے دینی اور لامذہبی کے سوا کچھ نہیں نکلا۔ وہی ہندوستان میں ہو رہا ہے۔ رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ حکم موجود ہے جس میں فرمایا گیا تھا کہ آج میں نسل، ذات پات اور برادری کے تمام امتیازات کو پاؤں کے نیچے کچلتا ہوں۔ تم سب مسلمان ہو اور یہی تمہارا صحیح نام ہے۔ ہندوستان میں جس قدر اقوام ہیں، سب چاہتی ہیں کہ ان کی خصوصیات باقی رہیں۔ اس لیے مسلمان بھی یہی چاہتے ہیں۔ مسلمان دوسروں پر حکومت نہیں چاہتے اور نہ یہ چاہتے ہیں کہ دوسرے ان پر حکمران ہوں اور وہ ان کے غلام بنے رہیں ...... میں مسلمان نوجوانوں سے کہتا ہوں کہ قومیت کا صحیح تخیل معلوم کریں ...... مسلم نوجوانوں سے کہتا ہوں کہ منظم ہو جائیں، اور یہ کوششیں اس لیے ہیں کہ آپ گونڈ یا بھیل نہ بن جائیں، ابھی آپ کو ایک شدید جنگ میں قربانیاں دینا ہیں اور وہ سرمایہ داری کی لعنت کے خلاف جنگ ہے۔ اس لیے آپ کو چاہیے کہ اس کے لیے بھی ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار رہیں۔ اگر کوئی یہ خیال کرتا ہے کہ کوئی دوسری قوم یا انگریز اس کی دستگیری کرے گا تو وہ بدبخت ہے۔ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جاؤ ورنہ تمہیں کوئی حق نہیں کہ زندہ رہو۔

اقبال ۱۰رمئی ۱۹۳۱ء کو مع غلام رسول مہر بھوپال پہنچے۔ انہوں نے نواب حمید اللہ خان سے ملاقات کے علاوہ آل انڈیا مسلم کانفرنس اور مسلم نیشنلسٹ پارٹی کے راہنماؤں کی گفت و شنید میں حصّہ لیا، تاہم کوئی کوشش بارآور ثابت نہ ہوئی۔ اس کوشش کے متعلق اقبال، مولانا شوکت علی، سر محمد شفیع اور شروانی کے دستخطوں سے ایک بیان ۱۲رمئی ۱۹۳۱ء کو شائع ہوا۔

پھر ۱۳رمئی ۱۹۳۱ء کو جب اقبال اور نواب محمد اسمٰعیل خان بھوپال سے واپسی پر دہلی سے گزرے تو ریلوے اسٹیشن پر اخبار اسٹیٹسمین کے نمائندے کو انہوں نے اسی سلسلے میں ایک

انٹرویو بھی دیا، مگر اقبال کے بیان مورّخہ ۱۵ مئی ۱۹۳۱ء سے واضح ہو گیا کہ مسلم نیشنلسٹ پارٹی کے رہنماؤں اور آل انڈیا مسلم کانفرنس کے قائدین میں اتفاق رائے نہ ہو سکا۔ اقبال نے اپنے بیان میں کہا:

اگر ڈاکٹر انصاری اور مسٹر شعیب نے بھوپال کانفرنس کے غیر مباحث کو بمنزلہ عارضی میثاق پیش کیا ہے تو انہوں نے یقیناً نہ صرف ان لوگوں کے ساتھ، جن کے ساتھ انہوں نے گفت وشنید کی بلکہ تمام مسلم قوم کے ساتھ برائی کی۔ میں اسے کامل طور پر واضح کرنا چاہتا ہوں کہ عارضی میثاق کی قسم کی کوئی چیز حاضرین جلسے کے خیال میں بھی نہیں آئی تھی۔ اس جلسے میں اس سے زیادہ کوئی کارروائی نہیں ہوئی کہ نام نہاد مسلم نیشنلسٹوں کو انتخابات کے متعلق آل انڈیا مسلم کانفرنس کے فیصلوں کے قریب تر لانے کے لیے بعض تجاویز پیش کی گئیں تاکہ لوگ پھر کامل مسلم قوم میں شامل ہونے کے قابل ہو سکیں، جس نے جداگانہ انتخاب کے بدستور بحال رکھنے کا ایسا فیصلہ صادر کیا ہے جس میں کسی قسم کے مغالطے کی گنجائش باقی نہیں رہتی ...... ایسی تجاویز کو گاندھی جی کے پاس بھاگے بھاگے لے جانے، جن پر کسی قسم کی بحث بھی نہیں ہوئی اور انہیں عارضی میثاق کے نام سے تعبیر کرنے سے شبہ پیدا ہوتا ہے کہ بھوپال کانفرنس کو پروپیگنڈے کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ اگر اس کی کوئی حقیقت ہے تو مجھے کامل یقین ہے کہ بھوپال یا شملہ میں دوسرا جلسہ کرنا نہ صرف مفید نہ ہوگا بلکہ لازمی طور پر مسلمانانِ ہند کے مفاد کے لیے ضرر رساں ہو گا۔

کانگرسی مسلم لیڈروں اور دیگر مسلم قائدین کے مابین جداگانہ یا مخلوط انتخاب کے مسئلے پر اختلاف ختم نہ کیا جا سکا اور ادھر ہندو مسلم سیاسی مفاہمت کی بھی کوئی صورت نہ نکلی۔ اسی دوران میں یعنی اپریل ۱۹۳۱ء سے ہندوستان کے متعدد مقامات بشمول بنارس، آگرہ، مرزا پور اور کانپور میں ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے۔ مظلومین کانپور کی مالی امداد کے لیے اقبال نے دیگر مسلم قائدین کے ہمراہ ۱۴ جولائی ۱۹۳۱ء کو اخبارات میں پنجاب، سرحد اور سندھ کے مسلمانوں سے کانپور مسلم ریلیف فنڈ میں چندہ دینے کی پُرزور اپیل کی۔ انہوں نے فرمایا:

بنارس، آگرہ اور مرزا پور کے بعد کانپور میں مسلمانوں کا قتل عام ہندوستان کے مسلمانوں کو چیلنج تھا کہ وہ ایک ایک کر کے اس ملک سے نابود کر دیے جائیں گے، اور کوئی ان کی امداد کرنے والا نہ ہو گا...... پوربیوں نے انگریزوں سے غدر میں وہ کچھ نہ کیا تھا جو اس شہر میں دوسرے ہندوؤں

نے مسلمانوں سے کیا ہے......بیکس مسلمانوں کو مارا ہی نہیں گیا بلکہ ان پر تیل ڈال کر ان کو جلایا بھی گیا، اور بعض جگہ تو سسکتے ہوئے زندہ آدمی جلا دیے گئے ......کئی گھروں اور مساجد میں اب تک خون کے چھینٹے ان دردناک حوادث کی یاد دلا رہے ہیں جن میں غریب مسلمانوں کو مار مار کر ان کے سر پھوڑ دیے گئے ......تیس مسجدیں کلّی طور پر یا جزوی طور پر توڑ دی گئیں......کئی جگہ قرآن مجید کی بھی بے حرمتی کی گئی۔

کانپور کے مسلم کش فساد نے اقبال پر گہرا اثر چھوڑا۔ وہ نہ صرف ہندو مسلم اتحاد کے متعلق ایک بار پھر مایوسی کا شکار ہوئے بلکہ سنجیدگی سے یہ بھی سوچنے لگے کہ اگر آئندہ گول میز کانفرنس میں حکومت برطانیہ نے ہندو اکثریت کو خوش کرنے کے لیے مسلمانوں کو نظر انداز کیا تو مسلمان سوویٹ یونین یا اشتراکیت کی طرف مائل ہونے میں حق بجانب ہوں گے۔ اسی ذہنی پس منظر کے ساتھ انہوں نے اپنے ایک خط محرّرہ ۳۰ر جولائی ۱۹۳۱ء بنام سر فرانسنس ینگ ہسبنڈ میں تحریر کیا:

برطانیہ نے اگلی گول میز کانفرنس میں فرقہ وارانہ اختلافات سے کوئی ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تو یہ دونوں ملکوں کے لیے تباہ کن ثابت ہوگی۔ اگر سیاسی اقتدار ہندو کے سپرد محض اس لیے کر دیا گیا کہ اسے حاکم بنانے سے برطانیہ کو کوئی مادی مفاد حاصل ہو سکتا ہے تو مسلمان سوراجی یا اینگلو سوراجی حکومت کے خلاف وہی حربے استعمال میں لانے پر مجبور ہو جائیں گے۔ جو گاندھی نے حکومت برطانیہ کے خلاف برتے تھے۔ اس کے علاوہ اس کا یہ نتیجہ بھی نکل سکتا ہے کہ پورا مسلم ایشیاء روسی کمیونزم سے ہم آغوش ہونے پر مجبور ہو جائے ...... بالشوزم میں اگر خدا کے تصور کا اضافہ کر دیا جائے تو وہ اسلام کے بہت حد تک مماثل ہو جاتا ہے، اس لیے مجھے اس بات پر حیرت نہ ہوگی اگر مستقبل میں اسلام روس پر حاوی ہو جائے یا روس اسلام پر چھا جائے۔ نتیجے کا انحصار، میرے خیال میں کافی حد تک اس پوزیشن پر ہوگا جو ہندی مسلمانوں کو نئے آئین کے تحت ملے گی۔

انہی ایام میں لاہور میں مغلپورہ انجینیئرنگ کالج کے انگریز پرنسپل کی اسلام دشمنی کے سبب مسلم طلبہ نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ اسی سلسلے میں ۳ جون ۱۹۳۱ء کو ایک جلسہ موچی دروازے کے بیرون باغ میں زیرِ صدارت اقبال منعقد ہوا۔ اقبال نے صدارتی خطبہ میں فرمایا:

چونکہ مسلمان منتشر ہیں اس لیے یہاں کی ہر قوم مسلمانوں سے عناد رکھتی ہے۔ یہ صورت حال قابل افسوس ہے۔ تم آج تک اپنی مصیبت کے علاج کے لیے ہزاروں تدبیریں کر چکے ہو اب ایک تدبیر محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی آزماؤ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: اتحاد امتی

حجۃ قاطعۃ۔ ایک دفعہ اتحاد کر کے دیکھو۔ اگرچہ اب تک کی تمام تدابیر ناکام ثابت ہو چکی ہیں، لیکن حضرت محمد مصطفیٰ کا بتلایا ہوا یہ نسخۂ شفا کبھی ناکام نہیں ہوگا۔

اس موقع پر ایک اور جلسہ ۳/ جولائی ۱۹۳۱ء کو زیر صدارت مولانا داؤد غزنوی باغ بیرون موچی دروازے میں منعقد ہوا۔ جلسے میں مولانا داؤد غزنوی نے ایک قرارداد پیش کی۔ اقبال نے قرارداد کی حمایت کرتے ہوئے کہا:

سب سے پہلے جلسے میں تقریر کرتے ہوئے میں نے عرض کیا تھا کہ مسلمانوں کا اتحاد حضورؐ کے مطابق برہانِ قاطع ہے۔ آپ نے اس امر میں خلوص نیت سے عمل کیا اور اس کا نتیجہ آپ نے دیکھ لیا۔ مسلمانوں کے سامنے عنقریب بہت بڑے امور پیش ہونے والے ہیں، جن کا تعلق آپ کی اجتماعی زندگی سے ہے۔ ان کا تقاضا ہے کہ اسی طرح سے ثابت قدم رہیں اور میری دعا ہے کہ خدا تعالیٰ آپ کو اسی طرح اتحاد نصیب کرے جس طرح قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کو نصیب ہوا تھا۔

بالآخر اقبال اور مولانا داؤد غزنوی کے مشورے سے احتجاجی جلسوں اور جلوسوں کا خاتمہ ہوا اور کمیشن کے سامنے پرنسپل کے رویّے کے خلاف شہادتیں قلمبند کرانے پر اصرار کیا گیا، مگر اسی دوران میں پرنسپل نے مسلم طلبہ سے معافی مانگ لی اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

انہی مہینوں میں ریاست جموں اور کشمیر میں حالات نے سنگین صورت اختیار کر لی اور تحریک کشمیر کی ابتداء ہوئی۔ ۱۹۳۱ء میں دو واقعات کے سبب کشمیری عوام غصّے میں آپے سے باہر ہو گئے۔ پہلا واقعہ تو یوں پیش آیا کہ مسلمان کسی جگہ نماز کے لیے اکٹھے ہوئے۔ امام خطبہ پڑھنا چاہتا تھا کہ ایک ہندو پولیس افسر نے اسے خطبہ پڑھنے سے روک دیا۔ کچھ مدت بعد دوسرا واقعہ یہ پیش آیا کہ جموں سنٹرل جیل میں کسی ہندو سپاہی نے قرآن مجید کو زمین پر پٹک دیا۔ اس پر احتجاج کرنے والے ہجوم کو منتشر کرنے کے لیے پولیس نے گولی چلا دی۔ جس سے اکیس مسلمان شہید ہو گئے۔ اس کے بعد کشمیر کے مختلف شہروں میں مظاہروں نے ہندو مسلم فسادات کی صورت اختیار کر لی۔ حالات مہاراجہ ہری سنگھ کے قابو سے باہر ہو گئے اور اس نے برطانوی فوج کی امداد طلب کر لی۔

کشمیری مسلمانوں کی تعلیمی حالت پہلے ہی سے نہایت پست تھی۔ چوہدری غلام عباس اور شیخ محمد عبداللہ جیسے امن پسند کشمیری راہنماؤں اور کئی دیگر کارکنان کو بھی حراست میں لے لیا گیا۔ ریاست میں مارشل لا نافذ تھا۔ جگہ جگہ ٹکٹکیاں نصب کی گئی تھیں، جن پر کشمیری مسلمانوں کو باندھ

کر کوڑے لگائے جاتے تھے۔

کشمیریوں کی بے بسی سے بالخصوص پنجاب کے مسلمان متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ مجلس احرار نے ہزاروں کی تعداد میں رضا کاروں کے جتھے بنا بنا کر ریاست میں بھیجنے شروع کر دیے اور انھوں نے کشمیر کی تمام جیلیں بھر دیں۔ مسلمانانِ کشمیر کی حمایت کی خاطر جولائی ۱۹۳۱ء کے آخری ہفتے میں آل انڈیا کشمیر کمیٹی قائم کی گئی۔ مرزا بشیر الدین محمود (امیر جماعت احمدیہ قادیان) صدر بنے اور اقبال کمیٹی کے ایک سرگرم رکن تھے۔ اقبال نے چند مسلم قائدین کی معیت میں یوم کشمیر منانے کے لیے لاہور سے یہ اپیل شائع کی:

> مسلمانو! پے در پے حملے کر کے تمھارے دشمن کو اب یہ گمان ہو گیا ہے کہ مسلمان ایک مردہ قوم ہے، اس گمان کو غلط ثابت کرنے کے لیے آپ کا یہ فرض ہے کہ یوم کشمیر کو کامیاب بنائیں اور دشمن پر عملاً ثابت کر دیں کہ آپ ظلم و تعدی کو برداشت کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہیں۔

۱۴/اگست ۱۹۳۱ء کو مسلمانان لاہور نے یوم کشمیر منانے کی خاطر ایک عظیم الشان جلوس نکالا۔ جلوس کے اختتام پر اقبال کی زیر صدارت ایک جلسہ عام منعقد ہوا۔ تلاوت قرآن کریم کے بعد، انھوں نے اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا:

> پہلے پنجاب اور ہندوستان کے مسلمان کشمیر کے حالات سے بہت کم دلچسپی لیتے تھے، بلکہ وہ لوگ جو کشمیر سے یہاں آئے وہ بھی اس کی تاریخ سے پوری طرح واقفیت نہیں رکھتے تھے۔ اب جو مظالم کشمیر میں برپا کیے گئے، انھوں نے اہل پنجاب کو بھی بیدار کر دیا ہے...... حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کی تحریک کا اثر اہل کشمیر پر بھی ہونا لازمی تھا۔ چنانچہ وہ بھی اپنے پڑوسیوں کی حالت سے متاثر ہو کر بیدار ہو گئے۔ زمانہ خود لوگوں کو بیدار کر رہا ہے۔ اور کشمیر میں عرصے سے جو مظالم برپا ہیں، ان کی موجودگی میں ضروری تھا کہ وہاں کی رعایا بھی اپنے جائز حقوق کا مطالبہ کرتی...... بادشاہی خریدنے سے نہیں چل سکتی۔ اس لیے ہر ملک کے حکام کے لیے ضروری ہے کہ رعایا کی رضا جوئی حاصل کریں۔

ایک ہندو اخبار کیسری کی افواہ پر کہ اقبال کشمیر کے وزیر اعظم بننا چاہتے ہیں، اقبال نے جلسہ عام پر واضح کیا کہ وہ ایسے حاکم کی وزارت پر لعنت بھیجتے ہیں۔ ہندوؤں کے انگریزی اخبار ٹریبیون میں بھی اسی قسم کی غلط بیانی سے کام لیا گیا۔ اس پر مدیر انقلاب نے اقبال سے استفسار کیا کہ یہ ممتاز لیڈر کون ہو سکتا ہے۔ انھوں نے فرمایا:

> میں نہیں کہہ سکتا کہ کس سے مراد ہے، لیکن چونکہ پہلے بھی ایک ہندو اخبار میرا نام لے چکا ہے اور

ممکن ہے کہ مسٹر راگھون کے اس فقرے سے بھی کسی کو غلط فہمی ہو۔ اس لیے میں اپنے متعلق نہایت زور سے اس افواہ کی تردید کرتا ہوں۔ میں نے یوم کشمیر کے جلسے میں صاف صاف کہہ دیا تھا کہ میں ایسی وزارت پر لعنت بھیجتا ہوں۔ میں نے تو اس وزارت سے بڑی بڑی چیزوں کے لیے کبھی کسی سے درخواست نہیں کی۔ علاوہ بریں میں آل انڈیا کشمیر کمیٹی کا ممبر ہوں، جو کشمیر کے نظام حکومت میں اصلاحات چاہتی ہے۔ میرے نزدیک اس کمیٹی کا ممبر ہونے کی حالت میں کوئی ایسی حرکت کرنا دیانت وامانت کے خلاف ہے۔

اقبال نے مظلومین کشمیر کی امداد کے لیے چندہ کی رقوم جمع کر کے ریاست میں بھجوائیں اور اپنے جاننے والے بعض ناموروکلا کو قانونی امداد کے سلسلے میں کشمیر بھیجا۔ اقبال کے لیے کشمیر میں داخلہ ممنوع تھا اور یہ پابندی اخیر عمر تک عائد رہی۔ اقبال ہی کی کوششوں سے گلانسی کمیشن کا تقرر ہوا، جس نے تحقیقات کے بعد اپنی رپورٹ میں کئی قسم کی اصلاحات کی سفارش کی۔

۱۹۳۱ء میں دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے وائسرائے نے اقبال کو بقول عظیم حسین، سر فضل حسین کے ایماء پر نامزد کیا تھا۔ انگلستان روانہ ہونے سے پیشتر اقبال نے ۲۶/اگست ۱۹۳۱ء کو ایک خط سردار بیگم کے نام تحریر کر کے میاں امیرالدین کے حوالے کیا۔ اقبال اس خط میں لکھتے ہیں:

والدۂ جاوید کو بعد سلام علیک کے واضح ہو کہ چونکہ میں گول میز کانفرنس کے سلسلے میں ولایت جانے والا ہوں اور زندگی کا کوئی اعتبار نہیں اس واسطے یہ تحریر لکھتا ہوں کہ صورت حال سے تم کو آگاہی رہے، اگرچہ پہلے بھی تم کو کل حالات معلوم ہیں۔

(۱) عرصہ دوتین سال کا ہوا جب میں درد گردہ کی وجہ سے بیمار ہو گیا تھا اور زندگی کی امید منقطع ہو گئی تھی، لیکن خدا تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے مجھے صحت عطا کی۔ اس بیماری کے بعد میرے خیالات میں بڑا تغیر ہوا اور چند روزہ زندگی کی حقیقت مجھ پر واضح ہو گئی۔ صحت یابی کے بعد میں نے مبلغ دس ہزار روپیہ جاوید کے نام ہبہ کر کے پنجاب نیشنل بنک لاہور میں اس کے نام جمع کرا دیا اور چند ماہ ہوئے اس ہبہ میں پانچ ہزار کا اور اضافہ کر دیا۔ یعنی پانچ ہزار روپیہ مزید ہبہ کر کے اس کے نام اسی بنک میں جمع کرا دیا۔ اس رقم کے علاوہ پانچ ہزار روپیہ میں نے منیرہ بیگم کے نام ہبہ کر کے پنجاب نیشنل بنک لاہور میں جمع کرا دیا۔ کل پندرہ ہزار روپیہ جاوید کے نام اور پانچ ہزار منیرہ بیگم کے نام بنک مذکورہ میں جمع ہے۔ جب تک میں زندہ ہوں میں ان کا گارڈین ہوں۔ میری زندگی کے بعد تم ان دونوں کی گارڈین ہوگی۔ بنک کی رسیدات تمہارے پاس ہیں۔

(۲) مندرجہ بالا رقوم کے علاوہ میں نے دس ہزار روپیہ تمہارے نام ہبہ کر دیا تھا۔ یہ روپیہ سنٹرل کوآپریٹو بنک لاہور میں میرے اور تمہارے نام سے جمع ہے۔ لیکن میرا نام محض اس لیے درج کیا گیا تھا کہ اگر تمہارے لیے کوئی جائداد خرید کرنے کی ضرورت پڑے تو بنک سے اس کے نکالنے میں آسانی ہو۔ حقیقت میں یہ روپیہ تمہارا ہے اور مجھے اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس دس ہزار کی رقم کے علاوہ مبلغ پندرہ سو روپیہ بھی اسی بنک میں میرے اور تمہارے نام سے جمع ہے۔ یہ روپیہ تمہارے بعض زیورات کی فروخت سے حاصل ہوا تھا۔ یہ بھی تمہاری ملکیت ہے اور مجھے اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میرا نام اس رقم کے سلسلے میں محض مذکورہ بالا سہولت کی غرض سے درج کیا گیا تھا۔

(۳) مبلغ آٹھ ہزار روپیہ خالصتاً میرے نام سنٹرل کوآپریٹو بنک لاہور میں جمع ہے اس روپیہ میں کچھ روپیہ میں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔

(۴) مبلغ دو ہزار روپیہ کے قریب منشی طاہر الدین کے پاس ہے کچھ اور روپیہ آنے والا ہے۔ جس کو وہی وصول کریں گے۔ اس روپے میں سے انکم ٹیکس ادا کرنا ہے اور بعض اور اخراجات جو میری عدم موجودگی میں لاحق ہوں۔ مثلاً کرایہ کوٹھی اور ملازمین کی تنخواہیں وغیرہ، اس کے علاوہ گھر کے اخراجات، گھر کے اخراجات کے لیے کچھ روپیہ تمہارے پاس بھی موجود ہے۔

(۵) جاوید نامہ میں نے چھپنے کے لیے دے دیا ہے۔ اور اس کے متعلق ضروری ہدایات منشی طاہر الدین اور چوہدری محمد حسین صاحب کو دے دی ہیں۔ چونکہ یہ کتاب جاوید کے نام پر لکھی گئی ہے اس واسطے وہی اس کا مالک ہے۔ اس کی تمام آمدنی، اخراجات اشاعت وطباعت نکال کر اسی کی ملکیت ہے۔

(۶) میں نے زبانی کہا تھا کہ تمہارا حق مہر میں نے پندرہ ہزار روپیہ باندھ دیا ہے۔ وقت نکاح کوئی رقم مقرر نہ کی گئی تھی، لیکن اب میں اپنی مرضی سے تمہارا حق مہر مبلغ پندرہ ہزار مقرر کرتا ہوں۔ اور اس تحریر میں یہ بھی لکھ دیتا ہوں کہ تمہارا اطمینان ہو جائے۔ شرعاً یہ روپیہ مجھ پر قرض ہے اور تم اس رقم کو میری ہر قسم کی جائداد منقولہ یا غیر منقولہ سے وصول کر سکتی ہو۔ شرع شریف کی رو سے تم کو میری ہر قسم کی جائداد پر قابض ومتصرف رہنے کا حق ہے جب تک مذکورہ بالا رقم تم کو وصول نہ ہو جائے۔

(۷) باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ میں تم سے یہ توقع رکھتا ہوں کہ میری عدم موجودگی میں تم بچوں کی تربیت سے غافل نہ رہو گی۔ اور بحیثیت ان کی ماں ہونے کے جو فرائض

تم پر عائد ہوتے ہیں، ان کو ادا کرو گی۔ محمد اقبال بیرسٹر لاہور ۲۶ اگست ۱۹۳۱ئ۔

یہ خط سردار بیگم کو اقبال کی ناگہانی موت کے موقع پر دیا جانا تھا، لیکن چونکہ ایسی صورت پیدا نہ ہوئی، یہ خط میاں امیر الدین کے پرانے ریکارڈ میں پڑا رہا اور کسی کا خیال اس کی طرف نہ گیا۔ اقبال کا ارادہ تھا کہ سفر یورپ کے لیے یکم ستمبر ۱۹۳۱ء کو لاہور سے روانہ ہو کر ۵ ستمبر ۱۹۳۱ء کو بمبئی پہنچیں گے۔ لیکن لاہور سے چلنے سے چند گھنٹے قبل اقبال کو بخار ہو گیا اس لیے ۵ ستمبر ۱۹۳۱ء کو روانگی ملتوی کرنا پڑی۔ آخر کار وہ ۸ ستمبر ۱۹۳۱ء کو لاہور سے روانہ ہوئے۔ علی بخش بمبئی تک ان کے ساتھ رہا۔

لاہور ریلوے اسٹیشن پر انہیں رخصت کرنے کے لیے احباب جمع تھے۔ اقبال نے کچھ دیر سر عبداللہ ہارون سے جو انہیں اتفاقاً مل گئے، سیاسی مسائل پر بات چیت کی۔ پھر عبدالمجید سالک کی فرمایش پر انقلاب کے لیے یہ پیغام دیا:

کوئی ایسا دستور اساسی جو مسلمانوں کے لیے اجتماعی حیثیت سے موت کا پیغام ہو، ہرگز ہرگز قبول نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوستان کی آزادی ہندوستان کی قوموں کے ہاتھ میں ہے۔...... آخر میں میں اپنے ہندو بھائیوں اور خصوصاً ہندو اخبار نویسوں سے صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ؎

سخن درشت مگو در طریق یاری کوش
کہ صحبت من و تو درجہاں خدا ساز است

۹ ستمبر ۱۹۳۱ء کو صبح ساڑھے سات بجے وہ دہلی پہنچے۔ اسٹیشن پر تقریباً تین ہزار افراد جمع تھے۔ بعض تو صبح چھ بجے سے منتظر کھڑے تھے۔ مولانا سید احمد، امام جامع مسجد دہلی، مولانا مظہر الدین مدیر سہ روزہ الامان، حاجی محمد یوسف، سیکرٹری خلافت کمیٹی، نواب ابوالحسن خان اور سیّد نذیر نیازی کے علاوہ صوبہ مسلم کانفرنس دہلی، سنٹرل مسلم یوتھ لیگ، انجمن رفیق المسلمین، انجمن اتحاد و ترقی و انجمن تیموریہ کے ارکان اور محمد علی اسکول کے طلبہ و اساتذہ موجود تھے۔ اقبال کو متعدد سپاس نامے پیش کیے گئے، لیکن وقت کی قلت کے سبب انہوں نے تمام سپاسناموں کو سننے سے معذوری کا اظہار کیا۔ فرمایا کہ دوران سفر خود پڑھ لیں گے۔

صرف مولانا سید احمد امام جامع مسجد دہلی نے صوبہ مسلم کانفرنس کی طرف سے سپاسنامہ پڑھ کر سنایا جس پر اراکین کانفرنس کے دستخط تھے۔ سپاسنامے کے جواب میں اقبال نے تقریر کرتے ہوئے کہا:

جہاں تک سیاسی مسائل کا تعلق ہے میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ نہ میرے ساتھ کوئی پرائیویٹ سیکرٹری ہے، جو میرے لیے ضروری مواد فراہم کرے۔ نہ میرے پاس سیاسی لٹریچر کا کوئی پلندہ ہے جس پر میں اپنی بحثوں کی اساس قائم کروں، بلکہ میرے پاس حق وصداقت کی ایک جامع کتاب (قرآن مجید) ہے جس کی روشنی میں مَیں مسلمانانِ ہند کے حقوق کی ترجمانی کرنے کی کوشش کروں گا۔ گذشتہ دس سال سے ہم اپنے اقتصادی و سیاسی فوائد کو پس پشت ڈال کر کانگرس اور ہندوؤں کے ساتھ اتحاد کی کوشش کرتے رہے، لیکن اس میں ہم کو برابر ناکامی کا مُنہ دیکھنا پڑا۔ لہٰذا اب اگر لندن میں بھی فرقہ وار اتحاد کی کوئی قابل اطمینان صورت نہ نکلی اور مکمل پراونشنل اٹانومی نہ دی گئی اور مرکزی حکومت میں ان کا کافی خیال نہ کیا گیا تو مسلمانانِ ہند کو اجتماعی زندگی پر انفرادی زندگی قربان کرنا پڑے گی۔ (نعرہ اللہ اکبر) اور مجھے یقین ہے کہ اگر بنگال اور پنجاب کی اکثریت اور مسلمانوں کے دیگر مطالبات کو تسلیم نہ کیا گیا تو جو دستور اساسی بھی ہندوستان کو دیا جائے گا، مسلمانان ہند اس کے پرخچے اڑا دیں گے۔ (نعرہ اللہ اکبر) سن رسیدہ نسل نے نوجوانوں کو اپنی جانشینی کے لیے تیار کرنے کا کام جیسا چاہیے تھا ہرگز نہیں کیا، لہٰذا میں نوجوانوں کو مشورہ دیتا ہوں کہ وہ قرآن پاک کی تعلیمات اور اسوۂ حسنہ کو پیش نظر رکھیں اور اگر ان کو زندہ رہنا ہے تو وہ ان قربانیوں کے لیے تیار رہیں جو ہمیشہ سے زیادہ ان کو آئندہ دینی ہوں گی (نعرہ اللہ اکبر)۔

اقبال ۱۰ ستمبر ۱۹۳۱ء کو بمبئی پہنچے اور خلافت ہاؤس میں قیام کیا۔ اسی روز سہ پہر کے وقت عطیہ فیضی نے ان کے اعزاز میں ایوان رفعت کے وسیع لان میں چائے پارٹی کا اہتمام کیا، جس میں بمبئی کے اہل علم وفن بھی مدعو تھے۔ اقبال نے یہاں چھوٹی سی تقریر کی اور پھر اپنا یہ شعر پڑھ کر بیٹھ گئے:

چناں بزی کہ اگر مرگ ماست مرگ دوام
خدا ز کردۂ خود شرمسار تر گردد!

لوگوں نے اصرار پر انھوں نے وہیں شعر کا انگریزی ترجمہ تحریر کروا دیا۔

اس کے بعد مہمانوں کو کوٹھی کے ایوان میں لے جایا گیا، جہاں رقص وسرود کی محفل آراستہ کی گئی تھی۔ اقبال نے کاغذ کا ایک پرزہ منگوایا اور اس پر یہ اشعار لکھ کر عطیہ فیضی کے ہاتھ میں تھما دیے:

ترسم کہ تومی رانی زورق بسر آب اندر

زادی بہ حجاب اندر میری بہ حجاب اندر
بر کِشت و خیاباں پیچ بر کوہ و بیاباں پیچ
برقے کہ بخود پیچد میرد بہ سحاب اندر
ایں صورت دل آ دیزے از زخمۂ مطرب نیست
مہجور جناں حورے نالد بہ رباب اندر

چند لمحوں بعد ایک اور کاغذ کے پرزے پر یہ مزاحیہ مصرع اور عبارت تحریر کر کے عطیہ فیضی کو پیش کی:

عالم جوش جنوں میں ہے روا کیا کیا کچھ
کہیے کیا حکم ہے؟ دیوانہ بنوں یا نہ بنوں
محمد اقبال بمبئی ۱۰ ستمبر ۱۹۳۱ء

ایوان رفعت پہنچنے سے بیشتر وہ سردار صلاح الدین سلجوقی قونصل افغانستان مقیم بمبئی کے ہاں کھانے پر گئے تھے روانگی سے چند گھنٹے قبل ''بمبئی کرانکل'' کے نمائندہ خصوصی نے ان کا انٹرویو لیا۔

اس انٹرویو میں اقبال نے واضح کیا کہ وہ کسی فرقے یا قوم کے متعلق تعصب نہیں رکھتے بلکہ صرف یہی چاہتے ہیں کہ ہندوستانی پر امن رہیں اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہر فرقے کو اپنی تہذیب اور انفرادیت برقرار رکھنے کا موقع دیا جائے۔ انہیں سوال کیا گیا کہ پان اسلامزم کے متعلق ان کا تصور کیا ہے، جواب دیا کہ یہ اصطلاح ایک فرانسیسی صحافی کی اختراع ہے۔ یہ اصطلاح اسی طرح وضع کی گئی جیسے چینیوں یا جاپانیوں کے لیے خوف یا نفرت پیدا کرنے کی خاطر اصطلاح ''زرد خطرہ'' بنائی گئی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ اسلامی ممالک میں یورپی جارجیت کو جائز قرار دیا جا سکے۔ بہرحال اس اصطلاح کے استعمال کا ایک اور طریقہ بھی ہے۔ جو قرآنی تعلیمات سے مطابقت رکھتا ہے۔ اس اعتبار سے پان اسلامزم کا کوئی سیاسی مقصد نہیں، بلکہ اتحاد انسانی کے لیے ایک معاشرتی تجربہ ہے۔ سوال کیا گیا سر فرانسس ینگ ہسبنڈ کے نام ایک خط میں انہوں نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ بالشوزم میں اگر خدا کے تصور کا اضافہ کر دیا جائے تو وہ اسلام ہوگا، کیا وہ اب بھی اس نظریے کے حامی ہیں۔ جواب دیا کہ اسلام ایک سوشلسٹ مذہب ہے۔ قرآن مجید انفرادی ملکیت اور مکمل اشتراکیت کے بین بین نظام قائم کرنے کی تعلیم دیتا

ہے۔سوال کیا گیا کہ کیا وہ شاہی نظام کے حق میں ہیں۔ جواب دیا کہ وہ شاہی نظام قائم رکھنے کے حق میں نہیں ہیں، مگر جمہوریت کے بھی دل سے قائل نہیں۔ وہ جمہوریت کو محض اس لیے برداشت کرتے ہیں کہ اس کا کوئی نعم البدل نہیں ہے۔سوال کیا گیا کہ ان کے خیال میں سیاست دان بننے کی بجائے اگر وہ شاعر ہی رہتے تو ملک کے لیے زیادہ فائدہ مند نہ ہوتے۔ جواب دیا کہ وہ

اب بھی ادبیات میں خاصی دلچسپی لیتے ہیں اور ان کا بیشتر وقت اسی میں صرف ہوتا ہے۔سوال کیا گیا کہ وہ ہر کسی سے کہیں زیادہ ایسی کانفرنسوں اور جمعیت اقوام جیسے اداروں کا پول کھولنے میں اپنی آواز بلند کرتے رہے ہیں، لیکن اس کے باوجود گول میز کانفرنس کے نتائج سے اپنی توقعات وابستہ کیے ہوئے ہیں۔ اس تضاد کی کیا وضاحت کی جا سکتی ہے۔ اقبال نے جواب دینے کی بجائے اپنی آنکھیں جھپکیں اور اپنے مستقل ساتھی حُقّے کی طرف رجوع کیا۔سوال کیا گیا کہ وہ نیشنلزم کے مخالف کیوں ہیں۔ جواب دیا گیا کہ وہ اسے اسلام کے ارفع اصولوں کے خلاف سمجھتے ہیں، کیونکہ اسلام نے دنیا میں پہلی بار نسل انسانی کو اتحاد اور روحانی ہم آہنگی کا سبق دیا تھا۔سوال کیا گیا کہ عرب ممالک کے وفاق کے وجود میں آنے کے کیا امکانات ہیں۔ جواب دیا کہ وہ عرب ریاستوں کے وفاق پر یقین رکھتے ہیں۔ تاہم ان کے خیال میں ہندی مسلمان نے مستقبل میں اسلام کی سربلندی کے لیے ایک نہایت اہم کردار ادا کرنا ہے۔ پس اسلام کے احیاء کا انحصار زیادہ تر نئی نسل پر ہے، جس نے اسلام کے بنیادی اصولوں پر قائم رہ کر زیادہ سے زیادہ تعلیم حاصل کی ہے۔ ایک سوال کے جواب میں فرمایا کہ وہ انگلستان سے واپسی پر مصر جائیں گے اور جتنے مسلم ممالک کی سیاحت ممکن ہوسکی کریں گے تاکہ ان کے حالات کا مطالعہ کر کے ایک کتاب بعنوان ''جدید دنیائے اسلام'' تحریر کی جاسکے۔

۲۱ ستمبر ۱۹۳۱ء کو اقبال نے حکیم طاہر الدین موجد دلروز کے نام ''ملوجا'' جہاز سے ایک خط تحریر کیا جس میں سفر کے تمام حالات بڑی وضاحت سے بیان کیے۔ فرمایا:

> بمبئی پہنچتے ہی سردار صلاح الدین سلجوتی قونصل افغانستان مقیم بمبئی نے دعوت دی۔ اِن کے ہاں پُر لطف محفل رہی۔ سردار موصوف فارسی اور عربی ادبیات پر پورا عبور رکھتے ہیں۔ عربی کی جدید شاعری سے بھی باخبر۔...... اسی شام عطیہ بیگم صاحبہ کے ہاں سماع کی صحبت رہی، جہاں اہل ہوس بار نہیں پا سکتے:

بر سماع راست ہر تن چیر نیست
طعمۂ ہر مرغکی انجیر نیست!

۱۲ ستمبر کو ایک بجے کے قریب بمبئی سے روانہ ہوئے،"ملوجا" جہاز کی وسعت کا حال علی بخش سے سنیے۔
۱۶ ستمبر کی شام کو عدن پہنچے۔عدن یہ اسی سرزمین کا ٹکڑا ہے جس کی نسبت حالی مرحوم فرما گئے ہیں۔

عرب کچھ نہ تھا اک جزیرہ نما تھا

...... جہاز ساڑھے گیارہ بجے رات روانہ ہوا۔ ۲۰ ستمبر کو تقریباً ۳ بجے شب پورٹ سعید مقام ہوا۔ یہ جگہ بھی بے انتہا ترقی کر گئی ہے۔ میں تو سو چکا تھا، مگر ایک مصری ڈاکٹر سلیمان نے آ جگایا۔ میں اُٹھا اور ان سے ملاقات کی۔اتنے میں اور مصری نوجوان جو وہاں کے شبان المسلمین کے ممبر تھے۔ملاقات کو آئے ان نوجوانوں سے مل کر طبیعت بہت خوش ہوئی۔......آپ یہ سن کر تعجب کریں گے کہ مصر کے مسلمان عام طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمانان ہند ہندوستان کی آزادی کی راہ میں روڑا اٹکا رہے ہیں۔ یہ پراپیگنڈا دیگر ممالک میں بھی کیا گیا ہے۔پورٹ سعید پر تقریباً ہر مسلمان نوجوان نے مجھ سے سوال کیا لیکن یہ معلوم ہوتا ہے کہ اب ان کی آنکھوں سے رفتہ رفتہ حجاب اٹھ رہا ہے میں نے ان کو ایک طویل لکچر دیا اور بتایا کہ ہندوستان کا پولٹیکل پرابلم کس طرح مسلمانان ہند پر موثر ہوتا ہے۔......بمبئی سے لے کر اس وقت تک جہاز"ملوجا" بحر روم کی موجوں کو چیرتا ہوا چل رہا ہے۔سمندر بالکل خاموش ہے۔طوفان کا نام ونشان تک نہیں ہے۔موسم بھی نہایت خوشگوار رہا۔البتہ بحر احمر میں گرمی تھی۔ یہ سمندر عصائے کلیم کا ضرب خوردہ ہے۔گرم مزاج کیوں نہ ہو۔ ...... جہاز کی روزمرہ کی زندگی کی داستان نہایت مختصر ہے۔ میں اپنی قدیم عادت کے مطابق آفتاب نکلنے سے پہلے ہی تلاوت سے فارغ ہو جاتا ہوں۔اس کے بعد دیگر حوائج سے فراغت پاتے پاتے بریک فاسٹ کا وقت آ جاتا ہے۔ بریک فاسٹ کے بعد عرشۂ جہاز پر ہم سفروں سے گفتگو یا گول میز کانفرنس پر جس کی خبریں لاسلکی کے ذریعے سے ہر روز جہاز پر پہنچ جاتی ہیں۔ بحث ومباحثہ یا گزشتہ سال کی رپورٹوں کا مطالعہ۔ ہاں کبھی شعر وشاعری بھی ہو جاتی ہے۔سید علی امام کو عربی، فارسی اور اردو کے بے شمار اشعار یاد ہیں اور پڑھتے بھی خوب ہیں الولد سرٌ لابیہ۔ ان کے والد ماجد مولانا نواب امداد امام ادبیات اردو میں ایک خاص پایہ رکھتے تھے۔ جہاز پر میں نے گوشت کھانا بالکل ترک کر دیا ہے۔وطن میں بھی کم کھاتا تھا۔مگر یہاں تو صرف سبزی، ترکاری، مچھلی اور انڈے پر گزران ہے۔......گول میز کانفرنس کے ہندو اور مسلمان نمائندے شاید سات، آٹھ ہیں۔ راجہ نرندر ناتھ صاحب بھی اسی

جہاز پر ہیں، چار مسلمان نمائندے ہیں اور چاروں ''مغرب زدہ''۔ مغرب زدہ مسلمان کی اصطلاح جو شاید معارف نے وضع کی تھی، نہایت پُرلطف ہے۔ لیکن مسلمانوں کے اس مغرب زدہ قافلے کی کیفیت یہ ہے کہ اس میں دو حافظ قرآن ہیں، یعنی نواب صاحب چھتاری اور خان بہادر حافظ ہدایت حسین، مقدم الذکر ہر روز ورد کرتے ہیں اور سنا ہے کہ ہر سال تراویح بھی پڑھاتے ہیں۔ سید علی امام صاحب کی مغرب زدگی کی کیفیت یہ ہے کہ ایک روز صبح کے وقت عرشہ جہاز پر کھڑے تھے۔ میں بھی ان کے ہمراہ تھا۔ میل و فرسنگ کا حساب کر کے کہنے لگے: دیکھو بھائی اقبال اس وقت ہمارا جہاز ساحل مدینہ کے سامنے سے گزر رہا ہے۔ یہ فقرہ ابھی پورے طور پر ان کے منہ سے نکلا بھی نہ تھا کہ آنسوؤں نے الفاظ پر سبقت کی۔ ان کی آنکھ نمناک ہوگئی اور بے اختیار ہو کر بولے: **بلغ سلامی روضة فیھا النبی المحترم**۔ ان کے قلب کی اس کیفیت نے مجھے بے انتہا متاثر کیا۔ باقی رہا میں مغرب زدہ بھی ہوں اور مشرق زدہ بھی۔ البتہ مشرقی ضرب میرے لیے زیادہ کاری ثابت ہوئی۔ باقی ہم سفروں میں مسٹر جسٹس سہروردی، شیخ مشیر حسین قدوائی اور اودھ کے دو نوجوان تعلق دار ہیں۔ قدوائی صاحب نہایت پُرجوش پان اسلامسٹ ہیں۔ تبلیغی فرائض سے کبھی غافل نہیں رہتے اور اودھ کے دو تعلق داروں میں ایک عربی خوب بولتے ہیں۔ دوسرے سمجھ لیتے ہیں مگر بول نہیں سکتے ان دونوں نوجوانوں کے والد مدتوں کربلائے معلّی میں مقیم رہے۔ یہی وجہ ہے کہ عربی بول اور سمجھ سکتے ہیں۔ یہ ہے اس مغرب زدہ قافلے کی مختصر کیفیت۔

پورٹ سعید میں چند گھنٹے قیام کے دوران میں حکیم محمد صدیق ناڑو نے رائٹر کے نمائندے کی حیثیت سے اقبال سے ملاقات کی۔ انہوں نے مصری نوجوانوں کی موجودگی میں فرمایا:

ہندوؤں کو فکر لگی رہتی ہے کہ مسلمان افغان، بلوچ اور سرحد کے مسلمانوں کی مدد سے ہندوستان پر قبضہ کر لیں گے، لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ اگر مصر آزاد ہو جائے، تو مصری اپنا ملک ترکوں کو اس وجہ سے حوالے کر دیں گے کہ ترک مسلمان ہیں؟ نیز کانگرس کا عدم تشدد محض انگریزی سنگینوں کے سامنے ہے۔ ورنہ مرزا پور، کانپور اور سری نگر وغیرہ کے حالات سے ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے مقابلے کے لیے تشدد ہے۔

بعد میں انہوں نے بیان بھی دیا جس میں ارشاد کیا:

مصری لوگوں کو شبہ ہے کہ ہندی مسلمان آزادی کے راستے میں کانٹا ہیں۔ اس میں ذرا صداقت نہیں۔ اگر مصری اصحاب کے دلوں میں یہ خیال بیٹھ گیا ہے تو اس لیے کہ ان اصحاب

نے ہندوستان کی سیاست سمجھنے کی تکلیف گوارا نہیں فرمائی۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ مصری اخبارات کے مندوبین ہندوستان آ کر مطالعہ کریں۔ ہندوستان میں مصری مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ مصری مسلمانوں نے قرآن، اللہ اور اسلام کو خیر باد کہہ دیا۔ حالانکہ یہ ایک شرارت ہے۔

اقبال ۲۷ ستمبر ۱۹۳۱ء کو لندن پہنچ گئے۔ اور راقم کے نام تار بھیجا۔ میں بخیریت لندن پہنچ گیا ہوں۔ جاوید نامہ چھپوانے میں عجلت سے کام لیا جائے۔ لندن میں ان کا قیام ۱۱۳۔ اے سینٹ جیمز کورٹ بکنگھم گیٹ ایس ڈبلیو نمبر ا میں تھا۔ یکم اکتوبر ۱۹۳۱ء کو غلام رسول مہر بھی ان سے آ ملے۔ گول میز کانفرنس کے اجلاس سینٹ جیمز پیلس میں ہوتے تھے۔ جو قریب ہی تھا۔ اقبال تقریباً تیئس سال بعد یورپ آئے تھے۔ اور اس دوران میں مغربی دنیا میں خاصا تغیر آ چکا تھا۔ یورپ میں بالخصوص اٹلی اور جرمنی نئی قوتوں کی صورت میں ابھر رہے تھے۔ چین میں انقلاب کے آثار پیدا ہو چکے تھے اور جمعیت اقوام ایک قطعی غیر مؤثر ادارہ بن کر رہ گئی تھی۔

اقبال کی دوربین نگاہ سے معاصر عالمی حالات کے مضمرات پوشیدہ نہ تھے۔ وہ محسوس کر رہے تھے کہ نظام عالم کسی نئی تشکیل کا محتاج ہے، مگر اس جدید تشکیل میں اسلام نے کیا کردار ادا کرنا ہے؟ یہ سوال ان کے ذہن میں بار بار ابھرتا تھا۔ اور غالباً اسی سوال کے جواب کی خاطر انہوں نے چند سال بعد اپنے ایک خط محرّرہ ۱۵ جنوری ۱۹۳۴ء بنام سید سلیمان ندوی میں تحریر کیا:

> دنیا اس وقت عجیب کشمکش میں ہے جمہوریت فنا ہو رہی ہے اور اس کی جگہ ڈکٹیٹرشپ قائم ہو رہی ہے۔ جرمنی میں مادی قوت کی پرستش کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ سرمایہ داری کے خلاف پھر ایک جہاد عظیم ہو رہا ہے۔ تہذیب و تمدن (بالخصوص یورپ میں) بھی حالت نزع میں ہے۔ غرض کہ نظام عالم ایک نئی تشکیل کا محتاج ہے۔ ان حالات میں آپ کے خیال میں اسلام اس جدید تشکیل کا کہاں تک ممد ہو سکتا ہے۔

تیئس سال بعد یورپ کے سفر نے کئی پرانی یادیں بھی تازہ کر دی تھیں۔ ۱۹۰۸ء میں جب اقبال واپس لاہور آئے تو شدید ذہنی کشمکش میں مبتلا تھے۔ پہلی بیوی سے کشیدگی کی ناگوار صورتِ حالات، والد اور بھائی کی مفاہمت کے لیے کوششوں کے باوجود، بدستور قائم تھی۔ مالی مشکلات یا فراہمی روزگار کا مسئلہ بھی تھا۔ سو ازدواجی بے سکونی اور مالی مشکلات کے سبب

اضطراب کی اس کیفیت میں ہندوستان میں تو عطیہ فیضی جیسی حاضر دماغ خاتون نے اپنی ہمدردانہ توجہ کے ذریعے انہیں جذباتی سہارا فراہم کیا لیکن اس دور میں ان کی خط وکتابت جرمنی میں ایما ویگے ناست سے بھی جاری تھی۔

۱۹۳۱ء میں لندن پہنچنے پر اقبال نے اپنے کسی پرانے جرمن دوست سے ایما ویگے ناست کا پتا معلوم کیا اور انہیں اپنے ایک خط مورّخہ ۱۵ اکتوبر ۱۹۳۱ء میں تحریر کیا:

براہ کرم مجھے خط لکھیے اور ان سارے برسوں کے دوران میں اپنی مصروفیات اور حالات سے مطلع کیجیے۔ مجھے آپ کا جواب پا کر مسرت ہوگی فی الحال ہمیں کافی عرصہ لندن میں رکنا پڑے گا...... مجھے اطلاع دیجیے کہ کیا ابھی کچھ دیر آپ ہائیڈل برگ ہی میں قیام رکھیں گی۔

ایما ویگے ناست کا جواب آنے پر انہیں اپنے خط مورخہ ۲۰ اکتوبر ۱۹۳۱ء میں تحریر کیا:

مجھے یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی کہ کئی مصائب کا سامنا کرنے کے باوجود آپ اپنی زندگی خندہ پیشانی سے بسر کر رہی ہیں۔ میں ہائیڈل برگ میں ان ایام کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا جب آپ نے مجھے گوئٹے کا فاؤسٹ پڑھایا تھا۔ اور ہر طرح سے میری امداد کی تھی۔ وہ واقعی بڑے خوشگوار دن تھے۔ آپ کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اپنے وقت پر اختیار حاصل نہیں۔ اس لیے میں پوری کوشش کروں گا کہ ہائیڈل برگ پہنچوں اور آپ کو ایک بار پھر اسی جگہ ملوں۔ ...... میرے لیے یہ بتا دینا ضروری نہیں کہ میرے دل میں آپ سے ملنے اور ان بیتے ہوئے خوشگوار ایّام کی یاد کو تازہ کرنے کی کس قدر تمنا ہے، جو افسوس ہے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گزر گئے۔

لیکن اقبال اپنے پروگرام میں تبدیلی کے سبب ہائیڈل برگ نہ جا سکے۔ چنانچہ انہوں نے ایما ویگے ناست کو اپنے خط محرّرہ ۱۹ر نومبر ۱۹۳۱ء میں اطلاع دی:

میں ہائیڈل برگ میں آپ سے ملنے کے لیے چشم براہ تھا، لیکن نہایت افسوس سے بتانا چاہتا ہوں کہ میرے پروگرام میں اچانک ردّ و بدل کی مجبوری کے سبب اب میرے لیے جرمنی میں سے گزر کر جانا ممکن نہ ہو سکے گا۔ ...... بہر حال امکان ہے کہ میں اگلے سال پھر یورپ آؤں گا۔ اگر ایسا ہو سکا تو میں ہائیڈل برگ میں ضرور آپ سے ملنے کے لیے آؤں گا۔

اقبال لندن میں دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے گئے تھے، لیکن وہاں پہنچتے ہی مرجع علم و ادب بھی بن گئے۔ سو انگلستان میں ان کے مشاغل کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یعنی دوسری گول میز کانفرنس کے سلسلے میں ان کی مصروفیات اور علم و ادب کی محفلوں یا ان کے اعزاز میں دی گئی دعوتوں میں ان کی شمولیت۔

جہاں تک دوسری گول میز کانفرنس کے نتائج کا تعلق ہے، اس سلسلے میں اقبال کا خط محرّرہ ۳؍نومبر ۱۹۳۱ء بنام عبداللہ چغتائی قابل توجہ ہے، فرماتے ہیں:

یہ دن بہت مصروفیت کے گزرے۔ مینارٹی کمیٹی کی میٹنگ تین دفعہ ہوئی اور تینوں دفعہ پرائیویٹ گفتگوئے مصالحت کے لیے ملتوی ہوگئی۔ پرائیویٹ گفتگو بہت ہوئی مگر اب تک کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ ہندو اور سکھ مسلمانوں کے مطالبات کی مخالفت پر اڑے ہوئے ہیں۔ اب مینارٹی کمیٹی کی میٹنگ جس کا میں ممبر ہوں۔ شاید ۱۱ نومبر کو ہو اس میں بھی کچھ نہ ہو سکے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ مینارٹی کمیٹی کا کام محض مصالحت کی کوشش ہے۔ یہ کوشش کی گئی، جس کا نتیجہ اس وقت تک کچھ نہیں ہوا۔

۱۶ نومبر ۱۹۳۱ء کو فیڈرل اسٹرکچر کمیٹی کے اجلاس کے متعلق اقبال کا موقف تھا کہ مسلم وفد آئندہ دستور کے متعلق بحث سے قطعی لاتعلق رہے، بلکہ اجلاس سے علیحدگی کا اعلان کر دے۔ مسلم وفد میں کسی نے بھی اقبال کا ساتھ نہ دیا۔ اس لیے وہ بہت دل برداشتہ ہوئے اور ۱۶؍نومبر ۱۹۳۱ء کو مسلم وفد کے رسمی سربراہ آغا خان کو ایک خط کے ذریعے مطلع کر دیا کہ وہ وفد سے علیحدہ ہو گئے ہیں۔ چند دنوں بعد انہوں نے سیکرٹری آف اسٹیٹ کو بھی اطلاع دی کہ ان کا لندن میں ٹھہرنا بے کار ہے اور وہ ۲۱ نومبر ۱۹۳۱ء کو چلے جائیں گے۔

دوسری گول میز کانفرنس کے ریکارڈ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال نے مباحث میں کوئی عملی حصہ نہ لیا بلکہ اقلیتی سب کمیٹی کے اجلاسوں میں خاموش بیٹھے رہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ خاموش نہ بیٹھتے تو کیا کرتے، کیونکہ اقلیتی سب کمیٹی کے اجلاس تو ہر دفعہ ملتوی ہوتے رہے، یہاں تک کہ انہیں اپنی لکھی ہوئی تقریر بھی پڑھنے کا موقع نہ ملا۔ بحیثیت مجموعی اقبال دوسری گول میز کانفرنس کی کاروائی سے مایوس تھے۔ علاوہ ازیں مسلم وفد کے بعض اراکین کے کردار سے بھی انہیں مایوسی ہوئی۔ سر فضل حسین، جس کے ایما پر وائسرائے نے اقبال کو دوسری گول میز کانفرنس میں شریک ہونے کے لیے نامزد کیا تھا، اقبال کے کردار سے مایوس تھے اور انڈین پبلک سروس کمیشن کی خالی اسامی کے لیے وہ اقبال کے تقرر کے متعلق سوچ رہے تھے۔ ان کی ذاتی ڈائری کا اندراج مورّخہ ۲۵؍نومبر ۱۹۳۱ء ملاحظہ ہو:

میں اقبال کے اس منصب پر تقرر کے لیے آخر تک پورا زور لگاتا اگر اس بیوقوف نے بذریعہ تار یہ اعلان نہ کیا ہوتا کہ اس نے گول میز کانفرنس سے استعفا دے دیا ہے جبکہ دوسروں نے ایسا نہیں کیا۔

انگلستان میں قیام کے دوران میں اقبال کی دیگر مصروفیات کی تفصیل یہ ہے: یکم اکتوبر ۱۹۳۱ء کو سر سیموئیل ہورو زیر ہند سے ملاقات، ۷/ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو وہ ایران کے سابق وزیر اعظم سید ضیاء الدین طباطبائی کی دعوت میں شرکت، ۸ ا کتوبر ۱۹۳۱ء کو عراق کے سفارت خانے میں دعوت طعام میں شرکت، ۹ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو البانیہ کے سفیر کی دعوت میں شرکت اور برطانوی پریس سے گفتگو، ۱۰/ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو سر ظفر اللہ خان کی دعوت میں شرکت، اگلے روز مسجد فضل میں انگریز نومسلموں سے تعارف، ۱۳ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو سر ڈینی سن راس سے ملاقات، ۱۴/ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو اقبال کے اعزاز میں نومسلم بیرونٹ ماوام فاطمۃ العابد کی رٹز ہوٹل میں دعوت، ۱۶ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو غازی رؤف بے سے ملاقات، اسی دن افغان قونصل خانے میں سردار احمد علی خان، وزیر مختار کی عظیم الشان دعوت میں شرکت۔ انہی دنوں میں سے کسی دن کیمبرج سے چوہدری رحمت علی، خواجہ عبدالرحیم اور دیگر مسلم طلبہ انہیں ملنے کے لیے آئے۔ بقول خواجہ عبدالرحیم، انہوں نے اقبال کو بتایا کہ شمال مغربی ہند میں ان کی تجویز کردہ مسلم ریاست کا نام ''پاکستان'' رکھا گیا ہے اور یہ لفظ مرکب ہے۔ کشمیر سمیت تین مسلم اکثریتی صوبوں کے ناموں کے پہلے حروف کا اور بلوچستان کے ''تان'' کا۔ اقبال اس روز کچھ علیل تھے اور بستر پر دراز تھے۔ انہوں نے طلبہ سے کہا کہ ''پاکستان'' کے مختلف حروف کو علیحدہ علیحدہ گتے کے ٹکڑوں پر تحریر کر کے ان کے بستر کے اردگرد رکھ جائیں تاکہ وہ اس نام پر غور کر سکیں۔ طلبہ نے ان کے حکم کی تعمیل کر دی اور چلے آئے۔ ۲۰ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو سروجنی نائیڈو کی وساطت سے اسلامی ممالک کی سیاح خاتون روزیٹہ فاربیز نے انہیں گھر بلوایا اور قرآنی تعلیمات کے متعلق ان سے سوال پوچھے۔ اس کے بعد وہ لیڈی ہاٹوگ کی دعوت میں شرکت کے لیے چلے گئے۔ ۲۱/ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو کرنل فیرا اور دو ایک روز بعد پروفیسر گب سے ملاقات، ۲۳/ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو سعید شامل سے ملاقات، اسی شام انہوں نے نواب احمد سعید خان چھتاری کی مسلم مندوبین کے لیے دعوت چائے میں شرکت کی۔ لندن میں اقبال کا تعارف نیشنل لیگ آف انگلینڈ کی صدر مس مارگریٹ فارقوہرسن سے ہو چکا تھا۔ مس فارقوہرسن مسلمانوں کی ہمدرد تھیں اور ان کی نیشنل لیگ کا مقصد سلطنت برطانیہ کے مسلمانان عالم سے خوشگوار تعلقات قائم کرنا اور ان کے ساتھ زیادتیوں کے مداوا کی کوشش کرنا تھا۔ ۲۷/ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو انہوں نے اقبال اور مولانا شوکت علی کی دعوت کی جس میں اپنے ہم خیال لوگوں کو مدعو کیا۔

۴ نومبر ۱۹۳۱ء کو پانچ بجے شام اقبال نے لندن میں انڈیا سوسائٹی کے علمی اجتماع سے خطاب کیا۔ اقبال نے اپنی تقریر میں واضح کیا کہ ان کی شاعری میں بعض فلسفیانہ خیالات موجود ہیں، لیکن ان کا کوئی منظم فلسفہ نہیں ہے۔ وہ انسان کے درخشاں مستقبل پر پختہ یقین رکھتے ہیں۔ آخر میں اپنی تازہ تصنیف جاوید نامہ (جوان دنوں زیر طباعت تھی) کے موضوع کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ تقریر کے اختتام پر انھوں نے انسانی خودی یا انا کے بارے میں چند سوالات کے جواب دیے۔ رات کے کھانے کے لیے لارڈ اور لیڈی اروِن کے ہاں گئے۔ ۱۸ نومبر ۱۹۳۱ء کو اقبال ایک دن کے لیے کیمبرج گئے۔ غلام رسول مہر اور مولانا شفیع داؤدی ان کے ساتھ تھے، اسٹیشن پر چوہدری رحمت علی، خواجہ عبدالرحیم اور متعدد دیگر اصحاب استقبال کے لیے موجود تھے۔ پانچ بجے شام ان کے اعزاز میں یونیورسٹی آمرز ہوٹل میں دعوتِ چائے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ جس میں پروفیسر نکلسن اور پروفیسر لیوی سمیت یونیورسٹی کے کئی اساتذہ موجود تھے۔ مصر کے ڈاکٹر سلیمان نے، جو انٹرنیشنل مسلم ایسوسی ایشن کیمبرج کے صدر تھے، اقبال کا تعارف دیگر مہمانوں سے کرایا۔ مجمع سے پروفیسر سورلے، پروفیسر نکلسن اور پروفیسر لیوی نے خطاب کیا۔ آخر میں اقبال نے تقریر کی۔ انھوں نے اپنے میزبانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے افسوس کا اظہار کیا کہ محفل میں پروفیسر براؤن اور پروفیسر میک ٹیگرٹ موجود نہیں۔ پھر فرمایا:

> کانفرنس کے کام میں میری شرکت بلا واسطہ نہیں بالواسطہ ہے۔ ...... باہمی گفتگوؤں میں ہم کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکے اور ہم میں اتحاد نہیں ہو سکا میں ان نوجوانوں کو جو کیمبرج میں اس وقت تعلیم پا رہے ہیں۔ چند نصیحتیں کرنا چاہتا ہوں۔ ...... میں نوجوانوں کو نصیحت کرتا ہوں کہ وہ دہریت اور مادیت سے بچیں۔ اہل یورپ کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ انھوں نے مذہب و حکومت کو علیحدہ علیحدہ کر دیا اور اس سے ان کی تہذیب روحِ اخلاق سے محروم ہو گئی اور اس کا رُخ دہریانہ مادیت کی طرف پھر گیا میرا عقیدہ ہے کہ انسانی انا کائنات کا مرکز ہے۔ یہ اوّلین نقطۂ نظر ہے۔ فلسفی کثرت سے وحدت کی طرف آئے۔ صحیح راستہ یہ ہے کہ وحدت سے کثرت کی طرف جائیں۔ ...... میں نوجوانوں کو نصیحت کرتا ہوں کہ وہ مادیت سے بچیں۔ چند روز قبل انگریز خواتین کے ایک بہت بڑے مجمع میں مجھ سے کہا گیا کہ میں عورتوں کو کوئی نصیحت کروں۔ میں نے انھیں کہا تھا کہ انگریز خواتین کا سب سے پہلا اور سب سے زیادہ اہم فرض یہ ہے کہ وہ آئندہ نسل کو دہریانہ مادیت کے چنگل سے بچائیں۔ مذہب بے حد ضروری چیز ہے۔ مذہب عرفان و ایقان کا نام ہے۔

اقبال کے لندن کو خیر باد کہنے سے قبل ۶ نومبر ۱۹۳۱ء کو ہوٹل والڈورف میں اقبال لٹریری ایسوسی ایشن نے اقبال کے اعزاز میں ایک عظیم الشان ٹی پارٹی کا اہتمام کیا۔ جس میں تقریباً چار سو شخصیات کو مدعو کیا گیا۔ دوسری گول میز کانفرنس کے تمام اراکین اس دعوت میں موجود تھے۔ سر عبدالقادر نے صدارت کے فرائض انجام دیے۔ بعد ازاں پروفیسر نکلسن نے تقریر کی انہوں نے واضح کیا کہ اقبال اپنے کلام کے ذریعے ایک خاص پیغام دینا چاہتے ہیں۔ جس میں روحانیت کا پہلو غالب ہے اور یہ پیغام دہریانہ مادیت کے خلاف ہے۔ ابتداء میں لوگوں نے گمان کیا کہ اقبال نطشے کے افکار کو فارسی جامہ پہنا کر پیش کر رہے ہیں، مگر جس کسی نے بھی ان کے اشعار کا بغور مطالعہ کیا ہے اس پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ان کی تعلیمات مختلف ہیں۔

پروفیسر نکلسن کی تقریر کے بعد نیاز محمد خان سیکرٹری اقبال لٹریری ایسوسی ایشن نے اقبال کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا۔ ایڈریس کے خاتمے پر اقبال نے میز بانوں اور مہانوں کا شکریہ ادا کرنے کے بعد فرمایا:

میں نے جو خیالات ظاہر کیے تھے، ان پر ابتدا میں بہت سے اعتراض ہوئے۔ حتیٰ کہ میری نسبت کہا گیا کہ میں دہریت کی تبلیغ کرتا ہوں۔ اور یہ اعتراض مسیحی کلیسا کے ایک رئیس کی طرف سے کیا گیا۔ سائنس کے مقابلے میں یورپی ادبیات کی کمزوری اور انحطاط کا مجھے جو احساس ہوا، اسے میں نے مختلف اشعار کے روپ میں پیش کیا ہے۔ مثلاً

عشق ناپید و خرد مے گزدش صورت مار
گرچہ در کاسۂ زر لعل روانے دارد

میں مکرّر آپ حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور خوش ہوں کہ اگرچہ میرے ساتھ رفقار کی کوئی فوج نہیں ہے، تاہم رفقاء کی ایک کثیر جماعت میرے سامنے ہے۔ آپ اپنی تعداد بڑھایئے۔ میں آپ کو وہی نصیحت کرتا ہوں جو میں نے اپنے فرزند (جاوید اقبال) کو کی ہے۔ یعنی

کم خور و کم خواب و کم گفتار باش
گرِد خود گر دندہ چوں پُرکار باش

اور آپ کے سامنے وہی بات دہراتا ہوں جو میں نے صوفیوں سے کہی ہے:

ز من گو صوفیان باصفا را
خدا جویان معنی آشنا را

غلام ہمت آں خود پرستم
کہ با نورِ خودی بیند خدا را

بعد میں شیخ نور محمد اور عبداللہ یوسف علی نے بھی اقبال کی شاعری و فکر کے متعلق تقاریر کیں۔ آخر میں سروجنی نائیڈو نے ایک نہایت دلکش تقریر کی۔ پھر آغا خان کی تقریر کے ساتھ تقریب اختتام پذیر ہوئی۔

۲۱ر نومبر ۱۹۳۱ء کو نو بجے صبح اقبال مع غلام رسول مہر وکٹوریہ اسٹیشن لندن سے روم روانہ ہوئے۔ پیرس کے اسٹیشن گاردی نورد میں امراؤ سنگھ شیر گل استقبال کے لیے موجود تھے۔ شب اور ۲۲ نومبر ۱۹۳۱ء کا پورا دن سفر میں گزرا۔ رات کے تقریباً آٹھ بجے گاڑی روم پہنچی۔ اسٹیشن پر اقبال کے دوست ڈاکٹر سکارپا (قونصل جنرل اٹلی مقیم بمبئی) اور اٹلی کی رائل اکادمی کی طرف سے روم یونیورسٹی میں فلسفے کے پروفیسر ایرسٹا کو استقبال کے لیے موجود تھے۔ انہوں نے اقبال اور غلام رسول مہر کو موٹر کار میں لے جا کر ایک اعلیٰ ہوٹل میں ٹھہرایا۔ رات کا کھانا ڈاکٹر سکارپا کے ساتھ کھایا گیا۔

۲۳ر نومبر ۱۹۳۱ء کو ڈاکٹر سکارپا صبح آئے اور اقبال کو بعض اہل علم سے ملوانے کے لیے ساتھ لے گئے۔ واپسی پر تقریباً ایک بجے رائل اکادمی کے نائب صدر فالمیکی انہیں ملنے کے لیے ہوٹل میں آئے اور دو گھنٹے تک باتیں کرتے رہے۔ تین بجے ایک فاضل اطالوی خاتون اقبال سے ملاقات کے لیے آئیں۔ شام کو ایک اطالوی بینکر کی بیوی آئیں جو ہندوستان کے علاوہ وسط ایشیا کے مختلف حصوں کی سیاحت کر چکی تھیں۔ پھر وزارت خارجہ کا ایک اہم رکن ملاقات کے لیے آیا۔

۲۴ر نومبر ۱۹۳۱ء کی صبح تاریخی مقامات کی سیر کے لیے مخصوص تھی۔ سو اطالوی محکمہ آثارِ قدیمہ کا ایک افسر اور ایک جرمن خاتون جو انگریزی جانتی تھی، اقبال اور غلام رسول مہر کو ہوٹل سے لے کولسیزیم یا ایلفی تھیٹر پہنچے۔ آثار قدیمہ کے ماہر نے بتایا کہ اس تماشا گاہ میں جہاں انسانوں اور درندوں کی لڑائی کرائی جاتی تھی۔ پچاس ہزار افراد کے بیٹھنے کا انتظام تھا۔ اقبال نے غلام رسول مہر سے مخاطب ہو کر کہا کہ دیکھو ایک طرف قدیم رومی بادشاہ تھے، جنہوں نے ایک عظیم الشان عمارت اس غرض سے بنوائی کہ پچاس ہزار آدمی اس میں بیٹھ کر انسانوں اور درندوں کی لڑائی کا تماشا دیکھیں اور دوسری طرف لاہور کی شاہی مسجد اس غرض کے لیے تعمیر کی گئی تھی کہ ایک لاکھ

بندگانِ خدا جمع ہو کر مساوات، اخوت اور محبت کے سچے اور مخلصانہ جذبات کا مظاہرہ کریں۔ اسی ایک مثال کو سامنے رکھ کر اندازہ کیجیے کہ اسلام کیسی برکات و حسنات کا سرچشمہ ہے۔ یہاں کچھ وقت گزارنے کے بعد قیصر اگسٹن کے بابِ فتح سے گزرتے ہوئے وہ فورم میں داخل ہوئے۔ پھر سپلیٹن کے حصے دیکھے اور تقریباً اڑھائی گھنٹوں کے بعد لوٹے۔ کچھ دیر ہوٹل میں آرام کر کے کٹیا کو 🕓 دیکھنے کے لیے چلے گئے۔ یہ زمین دوز پُر پیچ رستے میلوں تک پھیلے ہوئے ہیں اور ان کے غاروں یا کئی منزلوں کے تہ خانوں میں رومی دور کے عیسائی ولیوں یا راہبوں کے جسمانی پنجر اور کھوپڑیاں ترتیب سے رکھی ہیں۔ اس منظر کو دیکھ کر اقبال کے دل پر بہت اثر ہوا۔ فرمایا:

مذہب بھی کیا عجیب چیز ہے۔ کوئی دوسری قوت، عقیدے اور ایمان کی قوت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ یہ جو کچھ ہوا مذہبی عقائد کے جوش میں ہوا۔ عقیدہ اصلاً غلط بھی ہو، لیکن مذہب کے رنگ میں دل پر قبضہ کر لیتا ہے تو انسان کے قوائے عمل میں عجیب و غریب حرارت پیدا کر دیتا ہے۔

کٹیا کو 🕓 کی زمین دوزی اور تاریکی پر بھی اقبال نے اظہارِ رائے کرتے ہوئے کہا:

اسلام سے قبل ہر مذہب کا رجحان تیرگی، ظلمت، اخفا اور اسرار کی طرف تھا۔ اسلام پہلا مذہب ہے جس نے سورج کی روشنی میں خدائے واحد و قہار کی پرستش کی اور مذہب کو مستوری اور اخفا سے باہر نکالا۔ اور یہ حقیقت اسلام کی عبادت گاہوں اور ما قبل اسلام کی عبادت گاہوں پر سرسری نگاہ ڈالنے سے بھی آشکارا ہو جاتی ہے۔

شام کو پانچ بجے اٹلی کے معروف عالم پروفیسر جنٹیلی انہیں ملنے کے لیے آئے اور تقریباً ایک گھنٹے تک مختلف مسائل پر باتیں ہوتی رہیں۔ مترجم کے فرائض ڈاکٹر سکارپا نے انجام دیے۔ زیرِ بحث مسائل تھے: کسی قوم کی تعمیر و تربیت میں شعر و موسیقی کا حصّہ، روم کے آثارِ قدیمہ کے متعلق اقبال کے تاثرات اور یورپی تہذیب کا مستقبل۔ ڈاکٹر سکارپا نے اطالوی اخباروں اور رسالوں میں اشاعت کے لیے اقبال پر اپنے مضمون میں ان کے بعض اشعار کے علاوہ نظم سسلی کا ترجمہ بھی اطالوی زبان میں کر رکھا تھا۔ پروفیسر جنٹیلی چونکہ خود سسلی کے رہنے والے تھے، اس لیے انہوں نے ڈاکٹر سکارپا سے ترجمے کی ایک نقل حاصل کی۔ بعد ازاں اقبال نے ان کے ساتھ جا کر اس محکمے کے مختلف شعبوں کا معائنہ کیا جہاں پروفیسر جنٹیلی کی زیرِ نگرانی انسائیکلوپیڈیا اطالیہ کی ترتیب دی جا رہی تھی۔

۲۵ر نومبر ۱۹۳۱ء کو تین بجے اقبال اور غلام رسول مہر افغانستان کے سابق شاہ امان اللہ

خان کے مکان پر انہیں ملنے کے لیے گئے۔ یہ ملاقات تقریباً تین گھنٹے تک جاری رہی اور اس میں امان اللہ خان نے بتایا کہ کن حالات کے تحت انہیں افغانستان چھوڑنا پڑا۔ پھر افغانستان کے مستقبل کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں۔

۲۶ر نومبر ۱۹۳۱ء کو اقبال نے اٹلی کی رائل اکادمی میں لیکچر دیا۔ اس جلسے میں روم کے تمام اہل علم، دانشور اور یونیورسٹی کے پروفیسر مدعو تھے۔ نیز روم کی بعض اہم شخصیات اور کئی خواتین و حضرات نے شرکت کی۔ اس لیکچر کے نوٹس جو اقبال نے اپنے ہاتھ سے لکھے تھے، اقبال کے خطوط اور تحریریں مرتبہ بی۔ اے۔ ڈار (انگریزی)، صفحات ۸۰ تا ۸۶ پر دیکھے جا سکتے ہیں۔

۲۷ نومبر ۱۹۳۱ء کی صبح کو شاہ امان اللہ اقبال سے ملاقات کے لیے ان کے ہوٹل میں آئے اور تقریباً دو گھنٹے تک ان کے ساتھ مختلف موضوعات پر باتیں کرتے رہے۔ اقبال نے انہیں رخصت کرتے وقت فرمایا:

پیر ما گفت جہاں بر روشے محکم نیست
از خوش و ناخوش او قطع نظر باید کرد

اسی دن مسولینی نے اقبال کو مدعو کر رکھا تھا۔ مسولینی سے اقبال کی ملاقات کے متعلق مختلف روایتیں مشہور ہیں۔ ایک روایت تو غلام رسول مہر کی ہے۔ اِن کے بیان کے مطابق ڈاکٹر سکارپا مترجم کی حیثیت سے اقبال کے ساتھ گئے۔ مسولینی نہایت تپاک سے ملا، مگر ملاقات زیادہ طویل نہ تھی۔ اقبال کی تصانیف کے متعلق گفتگو ہوئی۔ مسولینی نے پیشکش کی کہ اقبال حکومت اطالیہ کے خرچ پر لیبیا جائیں۔ اور دیکھیں کہ عربوں کی فلاح و بہبود کے لیے کیا کچھ کیا جا رہا ہے۔ اور پھر اس مشاہدے کے بعد مشورہ دیں کہ حکومت اطالیہ کو مزید کیا کچھ کرنا چاہیے، لیکن اقبال نے فرصت نہ ہونے کا عذر کر کے اس پیشکش کو رد کر دیا۔

دوسری روایت سر مالکم ڈارلنگ کی ہے جس نے ۱۹۳۴ء میں اقبال سے لاہور میں ملاقات کی تھی اور بقول اس کے اقبال نے مسولینی کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ مسولینی سے اُن کی ملاقات ایک وسیع و عریض ہال میں ہوئی۔ جو اس کا دفتر تھا۔ ہال کے ایک سرے پر اونچے پلیٹ فارم پر رکھے ہوئے بڑے سے میز کے پیچھے ایک شاندار کرسی پر مسولینی بیٹھا کام میں مصروف تھا۔ اقبال کو اس حد تک پہنچنے کے لیے خاصا فاصلہ طے کرنا پڑا، لیکن اس نے آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا کہ کون آ رہا ہے۔ جب وہ پلیٹ فارم کے قریب پہنچے تو اس نے نظریں اٹھائیں اور ان کی

طرف بڑھ کر پرتپاک طریقے سے مصافحہ کیا۔ یہ ملاقات تقریباً چالیس منٹ تک جاری رہی۔ مسولینی نے اقبال سے اٹلی کے متعلق ان کے تاثرات معلوم کرنے چاہے۔ اقبال نے کچھ پس و پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان کی رائے میں اطالوی لوگ ایرانیوں سے مشابہت رکھتے ہیں۔ وہ بڑے خوب رو، فن پرست اور ذہین وفطین ہیں اور ان کا عظیم الشان ماضی تہذیب وتمدن کی کئی صدیوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ مگر ان میں خون نہیں ہے، اس پر مسولینی نے انتہائی تعجب کا اظہار کیا۔ اقبال نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا کہ ایرانیوں کو ایک فائدہ حاصل ہے جو بد قسمتی سے اطالویوں کو حاصل نہیں اور وہ یہ ہے کہ ایرانیوں کے اردگرد توانا قومیں ترک، افغان اور کُرد آباد ہیں، جن سے تازہ خون حاصل کیا جا سکتا ہے، لیکن اطالویوں کے لیے ایسی صورت موجود نہیں۔ مسولینی نے پوچھا کہ پھر اطالویوں کو کیا کرنا چاہیے۔ اقبال نے جواب دیا کہ یورپ سے مُنہ موڑ کر مشرق کا رُخ کرو۔ یورپ کا اخلاق رو بہ تنزل ہے، لیکن مشرق کی ہوا تازہ ہے اور اس میں سانس لینا چاہیے۔ بعدازاں مسولینی نے اقبال کو خط لکھ کر پوچھا کہ اٹلی میں آباد مسلمانوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کوئی تجویز پیش کریں۔ اقبال نے مشورہ دیا کہ روم میں ایک مسجد تعمیر کی جائے اور سلرنو میں علماء کی ایک کانفرنس بلوانے کا اہتمام کیا جائے کیونکہ سلرنو کو مسلم حلقے ایک قدیم اسلامی شہر تصور کرتے ہیں۔ مسولینی سے ملاقات کے اختتام پر جب اقبال قصر وینس سے باہر نکلے تو انہیں صحافیوں نے گھیر لیا اور پوچھا کہ ڈوچے کے متعلق ان کی کیا رائے ہے۔ اس پر اقبال نے جواب دیا کہ وہ اس خوف سے اپنی رائے کا اظہار کرنا مناسب نہیں سمجھتے کہ کہیں پوپ اسے ناپسند نہ کرے، لیکن صحافیوں نے انہیں نہ چھوڑا۔ بالآخر اقبال نے بہ عالم مجبوری اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ''آپ کا دوچے ایک لوتھر ہے مگر بغیر انجیل کے''۔

تیسری روایت فقیر سید وحید الدین نے اپنی تصنیف میں پیش کی ہے۔ وہ تحریر کرتے ہیں:

> انہیں (اٹلی میں) مسولینی سے ملنے کا بھی اتفاق ہوا۔ یہ ساری کیفیت میں نے خود ان کی زبانی سنی ہے۔ انہوں نے خود مسولینی سے ملنے کی خواہش ظاہر نہیں کی تھی، بلکہ جن دنوں وہ روما میں مقیم تھے، مسولینی نے اپنے سٹاف کے آدمی کے ذریعے انہیں کہلا بھیجا کہ میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے دعوت قبول کر لی اور مسولینی سے ملنے تشریف لے گئے۔ وہ ایک

بڑے وسیع کمرے میں میز کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔ میز پر کاغذوں کا انبار تھا۔ ڈاکٹر صاحب کمرے میں داخل ہوئے تو وہ پیشوائی کے لیے بڑھا۔ اس کا قد زیادہ اونچا نہیں تھا۔ لیکن بازو بھرے ہوئے تھے۔ سینہ کشادہ اور آنکھیں شکرے کی آنکھوں کی طرح چمکیلی تھیں۔ رسمی مزاج پُرسی کے بعد اس نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا: میری فاشسٹ تحریک کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے انہوں نے جواب دیا: آپ نے ڈسپلن کے اس اصول کا بڑا حصّہ اپنا لیا ہے جسے اسلام انسانی نظامِ حیات کے لیے بہت ضروری سمجھتا ہے، لیکن اگر آپ اسلام کے نظریۂ حیات کو پوری طرح اپنا لیں تو سارا یورپ آپ کے تابع ہوگا۔ لیکن یہ ایسی بات نہیں تھی کہ مسولینی کے ذہن میں آسانی سے آجاتی۔ ڈاکٹر صاحب نے مسولینی کو یہ مشورہ دیا کہ یورپ سے اپنا مُنہ موڑ لو (یعنی یہ کہ یورپ جس معاشرہ کی ترقی کا داعی ہے تم اس کی تقلید سے اجتناب کرو) مسولینی نے ڈاکٹر صاحب سے دریافت کیا کہ میں دنیا کے مسلمانوں کی ہمدردیاں کس طرح حاصل کر سکتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا: مفت تعلیم اور رہائش کا انتظام کر کے زیادہ سے زیادہ مسلمان طلبہ کو اٹلی بلوائیے۔ مسولینی نے ڈاکٹر صاحب سے کوئی اچھوتا مشورہ بھی طلب کیا۔ انہوں نے کہا: ہر شہر کی آبادی مقرر کر کے اُسے حد سے نہ بڑھنے دو۔ اس سے زیادہ بسنے والوں کو نئی بستیاں مہیا کی جائیں۔ مسولینی نے حیران ہو کر کہا: اس میں کیا مصلحت ہے؟ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ شہر کی آبادی جس قدر بڑھتی جاتی ہے۔ اس کی تہذیبی و اقتصادی توانائی کم ہوتی جاتی ہے۔ اور ثقافتی توانائی کی جگہ محرکاتِ شر لے لیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا: یہ میرا ذاتی نظریہ نہیں ہے بلکہ میرے پیغمبرؐ نے آج سے تیرہ سو سال قبل یہ مصلحت آمیز ہدایت فرمائی تھی کہ جب مدینہ منورہ کی آبادی ایک حد سے تجاوز کر جائے تو مزید لوگوں کو آباد ہونے کی اجازت دینے کی بجائے دوسرا شہر آباد کیا جائے۔ یہ حدیث سُنتے ہی مسولینی کرسی سے کھڑا ہو گیا۔ اور دونوں ہاتھ میز پر زور سے مار کر کہا: کتنا اُچھوتا خیال ہے۔

ان تینوں روایتوں میں سے کون سی درست ہے؟ یہ بتانا تو ممکن نہیں مگر اس حقیقت سے انکار مشکل ہے کہ اقبال ملاقات کے وقت واقعی مسولینی کی شخصیت سے متاثر ہوئے تھے۔ آلِ احمد سرور کے نام اپنے ایک خط محرّرہ ۱۲ مارچ ۱۹۳۷ء میں فرماتے ہیں:

مسولینی کے متعلق جو کچھ میں نے لکھا ہے، اس میں آپ کو تناقص نظر آتا ہے۔ آپ درست فرماتے ہیں لیکن اگر اس بندۂ خدا میں ڈیول (شیطان) اور سینٹ (ولی) دونوں کی خصوصیات جمع ہوں۔ تو اس کا میں کیا علاج کروں۔ مسولینی سے اگر کبھی آپ کی ملاقات ہو تو آپ اس بات

کی تصدیق کریں گے کہ اس کی نگاہ میں ایک ناممکن البیان تیزی ہے، جس کو شعاع آفتاب سے ہی تعبیر کر سکتے ہیں۔ کم از کم مجھے اس قسم کا احساس ہوا۔

۲۷ نومبر ۱۹۳۱ء ہی کے دن روم کے بعض اخباروں میں اقبال کی تصویریں یا ان کی شاعری و فکر پر مضامین شائع ہوئے نظم سسلی کے چند حصوں کا اطالوی ترجمہ بھی اقبال کے رائل اکادمی میں لکچر کے اقتباسات کے ساتھ چھپا۔

روم میں کاؤنٹس کارنیوالے نے اقبال کے اعزاز میں دعوت کا اہتمام کیا۔ یہ عظیم الشان دعوت ۲۷ نومبر ۱۹۳۱ء کی شب کو انہوں نے روم میں اپنے ویلا میں دی۔ اس سے پیشتر شام کو نیپلز سے اٹلی کی اسمبلی کے ایک رکن بیرن رابرٹو ریکاڈی اقبال سے ملاقات کے لیے ہوٹل میں آئے۔ اور انہیں نیپلز آنے کی دعوت دی تا کہ وہ پمپئی کے کھنڈر اور آتش فشاں ماؤنٹ ویسوویس دکھا سکیں۔ اقبال نے ان کے اصرار پر دعوت قبول کر لی۔ چنانچہ ۲۸ نومبر ۱۹۳۱ء کی صبح کو اقبال اور غلام رسول مہر نیپلز پہنچے۔ بیرن ریکاڑدی کے بیٹے نے ان کا استقبال کیا۔ وہاں سے پمپئی گئے اور دو گھنٹے تک کھنڈروں کی سیر کرتے رہے۔ ۲۹ نومبر ۱۹۳۱ء کو سہ پہر کے وقت بارش اور تند و تیز ہوا میں اقبال، غلام رسول مہر اور مولانا شفیع داؤدی (جو انہیں یہاں آ ملے تھے) ''وکٹوریہ'' نامی جہاز کے ذریعے برنڈزی سے اسکندریہ (مصر) روانہ ہوئے اور دو دن کے سمندری سفر کے بعد یکم دسمبر ۱۹۳۱ء کو صبح نو بجے اسکندریہ پہنچے۔ بندرگاہ پر پرنس عمر طوسون کے خاص آدمی جمعیۃ الشبان المسلمین کے چند ارکان، صدیق محمد ناڑو، مولانا شوکت علی اور دیگر اصحاب جو ان کی آمد سے قبل روم سے سیدھے یہاں پہنچ چکے تھے، ان کے استقبال کے لیے موجود تھے۔

پھر تین بجے بذریعہ ریل قاہرہ کے لیے روانہ ہوئے اور چھ بجے شام قاہرہ پہنچے۔ اسٹیشن پر شبان المسلمین کے ارکان، چند ممبر پارلیمنٹ، اخبارات و رسائل کے مدیر، قاہرہ میں مقیم ہندوستانی مسلمان اور جامعہ ازہر کے ہندوستانی طلبہ ان کے استقبال کے لیے پہنچے ہوئے تھے۔ قاہرہ میں اقبال کا قیام میٹرو پولٹین ہوٹل میں تھا۔ لیکن اس رات کا کھانا انہوں نے ڈاکٹر عبدالحمید سعید بے ممبر پارلیمنٹ کے ہاں کھایا، جہاں شیخ الازہر مفتی ازہر محمد علی پاشا، سابق وزیر اوقاف اور دیگر اکابرین سے اُن کی ملاقات ہوئی۔ اخباری نمائندوں نے اقبال کو شبان مصر کے لیے کوئی پیغام دینے کو کہا، فرمایا کہ نوجوانانِ مصر سے میری آرزو ہے کہ پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وفادار رہیں۔ رات کے گیارہ بجے واپس ہوٹل آئے۔ اقبال نے محسوس کیا کہ مصر میں عام

تاثر یہی ہے کہ ہندوستان کی جدو جہد آزادی میں مسلمان روڑے اٹکا رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے قیام کے دوران میں اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی اور مصری صحافیوں کو ہندی مسلمانوں کی جداگانہ سیاسی حیثیت یا ان کے سیاسی موقف سے آگاہ کیا۔ مصر کی کئی اہم علمی شخصیتیں اقبال کی آمد کی منتظر تھیں۔ چنانچہ ان میں سے مشہور وکیل اور فلسفے پر متعدد کتب کے مصنف لطفی بے جمعہ نے قاہرہ میں اپنا بیشتر وقت اقبال کے ساتھ گزارا۔

۲؍دسمبر ۱۹۳۱ء کی صبح کو محمد صدیق ناڑو، محمود احمد عرفانی اور ماسٹر امام دین کار میں اقبال کو آثار قدیمہ کی سیر کرانے لے گئے۔ انہوں نے قاہرہ سے دس میل کے فاصلے پر اہرام مصر کی سیر کی، دریائے نیل کے کنارے خوبصورت باغات میں گھومے۔ یہاں کئی نئی عمارتیں تعمیر ہو رہی تھیں۔ جنہیں دیکھتے ہوئے وہ آگے بڑھ گئے۔ ہرم اکبر، ہرم اوسط اور ہرم اصغر دیکھے۔ اہرام سے کچھ فاصلے پر ابولہول دیکھا۔ واپسی پر قصر العینی گئے۔ یہ ایک بہت بڑا ہسپتال ہے جو علامہ بدرالدین عینی کے نام سے موسوم ہے۔ اس علاقے کے بازاروں میں پھرے۔ دوپہر کا کھانا شام کے تاجر محی الدین الحضی کے مکان پر کھایا جہاں وہ شام میں فرانسیسی استعمار کے خلاف برسوں جہاد کرنے والے شامی مجاہد ڈاکٹر عبدالرحمن شہبندر سے ملے۔ ڈاکٹر شہبندر کو اقبال نے ہندوستان کے صحیح حالات سے روشناس کرایا۔ بعدازاں عرب ممالک کے حالات اور عربوں کے مستقبل کے مسائل زیر بحث آئے۔ ساڑھے تین بجے واپس ہوٹل پہنچے جہاں کئی حضرات کو منتظر پایا اور جن سے ملاقات کی گئی۔

اسی دوران میں اقبال سے ملاقات کے لیے مصر کے مشہور صاحب طریقت بزرگ سید محمد ماضی ابوالعزائم اپنے دو صاحبزادوں کے ساتھ تشریف لائے۔ اقبال انہیں یوں ہوٹل میں دیکھ کر سخت پریشان ہوئے۔ کہا کہ حضرت آپ نے تکلیف کیوں کی، میں خود زیارت کے لیے حاضر ہو جاتا۔ انہوں نے فرمایا:

خواجہ دو جہاں حضورؐ کا ارشاد ہے کہ جس نے دین سے تمسک کیا ہو اس کی زیارت کو جاؤ گے۔ تو مجھے خوشی ہوگی، لہٰذا میں اس ارشاد کی تعمیل میں چلا آیا ہوں تاکہ میرے آقا مجھ سے خوش ہوں۔

اقبال اُن کی بات سُن کر بیتاب ہو گئے اور انہیں چپ سی لگ گئی۔ سید العزائم دیر تک بیٹھے نصیحتیں کرتے رہے اور اقبال خاموشی سے سنتے رہے۔ جب وہ چلے گئے تو اقبال سے نہ رہا گیا آنسوؤں کا سیلاب بے اختیار آنکھوں سے بہ نکلا۔ فرمایا:

ایسا زمانہ بھی آ گیا ہے کہ لوگ مجھ جیسے گناہ گار کو متمسک بالدین سمجھ کر حضور خواجۂ دو جہاںؐ کے ارشاد کے اتباع میں بغرض خوشنودیِ آنحضرتؐ ملنے آتے ہیں۔

کچھ دیر کے بعد پروفیسر علی بے عبدالرزاق ملاقات کے لیے آئے۔ انہوں نے اپنی کسی تصنیف میں مذہب اور سیاست کی علیحدگی کے مسئلے پر بحث کی تھی۔ جس پر علمائے ازہر نے ان کے خلاف فتویٰ دے رکھا تھا۔ اقبال نے انہیں اس مسئلے پر اپنا نقطۂ نظر واضح کیا اور ایسی علیحدگی کے نقصانات کی تفصیل بیان کی۔ بعدازاں اقبال، احمد ذکی پاشا شیخ العروبہ کے مکان پر گئے جو دریائے نیل کے کنارے واقع تھا اور رات کا کھانا ان کے ساتھ کھایا۔ گفتگو مسئلہ فلسطین اور مؤتمر اسلامی کو کامیاب بنانے کے بارے میں ہوئی۔

۳؍ دسمبر ۱۹۳۱ء کو دوپہر کے کھانے کی دعوت مرزا مہدی بے ایرانی کے ہاں تھی۔ مولانا شوکت علی، مولانا شفیع داؤدی، شیخ ازہر اور دیگر اصحاب بھی مدعو تھے۔ چار بجے انہوں نے احمد ذکی پاشا کے گھر چائے کی پارٹی میں شرکت کی۔ پانچ بجے محمود پاشا عبدالرزاق کے یہاں تشریف لے گئے جہاں محمود پاشا رئیس حزب الاحرار، محمد علی پاشا، ڈاکٹر محمد حسین ہیکل مدیر السیاستہ اور دیگر اہل علم سے ملاقات ہوئی۔ ابھی یہیں بیٹھے تھے کہ سید ابوالعزائم کے فرزند کار لے کر پہنچ گئے اور بتایا کہ ان کے والد نے یاد فرمایا ہے۔ سو اقبال وہاں سے سید ابوالعزائم کے مکان پر تشریف لے گئے۔ یہاں ان کے مریدوں کی خاصی تعداد موجود تھی۔ سید ابوالعزائم نے معمول کے مطابق اپنے ناصحانہ انداز میں کہا کہ جب مسلمانوں کی تعداد صرف چند لاکھ تھی تو دنیا کی عظیم سلطنتیں ان کے قدم چومتی تھیں اور آج جب وہ چالیس کروڑ ہیں، تو ہر جگہ کفار ان پر مسلّط ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے اسلام چھوڑ دیا اور اس کی روح سے کنارہ کش ہو گئے۔

پھر اقبال کے دل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

اس دل میں اسلام کی محبت اور رسولؐ کی خاص شیفتگی نظر آتی ہے۔

سید ابوالعزائم کے اشارے پر ایک مرید نہایت دلکش مصری لہجے میں سورۃ فتح سنانے لگا۔ جب اقبال جانے کے لیے اٹھے تو سید ابوالعزائم کے مریدوں نے حضرت اقبال زندہ باد کے نعروں سے انہیں رخصت کیا۔

۴؍ دسمبر ۱۹۳۱ء کو اقبال قاہرہ کا میوزیم دیکھنے کے لیے تشریف لے گئے۔ میوزیم سے

واپس آ کر چار بجے شام جمعیۃ الرابطہ الھندیہ کی طرف سے چائے کی پارٹی میں شریک ہوئے۔ تقریب میں صدیق محمد ناڑو اور محمود احمد عرفانی نے اقبال کو سپاسنامہ پیش کیا اور لطفی بے جمعہ اور منیر الحصی نے خطاب کیا، اقبال نے اپنی جوابی تقریر میں اراکین جمعیت کا شکریہ ادا کیا۔ اور مصر و ہندوستان کے مابین تعلقات کو مضبوط بنانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ بعد میں سات بجے شام اقبال شبان المسلمین کے ارکان سے خطاب کرنے کے لیے شبان المسلمین کے دفتر پہنچے۔ ہال اہل علم سے کچھا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اقبال کی تقریر انگریزی میں تھی۔ رات کے کھانے کی دعوت محمد علی پاشا کے ہاں تھی۔ اقبال نے ان سے مختلف موضوعات پر گفتگو کی جن میں مسئلہ سود، قرونِ اولیٰ کی اسلامی فتوحات، دور جدید میں مسلمانوں کے زوال کے اسباب اور ہندوستان کی سیاسیات نمایاں تھی۔

۵ر دسمبر ۱۹۳۱ء کی صبح کو سید ابو العزائم نے اپنی کار مع ڈرائیور بھیج دی تا کہ اقبال فسطاط (مصر کا قدیم اسلامی دارالخلافہ) دیکھ آئیں۔ سو اقبال اور غلام رسول مہر، شیخ محمود احمد عرفانی کی معیت میں فسطاط پہنچے اور سب سے پہلے جامعہ عمرو ابن العاص دیکھی۔ اقبال نے قبروں پر فاتحہ پڑھی اور پھر امام شافعیؒ کے مزار پر پہنچے۔ بعد ازاں جامعہ ازہر پہنچے۔ جامعہ ازہر کے منتظم محمد خالد حسنین بے ان کا انتظار کر رہے تھے۔ اقبال نے کچھ دیر طلبہ کے ساتھ بیٹھ کر تفسیر، حدیث اور منطق کے درس سنے۔ جامعہ کا نیا حصّہ بھی دیکھا جہاں طلبہ کو علوم جدیدہ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ نیز طبیعیات، کیمیا وغیرہ کے شعبوں کا معائنہ کیا۔ جامعہ کے ایک استاد نے اقبال کی شان میں قصیدہ لکھ رکھا تھا، جو انہیں پڑھ کر سنایا گیا۔ اس پر تمام طلبہ نے ''دکتور اقبال زندہ باد'' اور ''شاعر ہندی زندہ باد'' کے نعرے لگائے۔ پھر اقبال، شیخ الازہر شیخ مصطفی المراغی سے ملنے گئے جو اپنے دفتر میں ان کے منتظر تھے۔ اقبال نے جامعہ کے متعلق اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ راستہ وہی ہے گو قافلہ بدل گیا ہے۔ اس لیے اگر آپ موجودہ قافلے کی، وقت کے جدید تقاضوں کے مطابق ضروریات کا خیال نہ کریں گے، تو مقصد کی تحصیل میں ہرگز کامیابی نہ ہوگی۔

روانگی کے لیے جب اقبال ریلوے اسٹیشن پہنچے تو اسٹیشن پر کئی مصری اور ہندوستانی اصحاب انہیں الوداع کہنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ پورے چھ بجے ریل فلسطین کے لیے روانہ ہوئی۔ اور اقبال مصریوں کی محبت و شفقت کا ایک انمٹ نقش اپنے دل میں لے کر رخصت ہو گئے۔

۶ دسمبر ۱۹۳۱ء کو صبح ساڑھے نو بجے اقبال بیت المقدس (یروشلم) پہنچے۔ بارش جاری تھی۔ اسٹیشن پر ان کے استقبال کے لیے مفتی سید امین الحسینی، مولانا شوکت علی اور مؤتمر اسلامی کے منتظمین موجود تھے۔ مؤتمر اسلامی کے اجلاس حرم مقدس کے متصل روضۃ المعارف کی عمارت میں منعقد ہو رہے تھے۔ اس لیے مندوبین کو اس کے قریب مختلف ہوٹلوں میں ٹھہرایا گیا۔ بعض حضرات پیلس ہوٹل (فندق بلاس) میں مقیم ہوئے۔ بعض جن میں مولانا شوکت علی، مولانا شفیع داؤدی اور رؤف پاشا شامل تھے، روضۃ المعارف ہی میں ٹھہرے۔ اقبال اور غلام رسول مہر کا قیام گرینڈ ہوٹل (فندق مرقص) میں تھا۔ ۶ دسمبر ۱۹۳۱ء تک بیشتر مندوب بیت المقدس پہنچ گئے تھے۔ یہ مؤتمر مفتی سید امین الحسینی اور ان کے رفقاء کی طرف سے اتحاد اسلامی کے نصب العین کی تحصیل کی خاطر منعقد کی گئی تھی اور اس کی دعوت کسی اسلامی حکومت نے نہ دی تھی۔ اس مؤتمر میں بیشتر اسلامی ممالک اور تقریباً ہر اہم اسلامی خطے کے نمائندوں نے شرکت کی۔

مؤتمر کا تعارفی اجلاس ۶ دسمبر ۱۹۳۱ء کو شام چار بجے روضۃ المعارف کے وسیع و عریض ہال میں ہوا۔ اس وقت خوب بارش ہو رہی تھی۔ اجلاس کی کارروائی ایک گھنٹے تک جاری رہی۔ جس میں مندوبین کو ایک دوسرے سے متعارف کرایا گیا۔ کارروائی کے اختتام پر دیگر مندوبین کے ساتھ اقبال بھی رضا کاروں کی معیت میں مسجد اقصیٰ کی طرف روانہ ہوئے۔ رضا کار مل کر عربی زبان میں قومی نغمے گاتے جا رہے تھے۔ رستے میں مولانا محمد علی جوہر کی قبر پر اقبال رک گئے۔ فاتحہ پڑھی اور پھر مسجد اقصیٰ پہنچے۔ مغرب کی نماز وہیں ادا کی۔ نماز کے بعد مسجد اقصیٰ میں محفل اسراء منعقد ہوئی جس میں قرآن کریم کی تلاوت اور نعت خوانی کی گئی، چند اصحاب نے آیات اسراء کی تفسیر بیان کی۔ محفل کے اختتام تک نماز عشاء کا وقت ہو گیا تھا اور مسجد اس وقت پوری طرح بھر چکی تھی۔ سب نے نماز عشاء پڑھی۔ فراغت کے بعد مفتی سید امین الحسینی نے اپنا افتتاحی خطبہ پڑھتے ہوئے فرمایا:

> اس مؤتمر کے انعقاد کا مقصد ہے کہ ہم کسی امت یا دین پر دراز دستی کرنا چاہتے ہیں نہ ہی ہم کسی سے مخاصمت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ بلکہ ہمارا مقصد تو یہ ہے کہ مسلمان یک جان اور یک آہنگ ہو کر اپنے مصالح کے لیے جدوجہد کریں۔

ان کے بعد اقبال سمیت بعض مندوبین نے مختصر تقاریر کیں اور داعیان مؤتمر کی مساعی کا شکریہ ادا کیا۔ آخر میں مصر کے ڈاکٹر عبدالحمید سعید بے نے برکت مقام کے پیش نظر اراکین سے

التماس کی کہ سب کھڑے ہو کر اللہ تعالیٰ سے عہد کریں کہ وہ مقاماتِ مقدسہ کی حفاظت کے لیے اپنی جانیں تک قربان کر دیں گے۔ اس پر سب نے کھڑے ہو کر عہد کیا اور اللہ اکبر کے فلک شگاف نعروں کے ساتھ یہ تقریب رات کے دس بجے اختتام پذیر ہوئی۔

۷ دسمبر ۱۹۳۱ء کو مؤتمر کا اجلاس شروع ہوا۔ عارضی صدر اور سیکرٹریوں کے انتخاب کے لیے اہل عرب کے اصول پر عمل کیا گیا۔ یعنی مجمع میں سب سے معمر شخص صدر منتخب ہوئے۔ اور سب سے کم عمر دو مندوب، سیکرٹریوں کے طور پر چنے گئے۔ مفتی سید امین الحسینی کو مستقل صدر کی حیثیت سے اتفاق رائے سے منتخب کیا گیا۔ اقبال، محمد علی پاشا (مصر)، سید ضیاء الدین طباطبائی (ایران) اور سید محمد زبارہ (یمن) نائب صدر منتخب ہوئے۔

اقبال نے مؤتمر کے اجلاسوں میں ۷ دسمبر ۱۹۳۱ء سے لے کر ۱۴ دسمبر ۱۹۳۱ء تک شرکت کی اور اس دوران میں پانچ کمیٹیوں کی رپورٹوں یا پیش کردہ قراردادوں پر اپنی رائے کا اظہار کیا۔ مسجد اقصیٰ کمیٹی کی سفارش تھی کہ بیت المقدس میں تعلیم کے لیے ایک ایسی یونیورسٹی قائم کی جائے۔ جو تمام عالم اسلام کے مسلم طلبہ کو غیر ملکی یونیورسٹیوں سے بے نیاز کر دے۔ اقبال کو اس یونیورسٹی کے قیام سے اختلاف تھا۔ وہ کسی ایسی قدیم طرز کی یونیورسٹی کے قیام کے خلاف تھے۔ جس میں صرف علوم دینیہ کی تعلیم دی جائے۔ ان کی رائے میں ایسی یونیورسٹی میں جدید و قدیم دونوں قسم کے علوم کی دور جدید کے تقاضوں کے مطابق تعلیم دینا ضروری تھا۔ دوم، ان کے خیال میں تجویز نا قابل عمل تھی کیونکہ یہ توقع نہ رکھی جا سکتی تھی کہ عالم اسلام کے تمام مسلم طلبہ تعلیم کی خاطر صرف اس یونیورسٹی کی طرف رجوع کریں گے۔ سو ان کی نظر میں تعلیمی اعتبار سے بیت المقدس کو وہ اہمیت حاصل نہ تھی جو مدینہ منورہ، قاہرہ، تہران اور دمشق کو حاصل تھی۔ نیز بیت المقدس میں صیہونی خطرہ بھی تھا جو شہر کے امن و سکون کو ختم کر سکتا تھا۔

بیت المقدس میں اپنے قیام کے دوران میں اقبال نے مسلم یتیموں اور معذوروں کی درس گاہ دار الایتام اور اس کے مختلف شعبوں کا معائنہ کیا اور فلسطینی بوائے اسکاؤٹوں کے عربی قومی گیت سنے۔ ایک شب مسلم طلبہ نے فتح اندلس کے موضوع پر ڈرامہ پیش کیا۔ جسے دیکھ کر اقبال بہت خوش ہوئے۔ حاضرین نے اصرار کیا کہ اقبال بھی اپنے اشعار سنائیں۔ سو موقع کی مناسبت سے انہوں نے طارق فاتح اندلس سے متعلق اپنے چند فارسی اشعار سنائے جن کا عربی ترجمہ ایک عراقی مجتہد نے کیا۔

اقبال نے بیت المقدس میں مختلف مقاماتِ مقدسہ کی زیارت میں کچھ وقت گزارا۔ جبل

زیتون جہاں ایک روایت کے مطابق حضرت عیسیٰ نے وعظ کیا تھا، حضرت مریمؑ کا روضہ، بستان جسمانیہ جہاں حضرت عیسیٰ کو گرفتار کر دیا گیا، حضرت زکریا اور حضرت داؤد علیہما السلام کے فرزند کی قبریں، بیت المقدس شہر کے دروازے اور دیگر مقامات کی زیارت کی۔ اقبال نے ۱۴ دسمبر ۱۹۳۱ء تک مؤتمر کے اجلاسوں میں شرکت کی۔ قانون اساسی کمیٹی اور تبلیغ دین کمیٹی کے اجلاسوں میں شریک نہ ہو سکے، کیونکہ وہ ان کی روانگی کے بعد منعقد ہوئے۔ ۱۴ر دسمبر ۱۹۳۱ء کی شام کو انہوں نے مؤتمر کے مندوبین سے الوداعی خطاب کیا۔ خطبہ انگریزی میں تھا لیکن اس کا عربی ترجمہ ساتھ ساتھ عبدالرحمن عزام کرتے گئے۔ اقبال نے فرمایا:

افسوس کہ میں مؤتمر کے اختتام تک نہیں ٹھہر سکتا اور مجھے اس کا بھی افسوس ہے کہ عربی زبان پر پوری قدرت نہ ہونے کے سبب مباحث میں بھی زیادہ حصہ نہ لے سکا۔ میری آرزو ہے کہ ایک مرتبہ پھر مقامات مقدسۂ اسلامیہ فلسطین کی زیارت کروں جو انبیاء کی سرزمین ہے میں آپ لوگوں کو اس روحِ اخوت و مودّت پر مبارکباد پیش کرتا ہوں جس کا مظاہرہ مسلسل ہوتا رہا۔ ہم پر واجب ہے کہ اپنے نوجوانوں کو سلامتی کی راہ پر چلائیں۔ اسلام کو اس وقت دو طرف سے خطرہ ہے۔ ایک الحاد مادی کی طرف سے اور دوسرا وطنی قومیت کی طرف سے۔ ہمارا فرض ہے کہ ان دونوں خطروں کا مقابلہ کریں اور میرا یقین ہے کہ اسلام کی روح ان دونوں خطروں کو شکست دے سکتی ہے۔ وطنی قومیت یا وطنیت بجائے خود بُری چیز نہیں، لیکن اگر اس میں خاص اعتدال ملحوظ نہ رکھا جائے۔ اور افراط و تفریط ہو جائے تو اس میں بھی دہریت اور مادہ پرستی کے پیدا ہونے کے امکانات موجود ہیں۔ میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ آپ دل سے مسلمان بنیں مجھے اسلام کے دشمنوں سے نہیں، بلکہ خود مسلمانوں سے اندیشہ ہے۔ آنحضرتؐ کی ایک نہایت پیاری حدیث یاد آئی ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ **انا خطیکم من الانبیا و انتم خطی من الامم** میں جب کبھی سوچتا ہوں شرم و ندامت سے میری گردن جھک جاتی ہے کہ کیا ہم مسلمان آج اس قابل ہیں کہ رسول اللہؐ ہم پر فخر کریں، ہاں، جب ہم اس نور کو اپنے دلوں میں زندہ کر لیں گے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم میں داخل کیا تھا تو اس وقت اس قابل ہو سکیں گے کہ حضورؐ ہم پر فخر کریں۔ مؤتمر کی ذمہ داریاں بہت بڑی ہیں۔ اس کے سامنے اہم کام ہیں۔ خاص طور پر حجاز ریلوے کی واپسی اور جامعہ اسلامیہ کا قیام۔ لیکن اگر ہم اسلام و اخوت کی سچی روح سے معمور ہو کر کام کریں گے تو اپنے مقاصد حاصل کر لیں گے۔ اپنے وطنوں کو واپس جاؤ تو روحِ اخوت کو ہر جگہ پھیلا دو اور اپنے نوجوانوں پر خاص توجہ دو۔ ہمارا مستقبل خاص انہی کی مساعی پر

موقوف ہے۔ میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ عرب کے نوجوانوں میں میں نے وہ روح دیکھی ہے جو اٹلی کے نوجوانوں کے سوا کہیں نہیں دیکھی۔ عربی نوجوان بلندی مرتبت کی روحِ صادق سے معمور ہیں۔ میرا عقیدہ ہے کہ اسلام کا مستقبل عرب کے مستقبل کے ساتھ وابستہ ہے اور عرب کا مستقبل عرب کے اتحاد پر موقوف ہے۔ جب عرب متحد ہو جائیں گے تو اسلام کامیاب ہو جائے گا۔ ہم سب پر واجب ہے کہ اس باب میں ساری قوتیں صرف کریں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں کامیابی عطا کرے گا۔

عرب کے اتحاد کے متعلق اقبال نے جاوید نامہ میں مہدی سوڈانی کے منہ سے اپنے عقیدے کا اظہار پہلے ہی کر دیا تھا، گو اقبال کی یہ تصنیف ابھی زیر طباعت تھی۔

١٥/ دسمبر ١٩٣١ء کی صبح کو اقبال اور غلام رسول مہر بیت المقدس سے روانہ ہوئے۔ مفتی سید امین الحسینی، سید ضیاء الدین طباطبائی، سعید شامل اور دیگر اصحاب انہیں الوداع کہنے کے لیے اسٹیشن پر آئے۔ چھ بجے شام گاڑی قنطرہ پہنچی، وہاں سے ڈاکٹر سلیمان کی کار میں بیٹھ کر پورٹ سعید گئے۔ سفر کے دوران میں اقبال کی طبیعت ناساز ہو گئی، تاہم ڈاکٹر سلیمان کے علاج سے وہ اگلے روز ٹھیک ہو گئے۔ پورٹ سعید میں ١٦/ دسمبر ١٩٣١ء کی رات کا کھانا انہوں نے ڈاکٹر سلیمان اور ان کی جرمن بیگم کے ساتھ کھایا۔ ١٧/ دسمبر ١٩٣١ء کی شب صدیق محمد ناڑو کی دعوت میں شریک تھے اور وہیں اطلاع ملی کہ جہاز بندرگاہ پر لگ گیا ہے۔ سوا سی رات تقریباً بارہ بجے ''پلسنا'' نامی جہاز میں سوار ہو گئے۔

١٨/ دسمبر ١٩٣١ء کو صبح چار بجے جہاز پورٹ سعید سے روانہ ہوا۔ اس جہاز میں مہاتما گاندھی ہندوستان جا رہے تھے۔ اُن کے علاوہ دیگر معروف شخصیتیں بھی اسی جہاز میں سفر کر رہی تھیں۔ مثلاً حیدر آباد دکن کے شہزادہ اعظم جاہ، شہزادہ معظم جاہ اور ان دونوں کی بیگمات، شہزادی درشہوار اور شہزادی نیلوفر، ان کی والدہ معزول سلطان ترکی عبدالمجید خان کی بیگم اور بیگم اکبر حیدری وغیرہ۔ عدن کی بندرگاہ پر جہاز چند گھنٹوں کے لیے رکا اور اقبال گھنٹہ بھر سیر کے لیے اترے۔

٢٨/ دسمبر ١٩٣١ء کی صبح کو جہاز بمبئی پہنچ گیا۔ ٢٩/ دسمبر ١٩٣١ء کی شام کو گاڑی دہلی اسٹیشن پر پہنچی۔ ٣٠ دسمبر ١٩٣١ء کو صبح آٹھ بجے گاڑی لاہور پہنچی۔ اسٹیشن پر ہجوم اس قدر زیادہ تھا کہ سپاسنامہ پیش کرنے والے اسے پڑھ بھی نہ سکے۔ بے شمار لوگوں نے اقبال کو پھولوں کے

ہاروں سے لاد دیا اور اسی حالت میں گھر پہنچے۔

یکم جنوری ۱۹۳۲ء کو روزنامہ سول اینڈ ملٹری گزٹ کے نمائندے نے ان سے گھر پر ملاقات کی اور سفر فلسطین کے متعلق سوالات پوچھے۔ اقبال نے کہا:

سفر فلسطین میری زندگی کا نہایت دلچسپ واقعہ ثابت ہوا ہے۔ فلسطین کے زمانۂ قیام میں متعدد اسلامی ممالک کے نمائندوں سے ملاقات ہوئی۔ شام کے نوجوان عربوں سے مل کر میں خاص طور پر متاثر ہوا۔ ان نوجوانانِ اسلام میں اس قسم کے خلوص و دیانت کی جھلک پائی جاتی تھی۔ جیسی میں نے اطالیہ میں فاشسٹ نوجوانوں کے علاوہ کسی میں نہیں دیکھی۔ میں نے اسلام، عیسائیت اور صیہونیت کے بعض مشترکہ مقامات مقدسہ کی زیارت کی۔ خصوصاً حضرت عیسیٰ کے مقام ولادت سے میں بہت متاثر ہوا۔ مجھے یقین ہے کہ فلسطین کو یہودیوں کا وطن بنانے کی اسکیم بالآخر ناکام رہے گی۔ مؤتمر شاندار طریق سے کامیاب رہی۔ اس عظیم الشان اجتماع میں اکثر اسلامی ممالک نے نمایندے شریک ہوئے اور اسلامی اخوت اور ممالک اسلامی کہ آزادی کے مسائل پر مندوبین نے بے حد جوش وخروش کا اظہار کیا۔ میں بہت سی سب کمیٹیوں کا رکن تھا۔ جو بعض تجاویز پر بحث کرنے کے لیے مقرر کر گئی تھیں...... ایک سب کمیٹی میں میں نے یروشلم میں قدیم جامعہ ازہر کی طرز پر ایک اسلامی یونیورسٹی کے قیام کی مخالفت کی اور اس بات پر زور دیا کہ مجوزہ یونیورسٹی بالکل جدید طرز پر قائم کی جائے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ غلط فہمی کیونکر پیدا ہوگئی کہ میں یروشلم میں کسی قسم کی یونیورسٹی کے قیام کا حامی نہیں ہوں۔ رائٹر نے ایک تار بھیج دیا تھا جس کا مفہوم یہی تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میری یہ پرُ زور خواہش ہے کہ عربی زبان بولنے والے لوگ صرف ایک ہی نہیں بلکہ کئی یونیورسٹیاں قائم کر کے علوم جدیدہ کو زبانِ عربی میں تبدیل کرلیں۔

نمائندہ مذکورہ کو گول میز کانفرنس کے متعلق سوالات کا جواب دیتے ہوئے اقبال نے واضح کیا:

میں نے کانفرنس سے استعفا نہیں دیا بلکہ صرف مسلم وفد سے علیحدگی اختیار کی تھی۔ اور میں نے یہ بات آل انڈیا مسلم کانفرنس کے فیصلے کے ماتحت کی تھی ...... مسلمانوں کے لیے جداگانہ طریقِ انتخاب، صوبہ سرحد اور سندھ کے مسائل پر عملی طور پر بحث وتمحیص ختم ہو چکی ہے دارالعوام میں وزیر اعظم اور سر سیمول ہور نے ان کے متعلق واضح بیان دے دیا ہے۔ اب جس مسئلہ کا تصفیہ باقی ہے۔ وہ پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی آئینی اکثریت کا مسئلہ ہے۔

واپسی پر اقبال مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ کے اجلاس میں شرکت کے لیے ۸ جنوری

۱۹۳۲ء کی صبح کو دہلی پہنچے۔ سید نذیر نیازی شام تک ان کی خدمت میں رہے اور وہ اسی رات واپس لاہور چلے آئے۔ اسی طرح پھر ۳۰ جنوری ۱۹۳۲ء کو دہلی جانے کے لیے تیار ہوئے، لیکن چونکہ نقرس کی تکلیف بڑھ جانے کے سبب گرگابی نہ پہنی جاتی تھی، اس لیے غلام رسول مہر کی وساطت سے ورکنگ کمیٹی اور سیٹھ عبداللہ ہارون کی خدمت میں معذرت کر دی۔

فروری ۱۹۳۲ء میں اقبال کی معروف تصنیف جاوید نامہ شائع ہوئی۔ اس کا تصور ۱۹۲۷ء سے ان کے ذہن میں تھا، لیکن لکھنے کا کام ۱۹۲۹ء میں شروع کیا گیا۔ اس کے موضوع کے متعلق انہوں نے خود ہی گذشتہ سال لندن میں انڈیا سوسائٹی کی تقریب میں ارشاد کیا تھا کہ یہ حقیقت میں ایشیا کی ''ڈیوائن کامیڈی'' ہے۔ اس کا اسلوب یہ ہے کہ شاعر مختلف سیّاروں کی سیر کرتا ہوا مختلف مشاہیر کی روحوں سے مل کر باتیں کرتا ہے۔ پھر جنت میں جاتا ہے اور آخر میں خدا کے روبرو پہنچتا ہے۔ اس تصنیف میں دور حاضر کے تمام جماعتی، اقتصادی، سیاسی، مذہبی اخلاقی اور اصلاحی مسائل زیر بحث آ گئے ہیں۔ روداد میں دو شخصیتیں یورپ کی ہیں۔ اوّل کچنر اور دوم نطشے، باقی ساری شخصیتیں ایشیا کی ہیں۔ اس معراج نامے یا آسمانی ڈرامے میں اقبال کی خضر طریق یا رفیق سفر مولانا رومی ہیں۔

فروری ۱۹۳۲ء ہی میں ہندوستان کے اخباروں میں خبر شائع ہوئی کہ ترکی میں مصطفی کمال نے ترکی زبان میں قرآن کریم کی تلاوت اور ادائیگی نماز کے متعلق ایک حکم نافذ کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں ایک اخباری نمائندہ اقبال سے بھی ملا اور ان کا انٹرویو ویکلی اخبار لائٹ (انگریزی) مورخہ ۱۶ فروری ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا۔ اقبال سے سوال پوچھا گیا کہ کیا مصطفی کمال کے نافذ کردہ قانون کی تاریخ اسلام میں کوئی مثال یا سند موجود ہے؟ اقبال نے جواب دیا کہ ایک مرحلے پر امام ابوحنیفہؒ نے فتویٰ دیا تھا کہ ہر مسلمان اپنی زبان میں نماز ادا کر سکتا ہے، مگر بعد میں بستر مرگ پر انہوں نے اپنا فتویٰ منسوخ کر دیا۔ ابن طومارت نے بھی جنہیں مغربی افریقہ کے مہدی کے لقب سے پکارا جاتا ہے۔ اسی قسم کا قانون نافذ کیا تھا۔ لہٰذا جب ان کے مریدوں نے اندلس (اسپین) میں اقتدار حاصل کیا تو وہ بربر زبان میں اذان دیا کرتے تھے۔ اقبال کی رائے میں مصطفی کمال کا یہ فعل ترقی پسندانہ نہ تھا، بلکہ رجعت پسندانہ تھا۔ زمانۂ قدیم کے تمام مذاہب نیشنل یا قومی ہوتے تھے۔

فروری ۱۹۳۲ء کے آخر میں نواب بھوپال نے اقبال کو دہلی بلوایا۔ بات یہ تھی کہ مہاراجہ

ہری سنگھ نے مسئلہ کشمیر کے حل کے سلسلے میں نواب بھوپال سے مدد طلب کی تھی اور نواب بھوپال اس بارے میں اقبال سے مشورہ کرنا چاہتے تھے۔ اسی سلسلے میں نواب بھوپال کے بلانے پر وہ دہلی جانا تو ضرور چاہتے تھے لیکن راقم کی علالت کے باعث جا نہ سکے۔ اور اپنے ایک خط محرّرہ ۲۹ فروری ۱۹۳۲ء بنام غلام رسول مہر فرمایا کہ وہ راقم کی علالت کے باعث دہلی نہیں جا سکتے۔

راقم بچپن میں بے حد شریر تھا اور پڑھائی میں بھی کوئی دلچسپی نہ لیتا۔ اس لیے سردار بیگم سے مار کھانا اس کا معمول بن چکا تھا۔ وہ کھانے میں تو بلاشبہ سونے کا نوالہ دیتیں، لیکن دیکھتیں قہر کی نظر سے راقم کو یاد نہیں کہ انہوں نے اس پر کبھی ایسی شفقت یا محبت کا اظہار کیا ہو، جس کی توقع بچے اپنی ماؤں سے رکھتے ہیں۔ البتہ راقم کی شنید کے مطابق وہ جب کبھی بھی اسے پیار کرتیں تو سوتے کے عالم میں تاکہ راقم کو پتا نہ چلے۔ شاید اسی سبب بچپن میں راقم کے ذہن میں بعض اوقات یہ خیال گزرتا کہ اس کی ماں دراصل حقیقی ماں نہیں بلکہ سوتیلی ماں ہے۔ مگر کسی اور کو جرأت نہ تھی کہ راقم کو ہاتھ لگا سکے۔ اگر اقبال بھی کبھی راقم کی کسی شرارت پر اسے مارنے کے لیے ہاتھ اٹھاتے تو سردار بیگم بیچ میں آ کھڑی ہوتیں اور انہیں روک دیتیں۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ راقم کسی کو بتائے بغیر چپکے سے چند لڑکوں کی معیت میں کوٹھی کے قریب ایک سینما گھر میں فلم دیکھنے کے لیے گھس گیا۔ رات کے نو بجنے کو آئے لیکن فلم ختم نہ ہوئی اور اس لیے راقم گھر نہ پہنچا۔ گھر والے سخت پریشان تھے کہ کہاں غائب ہو گیا اور سب سے زیادہ پریشانی سردار بیگم کے بعد اقبال کو تھی۔ کوئی ساڑھے نو بجے کے قریب جب راقم چھپتے چھپاتے گھر پہنچا تو دیکھا کہ ہر طرف افراتفری کا عالم طاری ہے۔ راقم کے دیر سے گھر پہنچنے کی خبر بجلی کی طرح کوندگئی، اور آناً فاناً وہ اقبال کے حضور میں کھڑا تھا۔ اقبال غُصّے کے شدت سے کانپ رہے تھے۔ انہوں نے راقم کو مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ سردار بیگم بیچ میں آ کھڑی ہوئیں۔ اب ایک طرف اقبال تھے اور دوسری طرف راقم۔ وہ غصّے کے عالم میں اسے مارنے کے لیے ایک ہاتھ اٹھاتے لیکن سردار بیگم لپک کر ان کا ہاتھ پکڑ لیتیں۔ راقم خوف کے مارے ان کی ٹانگوں سے چمٹا ہوا تھا۔ یہ مشق کوئی تین چار منٹ تک جاری رہی۔ حتیٰ کہ سردار بیگم کو سراسیمگی کے عالم میں یوں اُچک اُچک کر ان کے ہاتھ پکڑتے دیکھ کر اقبال کو ہنسی آ گئی۔

بہرحال راقم نے اقبال سے بہت کم مار کھائی ہے۔ اس کے لیے ان کی جھڑک ہی کافی ہوا کرتی۔ گرمیوں میں دوپہر کے وقت دھوپ میں ننگے پاؤں پھرنے، نوکروں کو بُرا بھلا کہنے یا

جھوٹ بولنے پر راقم کو کئی بار کوسا گیا۔ اقبال جب کبھی بہت برہم ہوتے تو ان کے منہ سے ہمیشہ یہی الفاظ نکلتے ''احمق آدمی۔ بیوقوف''۔ غصہ کے عالم میں بعض اوقات پنجابی یا اردو کی بجائے انگریزی بولنے لگتے تھے۔ راقم نے ایک دو مرتبہ اُن سے جوتے بھی کھائے ہیں۔ لیکن جب جوتے سے مارتے تو تلے کی طرف سے نہیں بلکہ نرم چمڑے والی طرف سے مارتے۔

۶/مارچ ۱۹۳۲ء کو لاہور کی ایک علمی مجلس اسلامک ریسرچ سوسائٹی نے اقبال کی زندگی میں پہلی بار وائی۔ ایم۔ سی۔ اے ہال میں یوم اقبال منایا جس میں بعض اصحاب نے تقریریں کیں یا مقالے پڑھے۔ اس سے اگلے روز یعنی ۷ مارچ ۱۹۳۲ء کی شام کو اقبال کے اعزاز میں لاہور کے ریستوران ''لورینگز'' میں دعوتِ چائے دی گئی جس میں شہر کے معززین نے شرکت کی۔

۱۹۳۲ء ہی میں اقبال آل انڈیا مسلم کانفرنس کے صدر منتخب ہوئے اور ۲۱/مارچ ۱۹۳۲ء کو مسلم کانفرنس کے افتتاحی اجلاس منعقدہ بیرون دہلی دروازہ لاہور میں انہوں نے اپنا معروف خطبہ صدارت پڑھا۔ یہ معرکۃ الآرا خطبہ اقبال کی دوسری اہم سیاسی دستاویز ہے، جسے برصغیر کی مسلم سیاسیات کا کوئی بھی طالب علم نظر انداز نہیں کر سکتا۔

خطبہ کی ابتداء میں انہوں نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور فرمایا:

جہاں تک ہماری پالیسی کے بنیادی اصولوں کا تعلق ہے، میں آپ کے روبرو کوئی تازہ چیز پیش نہیں کر رہا۔ اُن کے متعلق میں پہلے ہی اپنے خیالات کا اظہار آل انڈیا مسلم لیگ کے خطبہ میں کر چکا ہوں۔

خطبے میں دوسری گول میز کانفرنس کی کارروائیوں کی تفصیل بیان کی گئی۔ برطانوی حکومت کی سیاسی پالیسی پر تنقید ہوئی اور مہاتما گاندھی یا کانگرس کے مسلمانوں کے ساتھ مخالفانہ روّیے پر تبصرہ کرتے ہوئے فیڈرل سنٹر کی تشکیل میں عدم دلچسپی کا اظہار کیا گیا۔ پھر صوبہ سرحد میں انگریزی حکومت کی سخت گیری اور کشمیر میں مسلمانوں پر تشدد اور استحصال کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر تم اپنے نصب العین کی تحصیل ہوتے دیکھنا چاہتے ہو تو اپنی خودی صرف اپنی ذات پر مرتکز کرو۔ اور اس کی تپش سے اپنی خاک کو پختہ بناؤ۔ مسولینی کا قول تھا کہ جس کے پاس لوہا ہے اس کے پاس روٹی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جو خود لوہا ہے اس کے پاس سب کچھ ہے سو سخت بن جاؤ اور سخت کوشی اختیار کرو۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا یہی

اصل راز ہے۔ ہمارا واضح نصب العین یہ ہے کہ آنے والے دستور میں اسلام کے لیے ایسا مقام اور ایسی حیثیت حاصل کریں کہ وہ اس ملک میں اپنی تقدیر کے منشا کو پورا کرنے کے مواقع پا سکے۔ اس نصب العین کی روشنی میں لازم ہے کہ قوم کی ترقی پسند طاقتوں کو بیدار کیا جائے اور اس کی خوابیدہ قوتوں کو منظم کیا جائے۔ شعلۂ حیات دوسروں سے مستعار نہیں لیا جا سکتا، وہ صرف اپنی روح کے آتش کدہ ہی میں روشن کیا جا سکتا ہے۔

اقبال نے مستقبل میں مسلمانوں کے سیاسی پروگرام کے سلسلے میں ایک پنج نکاتی لائحہ عمل پیش کیا۔ اس کا پانچواں نکتہ یہ تھا کہ علماء کی ایک مجلس قائم کی جائے جس میں ایسے وکلاء بھی شامل ہوں، جنہوں نے ماڈرن جورس پروڈنس کی تعلیم حاصل کر رکھی ہو۔ اس تجویز کا مقصد اسلامی قانون کا تحفّظ اس کی توسیع اور وقت کے جدید تقاضوں کے مطابق اس کی تعمیر نو تھا۔ اس مجلس کو ایسی آئینی حیثیت حاصل ہونی چاہیے کہ مسلمانوں کے شخصی قانون کو متاثر کرنے والا کوئی بھی مسودۂ قانون اس کی منظوری کے بغیر قانون ساز اداروں میں پیش نہ کیا جا سکے۔ اس سلسلہ میں اقبال نے فرمایا:

> مسلمانانِ ہند کے لیے اس تجویز کی خالص عملی قدر و قیمت سے قطعِ نظر ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ جدید مسلم اور غیر مسلم دنیا کو ابھی اسلام کے قانونی اَدب کی لامتناہی قدر و قیمت دریافت کرنا ہے اور سرمایہ دارانہ نظام، جس کے اخلاقی معیار ایک عرصے سے انسان کے معاشی طریق کار کی نگرانی سے دست بردار ہو چکے ہیں، اس کی افادیت سے آگاہ ہونا ہے۔

آل انڈیا مسلم کانفرنس نے اپنے دو روزہ اجلاس زیر صدارت اقبال میں کئی قراردادیں منظور کیں۔

پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کے حق اکثریت کو بروئے کار لانے کا مطالبہ مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس کئی بار اپنی قراردادوں میں کر چکی تھیں۔ اقبال اس مطالبے کے زبردست حامی تھے۔ لہٰذا انہوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں نہ صرف اس مطالبے کو دہرایا بلکہ مسلم مطالبات کی عدم منظوری کی صورت میں راست اقدام کی دھمکی بھی دی۔ ہندو اور سکھ اس مطالبے کے سخت مخالف تھے، اس لیے اقبال کے خطبے کے بعد انہوں نے اس معاملے کے خلاف اپنی پروپیگنڈا مہم تیز کر دی۔ اس کے جواب میں اقبال نے چند رفقا کے ساتھ ۲۰ اپریل ۱۹۳۲ء کو ایک مشترکہ بیان جاری کیا۔

۸ جون ۱۹۳۲ء کو مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ کا اجلاس شملہ میں منعقد ہوا۔ اقبال نے اس کی صدارت کی اور چند قراردادیں ریاست الور کے متعلق اور صوبوں کو مالی خودمختاری دیے جانے کے بارے میں منظور کی گئیں۔ اسی ماہ میں پنجاب یونیورسٹی میں تاریخ کے ایک انگریز پروفیسر نے ہندوؤں کے زیراثر آ کر تجویز پیش کی کہ اسلامی تاریخ کو بی۔اے کے پاس کورس سے حذف کرایا جائے۔ سینٹ کے مسلم ممبران کی مخالفت کے باوجود یہ تجویز ایک ووٹ کی اکثریت سے منظور ہوئی۔ اس پر پنجاب کے مسلمان بڑے مضطرب ہوئے اور متعدد جلسوں میں اس فیصلے کی شدید مذمت کی گئی۔ اس ضمن میں ایک جلسہ زیراہتمام اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ باغ بیرون موچی دروازہ میں ۱۱ جون ۱۹۳۲ء کو منعقد ہوا، جس کی صدارت اقبال نے کی۔ انہوں نے اپنی تقریر میں ارشاد کیا:

> میرا آج تک یہی خیال تھا کہ مسلمان نوجوانوں کے دلوں پر غفلت کے گہرے پردے پڑے ہوئے ہیں اور وہ تمدّن و تاریخ اسلام سے ایسے ہی ناواقف ہیں۔ جیسے کوئی غیر مسلم۔ چند ماہ ہوئے مجھے مصر اور فلسطین جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ وہاں کے واقعات سے مجھے یقین ہوگیا کہ غفلت کے پردے اٹھ چکے ہیں۔...... مسٹر بروس کی تجویز ہے کہ اسے (تاریخ اسلامی کو) پاس کورس سے خارج کیا جائے۔ پاس کورس میں طلبہ کی زیادہ تعداد ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کورس سے اسلامی تاریخ کو خارج کرنے کی تجویز پیش کی گئی ہے۔ عقل انسانی جب شرارت پر اتر آئے تو اپنے اندرونی جذبات اور محرکات سے کام لے کر اپنے مقصد کی تکمیل پر متوجہ ہو جاتی ہے...... جب میں اٹلی گیا تو مجھے ایک شخص پرنس کیتانی ملا۔ وہ اسلامی تاریخ کا بہت دلدادہ ہے۔ اس نے تاریخ پر اتنی کتابیں لکھی ہیں اور اس قدر روپیہ خرچ کیا ہے کہ کوئی اسلامی سلطنت اس کے ترجمے کا بندوبست بھی نہیں کر سکتی۔ جب میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کو اسلامی تاریخ میں دلچسپی کیوں ہے تو انہوں نے کہا کہ اسلامی تاریخ عورتوں کو مرد بنا دیتی ہے۔......

پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ مسلم کانفرنس کے اجلاس منعقدہ ۲۲ / ۲۱ مارچ ۱۹۳۲ء میں ایک قرارداد یہ منظور کی گئی تھی کہ اگر حکومت برطانیہ نے فرقہ وارانہ فیصلے کا اعلان اواخر جون تک نہ کیا تو مسلم کانفرنس کا ایگزیکٹو بورڈ ایک جلسہ ۳ جولائی ۱۹۳۲ء کو منعقد کر کے راست اقدام کا پروگرام طے کرے گا۔ اقبال نے بحیثیت صدر مسلم کانفرنس مجلس عاملہ کے بعض ممبران سے مشورہ کے بعد اس جلسے کو جولائی کے آخر تک ملتوی کر دیا۔ اس پر مختلف حلقوں میں بڑی لے دے ہوئی، اور اقبال پر الزام لگایا گیا کہ ان کا رویہ ڈکٹیٹرانہ تھا یا انہوں نے شملہ (یعنی انگریزی

حکومت) کے اشارے پر اجلاس ملتوی کر دیا۔ نتیجہ میں ۴؍جولائی ۱۹۳۲ء کو الہ آباد میں مسلم کانفرنس کے بعض مقتدر اراکین نے ایک اجلاس عام منعقد کیا، جس میں اقبال کے اعلان التوا کے خلاف احتجاج کیا گیا۔ نیز مولانا حسرت موہانی اور چند دیگر زعماء نے تجویز پیش کی کہ مسلم کانفرنس کے اندر ایک نئی جماعت بنائی جائے۔

اپنے خلاف اس احتجاجی جلسے یا نئی جماعت سازی کے فیصلے پر ناراضگی کا اظہار کرنے کی بجائے اقبال نے اپنے ۶ جولائی ۱۹۳۲ء کے بیان میں مولانا حسرت موہانی کی تجویز کو سراہتے ہوئے نئی جماعت کا خیر مقدم کیا اور واضح کیا کہ یہ طرزِ عمل ان کی اپنی تجویز کے عین مطابق ہے جو انہوں نے مسلم کانفرنس کے خطبہ ٔصدارت میں پیش کی تھی، یعنی مسلمانوں کی واحد سیاسی تنظیم کے آئین میں اتنی گنجائش ہو کہ اس میں ہر سیاسی مکتب فکر کو برسر اقتدار آنے کا موقع مل سکے۔ اقبال نے واضح کیا کہ جلسہ آمرانہ طور پر ملتوی نہیں کیا گیا، بلکہ مجلس عاملہ کے اجلاس میں، جس میں وہ خود شریک نہ تھے، مولانا شفیع داؤدی کو بحیثیت سیکرٹری جنرل اختیار دیا گیا تھا کہ اگر فرقہ وارانہ فیصلے کا اعلان ۳ جولائی ۱۹۳۲ء تک نہ ہوا تو وہ اپنے طور پر ایگزیکٹو بورڈ کا جلسہ ملتوی کر سکتے ہیں۔

اسی دوران میں مولانا شفیع داؤدی نے اپنے عہدے سے استعفا دے دیا۔ چند دنوں بعد نئی جماعت کے بانیوں نے اقبال سے ملاقات کی اور ان کی رائے کی تائید کی کہ اس مرحلے پر بورڈ کا اجلاس ملتوی کرنا مناسب تھا۔

۱۹؍جولائی ۱۹۳۲ء کو اقبال عید میلاد النبی کی تقریب میں حصہ لینے کے لیے جالندھر گئے۔ وہاں کے لوگوں نے ایک عظیم الشان جلوس نکالا۔ بعد میں جلسہ ہوا۔ جس میں اقبال نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سیرت کے متعلق ایک ایسی جامع تقریر کی کہ اہل جالندھر کے ایمان تازہ ہو گئے۔ پھر ان کے اعزاز میں چائے پارٹی ہوئی اور سپاسنامہ پیش کیا گیا۔ شام کو واپس لاہور پہنچے۔

دوسری گول میز کانفرنس میں سکھوں نے اقلیتوں کے ترتیب دیے ہوئے ایک میثاق کی مخالفت کی تھی۔ اقبال نے ان کے طرزِ عمل کے متعلق ایک بیان ۲۵؍جولائی ۱۹۳۲ء کو جاری کیا جس میں مسلمانوں کے مؤقف کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا:

مسلمانانِ ہند جس قدر اپنی جماعت کے مفادات [illegible]ظ کرنے کے لیے مضطرب ہیں اتنے ہی وہ

ملک کی دستوری ترقی کے لیے بے چین ہیں۔ مرکز میں اور ان صوبوں میں جہاں وہ نہایت ہی حقیر اقلیت میں ہیں، اکثریتی حکومت کے اصولوں کو وہ تسلیم کرتے ہیں، بشرطیکہ ان کو اس جائز اور متوازی فائدے سے محروم نہ کر دیا جائے، جو انہیں بعض دیگر صوبوں کے اندر اکثریت میں ہونے کی وجہ سے حاصل ہے۔

اقبال کے بیان پر سکھ مسلم مفاہمت کی کوششوں کا آغاز ہوا۔ ۲۹ر جولائی ۱۹۳۲ء کو اور اس کے بعد ان کے پرانے دوست سردار جوگندر سنگھ نے انہیں پنجاب کی کونسل میں مسلمانوں کو اکثریت دینے کے لیے مختلف اسکیمیں روانہ کیں، لیکن اقبال نے اسے بھی یہ کہہ کر رد کر دیا کہ پنجاب کونسل میں مسلمانوں کی واضح اکثریت ہونی چاہیے، اور اس اصول کو پیشِ نظر رکھے بغیر کسی بھی اسکیم پر غور کرنا یا مذاکرات کرنا بالکل بیکار ہے۔ اس سلسلے میں ۷ر اگست ۱۹۳۲ء کو مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ کا ایک اجلاس دہلی میں زیرِ صدارت اقبال منعقد ہوا، جس میں قرار پایا کہ مسلم لیڈر سکھوں سے اپنی گفت وشنید کو اس وقت تک ملتوی رکھیں جب تک حکومت فرقہ وارانہ فیصلہ کا اعلان نہ کر دے۔ الغرض سکھ مسلم مفاہمت کی گفت وشنید بھی ناکام رہی۔

۱۶ر اگست ۱۹۳۲ء کو وزیر اعظم برطانیہ نے فرقہ وارانہ فیصلے کا اعلان کیا، جس کے سبب سارے برصغیر میں بحث ونزاع کا ہنگامہ برپا ہو گیا۔ ۱۷ر اگست ۱۹۳۲ء کو مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ کے اجلاس میں، جو زیر صدارت اقبال منعقد ہوا، ایک قرارداد کشمیر ایجی ٹیشن کے سلسلے میں احرار کی قید و بند پر احتجاج اور ان کی رہائی کے بارے میں منظور کی گئی۔ مگر تحریک کشمیر جاری رہی۔ ۲۳ر اگست ۱۹۳۲ء کو مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ کا ایک اور اجلاس زیر صدارت اقبال دہلی میں منعقد ہوا جس میں فرقہ وارانہ فیصلے کے متعلق ایک قرارداد منظور کی گئی۔ ۲۴ر اگست ۱۹۳۲ء کو اقبال نے اس قرارداد کی تائید میں ایک اہم بیان جاری کیا جس میں فرقہ وارانہ فیصلے پر اپنے اعتراضات کی وضاحت کی اور فرقہ وارانہ فیصلے میں مسلمانوں کے نقصان کی تلافی کے لیے دو تجاویز پیش کیں۔

فرقہ وارانہ فیصلے میں اچھوتوں کو جداگانہ نیابت دیے جانے کے خلاف مہاتما گاندھی نے ۲۰ر ستمبر ۱۹۳۲ء سے مرن برت رکھا اور اس سے قبل اسی سلسلے میں انہوں نے وزیر ہند اور وزیر اعظم برطانیہ سے خط وکتابت بھی کی۔ اقبال نے اس مراسلت پر تبصرہ اپنے اخباری بیان مورخہ ۱۳ ستمبر ۱۹۳۲ء میں کیا۔ فرمایا:

یہ خطوط شخصی نفسیات کے دلچسپ مظہر ہیں اور اپنی نوعیت کے لحاظ سے مجھے ایسی تحریروں سے بہت کم سابقہ پڑا ہے۔ خطوط میں مجھے جو چیز سب سے نمایاں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ مسٹر گاندھی کے نزدیک ہندو مذہب کی صداقت اخلاقی اور مذہبی مسائل پر مشتمل ہے۔ ذاتی طور پر میں ان خیالات کا بے حد مداح ہوں، لیکن باوجود اس امر کے ہندو اخبارات نے میرے متعلق بدگمانیاں پھیلانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، لیکن میرا ہمیشہ یہی خیال رہا ہے کہ سیاسی مسائل بالخصوص ہندوستان میں مذہبی اور اخلاقی معاملات کے مقابلے میں بالکل بے حقیقت ہو کر رہ جاتے ہیں۔ میرے لیے یہ چیز کوئی تعجب انگیز نہیں کہ ہندوستان کی متحدہ قومیّت کے تخیل کے علمبردار اور ہندوستانی اقلیتوں میں فرقہ وارانہ بیداری (جو سیاسی طاقت کے انتقال کا لازمی نتیجہ ہے) کے اشد ترین مخالف نے نہایت دلیری سے بالخصوص ہندو قومیت کے تحفظ کے مسئلے کی حمایت کو نہایت ضروری خیال کیا۔ یہ صورت حالات مسلمانوں کی آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہے کہ وہ مہاتما جو ملک کی تمام اکثریتوں کو متحدّہ قومیت ہند میں جذب ہو جانے کی تلقین کیا کرتا تھا، آج اسے ایک ایسے فرقہ وار اعلان میں ہندو قوم کا انتشار نظر آ رہا ہے جس کے ذریعے سے مجالس وضع آئین میں ان لوگوں کو محدود نمائندگی حاصل ہونے کا امکان ہے جو خود مہاتما گاندھی کے نزدیک صدیوں تک ہندوؤں کی اونچی جاتیوں کے تختۂ مشق بنے رہے ہیں۔ اگر اچھوتوں کے لیے جداگانہ انتخاب کے یہ معنی ہیں کہ ہندو قوم کے فنا ہونے کا اندیشہ ہے تو مخلوط انتخاب کا مطلب یہ ہوگا کہ جو اقلیتیں اسے اختیار کریں گی وہ صفحۂ ہستی سے نابود ہو جائیں گی۔

بہرحال اچھوتوں کے جداگانہ حق نیابت کے بارے میں حکومت برطانیہ نے فرقہ وارانہ فیصلے میں میثاق پونا کے تحت تبدیلی کر دی۔ میثاق پونا کے متعلق اقبال نے اپنے بیان مورخہ ۲۸ ستمبر ۱۹۳۲ء میں صاف کہہ دیا کہ اس کی رد سے نہ تو اچھوتوں کی جداگانہ نیابت میں فرق آیا ہے اور نہ انہیں ہندو دھرم سے کوئی قرب حاصل ہوا ہے۔

چونکہ ہندو اور مسلمان دونوں فرقہ وارانہ فیصلے سے غیر مطمئن تھے، اس لیے مولانا شوکت علی کو سوجھی کہ اس موقع پر ہندو مسلم مفاہمت کی ایک اور کوشش کی جائے۔ چنانچہ انہوں نے شیخ عبدالمجید سندھی کے ساتھ مل کر مولانا ابوالکلام آزاد اور پنڈت مدن موہن مالویہ سے بمبئی میں گفت وشنید کا آغاز کیا۔ اس گفت وشنید کی خبر اخبارات میں شائع ہوئی اور اقبال نے بحیثیت صدر مسلم کانفرنس اپنے بعض رفقاء کے ساتھ ۱۶ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو ایک مشترکہ بیان جاری کیا۔

ابھی یہ مذاکرات جاری تھے کہ مولانا شوکت علی اور شیخ عبدالمجید سندھی نے اعلان کیا کہ

مسلم لیڈروں کی ایک کانفرنس ۱۵ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو لکھنؤ میں ہوگی۔ اس کانفرنس میں شرکت کی دعوت اقبال کو بھی بھیجی گئی۔ جواب میں انہوں نے اپنے تار مورخہ ۱۸ اکتوبر ۱۹۳۲ء میں تحریر کیا:

باہمی سمجھوتے کی کوشش قابل ستائش ہے، لیکن ہندوؤں کی طرف سے قطعی تجاویز پیش ہوئے بغیر مسلمان رہنماؤں کی کانفرنس منعقد کرنا نقصان رساں ہے۔ افسوس ہے کہ ان حالات میں میں شریک نہیں ہوسکتا۔ میری درخواست ہے کہ آپ کانفرنس کی تجویز پر نظر ثانی فرمائیں۔

۱۸ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو اسی موضوع پر اقبال نے ایک اخباری بیان بھی جاری کیا، جس میں ایسے ہی تاروں اور ان کے جوابات کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ مجوزہ کانفرنس اسلام اور ہندوستان کے مفاد کے لیے مضر اور بالکلیہ تضیع اوقات کا باعث ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس کانفرنس کے داعیان اپنے موقف پر نظر ثانی کریں گے۔

۱۶ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو مجوزہ کانفرنس لکھنؤ میں منعقد ہوئی۔ اقبال نے لکھنؤ کانفرنس کی قرارداد پر اپنے بیان مورخہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۲ء میں تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا:

یہ قرارداد عملاً اسی موقف کو دہراتی ہے جو فرقہ وارانہ گفت وشنید کے متعلق میں نے اختیار کیا تھا، یعنی یہ کہ قطعی تجاویز اکثریتی فرقے کی جانب سے سامنے آنی چاہئیں ......اب ہندووں کی باری ہے کہ وہ بتائیں کہ آیا وہ گفت وشنید کرنے کے لیے تیار ہیں۔

فضل حسین اور سرظفر اللہ خان کے انگریزی حکومت کو مشورہ پر اقبال کو تیسری گول میز کانفرنس کا رکن نامزد کیا گیا۔ تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے روانہ ہونے سے پیشتر اقبال نے اپنے سیاسی موقف کی تشریح کے سلسلے میں ھمدم لکھنؤ کے ایڈیٹر کے نام ایک نہایت اہم خط تحریر کیا۔ اس میں فرمایا کہ اگر آج مسلمانوں نے قبل از وقت جداگانہ انتخاب سے دستبرداری کر لی تو آئندہ کا مورّخ ان کے ہندوستان میں سیاسی اعتبار سے مٹ جانے کے لیے حکومت برطانیہ کو ہرگز مطعون نہ کرے گا، بلکہ خود مسلمانوں کو اس بات کا مجرم قرار دے گا کہ جمہوری نظام میں بحیثیت اقلیت انہوں نے اپنی بربادی اپنے ہاتھوں مول لی۔ مختصراً یہ کہ مفاہمت کی تجاویز مسلمانوں کی طرف سے پیش کرانا، خصوصاً جب کہ مسلمانوں کے مطالبات ایک مدت سے سب کو معلوم ہیں، خلوص اور حب الوطنی کے نیک جذبات کا ثبوت نہیں بلکہ ایک سیاسی حیلہ ہے، جس کا مقصود یہ ہے کہ اکثریت، جس کا فرض ہے کہ اقلیتوں کا اعتماد حاصل کرے، بھی اس کے لیے تیار نہیں۔ موجودہ حالت میں فرقہ وار مسائل کی بحث کو از سر نو چھیڑنا نہ

مسلمانوں کی خدمت ہے نہ ملک کی۔

۱۷ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو اقبال نے ادارۂ معارف اسلامیہ کی بنیاد رکھی اور چند دیگر اہلِ علم حضرات کی معیت میں اس کے اغراض و مقاصد، توسیع کے منصوبے اور طریق عمل وغیرہ کے بارے میں ایک تفصیلی بیان دیا۔ اس بیان کا تمہیدی حصہ قابل غور ہے۔ فرماتے ہیں:

عہد حاضر میں اسلام اور تمدّن اسلامی ہر نزدیک و بعید خطے میں ایک عظیم انقلابی کیفیت سے دوچار ہے۔ ترکی کا اجتہادی اقدام، ایران کا دورِ تجدد، مصر کا جوش اصلاح، افغانستان کا مغربی توغل، غرض عالم اسلام کے جس نقطۂ مدنیت پر نظر ڈالیے حیات کا ایک ہنگامہ زار برپا ہے۔ ممالک اسلامیہ کے یہ تمام تر تغیرات خفی اور جلی ہندوستانی مسلمانوں کے لیے جہاں ایک نوید زندگی کی شادابیوں سے لبریز ہیں وہاں درحقیقت ایک پیام بیداری کی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ یہ پیغام بیداری کیا ہے؟ خالص علمی نقطۂ نظر سے اس کا اور اس کے معنوی اثرات کا تجزیہ کیجیے تو بھی ہماری نگاہوں کو اکثر اہم نتائج سے دوچارہ ہونے کا موقع ملتا ہے، جن میں سے ایک، کم از کم تاریخی اعتبار ہی سے سہی، ماضیات اسلام کا تحفظ بھی ہے یعنی اخلاقی، معاشرتی تمدنی نقاط پر اپنی دماغی قوتوں کو صرف کرنے کے علاوہ جس حد تک ہندوستانی مسلمانوں اور عام مسلمانوں کی قدیم تاریخ کا تعلق ہے۔ از بس ضروری ہے کہ اس مفید سلسلے کی طرف بہترین توجہات منعطف کی جائیں کیونکہ مسلمانوں کو موجودہ دور جمود سے نکالنے اور ان میں ایک معنوی بیداری کی روح پھونکنے کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی تدبیر نہیں ہو سکتی۔

تیسری گول میز کانفرنس کے لیے روانگی سے قبل انہوں نے اخبارات کے لیے اپنے بیان میں فرمایا کہ وہ مسلمانوں سے توقع رکھتے ہیں کہ اس حکمت عملی پر سختی سے کاربند رہیں گے جو آل انڈیا مسلم کانفرنس اور آل انڈیا مسلم لیگ کی قراردادوں میں درج ہے۔ پھر ارشاد کیا:

میں سمجھتا ہوں کہ میں اس سے بہتر اور کچھ نہیں کہہ سکتا کہ مسلمانوں کو قرآن کریم کے بیان کردہ اصول عمل یاد دلاؤں۔ جب تو نے ایک طریق عمل اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ تو فی الفور عمل شروع کر دے اور اللہ پر بھروسا رکھ۔

اس سفر کے دوران پیرس میں سردار امراؤ سنگھ شیر گل نے اقبال کا خیر مقدم کیا۔ پیرس میں قیام کے دوران انہوں نے معروف فرانسیسی مستشرق لوئی میسنیوں سے ملاقات کی۔ فرانسیسی فلسفی، برگساں سے بھی ملنے کا ارادہ تھا، لیکن معلوم ہوا کہ وہ چند دنوں کے لیے پیرس سے باہر کسی گاؤں میں گئے ہوئے ہیں۔ اس لیے طے پایا کہ گول میز کانفرنس سے واپسی پر ان

سے ملاقات کریں گے۔

تیسری گول میز کانفرنس میں کانگرس کی طرف سے کوئی شریک نہ ہوا۔ محمد علی جناح کو شرکت کے لیے نامزد نہ کیا گیا تھا، اس لیے وہ بھی موجود نہ تھے، البتہ قیام لندن کے دوران میں اقبال نے ان سے کئی ملاقاتیں کیں۔ اقبال نے اس کانفرنس میں بھی محض ایک تماشائی کی حیثیت سے شرکت کی اور اس کی کارروائیوں میں سرگرمی سے حصّہ نہ لیا۔ انہیں اینگلو انڈین فرقے کی تعلیمی کمیٹی کا ممبر بنایا گیا، لیکن اس کمیٹی کے کسی بھی اجلاس میں وہ شریک نہ ہوئے۔ بات دراصل یہ تھی کہ تیسری گول میز کانفرنس کے بیشتر مباحث کل ہند وفاق یا مرکزی حکومت سے متعلقہ امور کے بارے میں تھے اور اقبال وفاق میں کوئی دلچسپی نہ رکھتے تھے، بلکہ وہ تو مرکزی حکومت کے قیام ہی کے خلاف تھے۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ صوبوں کو مکمل خودی مختاری دے دی جائے اور ہر صوبے کا تعلق براہ راست لندن میں وزیر ہند سے ہو۔ اس سلسلے میں انہوں نے ساری کانفرنس کے دوران میں صرف ایک تقریر کی اور اس میں جان برائیٹ کے اقوال کو اپنے مؤقف کی تائید میں اس لیے پیش کیا کہ برطانوی زعماء اُن کی تجویز سے سیخ پا نہ ہو جائیں، بلکہ اسے اپنے ایک پرانے سیاستدان اور پارلیمینٹیرین کی بلند کی ہوئی آواز کی بازگشت تصور کریں۔ اس کانفرنس کے دوران میں چوہدری رحمت علی اور کیمبرج کے دیگر مسلم طلبہ نے بھی پاکستان اسکیم سے متعلق انگریزی پمفلٹ اب اور کبھی نہیں مندوبین میں تقسیم کیا۔

۲۴ر نومبر ۱۹۳۲ء کو مس فارقوہرسن نے نیشنل لیگ آف انگلینڈ کی جانب سے اقبال کو ایک استقبالیہ دیا۔ اس تقریب میں گول میز کانفرنس کے ہندو اور مسلم مندوبین اور برطانیہ کی بعض مقتدر شخصیات موجود تھیں۔ مس فارقوہرسن نے اقبال کا تعارف کراتے ہوئے ان کی شاعرانہ بصیرت اور فلسفیانہ دقت نظری کو خراج تحسین پیش کیا۔ اس کے بعد لارڈ لیمنگٹن نے ان کی شعری تخلیقات کی تعریف کی اور دنیائے اسلام کی بیداری کے سلسلے میں اقبال کی خدمات کو سراہا۔ اس موقع پر اقبال نے اپنی مختصر سی تقریر میں واضح کیا کہ وہ سب حکومت برطانیہ کے تعاون سے ہندوستان کے لیے آئین وضع کرنے کی خاطر اکٹھے ہوئے ہیں۔ انہیں پایدار آئین بنانا چاہیئے۔ انہیں توقع ہے کہ آخری فیصلہ کرتے وقت مسلمانوں کی خواہشات کا خیال اور ان کے مطالبات کا تحفظ کیا جائے گا۔

بعدازاں ۱۵؍ستمبر ۱۹۳۲ء کو اقبال نے نیشنل لیگ آف انگلینڈ کے ایک اور اجلاس سے خطاب کیا۔ یہ اجلاس کمیٹی روم نمبر ا میں منعقد ہوا اور اس میں برطانوی پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے اراکین، غیر ملکی سفیر اور مسلم وفد کے دیگر ممبران موجود تھے۔ اقبال نے اپنی تقرر میں فرمایا کہ مسلمانانِ ہند کے مطالبات کے پیچھے جو اصول کارفرما ہے۔ وہ اتنا سادہ ہے کہ برطانوی عوام اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں گے۔ اور اپنے تمدّنی خطوط پر ترقی کرنا چاہتے ہیں یہی وہ اصول ہے جو اُن کے مطالبات کے پس پردہ کارفرما ہے۔ یہ مطالبات آل انڈیا مسلم کانفرنس اور آل انڈیا مسلم لیگ کی قراردادوں کی شکل میں پیش کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد اقبال نے چودہ نکات کی روشنی میں مسلمانوں کے مطالبات کی وضاحت کی۔ تاہم اقبال کی تجویز کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہ دیکھا گیا۔ بہر حال بقول اقبال، لارڈ لوتھیان نے ان کی تجویز سے متاثر ہو کر اتنا ضرور کہا کہ گو ان کی اسکیم ہندوستان کے مسئلے کا واحد حل ہے، لیکن اسے بارآور ہونے میں پچیس برس درکار ہوں گے۔

قیام لندن کے دوران میں اقبال نے ارسطاطلین سوسائٹی کے اجلاس میں انگریزی میں اپنا فلسفیانہ مقالہ ''کیا مذہب ممکن ہے؟'' پڑھا۔ اس مقالے کے لیے دعوت انہیں لاہور ہی میں موصول ہو گئی تھی اور انہوں نے یورپ روانگی سے قبل اسے ایک ماہ کی مدت میں تحریر کی تھا۔ اب یہ مقالہ اقبال کی انگریزی تصنیف تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ میں شامل ہے۔ انگلستان سے رخصت ہونے سے پیشتر اقبال کے ایک انٹرویو کی روئیداد لورپول پوسٹ میں ''مشرق میں خواتین کا مقام'' کے عنوان سے شائع ہوئی۔ موضوع گفتگو اسلام میں عورتوں کے حقوق تھا۔

تیسری گول میز کانفرنس ۲۴ دسمبر ۱۹۳۲ء کو اختتام پذیر ہوئی تاہم اقبال ۳۰ دسمبر ۱۹۳۲ء تک لندن ہی میں مقیم رہے۔ لندن میں انہوں نے سردار بیگم کے لیے چند زیورات خرید کیے جو ایک گلوبند اور دو تین انگشتریوں پر مشتمل تھے۔ راقم نے بھی انہیں قیامِ لندن کے دوران ایک خط لکھا تھا جس میں اس خواہش کا اظہار کیا گیا تھا کہ وہ واپسی پر اس کے لیے ایک گراما فون باجا لے کر آئیں۔ اقبال راقم کے لیے گراما فون لے کر تو نہ آئے لیکن راقم کا انہیں انگلستان میں لکھا ہوا خط ان کی نظم ''جاوید کے نام'' کی شانِ نزول کا باعث بنا۔ اقبال

• ۳۰ دسمبر ۱۹۳۲ء کو لندن سے دوبارہ پیرس پہنچے۔

پیرس میں اقبال کی توجہ کا مرکز دراصل صرف دو شخصیتیں تھیں۔ میسنیوں تحریر کرتے ہیں کہ پیرس میں اقبال سے ان کی ملاقات یکم نومبر ۱۹۳۲ء کو ہوئی اور گفتگو کا محور زیادہ تر حلاج تھا، جس کی شخصیت کو وہ بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ اس ملاقات کے وقت سید امجد علی و سردار امراؤ سنگھ شیر گل بھی اقبال کے ساتھ تھے۔

پیرس میں برگساں سے ان کی ملاقات کی تاریخ کا تعین کرنا ممکن نہیں۔ غالباً یہ ملاقات جنوری ۱۹۳۳ء کے پہلے ہفتے کے کسی دن ہوئی ہوگی۔ ان ایام میں برگساں بہت ضعیف ہو چکے تھے، اور کئی بیماریوں کے سبب دو پہیوں والی کرسی کے بغیر حرکت نہ کر سکتے تھے۔ لوگوں سے ملنا جلنا بھی ترک کر رکھا تھا، لیکن اقبال کے اشتیاق ملاقات کی بنا پر اُنہیں خاص طور پر نوازا۔ یہ ملاقات تقریباً دو گھنٹے تک جاری رہی۔ اس ملاقات میں برکلے کے افکار اور برگساں کے نظریہ واقعیت زمان پر خوب بحث ہوئی۔ گفتگو کے دوران میں اقبال نے ان کے روبرو اللہ تعالیٰ کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث بیان کی: **لا تسبوا الدھر ان الدھر ھو اللہ** جسے سن کر برگساں بہت متاثر ہوئے اور بار بار اقبال سے پوچھتے کہ کیا یہ قول واقعی درست ہے۔ اس ملاقات میں گفتگو شاید سردار امراؤ سنگھ شیر گل کے توسط سے ہوئی اور انہوں نے اس کی تفصیل بھی قلم بند کی، مگر ایسے برے طریق سے کہ بعد میں ان سے خود اپنی تحریر کا پڑھنا مشکل ہو گیا۔ سو بدقسمتی سے اس گفتگو کا ریکارڈ نہ کیا جا سکا۔

اقبال کی پیرس سے میڈرڈ (اسپین) روانگی کی تاریخ کا بھی حتمی طور پر تعین کرنا مشکل ہے، لیکن عین ممکن ہے کہ وہ ۵ یا ۶ر جنوری ۱۹۳۳ء کو پیرس سے میڈرڈ پہنچے ہوں اور ۲۶ر جنوری ۱۹۳۳ء کو واپس پیرس آ گئے ہوں۔ پس اسپین میں ان کا قیام تقریباً تین ہفتوں کا تھا۔ میڈرڈ میں ان کے ہمراہ ایک دبلی پتلی انگریز لڑکی بھی تھی، جو ان کے پرائیویٹ سیکرٹری یا شاید مترجم کے فرائض انجام دے رہی تھی اور جسے میڈرڈ کے اخباری نمائندوں نے غلطی سے اقبال کی بیٹی سمجھا۔

برٹش انٹیلی جینس کو اقبال کے سفر ہسپانیہ میں دلچسپی ہو سکتی تھی۔ وہ گذشتہ سال اٹلی جا کر مسولینی سے مل چکے تھے۔ اس مرتبہ ان کا ارادہ صرف اسپین جانے کا نہ تھا بلکہ وہ جرمنی اور آسٹریا بھی جانا چاہتے تھے۔ جرمنی میں ہٹلر برسر اقتدار تھا۔ مگر اقبال نے اس مرتبہ سفر یورپ

کے دوران میں فرانس اور اسپین دیکھنے پر ہی اکتفا کیا اور شاید اس خیال کے پیش نظر کہ برٹش انٹیلی جینس یورپ میں ان کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھے ہوئے ہے، انہوں نے جرمنی یا آسٹریا جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

میڈرڈ میں اقبال کے میزبان دراصل پروفیسر آسین پیلا کیوس تھے، جنہوں نے دانتے کی ڈیوائن کامیڈی اور اسلام پر ایک کتاب تحریر کی تھی۔ میڈرڈ میں اقبال کی ملاقات اسپین کے وزیر تعلیم، وہاں ان پروفیسروں اور دانشوروں اور عرب محقق محمود خضیری سے ہوئی۔ اقبال نے محمود خضیری کو مشورہ دیا کہ وہ طوسی کی اقلیدس اور ان کے معاصرین کی تحریروں کا بغور مطالعہ کریں، کیونکہ اس تحقیق سے انہیں معلوم ہوگا کہ مسلم ریاضی دان قرونِ وسطیٰ ہی میں اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ ہوسکتا ہے مکان کے ابعاد تین سے زیادہ ہوں۔

۲۴ جنوری ۱۹۳۳ء کو اقبال نے اسپین اور فلسفۂ اسلام کے موضوع پر میڈرڈ یونیورسٹی کی نئی عمارت میں لکچر دیا۔ اجلاس کی صدارت پروفیسر آسین پیلا کیوس نے کی اور انہی نے اقبال کا تعارف حاضرین جلسہ سے کرایا۔ اجلاس کی روئیداد میڈرڈ کے اخبار 'الدبیت' میں شائع ہوئی۔

اقبال نے قرطبہ، غرناطہ، اشبیلیہ اور طلیطلہ کی سیر کی اور حدیقة الزہرہ (وہ محل جو عبدالرحمن اوّل نے اپنی چہیتی بیوی زہرہ کے لیے ایک پہاڑ پر تعمیر کرایا تھا) کے کھنڈر بھی دیکھے، لیکن جو عمارت آنکھوں سے ان کے دل کی گہرائیوں میں اتر گئی، وہ مسجد قرطبہ تھی۔ اقبال غالباً پہلے مسلمان تھے جنہوں نے مسجد قرطبہ کے کلیسا میں منتقل کیے جانے کے کئی صدیوں بعد جنوری ۱۹۳۳ء میں یہاں پہلی بار دو رکعت نماز ادا کی۔ بہرحال ان کے نماز ادا کرنے کے متعلق جو مختلف روایتیں مشہور ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں: عبدالمجید سالک تحریر کرتے ہیں کہ اقبال مسجد کی شان و شوکت سے اسے قدر متاثر ہوئے کہ ان کا دل بے اختیار نماز پڑھنے کو چاہا، چنانچہ انہوں نے گائیڈ سے پوچھا۔ وہ کہنے لگا کہ میں بڑے پادری سے پوچھ کر آتا ہوں۔ ادھر وہ پوچھنے گیا۔ ادھر اقبال نے نیت باندھ لی اور اس کے واپس آنے سے پیشتر ادائے نماز سے فارغ ہو گئے۔ سید امجد علی دعویٰ کرتے ہیں کہ اقبال نے انہیں ایک خط میں تحریر کیا تھا کہ انہوں نے ادائیگی نماز سے قبل وہاں اذان بھی دی تھی۔ غالباً اسی دعوے کو ذہن میں رکھتے ہوئے فقیر سید وحید الدین، لکھتے ہیں کہ اقبال نے تقریباً سات سو سال بعد مسجد قرطبہ میں اذان دی اور نماز

پڑھی۔اقبال نے اپنی دعائیہ نظم:

ہے یہی میری نماز، ہے یہی میرا وضو
میری نواؤں میں ہے میرے جگر کا لہو

مسجد قرطبہ میں بیٹھ کر لکھی تھی۔

اقبال نے اندلس میں مسلمانوں کے فن تعمیر کے جو عظیم شاہکار دیکھے، ان کے متعلق مختلف شخصیتوں سے اپنے اثرات کا ذکر کیا ہے۔مثلاً شیخ محمد اکرام کے نام اپنے ایک خط محررہ ۲۷ مارچ ۱۹۳۳ء میں لکھا:

میں اپنی سیاحت اندلس سے بے حد لذت گیر ہوا۔ وہاں دوسری نظموں کے علاوہ ایک نظم مسجد قرطبہ پر لکھی جو کسی وقت شائع ہوگی۔الحمراء کا تو مجھ پر کچھ زیادہ اثر نہ ہوا، لیکن مسجد کی زیارت نے مجھے جذبات کی ایسی رفعت تک پہنچا دیا جو مجھے پہلے کبھی نصیب نہ ہوئی تھی۔

پروفیسر حمید احمد خان تحریر کرتے ہیں کہ اقبال نے اسلامی فن تعمیر کی قوت و ہیبت کا ذکر کرتے ہوئے مسجد قرطبہ کے حوالے سے فرمایا:

اندلس کی بعض عمارتوں میں بھی اسلامی فن تعمیر کی اس خاص کیفیت کی جھلک نظر آئی ہے۔لیکن جوں جوں قومی زندگی کے قواء شل ہوتے گئے تعمیرات کے اسلامی انداز میں ضعف آتا گیا۔ وہاں کی تین عمارتوں میں مجھے ایک خاص فرق نظر آیا۔قصر زہرا دیووں کا کارنامہ معلوم ہوتا ہے۔ مسجد قرطبہ مہذب دیووں کا۔مگر الحمراء محض انسانوں کا ...... میں الحمراء کے ایوانوں میں جا بجا گھومتا پھرا مگر جدھر نظر اٹھتی تھی دیوار پر **ھو الغالب** لکھا ہوا نظر آتا تھا۔ میں نے دل میں کہا: یہاں تو ہر طرف خدا ہی غالب ہے، کہیں انسان نظر آئے تو بات بھی ہو۔

جیسے کہ ذکر کیا جا چکا ہے، اقبال ۲۶؍جنوری ۱۹۳۳ء کو واپس پیرس پہنچے۔ان کے ایک خط بنام غلام رسول مہر محرّرہ یکم فروری ۱۹۳۳ئ، سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال شیدائی سے انہیں روزنامہ انقلاب کے بہت سے پچھلے پرچے پیرس میں پڑھنے کے لیے مل گئے اور یوں وہ ہندوستان کے سیاسی حالات سے باخبر ہوئے۔ بالآخر وہ اپنے پروگرام کے مطابق ۱۰؍فروری ۱۹۳۳ء کو وینس سے بحری جہاز کونٹے وردی پر سوار ہوئے اور ۲۲؍فروری ۱۹۳۳ء کو بمبئی پہنچے۔ کسٹمز سے نکلتے وقت ڈیوٹی ادا کرنے کی خاطر سردار بیگم کے زیورات کا ڈبا سوٹ کیس سے نکال کر اپنے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔کسی ساتھی نے مشورہ دیا کہ کم از کم انگشتریاں تو انگلیوں میں پہن لیجیے، کچھ ادا نہ کرنا پڑے گا۔مگر وہ نہ مانے اور تمام زیورات پر جو بھی ٹیکس لگا، ادا کر کے باہر

آئے۔

بمبئی میں خلافت کے نامہ نگار کو سیاحتِ ہسپانیہ کے متعلق اقبال نے ایک انٹرویو بھی دیا جس کے دوران فرمایا:

میں اپنے تاثرات کا اظہار الفاظ میں نہیں کر سکتا۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ جس طرح یہودیوں کے لیے ارض موعودہ فلسطین ہے، اسی طرح عربوں کے لیے غالباً اسپین کی سرزمین موعودہ ہے۔ اس قدر خوبصورت اس درجہ پُرفضا اور ایسا آرام دہ ملک۔

ایک اور موقع پر سفر اندلس کے متعلق فرمایا:

میں نے قرطبہ، غرناطہ، اشبیلیہ، طلیطلہ اور میڈرڈ کی سیاحت کی اور قرطبہ کی تاریخی مسجد اور غرناطہ کے قصر الحمراء کے علاوہ میں نے مدینۃ الزہرا کے کھنڈر بھی دیکھے۔ یہ مشہور عالم قصر عبدالرحمن اوّل نے اپنی چہیتی بیوی زہرا کے لیے ایک پہاڑ پر تعمیر کرایا تھا۔ آج کل یہاں کھدائی کا کام جاری ہے۔ بارہویں صدی عیسوی میں ایک مسلمان موجد نے سب سے پہلے اس جگہ پر ایک ہوائی جہاز کا مظاہرہ کیا تھا۔

۲۵ فروری ۱۹۳۳ء کو اقبال فرنٹیئر میل سے لاہور پہنچے۔ اسٹیشن پر راقم سمیت لاتعداد لوگ ان کے خیر مقدم کے لیے موجود تھے۔ پلیٹ فارم پر جمعیۃ الاسلام کی طرف سے خواجہ فیروز الدین بیرسٹر نے سپاسنامہ پیش کیا اور تیسری گول میز کانفرنس میں مسلمانانِ ہند کے حقوق کی ترجمانی کے سلسلے میں ان کی خدمات کو سراہا۔ مزید واضح کیا کہ مسلمانوں کا سیاسی نظام ابھی تک اس بات کا متقاضی ہے کہ اقبال اس کی تکمیل کے لیے قائدانہ امداد فرماتے رہیں۔ جواب میں اقبال نے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ارشاد کیا:

آپ میری سابقہ زندگی سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اول سے لے کر اب تک میری زندگی کا مطمح نظر یہ رہا ہے کہ مسلمان اپنی موجودہ پستی کی حالت سے نکل کر بلندی پر پہنچ جائیں اور ان میں جو کمزوریاں اور اختلافات رونما ہو گئے ہیں وہ دور ہو جائیں۔ جہاں تک مجھ سے ہو سکا میں نے گول میز کانفرنس میں اسلامی حقوق کے تحفّظ کی پوری پوری کوشش کی ہے اور کوئی ایسا لفظ نہیں کہا جس سے مسلمانوں کے حقوق کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو...... خدا کے لیے آپ اپنے تمام اختلافات کو خواہ سیاسی ہوں یا مذہبی بالکل مٹا دیں اور ایک ہو جائیں۔

اسٹیشن سے نکل کر اقبال احباب کے ہمراہ گھر آئے، لیکن گفتگو زیادہ تر سیاحت ہسپانیہ

کے متعلق ہی ہوئی۔ بار بار مسجد قرطبہ کا ذکر فرماتے رہے یوں معلوم ہوتا تھا گویا مسجد قرطبہ ہمیشہ کے لیے ان کے دل میں رچ بس گئی ہے۔

باب: ۱۹

افغانستان

لاہور پہنچنے سے اگلے روز یعنی ۲۶ فروری ۱۹۳۳ء کو اقبال نے گول میز کانفرنسوں کی بحثوں کی روشنی میں ہندوستان کے آئندہ دستور کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ایک اخباری بیان میں فرمایا:

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، ان کا فرض ہے کہ وہ آنے والے انتخابات کے لیے اپنے آپ کو منظم کریں اور ایسے تمام اسباب کا سدباب کریں جن کے سے ان کے اندر فرقہ وارانہ اختلافات پیدا ہوتے ہیں۔ مجوزہ دستور واضح طور پر اقلیتوں کے اصول کو تسلیم کرتا ہے۔

یکم مارچ ۱۹۳۳ء کو اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے اقبال کے اعزاز میں ٹاؤن ہال لاہور کے باہر باغ میں دعوتِ چائے دی گئی، جس میں شہر کے معززین نے شرکت کی۔ اقبال نے ارکان انسٹی ٹیوٹ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا:

میں نے اپنی زندگی کے گذشتہ پینتیس سال اسلام اور موجودہ تہذیب وتمدن کی تطبیق کی تدابیر کے غور وفکر میں بسر کر دیے ہیں اور اس عرصے میں یہی میری زندگی کا مقصد وحید رہا ہے...... میری رائے میں اس (مسئلے) کو یوں پیش کرنا چاہیے کہ موجودہ تمدن کو کس طرح اسلام کے قریب تر لایا جائے۔

۱۸ مارچ ۱۹۳۳ء کو اقبال، ڈاکٹر انصاری کی دعوت پر جامعہ ملّیہ میں رؤف بے کے دو خطبوں کی صدارت کے لیے دہلی پہنچے۔ رؤف بے ایک ترک سیاستدان اور دنیائے اسلام کے ایک بطل جلیل کی حیثیت سے پیرس سے دہلی مدعو کیے گئے تھے تاکہ جامعہ ملّیہ کے توسیعی خطبات کے سلسلے کا آغاز کر سکیں۔ اقبال اسٹیشن سے سیدھے دارالاسلام، ڈاکٹر انصاری کے گھر تشریف لے گئے۔ شام کو ڈاکٹر انصاری، رؤف بے، ذاکر حسین اور دیگر احباب کی معیت میں جامعہ ملّیہ پہنچے۔ اجلاس کا اہتمام محمد علی ہال میں کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر انصاری نے جلسے کا افتتاح کیا اور اقبال کو کرسی صدارت پر بیٹھنے کی درخواست کی۔ رؤف بے نے وطنیت اور اتحاد اسلامی کے

موضوع پر اپنا خطبہ پڑھا۔ بعد ازاں اقبال نے بحیثیت صدر جلسہ انگریزی میں ایک طویل تقریر کی۔ اس تقریر میں انہوں نے عالم اسلام کی تازہ بیداری، انقلابِ ترکی، مسئلہ اجتہاد، خلافت اور اتحاد اسلامی (مغربی اصطلاح کے مطابق پان اسلامزم) ایسے موضوعات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ آخر میں اپنی معروف نظم مسجد قرطبہ (جو اس وقت تک غیر مطبوعہ تھی) کا آخری بند سنایا جس میں ان اشعار کی تاثیر کے باعث اہل محفل پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو گئی:

روح مسلماں میں ہے آج وہی اضطراب
راز خدائی ہے یہ کہہ نہیں سکتی زباں!
دیکھیے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا
گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا

ایک روز کے وقفے کے بعد یعنی ۲۰ مارچ ۱۹۳۳ء کو رؤف بے کے دوسرے توسیعی لکچر کے لیے اجلاس کی صدارت پھر اقبال نے کی۔ اس مرتبہ ان کا موضوع خطبہ ''جنگ عظیم'' تھا۔ خطبے کے اختتام پر اقبال نے کوئی تقریر تو نہ کی، البتہ اتنا ضرور فرمایا کہ رؤف بے کی تقریر میں انہیں صرف ایک لطیفے کا اضافہ کرنا ہے، جس کا کسی زمانے میں یورپ میں بڑا چرچا تھا۔ لطیفہ یہ تھا:

> ایک روز کسی نے شیطان کو دیکھا، بڑے اطمینان سے آرام کرسی پر بیٹھا سگار پی رہا ہے اس نے جو شیطان کو اس حال میں دیکھا، بڑا متعجب ہوا۔ کہنے لگا۔ حضرت یہ کیا بات ہے؟ آپ اس اطمینان سے بیٹھے سگار پی رہے ہیں۔ اب دنیا میں فتنہ وفساد کون پھیلائے گا۔ اس نے کہا: فکر نہ کیجئے، میں نے یہ خدمت برطانوی کابینہ کے سپرد کر رکھی ہے۔

اس پر محفل میں بڑے زور کا قہقہہ بلند ہوا اور جلسہ برخاست ہو گیا۔ مارچ ۱۹۳۳ء ہی میں حکومت برطانیہ نے ہندوستان کے آئندہ دستور کا خاکہ قرطاس ابیض (وائٹ پیپر) کی صورت میں شائع کر دیا۔ اس دستاویز پر ہندوستان بھر کے سیاستدانوں نے کڑی نکتہ چینی کی۔ اقبال نے بھی اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک بیان ۲۰/ مارچ ۱۹۳۳ء کو جاری کیا۔ ۲۱/ مارچ ۱۹۳۳ء کو اقبال دہلی سے واپس لاہور آئے، لیکن ۵/ اپریل ۱۹۳۳ء کی صبح کو انہیں پھر دہلی جانا پڑا۔ کیونکہ ۶/ اپریل ۱۹۳۳ء کو مسئلہ تعلیم پر وائسرائے کے ہاں کانفرنس میں اقبال کو مدعو کیا گیا تھا، اور وہ اس لیے کہ تیسری گول میز کانفرنس کے دوران لندن میں انہیں اینگلو انڈین فرقہ کی

تعلیمی کمیٹی کا رکن بنایا گیا تھا۔ بہرحال ۵ اپریل ۱۹۳۳ء ہی کی شام کو ذاکر حسین کی صدارت میں انہوں نے جامعہ ملّیہ میں ''لندن سے غرناطہ تک'' کے موضوع پر ایک لکچر دیا۔

اگلے روز اقبال پھر طلبہ سے خطاب کرنے کے لیے جامعہ ملّیہ گئے۔ مولانا اسلم جیراجپوری نے ان کا خیر مقدم کیا اور اپنی تقریر کے دوران میں فرمایا کہ اقبال ہمارے مدۃ العمر کے محبوب ہیں۔ انہوں نے شعر کہنا کیا شروع کیے، ہمارے دل میں گھر کر لیا۔ ہم اپنی محبت کا اظہار ان کے استاد ہی کی زبان میں کریں گے۔

تخلص داغؔ ہے اور عاشقوں کے دل میں رہتے ہیں

ان کا گھر بھی عشاق کا دل ہے اور وہ ہم سب کے محبوب ہیں۔ اقبال نے ان کا شکریہ ادا کیا اور طلبہ سے خطاب کیا۔ بعدازاں طلبہ سے بات چیت کی اور ان کی بیاضوں پر دستخط کرتے رہے۔ اقبال ۷/ اپریل ۱۹۳۳ء کو لاہور روانہ ہو گئے۔

۱۵/ اپریل ۱۹۳۳ء کو ادارۂ معارف اسلامیہ کا اجلاس زیر صدارت اقبال ہیلی ہال پنجاب یونیورسٹی میں منعقد ہوا۔ اقبال نے اپنے خطبۂ صدارت کے دوران فرمایا:

> وقت کا تقاضا یہ ہے کہ اب ہم فقہی جزئیات کی چھان بین کے بجائے ان اہم شعبہ ہائی علم کی طرف متوجہ ہوں جو ہنوز محتاج تحقیق ہیں۔ ریاضیات، عمرانیات، طب اور طبیعیات میں مسلمانوں کے شاندار کارنامے ابھی تک دنیا کے مختلف کتب خانوں میں مستور و پنہاں ہیں، جن کے احیاء کی سخت ضرورت ہے...... یورپ کے علماء بیسویں صدی میں جن نظریات و انکشافات کو اپنے لیے نئی چیز سمجھتے ہیں۔ ان پر عرب علماء و فضلا صدیوں پہلے سیر حاصل بحثیں کر چکے ہیں۔ آئن سٹائن کا نظریۂ اضافیت یورپ کے نزدیک نیا ہو تو ہو، لیکن علمائے اسلام کی کتابوں میں صدہا سال پہلے اس کے مبادی زیر بحث آ چکے ہیں۔ برگساں کے فلسفۂ امتیازی کو سمجھنے کے لیے ابن خلدون کے افکار و خیالات کا مطالعہ کرنے کی اشد ضرورت ہے......

مئی ۱۹۳۳ء میں چینی ترکستان میں یورش کی خبریں ہندوستان کے اخبارات میں شائع ہوئیں۔ اقبال عالم اسلام کے ہر معاملے میں دلچسپی رکھتے تھے، اس لیے ان خبروں کو پڑھ کر وہ وسطی ایشیا میں ایک اور مسلم مملکت کے قیام کا خواب دیکھنے لگے۔ اس ضمن میں ۱۶ مئی ۱۹۳۳ء کو انہوں نے ایک بیان جاری کیا جس میں چینی ترکستان کے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا:

> آج کل دنیا میں نسلی امتیاز کی بھی بڑی اہمیت ہے، اگرچہ میں اس انداز فکر کو جدید تمدن پر ایک بہت بدنما دھبہ سمجھتا ہوں۔ مجھے خدشہ ہے کہ ایشیاء میں نسلی امتیاز کے مسئلے کا ابھرنا کئی نہایت

خطرناک نتائج کا پیش خیمہ بن سکتا ہے۔ اسلام کی زیادہ تر کوشش بحیثیت مذہب یہی رہی ہے کہ اس مسئلے کو سلجھایا جائے اور اگر جدید ایشیا اس انجام سے بچنا چاہے جس کا سامنا یورپ کو کرنا پڑ رہا ہے، تو سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہیں کہ وہ تعلیمات اسلامی کو اپنائے اور نسلی بنیادوں پر سوچنے کی بجائے اسلامی بنیادوں پر سوچنے کی کوشش کرے۔ میرا یہ اندیشہ کہ چینی ترکستان کا انقلاب ممکن ہے پان تورانی تحریک کی صورت اختیار کر لے، وسطی ایشیا میں رائج انداز فکر پر مبنی ہے۔ ابھی چند روز ہوئے افغانستان کے معروف ماہنامہ ''کابل'' میں ایران کے ڈاکٹر افشار کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں افغانستان کو عظیم تر ایران کا حصّہ تصور کرتے ہوئے مصنّف نے دعوت دی تھی کہ تورانی تحریک کے فتنے کا مقابلہ کرنے کے لیے وہ ایران کا ساتھ دے۔ بہرحال اگر چینی ترکستان کا انقلاب کامیاب ہوا تو اس کا اثر یقیناً افغانی اور روسی ترکستان پر بھی پڑے گا...... انقلاب کی کامیابی کا یہ مطلب بھی ہوگا کہ چینی ترکستان میں صدیوں پرانے چینی استعمار سے نجات حاصل کر کے یہاں ایک ایسی خوشحال اور مضبوط مسلم مملکت وجود میں آ جائے گی جس کی ننانوے فیصد آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہوگی۔ پس ہندوستان اور روس کے درمیان ایک اور مسلم مملکت کا قیام بالشوزم کی ملحدانہ مادّیت کو ہمارے ملک کی حدود سے اور بھی پرے دھکیل دے گا۔

ریاست کشمیر کے حالات ابھی تک نہیں سدھرے تھے۔ گلانسی کمیشن کی سفارشات پر عمل ہونا ابھی شروع نہ ہوا تھا کہ کشمیری مسلمان دھڑے بندی کی نذر ہو گئے۔

جب کشمیر کمیٹی کے بعض ارکان نے تجویز پیش کی کہ تنظیم کے لیے ایک دستور بنایا جائے تاکہ ہر کام اس کے مطابق انجام دیا جا سکے۔ احمدی ارکان کو یہ بات ناگوار گزری کیونکہ ان کی دانست میں دستور بنانے کا مقصد ان کے امیر کے لامحدود اختیارات کو محدود کرنا تھا۔ بالآخر ایسے ہی اختلافات کے نتیجے میں مرزا بشیر الدین محمود کشمیر کمیٹی کی صدارت سے مستعفی ہو گئے، اگرچہ ان کی جماعت کے باقی افراد بدستور کمیٹی کے رکن رہے۔

مرزا بشیر الدین محمود کی جگہ اقبال کو کشمیر کمیٹی کا قائم مقام صدر چنا گیا۔ بحیثیت صدر انہوں نے ریاست کشمیر کے حالات پر ایک بیان ۷ جون ۱۹۳۳ء کو جاری کی جس میں کشمیری مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ آپس میں متحد رہیں اور ساری ریاست کے مسلمانوں کے لیے صرف ایک ہی سیاسی تنظیم قائم رکھیں۔

اقبال نے کشمیر کمیٹی سے استعفیٰ دے دیا اور اپنے بیان مورخہ ۲۰ جون ۱۹۳۳ء میں واضح

کیا:

بدقسمتی سے کمیٹی میں بعض ارکان کسی وفاداری کے پابند نہیں سوائے اپنے مذہبی فرقے کے امیر کے ساتھ وفاداری کے۔ اس کی وضاحت حال ہی میں ایک احمدی وکیل نے اپنے پبلک بیان میں بھی کر دی ہے جو میرپور کے لوگوں کے کیس کر رہا تھا۔ اس نے صاف اعتراف کیا ہے کہ وہ کسی کشمیر کمیٹی کو تسلیم نہیں کرتا اور وہ یا اس کے ساتھی جو کچھ بھی کرتے ہیں، صرف اپنے امیر کے حکم پر کرتے ہیں ...... بہر حال اگر مسلمانانِ ہند اپنے کشمیری بھائیوں کی امداد اور رہنمائی کرنا چاہتے ہیں تو ایک اور کشمیر کمیٹی بنا سکتے ہیں۔

اقبال کی تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مسلمانوں کے ایک نمائندہ اجلاس میں پرانی کشمیر کمیٹی توڑ دی گئی اور ایک نئی آل انڈیا کشمیر کمیٹی وجود میں لائی گئی۔ اقبال نے نئی کشمیر کمیٹی کی صدارت قبول کر لی۔ ملک برکت علی ایڈووکیٹ اس کے سیکرٹری مقرر کیے گئے چنانچہ مظلومین کشمیر کی مالی امداد کے لیے اقبال نے ملک برکت علی کی معیّت میں ایک اپیل ۳۰ /جون ۱۹۳۳ء کو شائع کی۔

جولائی ۱۹۳۳ء میں حکومت کشمیر نے اعلان کیا کہ گلانسی کمیشن کی تمام سفارشات پر عمل کیا جائے گا۔ اقبال نے اس اعلان کا خیر مقدم کرتے ہوئے اپنے بیان مورّخہ ۱۳ اگست ۱۹۳۳ء میں تجویز پیش کی کہ کشمیری مسلمانوں کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے حکومت کشمیر میرپور اور بارامولا کے سیاسی کارکنان کے خلاف دائر کردہ فوجداری مقدمات واپس لے۔

بہر حال کشمیر کے اندر مسلمانوں کو متحد رکھنا مشکل ہو گیا تھا۔ وہ مختلف دھڑوں یا سیاسی گروہوں میں بٹ گئے تھے۔ شیخ عبداللہ نے ان کے اختلافات دور کرنے کی خاطر تمام کارکنوں کی ایک کانفرنس سری نگر میں بلانے کا اہتمام کیا اور انہوں نے اقبال کو بھی کانفرنس میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ اقبال خود تو نہ جا سکے مگر انہوں نے اپنے ایک خط محرّرہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۳۳ء میں شیخ عبداللہ کو لکھا:

سنا ہے مختلف جماعتیں بن گئی ہیں۔ اور ان کا باہمی اختلاف آپ کے مقاصد کی تکمیل میں بہت بڑی رکاوٹ ہو گا۔ ہم آہنگی ہی ایک ایسی چیز ہے جو تمام سیاسی و تمدنی مشکلات کا علاج ہے۔ ہندی مسلمانوں کے کام اب تک محض اس وجہ سے بگڑے رہے کہ یہ قوم ہم آہنگ نہ ہو سکی اور اس کے افراد اور بالخصوص علماء اوروں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنے رہے، بلکہ اس وقت بھی ہیں۔

اس کے باوجود کشمیر کمیٹی میں مسلمانوں اور احمدیوں کے تنازعہ میں سر فضل حسین نے

احمدیوں کا ساتھ دیا اور الٹا اقبال پر یہ الزام لگایا کہ وہ اپنی سیاسی اغراض کے حصول کی خاطر مسلم یک جہتی پر اندر سے وار کر رہے ہیں، اقبال ریاست کشمیر کے مسلمانوں پر ظلم و تشدد کے خلاف اپنی آواز بلند کرتے رہے۔ فروری ۱۹۳۴ء میں اس ضمن میں انہوں نے وائسرائے کو تار دیا۔ بعد ازاں لندن ٹائمز اور جمعیت اقوام کے نام برقیے روزانہ کیے کہ ریاستی حکام سیاسی کارکنان کو سزائے بیدزنی دے رہے ہیں اور انہیں اس انسانیت سوز سزا دینے سے روکا جائے۔

یہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ فرقہ وارانہ مفاہمت کے لیے کل ہند بنیادوں پر آخری کوشش مولانا شوکت علی نے کی تھی جو ناکام رہی۔ لیکن صوبائی سطح پر ایسی کوششیں بہرحال جاری تھیں۔ اور اس سلسلے میں مئی ۱۹۳۳ء میں پنجاب میں سر فضل حسین، راجہ نریندر ناتھ اور سردار جوگندر سنگھ نے مل کر ایک فرقہ وارانہ فارمولا تیار کیا۔

ہندوؤں اور سکھوں کے ممتاز لیڈروں نے اس فارمولے کی شدید مخالفت کی۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے۔ اس کے خلاف اقبال اور ان کے بعض رفقاء نے آواز بلند کی۔ اقبال کے ایک اخباری بیان مورخہ ۱۴/ جولائی ۱۹۳۳ء سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شروع سے آخر تک فارمولے کے سخت مخالف تھے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

> یہ فارمولا پنجاب کے مسئلے کا کوئی حل نہیں ہے۔ اس کے برعکس مختلف فرقوں کے مابین ان دیکھے تنازعات کے سلسلے کا یہ ایک سرچشمہ بن جائے گا۔ ...... یہ اسکیم (پنجاب فارمولا) شہری اور دیہاتی آبادیوں کے نقطۂ نظر سے نہایت قابل اعتراض ہے۔ جب اس کو روبہ عمل لایا جاے گا۔ تو اس سے وہ دیہاتی طبقے بھی واجبی نمائندگی سے محروم ہو جائیں گے۔ جن کی اپنے حلقہ ہائے انتخاب میں اکثریت ہے۔ اس کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے اور ان تمام ممکنہ تنازعات کا جو اس کی وجہ سے پیدا ہوں گے اندازہ لگانے کے بعد، میرا یہ پختہ خیال ہے کہ یہ اسکیم ہر فرقے کے بہترین مفادات کے لیے نقصان رساں ہے۔

ہندوستان کے شمال مغرب میں سرحدی قبائل کے ساتھ انگریزی فوجیں عموماً برسرِ پیکار رہتی تھیں اور یہ جنگ کسی نہ کسی صورت میں قیام پاکستان تک جاری رہی۔ چونکہ یہ قبائل مسلمان تھے، اس لیے ہندوستان کے مسلمانوں کو ان کے ساتھ ہمدردی تھی۔ اگست ۱۹۳۳ء میں انہیں زیر کرنے کی خاطر ان کی چھوٹی چھوٹی پہاڑی بستیوں پر بے پناہ بمباری کی گئی۔ اس بمباری کے خلاف ہندوستان کے بعض شہروں میں مسلمانوں نے احتجاج کیا۔ لاہور میں بھی ایک احتجاجی جلسہ منعقد کرنے کا اہتمام کیا گیا تھا، لیکن یہ ملتوی ہوا۔ اس کے باوجود مسلمانوں کا مطالبہ

انگریزی حکومت تک پہنچانے کی خاطر اقبال نے ۱۱ اگست ۱۹۳۳ء کو ایک تار وائسرائے کو دیا، جس میں تحریر کیا کہ مسلمان پرزور مطالبہ کرتے ہیں کہ بمباری فوراً بند کردی جائے۔ اور امور متنازعہ کے تصفیے کے لیے پرامن طریقہ برتا جائے۔

اقبال کے ایک خط محرّرہ ۲۹ مئی ۱۹۳۳ء بنام عطیّہ فیضی سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی خط و کتابت مفتی سید امین الحسینی سے جاری تھی اور اقبال نے انہیں وسط اکتوبر ۱۹۳۳ء میں ہندوستان آنے کا مشورہ دیا تھا۔ مفتی سید امین الحسینی نے ان کے کہنے کے مطابق انہی ایام میں ہندوستان کا دورہ کیا اور اقبال نے مسئلہ فلسطین اور دیگر امور کے لیے چندے کی فراہمی کے سلسلے میں ہر ممکن طریق سے ان کی امداد کی۔

افغانستان کے نادرشاہ سے اقبال کے دیرنیہ تعلقات تھے۔ اقبال نادرشاہ کو اس زمانے سے جانتے تھے، جب وہ جرنیل محمد نادرخان کی حیثیت سے پیرس میں افغانستان کے سفیر تھے۔ نادرشاہ بقول اقبال نصف پنجابی تھے، کیونکہ ان کی والدہ کی جائے ولادت لاہور تھی اور وہ لاہور ہی میں رہائش پذیر رہیں۔ نادرشاہ خود بھی ڈیرہ دون کے پڑھے ہوئے تھے اور اردو بڑی اچھی بولتے تھے، بلکہ اقبال کے ساتھ اردو ہی میں بات چیت کرتے تھے۔ اقبال کی ملاقات نادرشاہ سے کب ہوئی؟ اس کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ یہ بات مشہور ہے کہ وہ پہلی مرتبہ ۱۹۲۹ء میں ایک دوسرے سے لاہور ریلوے اسٹیشن پر ملے، جب نادرشاہ افغانستان جاتے ہوئے یہاں رکے تھے۔ نادرشاہ کا قد زیادہ لمبا نہ تھا اور ویسے بھی وہ دبلے پتلے سے تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ نادرشاہ نے اقبال کو دیکھ کر کہا کہ میں تو سمجھتا تھا کہ آپ ایک لمبی چوڑی داڑھی والے بزرگ ہوں گے۔ اس پر اقبال نے جواب دیا کہ میرا خیال بھی یہ تھا کہ آپ کوئی قوی ہیکل قسم کے پہلوان ہوں گے، بہرحال نہ تو شاعر اسلام، نادرشاہ کی توقع کے مطابق نکلا اور نہ ہی غازیٔ اسلام کی صورت اس ذہنی تصویر سے مطابقت رکھتی تھی جو اقبال نے بنا رکھی تھی۔

نادرشاہ نے افغانستان کی تباہ حالی کے متعلق ہندوستانیوں سے ہر قسم کی امداد و اعانت کی اپیل کر رکھی تھی اور راقم کی معلومات کے مطابق تو اقبال نے انہیں اپنی جیب سے پانچ سو روپے کی رقم پیش کی تھی جو انھوں نے اس وقت لوٹا دی۔ بعد میں اقبال نے کئی طریقوں سے ان کی امداد جاری رکھی۔ نادرخان ہلال احمر فنڈ کھولا اور مالی امداد فراہم کرنے کے لیے سرمایہ اکٹھا کرنے کی غرض سے جلسے بھی منعقد کیے۔ یہ سب اس لیے کیا گیا کہ اقبال کے نزدیک افغانستان

کی سالمیت اور آزادی مسلمانانِ ہند اور وسطی ایشیا کی بقا کے لیے اشد ضروری تھی۔

ستمبر ۱۹۳۳ء میں نادر شاہ نے تعلیمی امور کے بارے میں مشورے کے لیے اقبال، سید راس مسعود اور سید سلیمان ندوی کو افغانستان آنے کی دعوت دی۔ تعلیمی مقاصد کے حصول کے سلسلے میں ہندوستان سے ان تین شخصیتوں کا انتخاب نہایت موزوں تھا، کیونکہ ان میں ایک تو مفکر تھا، دوسرا منتظم امور تعلیمی اور تیسرا عالم۔ افغان قونصل جنرل کی خواہش تھی کہ وہ تینوں ۱۳ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو جشن استقلال کے موقع پر کابل پہنچیں، مگر اس قدر جلد پاسپورٹ تیار ہونے کا امکان نہ تھا۔ بالآخر ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو اقبال اور سید راس مسعود کے پاسپورٹ مل گئے اور ان دونوں نے ۲۰ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو لاہور سے پشاور روانگی کا پروگرام بنا لیا۔ روانگی سے قبل ۱۹ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو اقبال نے ایک بیان میں اپنے سفر افغانستان کے مقصد کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

تعلیم یافتہ افغانستان، ہندوستان کا بہترین دوست ہو سکتا ہے۔ کابل میں ایک نئی یونیورسٹی کا قیام اور ہندوستان کی مغربی سرحد پر اسلامیہ کالج پشاور کو ایک دوسری یونیورسٹی میں منتقل کرنے کی اسکیم ہندوستان اور افغانستان کے درمیان علاقے میں آباد ہوشیار افغان قبائل کی فلاح و بہبود کے لیے بہت زیادہ ممد ثابت ہوگی۔ شاہ افغانستان نے ہمیں اس لیے دعوت دی ہے کہ ہم وہاں وزیر تعلیم کو کابل میں یونیورسٹی کے قیام کے سلسلے میں مشورہ دیں۔ ہم نے اس دعوت کو قبول کرنا اپنا فرض سمجھا۔ کابل میں شائع ہونے والے مختلف رسالوں سے پتا چلتا ہے کہ افغانوں کی نئی نسل نئے علوم کی تحصیل اور انہیں اپنے دین و تمدن کے سانچے میں ڈھالنے کی بے حد خواہشمند ہے۔ افغان فطرتاً بہت خلیق لوگ ہیں اور ہندوستانیوں کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کی ترقی میں ان کا ہاتھ بٹائیں۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ افغانوں میں ایک نئی بیداری پیدا ہو رہی ہے اور ہمیں امید ہے کہ ہندوستان کے اندر تعلیمی تجربے کی روشنی میں ہم انہیں تعلیمی مسائل میں مفید مشورہ دے سکیں گے۔ میرے ذاتی خیال میں خالص سیکولر تعلیم سے خصوصاً مسلم ممالک میں اچھے نتائج درآمد نہیں ہوئے۔ بہر حال کسی نظام تعلیم کو قطعی نہیں کہا جا سکتا۔ ہر ملک کی اپنی ضروریات ہوتی ہیں اور ان ضروریات کی روشنی ہی میں اس کے نظام تعلیم کا تعیّن کیا جا سکتا ہے۔

اقبال اور سید راس مسعود پشاور میں ٹھہرتے ہوئے ۲۳ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو کابل پہنچے۔ اقبال اور سید راس مسعود کی ایک ملاقات نادر شاہ سے قصر دلکشا میں ہوئی۔ اس ملاقات کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ اقبال نے نادر شاہ کو قرآن کریم کی ایک جلد تحفے کے طور پر دی۔ اسی دوران میں عصر کی نماز کا

وقت آ گیا اور نادر شاہ نے اقبال سے امامت کی درخواست کی مگر بقول ظہیر الدین، اقبال نے کہا کہ:

نادر! میں نے اپنی عمر کسی شاہ عادل کی اقتدا میں نماز پڑھنے کی تمنّا میں گزار دی ہے۔ آج جب کہ خدا نے فقیر کی اس مراد کے پورا کرنے کے اسباب مہیا کر دیے ہیں تو کیا تو مجھے اس نعمت سے محروم کرنا چاہتا ہے؟ آج میں تیری اقتدا میں نماز پڑھوں گا۔ امامت تجھ کو کرنی ہوگی۔

۲۷ اکتوبر ۱۹۳۳ء جمعہ کا دن تھا۔ نادر شاہ معمول کے مطابق مختلف مسجدوں میں نماز جمعہ ادا کرنے جایا کرتے تھے، مگر اس روز شہر کی سب سے بڑی جامع مسجد پل خشتی میں نماز پڑھنے آ رہے تھے۔ اقبال اپنے رفقا سمیت اسی مسجد میں نماز ادا کرنے کے لیے گئے۔ نمازی مسجد کے صدر دروازے سے لے کر محراب تک بھرے ہوئے تھے اور غریب مسلمانوں کی کمی نہ تھی۔ منبر پر ایک مولوی فارسی میں وعظ فرما رہے تھے، مہمانوں کو مقصورہ یعنی مسجد کے اُس حفاظتی حصّے میں لے جایا گیا جو بادشاہ کے نماز پڑھنے کے لیے مخصوص تھا۔ تھوڑی دیر بعد نادر شاہ نہایت سادگی کے ساتھ مقصورہ میں داخل ہوئے اور مہمانوں سے مصافحہ کیا۔ وعظ کے اختتام پر اذان کے بعد جب سب سنّتیں پڑھنے کے لیے کھڑے ہوئے تو خطیب نے عربی زبان میں خطبہ شروع کیا۔ آخر میں جب خطیب نے شاہ غازی و مجاہد شاہ نادر خان کا نام لیا تو نادر شاہ نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر تواضع کے طور پر اپنے سر کو جھکا دیا۔ خطبے کے بعد دوگانہ جمعہ اور اس کے بعد حسب معمول سنّتیں ادا ہوئیں۔ دعا کے بعد نادر شاہ نے مہمانوں سے کہا کہ میں نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا ہے اور اگر آپ لوگ پسند فرمائیں تو میرے ساتھ چل کر کھانا تناول کریں مگر دیگر ضروری کاموں کے سبب سب نے معذرت چاہی اور اس کے بعد نادر شاہ ان سے مل کر رخصت ہوئے۔

واپسی پر اقبال اور سید سلیمان ندوی کے ساتھ کار میں ایک اور شخص بیٹھ گئے جن سے چینی ترکستان کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ گفتگو کے دوران اقبال نے فرمایا:

یورپ نے اپنی اس نئی ترقی میں اپنا سارا زور بحری طاقت پر صرف کیا اور ہر قسم کی تجارتی آمد و رفت اور سیر و سیاحت کے راستے دریائی رکھے اور اپنے انھی جہازوں کے ذریعے سے مشرق کو مغرب سے ملا دیا، لیکن اب یہ نظر آ رہا ہے کہ ان بحری راستوں کی یہ حیثیت جلد فنا ہو جائے گی۔ اب آئندہ مشرق وسطیٰ (سنٹرل ایشیا) کا راستہ مشرق و مغرب کو ملائے گا اور تری کی بجائے خشکی کا راستہ اہمیت حاصل کرے گا۔ تجارتی قافلے اب موٹروں اور لاریوں ہوائی جہازوں اور ریلوں کے ذریعے مشرق و مغرب میں آئیں جائیں گے اور چونکہ یہ پورا راستہ اسلامی ملکوں سے

ہو کر گزرے گا، اس لئے اس انقلاب سے ان اسلامی ملکوں میں عظیم الشان اقتصادی و سیاسی انقلاب رونما ہوگا، اور اس وقت پہلے کی طرح پھر افغانستان کو دنیا کی شاہراہ بننے کا موقع ملے گا۔ اس لیے ابھی سے اس کی تیاری کرنی چاہیے۔

کھانا سب نے دارالامان پہنچ کر سردار فیض محمد خان، اللہ نواز خان اور سرور خان گویا کے ساتھ کھایا۔ چار بجے شام مجدّدی سلسلے کے روحانی پیشوا ملا شور بازار نور المشائخ سے ملاقات کا وقت مقرر تھا۔ مّلا شور بازار کا اصلی نام فضل عمر تھا اور کابل شہر، قبائل اور فوج میں بکثرت ان کے مرید تھے۔ ملا شور بازار کی قیام گاہ سے اقبال اور سید سلیمان ندوی، اللہ نواز خان کے مکان پر گئے، جہاں افغانستان میں مقیم برصغیر کے تقریباً ڈیڑھ سو باشندوں نے ان کے اعزاز میں دعوت چائے کا انتظام کر رکھا تھا۔ سید راس مسعود وہیں پہنچ گئے۔

چائے سے فراغت کے بعد تصویریں اتاری گئیں اور تقریریں ہوئیں۔ میزبانوں کی طرف سے مولانا محمد بشیر نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور انہیں مدعو کرنے پر حکومت افغانستان کا شکریہ ادا کیا۔ نیز ہندوستان کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ مایوسی کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ مصیبت کے بعد راحت آتی ہے۔ مہمانوں کی طرف سے سیّد سلیمان ندوی نے تقریر کی اور کہا کہ تاریخ میں ہندوستان نے افغانستان کے معاملے میں کئی دفعہ گناہ کا ارتکاب کیا ہے اور اب وقت ہے کہ ہمارے بھائی اپنے حسن خدمت سے ان گناہوں کا کفارہ ادا کریں۔ اس کے بعد اقبال نے ایک مختصر سی تقریر کی اور اسی پر جلسہ برخاست ہوا۔

۲۸ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو سردار محمد ہاشم خان صدر اعظم مہمانوں کو ملنے کے لیے شاہی مہمان خانے میں آئے اور دیر تک باتیں کرتے رہے۔ سید راس مسعود نے معدنیات اور سڑکوں کی تعمیر کی اہمیت کا ذکر کیا اور اسی طرح اقبال نے بھی افغانستان میں سڑکوں کی تعمیر پر زور دیا اور فرمایا کہ آئندہ تجارتی آمد و رفت کے سلسلے میں وسطیٰ ایشیا اور افغانستان کی مرکزیت یقینی ہے۔ سردار محمد ہاشم خان نے کھانا ان کے ساتھ کھایا۔

سردار فیض محمد خان وزیر خارجہ اور اللہ نواز خان تقریباً ہر روز انہیں ملنے کے لیے آتے تھے اور افغانستان کے انتظامی و تعلیمی امور پر گفتگو ہوتی تھی۔ اقبال اور سید راس مسعود تو ایک مرتبہ اکٹھے نادر شاہ سے قصر دلکشا میں مل آئے تھے۔ سید سلیمان ندوی بھی ان سے ملاقات کی خاطر قصر دلکشا گئے۔ نادر شاہ نے زیادہ گفتگو اردو میں کی اور انہیں یہ بھی بتایا کہ وہ معارف کو

ہمیشہ پڑھتے ہیں۔ سید سلیمان ندوی نے مسئلہ تعلیم کے متعلق انہیں اپنے خیالات سے آگاہ کیا اور نوجوان افغانوں میں مذہبی شیفتگی و پابندی کے فروغ کے سلسلے میں کابل میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ جیسی درسگاہ کے قیام کا مشورہ دیا۔ نادر شاہ نے آخر میں ان سے گذارش کی کہ وہ ہندوستان جا کر مسلمانوں کو یہ پیغام پہنچا دیں کہ آج ہم کو اور ان کو اتفاق اور اتحاد کی سب سے زیادہ ضرورت ہے اور ایک دوسرے پر نکتہ چینی کی بجائے ایک دوسرے کی حالت کو درست کرنے میں معاونت کی جائے تو بہتر ہے۔ پھر فرمایا:

میری کوشش ہے کہ افغانستان میں دین و دنیا کو جمع کر دوں اور ایک ایسے اسلامی ملک کا نمونہ پیش کروں، جس میں قدیم اسلام اور جدید تمدن کے محاسن یکجا ہوں...... میں دین وملّت کا خادم ہوں اور افغانستان کو صرف افغانوں کا ملک نہیں بلکہ مسلمانوں کا ملک سمجھتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ ہمارے مسلمان بھائی بھی اس کو اپنا ملک سمجھیں ...... میرے بھائیوں کو کہہ دیجیئے گا کہ دنیا میں ایک نئے انقلاب کا مواد تیار ہو رہا ہے۔ ضرورت ہے کہ مسلمان اپنی تعدادی، اقتصادی اور تعلیمی استعداد اس کے لیے پہلے سے تیار کر لیں۔

سید سلیمان ندوی، نادر شاہ کی شخصیت کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ وہ نہایت شیریں اخلاق، منکسر مزاج، پُرمحبت اور رقیق القلب تھے۔ اور ان کی آنکھیں مولانا محمد علی کی طرح اشکباری کے لیے ہمہ وقت تیار رہتی تھیں۔

اسی روز یعنی ۲۸ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو چار بجے شام شاہ محمود خان وزیر جنگ کے ہاں چائے کی دعوت تھی، جس میں چیدہ چیدہ حضرات بلائے گئے تھے۔ چائے پر مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ سید سلیمان ندوی نے افغانستان میں مذہبی عربی تعلیم کے متعلق اپنی اسکیم کا ذکر تفصیل کے ساتھ کیا۔

جب سارے مہمان تشریف لے آئے تو صدر انجمن نے فارسی میں خطبۂ استقبالیہ پڑھا، جس میں ہندوستان کے فضلاء اور سخنوروں کی تعریف و توصیف کے بعد اقبال کی علمی خدمات کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا گیا تھا:

ان کے قیمتی آثار و تالیفات جن میں سے ہر ایک نے اخلاق، سعی وعمل، اجتماع، جذبات شرق و دوستی اور احساساتِ اسلام پرستی کی، اہل ایشیا کے جسموں میں روح پھونکی ہے۔

خطبۂ استقبالیہ کے بعد افغانستان کے معروف شاعر عبداللہ خان نے مہانوں کے اعزاز

میں ایک طویل نظم پڑھی، جس میں بہت سے اشعار اقبال سے متعلق تھے۔ پھر مہمانوں کی طرف سے پروفیسر ہادی حسن نے فارسی میں تقریر کی۔ بعدازاں سید راس مسعود اٹھے اور اپنی برجستہ تقریر میں سید سلیمان ندوی کا بحیثیت عالم ذکر کرنے کے بعد اقبال کے متعلق فرمایا:

میرے معزز دوست علامہ اقبال اس گروہ کے نمائندے ہیں، جس نے قدیم وجدید عناصر کو ملا کر ان سے ایک روح پرور معجون تیار کیا ہے۔ میں نہ تو علماء کی جماعت سے ہوں اور نہ ہی شعراء کے فرقہ سے، بلکہ میں نے اپنی تعلیم کا دور زیادہ تر یورپ کے ممالک میں ختم کیا ہے، لیکن میرا دل ان دونوں گروہوں کی عظمتِ احترام سے سرشار اور لبریز ہے ...... افغانستان کے نوجوانوں کو چاہیے کہ سفید بال والوں کی عزت واحترام کا ہر وقت خیال رکھیں، ایسا نہ ہو کہ اختلاف رائے سے ان کی قومی وحدت میں رخنہ پیدا ہو جائے۔ تاریخ شہادت دیتی ہے کہ مسلمانوں کے تمام نقصانات آپس میں نفاق اور تفرقہ کا نتیجہ رہے ہیں۔

سید سلیمان ندوی نے اپنی جوابی تقریر میں ارشاد کیا:

سیاسی حالات ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں اور سیاسی تعلقات ٹوٹتے اور جڑتے رہتے ہیں، لیکن علمی اور ادبی تعلقات دائم اور برقرار رہتے ہیں، سلطان محمود غزنوی کی تلوار عرصہ ہوا کہ ٹوٹ گئی اور اس کی فتوحات کے اوراق صدیوں میں بکھر گئے لیکن حکیم سنائی غزنوی کا قلم اب تک باقی اور موجود ہے اور ان کی ادبی فتوحات کے اوراق کا شیرازہ اب تک منتشر نہیں ہوا ہے ...... اہل سیاست کو ان کی شعبدہ بازیوں میں مصروف رہنے دیجیے۔ اور آیئے کہ ہم علم وفن کے نام سے پیمان محبت و دوستی کو تازہ اور عہد رفاقت و آشنائی کو مستحکم کریں اور ہم دونوں اپنے اپنے وطن کے اندر رہ کر علم وادب کے ایک جدید مشرق کی تعمیر میں دوش بدوش کام کریں۔

سید سلیمان ندوی کے بعد اقبال نے تقریر کی جو بہت پراثر ثابت ہوئی، فرمایا:

میرا عقیدہ ہے کہ آرٹ یعنی ادبیات یا شاعری یا مصوری یا موسیقی یا معماری، ان میں سے ہر ایک زندگی کا معاون اور خدمت گار ہے۔ اسی بنا پر میں آرٹ کو ایجاد واختراع سمجھتا ہوں نہ کہ محض آلۂ تفریح۔ شاعر قوم کی زندگی کی بنیاد کو آباد بھی کر سکتا ہے اور برباد بھی۔ اس وقت جبکہ حکومت یہ کوشش کر رہی ہے کہ موجودہ زمانے میں افغانستان کی تاریخ ایک نئی زندگی کے میدان میں داخل ہو تو اس ملک کے شعراء پر لازم ہے کہ وہ نوجوان قوم کے سچے رہنما بنیں۔ زندگی کی عظمت اور بزرگی کی بجائے موت کو زیادہ بڑھا کر نہ دکھائیں، کیونکہ جب آرٹ موت کا نقشہ کھینچتا ہے، اور اس کو بڑھا چڑھا کر دکھاتا ہے۔ تو اس وقت وہ سخت خوفناک اور برباد کن ہو جاتا

ہے۔اور جو حسن قوت سے خالی ہو وہ محض پیام موت ہے:

دلبری بے قاہری جادوگری است
دلبری با قاہری پیغمبری است

......شعر کا کمال بعض اوقات لوگوں پر بڑا اثر مرتب کرتا ہے۔کسی قوم کی زندگی کی موقوف علیہ چیزیں محض شکل و صورت نہیں ہیں۔ بلکہ جو چیز حقیقتاً قوم کی زندگی کے ساتھ تعلق رکھتی ہے۔ وہ تخیل ہے جس کو شاعر قوم کے سامنے پیش کرتا ہے اور وہ بلند نظریات ہیں۔جن کو وہ اپنی قوم میں پیدا کرنا چاہتا ہے۔قومیں شعراء کی دستگیری سے پیدا ہوتی ہیں اور اہل سیاست کی پامردی سے نشوونما پا کر مر جاتی ہیں۔ پس میری خواہش یہ ہے کہ افغانستان کے شعراء اور انشا پرداز اپنے ہم عصروں میں ایسی روح پھونکیں جس سے وہ اپنے آپ کو پہچان سکیں۔ جو قوم ترقی کے راستے پر چل رہی ہے، اس کی انانیت خاص تربیت کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے، مگر وہ تربیت جس کا خمیر احتیاط کے ساتھ اٹھایا جائے۔ پس اس انجمن کا کام یہ ہے کہ نوجوانوں کے افکار کو ادبیات کے ذریعے سے متشکل کرے اور ان کو ایسی روحانی صحت بخشے کہ وہ بالآخر اپنی خودی کو پا کر اور قابلیت بہم پہنچا کر پکار اٹھیں:

دو دستہ تیغم و گردوں برہنہ ساخت مرا
فساں کشیدہ بروئے زمانہ آخت مرا
من آن جہان خیالم کہ فطرت ازلی
جہان بلبل و گل راشکست و ساخت مرا
نفس بہ سینہ گدازم کہ طائر حرمم
تواں ز گرمئ آواز من شناخت مرا

میں ایک نکتہ اور بھی کہنا چاہتا ہوں۔مسولینی نے ایک اچھا نظریہ قائم کیا ہے کہ اٹلی کو چاہیے کہ اپنی نجات حاصل کرنے کے لیے ایک کروڑ پتی کو پیدا کرے جو اس ملک کے گریبان کو اینگلو سیکسن اقوام کے قرضے سے نجات دلا سکے یا کسی دوسرے دانتے کو پیدا کرے جو نئی جنت پیش کرے، یا کسی نئے کولمبس کو پیدا کرے جو ایک نئے براعظم کا پتا لگائے، اگر آپ مجھ سے دریافت کریں تو میں کہوں گا کہ افغانستان کو ایسے مرد کی ضرورت ہے جو اس ملک کو قبائلی زندگی سے نکال کر وحدت ملی کی زندگی سے آشنا کر سکے۔

اگلے روز اقبال، سید راس مسعود اور سید سلیمان ندوی کی کابل سے غزنین کو روانگی تھی۔سو ۳۰ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو صبح آٹھ بجے وہ سرور خان گویا کی معیت میں غزنین روانہ ہوئے۔اقبال،

حکیم سنائی کے مزار کی زیارت کے لیے بے تاب تھے۔ اس لیے وہ رفقا سمیت مہمان خانے سے پیدل ہی نکل کھڑے ہوئے۔ مقبرہ قریب ہی ایک چھوٹے سے احاطے کے اندر تھا۔ قبر پختہ تھی اور اوپر گنبد تھا۔ اندر جانے کے لیے ایک چھوٹا سا دروازہ تھا۔ سب اندر داخل ہوئے اور مسنون دعا پڑھی۔ سید سلیمان ندوی تحریر کرتے ہیں:

حکیم سنائی کی جلالتِ شان سے کون واقف نہیں۔ ہم سب اس منظر سے متاثر تھے، مگر ہم میں سب سے زیادہ اثر ڈاکٹر اقبال پر تھا۔ وہ حکیم ممدوح کے سرہانے کھڑے ہو کر بے اختیار ہو گئے اور دیر تک زور زور سے روتے رہے۔

سید سلیمان ندوی کے بیان کے مطابق فقیروں کے جھونپڑے سے نکل کر قافلے نے قریب کھڑی موٹروں میں بادشاہوں کے محل یعنی سلطان محمود کے مزار کا رُخ کیا۔ رستے میں ملا قربان کی نشاندہی پر مختلف ٹیلوں پر انہوں نے بہلول دانا، سلطان ابراہیم اور سلطان محمود کے والد سلطان سبکتگین کے مزار دیکھے۔ سلطان محمود کا مزار ایک چھوٹے سے باغ میں ہے۔ سب اندر داخل ہوئے۔ سید سلیمان ندوی تحریر کرتے ہیں:

اندر داخل ہوئے تو سلطان کی قبر نظر آئی۔ آہ! یہ اس سلطان کی قبر ہے جو دیوار چین سے لے کر سومنات گجرات تک کے ملکوں پر فرمانروا تھا۔ جس کی ہیبت و جلالت سے بڑے بڑے گردن کش سر اطاعت جھکا دیتے تھے...... آج وہ سلطان کس بیکسی و بیچارگی کے عالم میں ایک سنسان باغ کے اندر یکہ وتنہا بسترِ خاک پر دراز ہے۔

سلطان محمود کے مزار سے واپسی پر اقبال کو لاہور کی مناسبت سے حضرت علی ہجویریؒ یعنی حضرت داتا گنج بخش کے والد ماجد کے مزار کی تلاش ہوئی۔ مّلا قربان نے بتایا کہ انہیں مزار کا علم ہے۔ چنانچہ اقبال کی ہدایت پر مّلا قربان نے قدیم غزنین کے ویرانوں میں قبر تلاش کی اور اقبال دعائے مسنونہ پڑھ کر وہاں سے لوٹے۔

یکم نومبر ۱۹۳۳ء کو چار بجے شام کے قریب جب ملنے والے رخصت ہو گئے تو وہ قندھار کی سیر کے لیے نکلے۔ خرقہ شریف کی زیارت گاہ اور احمد شاہ ابدالی کا مقبرہ قریب ہی تھا۔ اس لیے قیام گاہ سے پیدل ہی روانہ ہوئے اور موٹروں کو مقبرے کے دروازے پر لے جانے کی ہدایت کی۔ پہلے خرقہ شریف کی زیارت کی۔ اس کے متعلق مشہور ہے کہ یہاں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ملبوس اقدس ہے۔ غالباً احمد شاہ ابدالی بخارا سے حاصل کر کے بڑے ادب و احترام

سے اپنے دارالسلطنت لایا تھا اور اس نے قصر شاہی کے پاس ہی اس کے لیے خصوصی عمارت تعمیر کرائی تھی۔ یہاں سے فراغت کے بعد سلطان احمد شاہ ابدالی کے مقبرے پر گئے۔ احمد شاہ ابدالی دیندار، انصاف پسند اور پُرجوش مجاہد تھے اور تاریخ اسلام کے آخری حصے میں اس کی شخصیت بہت نمایاں ہے۔ قبر پر عظیم الشان مقبرہ اس کے بڑے فرزند تیمور شاہ نے بنوایا۔ افغانوں میں اس مقبرے کا اس قدر احترام تھا کہ خونی مجرم بھی اگر بھاگ کر اس میں پناہ لیتا تو امان پاتا۔ قبر کے سرہانے قدرے بلندی پر قرآن مجید کا وہ نسخہ رکھا تھا جو خاص احمد شاہ ابدالی کی تلاوت کا تھا۔

۲؍نومبر ۱۹۳۳ء کو صبح آٹھ بجے ناشتے سے فارغ ہوئے اور روانگی سے قبل گورنر قندھار نے خشک میووں اور قندھاری انار کے ٹوکرے مہمانوں کو تحفے طور پر بھیجے۔ نو بجے کے قریب قندھار سے چمن کی طرف روانہ ہوئے۔ بارہ بجے قلعہ جُدید پہنچے، جو افغانستان کی آخری چوکی تھی۔ دوپہر کا کھانا یہیں کھایا۔ یہاں سرور خان گویا اور دیگر شاہی ملازمین نے اقبال اور ان کے رفقا کو الوداع کہی اور موٹریں چند منٹ کے اندر افغانستان کی سرحد کو پار کر کے انگریزی علاقے میں داخل ہو گئیں۔

چمن میں اقبال اور ان کے رفقا کے آنے کی خبر پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ شہر کے دروازے پر ہی مسلمانوں نے ان کا استقبال کیا اور ایک ریستوران میں لا کر بیٹھایا۔ اہالیان شہر کا تقاضا تھا کہ اقبال اور سید سلیمان ندوی ایک شب چمن میں قیام کریں اور مسلمانوں کے سامنے تقریریں کریں، لیکن ان حضرات نے معذرت کی۔ ریستوران میں مختلف خیال کے مسلمان جمع تھے، جو سیاسیات کی مختلف راہوں سے آشنا تھے۔ وہ اقبال اور سید سلیمان ندوی سے طرح طرح کے سوالات کرتے رہے۔ اگرچہ چمن سے ریل شروع ہو جاتی ہے لیکن انہوں نے ایک دن بچانے کی خاطر چمن سے کوئٹے تک موٹروں پر سفر کیا۔

۳؍نومبر ۱۹۳۳ء کو کوئٹہ ریلوے اسٹیشن سے گیارہ بجے صبح کی گاڑی پکڑی۔ ریل دن بھر اور رات بھر چلتی رہی۔ ۴؍نومبر ۱۹۳۳ء کو بارہ بجے صبح ملتان پہنچے۔ یہاں تک سید سلیمان ندوی اور اقبال کا ساتھ رہا۔ سید سلیمان ندوی ملتان ٹھہر گئے۔ اقبال ملتان سے لاہور کی گاڑی میں بیٹھے اور اسی روز رات کو اپنے گھر پہنچ گئے۔ افغانستان کے نادر شاہ اور دیگر زعما نے انہیں بہت سے تحفے دیے تھے۔ سروے، انگور، انار اور خشک میووں کی پیٹیوں کے علاوہ افغانی پتھر کی بنی ہوئی اشیا، قالین اور خدا جانے کیا کیا کچھ ساتھ لائے تھے۔ راقم کے لیے نادر شاہ نے ایک سونے کی

گھڑی بھیجی تھی۔ کابل سے سردوں، انگوروں، اناروں اور خشک میووں کی پیٹیاں تو ان کے لیے کئی سالوں تک آتی رہیں۔

۶ نومبر ۱۹۳۳ء کو اقبال نے سید راس مسعود اور سید سلیمان ندوی کی معیت میں سفر افغانستان کے متعلق ایک اخباری بیان دیا جس میں فرمایا:

حکومت افغانستان کا ارادہ ہے کہ سارے محکمۂ تعلیم کو جدید طریقوں پر از سر نو ترتیب دیا جائے اور ساتھ ساتھ افغانستان اور ہمسایہ ممالک کے درمیان والی سڑکوں کی مرمت کی جائے۔ نئی یونیورسٹی بتدریج ترقی کر رہی ہے اور اس کے لیے پہلے ہی ایک خوبصورت اور وسیع محل مخصوص کر دیا گیا ہے۔ سب سے پہلے میڈیکل شعبہ قائم کیا گیا اور اس میں اعلیٰ تعلیم شروع ہو گئی ہے۔ دوسرا شعبہ جس کا قیام زیر غور ہے وہ سول انجینئرنگ کا ہوگا...... افغانستان آج ایک متحد ملک ہے، جہاں ہر طرف بیداری کے آثار پائے جاتے ہیں اور حکام کافی سوچ و بچار کے بعد نئے پروگرام بنا رہے ہیں۔ افغانستان سے ہم اس یقین کے ساتھ واپس ہوئے ہیں کہ اگر موجودہ حُکام کو دس سال تک اپنا کام جاری رکھنے کا موقع مل جائے تو بلا شک وشبہ افغانستان کا مستقبل روشن ہے۔

اس بیان کے اگلے ہی روز یعنی ۷ نومبر ۱۹۳۳ء کو یہ المناک خبر ہندوستان پہنچی کہ نادر شاہ کو کابل میں قتل کر دیا گیا ہے۔ یہ کسی شخص کی انتقامی حرکت تھی۔ افغانستان پر امن رہا اور نادر شاہ کے فرزند محمد ظاہر شاہ کو بادشاہ تسلیم کر لیا گیا۔ اقبال نادر شاہ سے محبت کرتے تھے، اس لیے انہیں نادر شاہ کی اچانک موت کا بے حد صدمہ ہوا۔ انہوں نے ۱۵ نومبر ۱۹۳۳ء کو محمد ظاہر شاہ اور وزیر اعظم افغانستان کے نام تعزیتی پیغامات بھیجے۔ محمد ظاہر شاہ کو تحریر کیا:

اعلیٰ حضرت محمد نادر شاہ کے قتل کی خبر سے مجھے ذاتی حیثیت سے بے حد صدمہ پہنچا ہے۔ اعلیٰ حضرت شہید کی خدمت میں گذشتہ کئی سال سے مجھے نیاز حاصل تھا اور میں ان کی شفقت اور محبت کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ شہید کی روح کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور آپ کے لیے اس جلیل القدر شہید کی یاد ہمیشہ موجب رہنمائی ہو۔

افغانستان کے اس مختصر دورے کے متعلق سید سلیمان ندوی نے تو اپنے تاثرات سیر افغانستان میں قلمبند کیے، جب کہ اقبال نے افغانستان کی چند روزہ سیاحت پر اپنے شاعرانہ جذبات کا اظہار اپنی تالیف مسافر میں کیا جو ۱۹۳۴ء میں شائع ہوئی۔ یہ فارسی مثنوی، ایک غزل کے سوا، زیادہ تر مثنوی معنوی کی بحر میں ہے اور بقول سیّد سلیمان ندوی خیبر و سرحد و کابل و غزنین و قندھار کے عبرت انگیز مناظر و مقابر پر شاعر اقبال کے آنسو ہیں اور بابر، سلطان محمود،

حکیم سنائی اور احمد شاہ درانی کی خاموش تربتوں کی زبان حال سے سوال و جواب ہیں۔ اس کا آغاز نادر شاہ کے مناقب سے اور اختتام محمد ظاہر شاہ سے اظہار توقعات پر ہے۔

افغانستان سے واپس آتے ہی اقبال ایک بار پھر مسلمانانِ ہند کے معاملات کی طرف متوجہ ہوئے۔ انہیں فلسطین کی بگڑتی ہوئی صورت حال پر خصوصاً بڑی تشویش تھی۔ نو آبادیات کے نائب وزیر نے حکومت برطانیہ کی پالیسی کی وضاحت کرتے ہوئے اعلان کیا تھا کہ فلسطین میں یہودیوں کی قومی حکومت قائم کر دی جائے گی۔ اس پر اقبال نے ۶/نومبر ۱۹۳۳ء کو وائسرائے کے نام اپنے برقیے میں تحریر کیا:

فلسطین کی صورت حال نے مسلمانان ہند میں زبردست ہیجان و اضطراب پیدا کر دیا ہے نائب وزیر نو آبادیات کی تقریر نے مسلمانوں کے شبہات کو زیادہ عمیق بنا دیا ہے کہ برطانیہ کی یہ پالیسی ہے کہ عربوں کے مفاد کے خلاف عمل پیرا ہو کر فلسطین میں یہودیوں کی حکومت قائم کر دی جائے۔ نائب وزیر نو آبادیات نے برطانیہ کی جو پالیسی بیان کی ہے، وہ صریحاً مخالفانہ ہے۔ فلسطین میں حال ہی میں جو واقعات رونما ہوئے ہیں وہ اس امر کے مقتضی ہیں کہ فوراً تحقیقات کی جائے اور فلسطین میں یہودیوں کا داخلہ جلد از جلد روک دیا جائے۔ برطانیہ کے بہترین مفاد کا اقتضا یہ ہے کہ ''اعلان بالفور'' کو واپس لیا جائے۔ مسلمانوں کو توقع ہے کہ وائسرائے اس نازک صورت حالات کی طرف ملک معظم کی حکومت کی توجہ دلائیں گے اور برطانیہ اور مسلمانوں کے تعلقات کو کشیدہ ہونے سے بچا لیں گے۔

اسی طرح ۲۲ نومبر ۱۹۳۳ء کو ایک تار نیشنل لیگ لندن کے صدر کو ارسال کیا جس میں لکھا:

مسلمانوں کے درمیان مسئلہ فلسطین پر بہت جوش پایا جاتا ہے، اور ناخوشگوار نتائج رونما ہونے کا خطرہ ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ آپ مزید نقل و حرکت روکنے میں کامیاب ہوں گے اور مسلمانوں اور انگلستان کے درمیان کشیدگی پیدا نہ ہونے دیں گے۔

لیکن جب انہیں یہ اطلاع ملی کہ جدّے سے مکے کے درمیان ریلوے لائن بنائے جانے کا امکان ہے، تو اپنے ایک بیان مورخہ ۱۲/نومبر ۱۹۳۳ء میں خوشی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ ایک ہندوستانی اسلامی کمپنی کا جدّہ اور مکہ کے درمیان ریلوئے لائن بنانے کا کام اپنے ذمے لینا بڑی مسرت کی بات ہے اور اس کمپنی کی کامیابی عربوں اور ہندوستانی مسلمانوں کے لیے بے حد فائدہ کا موجب ہوگی۔ مگر یہ اسکیم کامیاب نہ ہوئی۔

۴/ دسمبر ۱۹۳۳ء کو پنجاب یونیورسٹی نے اقبال کو ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی۔ اوائل دسمبر ۱۹۳۳ء میں پنڈت جواہر لعل نہرو نے ایک بیان میں گول میز کانفرنسوں میں مسلم وفد کے ارکان کے روّیے پر شدید نکتہ چینی کی۔ اقبال نے کہا کہ پنڈت جواہر لعل نہرو کی قیادت میں ہندو یا کانگرس اگر آج بھی مسلم مطالبات کو تسلیم کرنے کے لیے تیار ہو تو ساری کی ساری مسلم قوم ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں ان کے پیچھے چلے گی۔ انہوں نے فرمایا:

آخر میں مَیں ایک سیدھا سا سوال پنڈت جواہر لعل سے کرنا چاہتا ہوں۔ ہندوستان کا مسئلہ کیسے حل ہوسکتا ہے، جبکہ اکثریتی فرقہ نہ تو آٹھ کروڑ انسانوں پر مشتمل اقلیتی فرقے کے حقوق کے لیے کم سے کم تحفّظات دینے کو تیار ہے اور نہ اس معاملے میں تیسرے فریق کا فیصلہ قبول کرتا ہے، لیکن لگاتار ایک ایسے نیشنلزم کی رٹ لگائے جا رہا ہے۔ جو صرف اسی کے لیے فائدہ مند ثابت ہوسکتا ہے؟ ایسی صورت سے نپٹنے کے لیے تو صرف دو ہی رستے ہیں: یا تو ہندوستان میں اکثریتی فرقہ مشرق میں برطانوی استعمار کے ایجنٹ کی حیثیت سے دائمی طور پر کام انجام دیتا رہے یا ملک کو مذہبی تاریخی اور تمدّنی وابستگیوں کے اعتبار سے تقسیم کر دیا جائے تاکہ جدید شکل میں فرقہ وارانہ یا انتخاب کے مسئلے کا خاتمہ ہو سکے۔

اقبال عموماً علیل رہنے لگے تھے اور ان کی آنکھوں میں موتیا اترنے کے آثار بھی پیدا ہو رہے تھے۔ گذشتہ آٹھ برس سے وہ عملی سیاسیات میں الجھے رہے۔ لیکن مسلم سیاست کا افسوسناک پہلو یہ تھا کہ اقبال اپنی خواہش کے مطابق مسلمانوں کی مختلف سیاسی تنظیموں میں اتحاد یا نظم وضبط پیدا کرنے میں ناکام رہے۔ شاید اسی سبب وہ مسلم کانفرنس کی صدارت سے سبکدوش ہو گئے۔ مسلمانوں کا جماعتی انتشار وافتراق ختم ہونے میں نہ آتا تھا، اور اس کے باعث اقبال بے حد آزردہ اور دل شکستہ ہو گئے تھے۔ غالباً اسی ذہنی پس منظر کے ساتھ انہوں نے اپنے ایک خط محرّرہ ۱۷ ستمبر ۱۹۳۳ء میں سید سلیمان ندوی کو لکھا:

میں خود مسلمانوں کے انتشار سے بے حد دردمند ہوں اور گذشتہ پانچ چار سال کے تجربے نے مجھے سخت افسردہ کر دیا ہے۔

اسی طرح جب عبدالماجد دریابادی نے ان سے پٹنہ اور کانپور میں ہونے والے قومی اجتماعات میں شمولیت کے بارے میں پوچھا تو اپنے خط محررہ ۲۴/ستمبر ۱۹۳۳ء میں انہیں جواب دیا:

گذشتہ چار پانچ سال کے تجربے نے مجھے دردمند کر دیا ہے، اس لیے جلسوں میں میرے واسطے

کوئی کشش باقی نہیں رہی۔ میں کہیں نہیں جا رہا۔ نہ پٹنہ، نہ کانپور۔

بہرحال ان کی آزردگی یا دل شکستگی مسلم سیاست کے باعث تھی، فلسفہ و شاعری سے نہ تھی۔ نومبر ۱۹۳۳ء میں انہوں نے روڈز لیکچرز کی دعوت قبول کر لی تھی۔ آکسفورڈ یونیورسٹی میں اپنی پسند کے کسی فلسفیانہ موضوع پر لیکچر دینے کی یہ دعوت انہیں لارڈ لوتھیان نے روڈز ٹرسٹیز کی طرف سے دی تھی۔ اقبال کا خیال تھا کہ اس بہانے انہیں اپنے پسندیدہ موضوع ''فلسفہ اسلام کی تاریخ میں زمان و مکاں'' پر تحقیق کرنے کا موقع مل جائے گا اور وہ دنیا کو دکھا سکیں گے کہ آئن سٹائن کا نظریہ مغرب کے لیے کوئی نئی بات ہو تو ہو، مسلم صوفی اور ریاضی دان قرون وسطیٰ ہی سے اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ مکان کے ابعاد تین سے زیادہ ہو سکتے ہیں۔ اسی سلسلے میں اقبال اپنے ایک خط محررّہ ۸ نومبر ۱۹۳۳ء بنام سیّد نذیر نیازی میں فرماتے ہیں:

روڈز لکچرز کا موضوع زمان و مکاں فلسفہ اسلام کی تاریخ میں ہو گا۔ میں نے دعوت قبول کر لی ہے، مگر ابھی یقیناً نہیں کہہ سکتا کہ ۱۹۳۴ء میں جاؤں گا یا ۱۹۳۵ء میں۔ مضمون مشکل اور دقیق سا ہے۔ وقت لکھنے کے لیے بہت کم ہے۔ بہرحال جو کچھ ہو گا کیا جائے گا۔

اقبال نے اپنی ناسازی طبع کے باوجود اس موضوع پر تحقیق کا کام شروع کر دیا تھا۔ بقول عبدالمجید سالک ان کی علمی مصروفیتوں کا یہ عالم تھا کہ اس زمانے میں انہوں نے سید سلیمان ندوی اور دیگر احباب کو جو خطوط لکھے، ان سب میں زمان و مکاں کے متعلق مختلف کتابوں کا سراغ لگانے کی استدعا کی گئی اور ملک بھر میں زمان و مکاں کے بارے میں اکابر اسلام کی کتب کا تجسّس جاری رہا۔ کیونکہ ہر حال میں ان کا مقصد یہ تھا کہ ہر شعبۂ علم میں مسلمانوں کی برتری ثابت کی جائے۔ لیکن دشمنانِ اقبال اب تک ان کی روڈز لیکچرز میں خصوصی دلچسپی سے یہی پہلو نکالنے کے قابل ہو سکے ہیں کہ وہ اس دعوت نامے کو حاصل کرنے کے لیے محض اس لیے بیتاب تھے کہ انگلستان یا آکسفورڈ یونی ورسٹی کا ایک چکر لگ جائے گا۔ خیر آئندہ دو برسوں میں شدید علالت کے باعث اقبال کو یہ دعوت منسوخ کرنا پڑی اور اس موضوع پر قلم اٹھانے کی نوبت نہیں آئی۔ سید نذیر نیازی تحریر کرتے ہیں:

اللہ کو کچھ ایسا ہی منظور تھا، ورنہ اسلامی بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ انسان کی تاریخ فکر میں ایک بیش بہا اضافہ ہو جاتا۔ تاریخ فلسفہ کے لحاظ سے تو یہ مسئلہ جیسا اہم ہے، ظاہر ہے۔ لیکن اسلامی فکر بلکہ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ خالص اسلامی نقطۂ نظر سے اس کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ چنانچہ خطبات

(خطبہ پنجم) میں ایک جگہ حضرت علامہ نے لکھا ہے کہ زمان و مکاں کا مسئلہ مسلمانوں کے لیے موت و حیات کا مسئلہ ہے اور پھر اپنے اس خیال کی تھوڑی سی وضاحت بھی کر دی ہے۔ لہٰذا یہ مضمون ذرا تفصیل سے بیان ہو جاتا اور مفکرین اسلام کے گونا گوں خیالات و نظریات بھی سامنے آ جاتے تو کیا خوب ہوتا۔

جہاں تک شاعری کا تعلق ہے جاوید نامہ کی تکمیل کے بعد اقبال کے دل و دماغ، بقول ان کے نچڑ گئے تھے، اس لیے وقتی طور پر نہ فارسی میں کچھ کہنا ممکن تھا اور نہ اردو میں اور ویسے بھی فارسی کو چھوڑ کر اردو میں کہنا ان کی نگاہ میں سنگ مرمر کی بجائے گارے کی عمارت بنانا تھا، مگر اس کے باوجود مناسب ماحول میں ان کا میلان اردو کی طرف ہو سکتا تھا اور ہوا۔

غالباً انہی ایّام میں محمد دین تاثیر اور چند احباب ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور رسالہ کارواں کے لیے غیر مطبوعہ اردو کلام کا مطالبہ شروع کیا۔ اقبال پہلے تو انہیں ٹالتے رہے مگر ان کے اصرار سے مجبور ہو کر محمد دین تاثیر سے کہا تم اس وفد کے سرغنہ ہو اور شاعر ہو۔ اپنے اشعار سناؤ، شاید طبیعت کو بہانہ مل جائے۔ محمد دین تاثیر نے جی کڑا کر کے ایک مطلع پڑھا۔ پھر دوسرا اقبال نے اس مصرع:

تم کو اپنی زندگی کا آسرا سمجھا تھا میں

کو دہرایا۔ محمد دین تاثیر نے آخری شعر پڑھا:

زلف آوارہ گریباں چاک اے مستِ شباب
تیری صورت سے تجھے درد آشنا سمجھا تھا میں

اقبال کو شعر پسند آیا۔ فرمایا: زمین اچھی ہے خدا کا قافیہ کیوں چھوڑ دیا؟ اس کے بعد خاموش ہو گئے اور سر جھکا لیا۔ پھر بولے۔ اگر قافیہ بدل دیا جائے تو؟ محمد دین تاثیر نے جواب دیا۔ تو بہتر ہو گا۔ فرمایا، لو سنو:

عرصۂ محشر میں میری خوب رسوائی ہوئی
داورِ محشر کو اپنا رازداں سمجھا تھا میں

محمد دین تاثیر لکھتے ہیں:

یہ شعر کہہ کر علامہ کچھ رکے، دو تین منٹ تک اور پھر یہ حالت تھی کہ میں نقل نہیں کر چکتا تھا کہ ایک اور شعر تیار ہوتا۔ دوسرا شعر ''جاوید نامہ'' کی کیفیات کا حامل تھا:

مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں

جوں جوں شعر ہوتے جاتے، علامہ کی حالت بدلتی جاتی۔ بستر ہی میں اٹھ کر پاؤں کے بل بیٹھ گئے آواز میں لرزش سی آ گئی۔ جھوم جھوم کر داہنے ہاتھ کی سبابہ اٹھا کر انشاد کرتے تھے اور اس شعر پر:

تھی وہ اک درماندہ رہرو کی صدائے دردناک

جس کو آواز رحیلِ کارواں سمجھا تھا میں

وہ بھی رو رہے تھے اور ہم بھی! نہ جانے یہ غزل کتنی لمبی ہو جاتی مگر یہ سلسلۂ فیضان ایک اجنبی ملاقاتی کی آمد سے منقطع ہو گیا۔

کتنی انوکھی اور حیرت کی بات ہے کہ یہی شخص جو بستر میں اٹھ کر پاؤں کے بل بیٹھ جاتا، جھوم جھوم کر داہنے ہاتھ کی سبابہ اٹھا کر انشاد کرتا اور شعر کہتے ہوئے روتا چلا جاتا، اسلامی تمدّن کی برتری ثابت کرنے کے لیے زمان و مکاں کے مشکل اور دقیق مسئلے پر تحقیق کے لیے بیتاب تھا یا مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کی خاطر اپنی گوشہ نشینی سے نکل کر لاہور سے دہلی، شملہ یا لندن کی نہ صرف خاک چھانتا بلکہ ایک ایک نکتے کی خاطر لڑتا جھگڑتا تھا، جس کی تشویش، آزردگی یا دل شکستگی کا باعث خرچ کی تنگی یا آمدنی کا فقدان نہ تھا، بلکہ مسلمانوں کا انتشار اور افتراق تھا، لیکن اس کے باوجود وہ ہمت نہ ہارتا تھا۔

باب: ۲۰

علالت

۱۹۳۴ء کا سال علالت کے آغاز اور دیگر مصائب کے سبب ایک لحاظ سے اقبال کی سیاسی زندگی کے عملی طور پر خاتمے کا سال ہے۔ لیکن بقول محمد احمد خان، بستر علالت پر لیٹے لیٹے انہوں نے برصغیر کے مسلمانوں کے مستقبل کی تاریخ سازی میں جو کام انجام دیا۔ اسے اس خطہ زمین کے مسلمانوں کا مورّخ نظر انداز نہیں کر سکتا۔

انہوں نے گزشتہ برس لندن میں تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے دوران میں محمد علی جناح سے کئی ملاقاتیں کیں۔ اقبال نے اپنی ملاقاتوں میں محمد علی جناح پر واضح کیا کہ مسلمانوں کی سیاسی تنظیم اور آئندہ کے سیاسی پروگرام ترتیب دینے کے لیے ان کا ہندوستان واپس آنا اشد ضروری ہے۔ اسی طرح دیگر مسلم قائدین بھی وقتاً فوقتاً ان کی واپسی پر اصرار کرتے تھے۔ بالآخر محمد علی جناح نے ہندوستان واپس آنے کا مصمّم ارادہ کر لیا۔ وہ دسمبر ۱۹۳۳ء کے آخری ہفتے میں بمبئی پہنچے اور ۴ مارچ ۱۹۳۴ء کو مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے اور یوں ان کے ہاتھوں لیگ کا احیاء عمل میں آیا۔

اقبال مسلم سیاسی لیڈروں کے نفاق اور فتنہ تراشیوں یا مسلم عوام کے انتشار سے بڑے برگشتہ خاطر تھے۔ برصغیر میں ملت اسلامیہ کی ہم آہنگی، سا لمیت یا اس کی اساسی تنظیم کے نصب العین کی تحصیل کے لیے ان کی کوششیں اب تک کامیابی سے ہم کنار نہ ہو سکی تھیں۔ اس دور میں برصغیر میں مسلم سیاسی جماعتوں کی تعداد بیس سے اوپر جا چکی تھی اور ہر مسلم سیاسی جماعت کا مسلک دوسری جماعت سے مختلف تھا۔ اقبال نے مسلم کانفرنس کے اجلاس لاہور مورّخہ ۲۱ مارچ ۱۹۳۲ء میں اپنے صدارتی خطبے میں درست کہا تھا:

وہ لوگ جنہیں مسلمانوں کی سیاسی قیادت حاصل ہے اور جو مسلمانوں کی سیاسی کشمکش میں ان کی

رہنمائی کر رہے ہیں، ابھی تک ان کے ذہنوں میں انتشار ہے...... گو مسلم عوام میں قربانی کے جذبے کا فقدان نہیں ہے۔ پچھلے چند سالوں کے واقعات شاہد ہیں کہ قوم کی رہنمائی کسی قابلِ قبول اصول کے ماتحت نہیں کی جاتی جس کا نتیجہ خود ہماری سیاسی جماعتوں کے اندر اختلاف اور تضاد کی صورت میں رونما ہوتا ہے۔

مستقبل میں اس مسئلے کے حل کی خاطر اقبال نے اپنے خطبے میں کئی تجاویز پیش کیں اور ان میں سب سے اہم تجویز یہ تھی کہ مسلمانوں کی صرف ایک سیاسی تنظیم ہو جس کی شاخیں ملک کے سارے صوبوں اور ضلعوں میں پھیلا دی جائیں۔

۱۹۳۴ء میں عید الفطر ۱۰ جنوری کو آئی۔ اقبال، چوہدری محمد حسین، علی بخش اور راقم کے ساتھ موٹر کار میں بیٹھ کر حسب معمول بادشاہی مسجد میں نماز ادا کرنے کی غرض سے گئے۔ اس روز خوب سردی تھی اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ اقبال نے شلوار اور اچکن پہن رکھی تھی، سر پر ٹوپی تھی لیکن پاؤں میں موزے شاید باریک تھے۔ مسجد کے یخ بستہ فرش پر جوتوں کے بغیر چلنے سے انہیں سردی سی محسوس ہوئی۔ گھر واپس پہنچ کر سوّیوں پر دہی ڈال کر کھایا۔ اگلے روز انفلوائنزا ہو گیا، جو مختلف دوائیں کھانے کے باوجود دو تین ہفتوں تک جاری رہا۔ پھر ایک شب تین چار گھنٹے کھانسی کا دورہ پڑا۔ علاج کیا گیا۔ چند دنوں بعد انفلوائنزا اور کھانسی کی شکایت تو دور ہو گئی لیکن گلا بیٹھ گیا اور ایسا بیٹھا کہ ایلو پیتھک، یونانی اور ریڈیائی علاج ہونے کے باوجود تکلیف رفع نہ ہوئی۔ اقبال کو دیگر عارضوں کے ساتھ یہ عارضہ آخری دم تک رہا، جس کے نتیجے میں کھل کر یا بلند آواز سے بول نہ سکتے تھے۔ اس لیے سیاسی جلسوں میں تقریروں کا سلسلہ بند ہو گیا۔ جہاں تک وکالت کے کام کا تعلق ہے، اسے تو پہلے ہی ان کی سیاست میں دلچسپی اور گول میز کانفرنسوں میں شمولیت کے سبب ہندوستان سے طویل عرصوں کے لیے غیر حاضری سے شدید نقصان پہنچ چکا تھا اور اگر وہ اس سال سے اسے از سرِ نو شروع کرنے کا ارادہ رکھتے بھی تھے تو بھی ایسے ارادے کی تکمیل کے اب امکانات ختم ہو چکے تھے۔

صحت کے نقطۂ نظر سے اقبال اگرچہ اپنے سرخ و سپید چہرے کی بدولت ہمیشہ تندرست و توانا دکھائی دیتے تھے، مگر انہیں جوانی ہی سے مختلف قسم کے عوارض نے آ گھیرا تھا۔ مزاج بلغمی تھا۔ تبخیر معدہ کی تکلیف رہتی۔ پھر مدت تک درد گردہ کی شکایت رہی۔ یہ مرض انہیں اپنی والدہ سے ورثے میں ملا تھا۔ احباب کے مشورے سے حکیم نابینا کا علاج کرایا، جس سے بہت فائدہ

ہوا۔اس کے بعد دردنقرس کا عارضہ لاحق ہو گیا۔اس کے دورے پڑتے تو لگا تار کئی راتیں کرب اور بے چینی کے عالم میں تڑپتے گزر جاتیں۔ترش چیزیں کھانے کی عادت کے سبب گلا اکثر خراب رہتا۔تمباکونوشی سے کھانسی کی شکایت بھی تھی،جس نے رفتہ رفتہ دمہ ٔقلبی کی صورت اختیار کرلی۔کھانستے کھانستے بے ہوش ہوجایا کرتے۔ایک آنکھ بچپن ہی سے تقریباً بیکار تھی،لیکن اب ان کی دوسری آنکھ میں بھی موتیا اترنے لگا۔آخر کار بحیثیت مجموعی کمزوری اور ضعف کے باعث دل بڑھ گیا اور وہ پوری طرح خون پمپ کرنے کے قابل بھی نہ رہا،جس کے نتیجے میں معمولی محنت کرنے سے ان کا دم پھول جاتا۔علاج کے معاملے میں بڑی بے پرواطبیعت پائی تھی۔بدذائقہ دوا پینے سے یا ناگوار شے کھانے سے انکار کرتے تھے۔ملنے والوں میں سے کسی نے کوئی ٹوٹکا بتادیا تو اسے بھی استعمال میں لے آتے۔پرہیز کی پابندی سے کتراتے اور ایک طریق علاج میں دوسرا اور دوسرے میں تیسرا داخل کردیتے۔

ایلوپیتھک طریق علاج کے اس لیے خلاف تھے کہ ڈاکٹروں کی دوائیں بدذائقہ ہوتی ہیں اور انہیں تجویز کرتے وقت مریض کی نفاست طبع کوملحوظ نہیں رکھا جاتا،لیکن ایک بار جب حکیم نابینا نے انہیں آواز کے لیے چڑے کا مغز یا خرگوش کا مغز کھانے کو کہا تو نذیر نیازی کو تحریر کیا:

> پرندوں اور نرخوگوش کا مغز میں نے آج تک استعمال نہیں کیا......مغز خرگوش کا کھانا میرے لیے ناممکنات سے ہے......خرگوش کا مغز یا چڑے کا مغز کھانا بہت مشکل معلوم ہوتا ہے۔حکیم صاحب قبلہ کی خدمت میں عرض کیجیے کہ ان کی جگہ کوئی اور دوا تجویز فرمائیں۔

ان کی بد پرہیزی کی ایک مثال پیش خدمت ہے۔۲۳/جون ۱۹۳۴ء کے خط میں نذیر نیازی کو تحریر کرتے ہیں کہ تجربے سے معلوم ہوا،دہی اور لسّی کا گلے پر اچھا اثر نہیں ہوتا۔اسی طرح فالودے کا اثر بھی اچھا نہیں ہوتا لیکن اس سے اگلے ہی روز اپنے خط میں انہیں لکھا:

> دوسرے ہفتے کی دوا نے،پہلے ہفتے سے ترقی جو آواز میں ہوئی تھی،کوئی اضافہ نہیں کیا بلکہ ترقی معکوس میں ہوئی۔اس کے وجوہ جہاں تک سوچ سکتا ہوں،تین ہو سکتے ہیں:
>
> (۱) میں نے دہی کھایا اور لسّی بھی پی۔
>
> (۲) فالودہ پیا(برف ڈال کر)
>
> (۳) آپ نے پچھلے خط میں لکھا تھا کہ دوا کی مقدار دگنی کردی گئی ہے۔شاید ڈوس(خوراک)کے بڑھ جانے کی وجہ سے آواز نے ترقی معکوس کی۔

خیر گلے کا عارضہ لاحق ہونے کے تقریباً تین ماہ بعد یعنی اپریل ۱۹۳۴ء میں جب نذیر نیازی دہلی سے لاہور پہنچ کر اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہیں علیل پا کر گھبرا گئے۔ اسی تکلیف کی بنا پر اقبال جامعہ ملیّہ میں ترکی رہنما بہجت وہبی کے توسیعی خطبات میں کسی ایک کی صدارت کی خاطر دہلی نہ جا سکے تھے، گو اس حالت میں بھی جامعۂ ملیّہ کو ایک ایسا ادارۂ طبع و نشر قائم کرنے کا مشورہ دیا جو بقول نذیر نیازی، عصر حاضر کے جدید افکار اور رجحانات کے پیش نظر مطبوعات کے ذریعے اسلام کی ترجمانی نئے علمی تقاضوں کے علاوہ اس کے عمرانی، تہذیبی اور ثقافتی پہلوؤں کا لحاظ رکھتے ہوئے اس طرح کرے کہ عالم اسلام میں ذہناً اور عملاً جو انتشار پھیل رہا ہے اس کا ازالہ ہو جائے، لیکن اس انداز میں کہ قدیم و جدید کی غلط بحث کو سر اٹھانے کا موقع نہ ملے۔

نذیر نیازی کو بتایا گیا کہ سینے وغیرہ کے ایکس ریز فوٹو کی بنیاد پر ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ دل کے اوپر کی طرف ایک نئی گروتھ (رسولی) ہو رہی ہے۔ جس کے دباؤ سے ووکل کارڈ (آلۂ صوت) متاثر ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک اس بیماری کا علاج یا تو ریڈیم سے ہوگا یا ایکس ریز سے اور یہ دونوں علاج یورپ ہی میں ہو سکتے تھے۔ اس لیے انہیں لندن یا وی آنا (آسٹریا) چلے جانا چاہیے تاکہ علاج مذکور سے گروتھ کی نشوونما روکی جا سکے یا اسے ایکس ریز یا ریڈیم سے تحلیل کیا جا سکے۔ ان کی رائے میں اگر گروتھ کی طرف توجہ نہ کی گئی تو زندگی خطرے میں پڑ جائے گی، کیونکہ ممکن ہے یہ گروتھ بڑھ کر پھیپھڑوں پر بھی اپنا دباؤ ڈالے۔ نذیر نیازی نے عرض کیا کہ حکیم نابینا کے علاج سے اقبال کی درد گردہ رفع ہوئی تھی، اس لیے اس معاملے میں بھی کیوں نہ ان سے رجوع کیا جائے۔ اقبال کا ذاتی رجحان طب ہی کی طرف تھا۔ اور ویسے بھی انہیں یقین تھا کہ ایلوپیتھک طریق علاج کو دوسرے طریقوں پر وہ برتری حاصل نہیں جس کا عموماً دعویٰ کیا جاتا ہے۔ پس انہیں نذیر نیازی کی تجویز پسند آئی اور حکیم نابینا کا علاج شروع ہوا۔ حکیم نابینا نے اقبال کو دہلی آنے کے لیے کہا۔ نتیجتاً وہ ۱۱؍ جون ۱۹۳۴ء کو دہلی پہنچے۔ حکیم نابینا نے بڑی توجہ اور ہمدردی سے ان کا حال سنا۔ پھر نبض دیکھی، نسخہ تجویز کیا، دوائیں منگوائیں اور ضروری ہدایات دیں۔ ۱۲ جون ۱۹۳۴ء کو اقبال واپس لاہور آ گئے۔

حکیم نابینا کے علاج سے چند ماہ میں ان کی عام صحت تو خاصی بہتر ہو گئی لیکن آواز میں کوئی خاص افاقہ نہ ہوا۔ اُدھر ان کے عارضے کے متعلق ڈاکٹروں کا آپس میں اختلاف رائے بڑھتا چلا

گیا۔ چھ سات ماہ گزرنے کے بعد بالآخر ڈاکٹر اس نتیجے پر پہنچے کہ گروتھ، ٹیومر یا رسولی کی تھیوری غلط ہے، کیونکہ اگر ایسی صورت حال ہوتی تو ان کی عام صحت اس قدر جلد ترقی نہیں کر سکتی تھی بلکہ روز بروز بدتر ہوتی چلی جاتی۔ سو اب اُن کے خیال میں اقبال کا مرض صرف شاہرگ کا پھیلاؤ یا ورم تھا جو خون کے سمی مادوں یا نفس کے زیادہ استعمال کے سبب پیدا ہو سکتا تھا اور یہ عارضہ بعض پہلوانوں اور گویوں کو بھی لاحق ہوتا ہے۔ پس مرض خطرناک تو نہ تھا مگر آواز کے نارمل حالت میں عود کر آنے کے امکانات کم تھے، اس لیے علاج کی یہی ایک صورت تھی کہ موجودہ آواز پر اکتفا کیا جائے اور شاہرگ کے پھیلاؤ کو دواؤں کے ذریعے روکنے کی کوشش کی جائے۔

اسی دوران میں اقبال کو جنوبی افریقہ کے مسلمانوں کی طرف سے دعوت موصول ہوئی کہ اُن کے ملک کا دورہ کریں۔ اسی طرح ان کے بعض قدردان انہیں جرمنی میں دیکھنا چاہتے تھے اور ترکی کے بعض حلقے انہیں وہاں بلانے کے آرزومند تھے، لیکن اقبال کو اپنی علالت کے سبب بیرون ملک جانے کے تمام منصوبے ترک کرنے پڑے۔ نذیر نیازی کی وساطت سے جامعۂ ملّیہ کے ساتھ اپنے انگریزی خطبات مع اردو ترجمہ از نذیر نیازی اور زیر کتابت شعری تصانیف مسافر اور بال جبریل کی طباعت و اشاعت کے سلسلے میں بھی بات چیت ہوئی، مگر اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

آواز کی اچانک خرابی اقبال کے لیے ایک نفسیاتی دھچکا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اس مصیبت سے جتنی جلد ممکن ہو سکتا ہے، چھٹکارا حاصل ہو اور وہ معمول کے مطابق اپنی مصروفیات کی طرف متوجہ ہوں۔ ڈاکٹروں، حکیموں اور جراحوں کے علاج نے ان پر مایوسی کی کیفیت طاری کر دی تھی۔ غالباً اسی سبب وہ ٹوٹکوں یا چٹکلوں پر اتر آئے تھے یا کسی معجزے کے منتظر تھے۔ بیماری کے باعث ملکی سیاست میں ان کی دلچسپی کچھ محدود سی ہو گئی، لیکن بالکل ختم نہ ہوئی۔ اس زمانے کے اخبارات بالخصوص انقلاب میں ان کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اہم مسائل پر وہ اپنی رائے کا اظہار ضرور کرتے تھے مثلاً کشمیر میں ایجی ٹیشن ہنوز جاری تھی اور ریاستی پولیس سیاسی مظاہرین کو وحشیانہ سزائے بیدزنی دینے یا ان پر گولی چلانے سے باز نہ آتی تھی۔ اس سلسلے میں اقبال نے ۲۲ فروری ۱۹۳۴ء کو نہ صرف وائسرائے کو تار بھیجا بلکہ ۳ مارچ ۱۹۳۴ء کو ایسی انسانیت سوز سزاؤں کے خلاف آواز اٹھانے کے لیے جمعیتِ اقوام کے نام ایک برقی پیغام بھی لندن ٹائمز میں شائع کرایا۔

۲۴ مئی ۱۹۳۴ء کو کمیونل ایوارڈ (فرقہ وارانہ فیصلہ) کے متعلق انہوں نے نمائندہ ایسوسی اٹیڈ پریس کو بیان دیتے ہوئے فرمایا کہ کانگرس کو کمیونل ایوارڈ کی مخالفت نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس کے بجائے ہندو مسلم رہنماوں کو باہمی سمجھوتے کے لیے مشترکہ جدوجہد کرنی چاہیے۔ ان ایام میں کانگرس کے اندر سوشلسٹ پارٹی بن چکی تھی اور پنڈت جواہر لعل نہرو بھی سوشلزم کے حامی سمجھے جاتے تھے، بہرحال سوشلسٹ پارٹی کو پٹنہ میں شکست ہوئی۔ اس خیال سے کہ شاید سوشلسٹ پارٹی کے لبرل ہندو لیڈر کانگرسی سوراجی یا مہاسبھائی ہندو لیڈروں کے مقابلے میں مسلم رہنماؤں کے ساتھ زیادہ آسانی سے سمجھوتا کر لیں، اقبال نے ان کے خیالات سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے ہفت روزہ منادی میں یکم جون ۱۹۳۴ء کو بیان شائع کروایا۔ اقبال نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ اگرچہ کمیونل ایوارڈ ان کے تمام مطالبات پورے نہیں کرتا، وہ اسے قبول کر لیں کیونکہ عملی تقاضوں کے پیش نظر انہیں صرف یہی راستہ اختیار کرنا چاہیے۔

۲۹ جون ۱۹۳۴ء کی شام کو اقبال سرہند تشریف لے گئے اور شیخ احمد (حضرت مجدّد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ) کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ ۳۰ جون ۱۹۳۴ء کو واپس لاہور آ گئے۔ چوہدری محمد حسین، حکیم طاہر الدین، علی بخش اور راقم ان کے ہمراہ تھے۔ غلام بھیک نیرنگ، ان کے پرانے دوست، انبالے سے سرہند پہنچے اور انہوں نے اقبال کے ساتھ مزار پر حاضری دی۔ راقم کو خوب یاد ہے کہ وہ ان کی انگلی پکڑے مزار میں داخل ہوا۔ گنبد کے تیرہ و تار مگر پروقار ماحول نے اس پر ایک ہیبت سی طاری کر دی تھی۔ اقبال تربت کے قریب فرش پر بیٹھ گئے اور راقم کو بھی پاس بٹھا لیا۔ پھر انہوں نے قرآن مجید کا ایک پارہ کھولا اور دیر تک تلاوت کرتے رہے۔ اس وقت وہاں اور کوئی موجود نہ تھا۔ گنبد کی خاموش اور تاریک فضا میں ان کی رندھی ہوئی مدھم آواز گونج رہی تھی۔ راقم نے دیکھا کہ ان کی انکھوں سے آنسو اُمڈ کر رخسارو ں پر ڈھلک آئے ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مزار پر حاضری دینے کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ راقم کی پیدائش پر اقبال نے عہد کیا تھا کہ وہ اسے ساتھ لے کر بارگاہ میں حاضر ہوں گے۔ دوسری وجہ کے متعلق انہوں نے نذیر نیازی کو اپنے ایک خط مورخہ ۲۹/جون ۱۹۳۴ء میں تحریر کیا:

چند روز ہوئے صبح کی نماز کے بعد میری آنکھ لگ گئی۔ خواب میں کسی نے مندرجہ ذیل پیغام دیا: ہم نے جو خواب تمہارے اور شکیب ارسلان (شام کے معروف دروزی رہنما، اتحاد ممالک

اسلامیہ اوراحیائے اسلام کے بہت بڑے داعی) کے متعلق دیکھا تھا، وہ سرہند بھیج دیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ خدا تعالیٰ تم پر بہت بڑا فضل کرنے والا ہے۔ پیغام دینے والا معلوم نہیں ہو سکا کون ہے۔اس خواب کی بنا پر وہاں کی حاضری ضروری ہے۔

سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کی نمائندگی بھی ایک نہایت اہم مسئلہ تھا۔اقبال نے مسلم کانفرنس کے سیکرٹری حاجی رحیم بخش کے ہمراہ اپنے ایک بیان مورخہ ۷ جولائی ۱۹۳۴ء میں اس قرارداد پر تبصرہ کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ یہ تناسب پچیس فیصد کی بجائے تینتیس فیصد ہونا چاہیے، کیونکہ مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کے لیے تینتیس فیصد نیابت ہی طے ہوئی ہے، بلکہ ملازمتوں میں پرانی کمی کو دور کرنے کے لیے نئی اسامیوں میں مسلمانوں کا تناسب اس سے بھی زیادہ ہونا چاہیے۔ پھر ۹ ؍جولائی ۱۹۳۴ء کو انھوں نے ایک اور بیان دیا جس کا ماحصل یہ تھا کہ صوبائی حکومتیں بھی مرکزی حکومت کی اس قرارداد کی تائید کریں۔ نیز قرارداد پر صحیح طریقے سے عمل درآمد کروانے کی خاطر ایک مؤثر مشینری وجود میں لائی جائے۔

اگست ۱۹۳۴ء میں اقبال کی پریشانیوں میں ایک اور پریشانی کا اضافہ ہو گیا۔ یہ سردار بیگم کی ناگفتہ بہ حالت تھی۔سردار بیگم، جن کی عمر تب تقریباً چالیس برس تھی، چند سالوں سے علیل تھیں۔ان کا جگر اور تلی دونوں بڑھ گئے تھے اور ایک مدت سے ڈاکٹر ان کا علاج کر رہے تھے، لیکن کوئی فائدہ نہ ہوتا تھا۔ڈاکٹروں کی تشخیص تھی کہ ان کے خون میں سرخ ذرات نہیں رہے یا ان کی بہت کمی ہو گئی ہے۔اقبال نے ان کا علاج بھی حکیم نابینا سے کرانا شروع کر دیا۔

اپنی صحت اور سردار بیگم کی علالت کی پریشانیاں تو بدستور رہیں، مگر بعض ایسے خانگی امور بھی تھے جو مدت سے ٹل رہے تھے اور جو ان کی فوری توجہ کے مستحق تھے۔سو اسی ماہ انھوں نے راقم کی بنک میں جمع شدہ رقم میں کچھ رقم اپنی طرف سے ڈال کر، سردار بیگم کی خواہش کے مطابق، نیلامی میں ایک قطعہ اراضی میوروڈ (حال علامہ اقبال روڈ) پر خرید کیا تاکہ اس پر کوٹھی تعمیر کی جا سکے۔کوٹھی کی تعمیر پر سردار بیگم کی روزمرّہ خرچ سے بچائی ہوئی رقم، ان کے زیورات کی فروخت سے حاصل کردہ رقم اور بنک میں ان کے نام جمع شدہ رقم استعمال کی گئی۔کوٹھی کی تعمیر کے لیے اقبال نے اپنے بھائی شیخ عطا محمد کو سیالکوٹ سے بلوایا اور ان کی زیر نگرانی ایک ٹھیکے دار کے ذریعے نومبر ۱۹۳۴ء کے دوسرے یا تیسرے ہفتے میں ’’جاوید منزل‘‘ کی تعمیر شروع ہوئی۔اقبال کو کوٹھی کی تعمیر کے لیے مزید روپوں کی ضرورت تھی اور ان کی خواہش تھی کہ

اگر جامعۂ ملّیہ ان کے خطبات کی طباعت پر رضامند ہو جائے تو انہیں اس ایڈیشن کی رقم یکمشت اور فوراً ادا کر دی جائے۔ بالِ جبریل کی کتابت ہی کے دوران میں اس کے پہلے ایڈیشن کی فروخت کا انتظام ہو گیا تھا، لیکن جامعۂ ملّیہ کی اپنی مالی مشکلات کے باعث یہ مسئلہ اقبال کے حسبِ منشا طے نہ ہو گا۔ ''جاوید منزل'' کی تعمیر پانچ ماہ بعد یعنی اپریل ۱۹۳۵ء میں مکمل ہوئی اور اقبال مع اہل و عیال ۲۰ مئی ۱۹۳۵ء کو اس میں منتقل ہوئے۔ چونکہ قطعۂ اراضی راقم کی عطا کردہ رقوم سے خریدا گیا تھا اور کوٹھی کی تعمیر پر سردار بیگم کا روپیہ استعمال ہوا تھا، اس لیے ابتدا میں زمین اور کوٹھی اقبال اور سردار بیگم دونوں کی ملکیت تھیں، مگر سردار بیگم کی وفات سے دو روز قبل دونوں نے یہ جائداد راقم کے نام کر دی۔ اب اس مکان میں اقبال اور سردار بیگم کی حیثیت محض کرایہ داروں کی تھی اور اقبال ہر ماہ کی اکیس تاریخ کو ''جاوید منزل'' کے ان کمروں کا جو ان کے زیرِ استعمال تھے، کرایہ راقم کو ادا کرتے تھے۔

ستمبر ۱۹۳۴ء ہی میں انہوں نے علی گڑھ یونیورسٹی میں ایک خدا دشمن مجلس کے وجود کے متعلق سنا، جس نے وطنیت اور اشتراکیت کے آڑ لے کر اسلامیت کے خلاف ایک زبردست محاذ قائم کر رکھا تھا۔ اقبال کو یہ سن کر اس قدر رنج ہوا کہ تمام رات بے خواب گزری اور صبح کی نماز میں گریہ وزاری کی کوئی حد نہ رہی۔ نذیر نیازی تحریر کرتے ہیں کہ یہ مجلس اگرچہ توڑ دی گئی اور اس کے منتظمین کو علی گڑھ یونیورسٹی سے نکال دیا گیا، مگر یہ امر کہ یہ سب کچھ مسلمانوں کے مدرسۃ العلوم میں ہوا، اقبال کے لیے بڑا تکلیف دہ تھا۔

علی گڑھ یونیورسٹی کے حالات کے پیشِ نظر دسمبر ۱۹۳۴ء کے آخری حصّے میں اقبال دو ایک روز کے لیے علی گڑھ تشریف لے گئے۔ واپسی پر دہلی رکے اور حکیم نابینا سے سردار بیگم کی علالت کے بارے میں مشورہ کیا۔ ۲۵ دسمبر ۱۹۳۴ء کی صبح لاہور پہنچے۔

سردار بیگم کی طویل علالت کے سبب گھر کے ماحول پر افسردگی سی چھائی رہتی۔ سردار بیگم کا تو بیشتر وقت بسترِ علالت ہی پر پڑے گزرتا۔ اس لیے وہ منیرہ اور راقم کی صحیح دیکھ بھال نہ کر سکتی تھیں۔ منیرہ کی عمر تب تقریباً ساڑھے چار برس تھی اور راقم کی ساڑھے دس برس۔ منیرہ کو محلے کی لڑکیاں سارا دن گود میں اٹھائے لیے پھرتیں، لیکن وہ کسی سے نہ بہلتی تھی اور دن بھر منہ آسمان کی طرف اٹھا کر روتی رہتی، جس سے سردار بیگم بہت کڑھتیں۔ اصل میں منیرہ کو ماں کی توجہ یا محبت

کی ضرورت تھی جو بد قسمتی سے اسے میسر نہ آئی۔ سردار بیگم اسے پانچ برس سے کم عمر کی چھوڑ کر فوت ہوئیں۔ لہٰذا بڑی ہونے پر اسے ماں کی صورت بھی یاد نہ تھی۔

ماں اور باپ دونوں کو بستر علالت پر پڑے دیکھ کر بعض اوقات راقم اور منیرہ ایک دوسرے کو سہمی ہوئی نظروں سے دیکھتے۔ دونوں کی عمر میں چھ برس کا فرق تھا۔ اس لیے ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے، کیونکہ آپس میں کھیل بھی نہ سکتے تھے۔ منیرہ تو ایک نہایت ہی تنہا بچی تھی، کیونکہ اس کے ساتھ کھیلنے والا کوئی نہ تھا۔

نو سال کی عمر میں راقم کو سیکرڈ ہارٹ اسکول سے اٹھوا کر ایک سال کے لیے انارکلی بازار کے قریب سینٹ فرانسس اسکول میں ڈالا گیا۔ جہاں ماسٹر تارا چند اسے پڑھاتے تھے۔ اس اسکول سے پرائمری کا امتحان پاس کرنے کے بعد وہ ۱۹۳۴ء میں سنٹرل ماڈل اسکول میں پانچویں جماعت میں داخل ہوا۔

جنوری ۱۹۳۵ء میں اقبال کا معروف اردو مجموعۂ کلام بال جبریل لاہور سے شائع ہوا۔ پہلے انہوں نے اس تصنیف کا نام ''نشان منزل'' تجویز کیا تھا، بعد میں اس کی جگہ بال جبریل رکھا۔

نومبر ۱۹۳۴ء سے سر راس مسعود بھوپال میں وزیر تعلیم وصحت و امور عامہ کے فرائض انجام دے رہے تھے، انہوں نے گلے کی تکلیف کے بارے میں اقبال کو بھوپال آ کر بجلی کا علاج کرانے کی دعوت دی۔ اقبال کے بعض دیگر احباب نے بھی انہیں یہی مشورہ دیا تھا۔ بھوپال کے حمیدیہ ہسپتال میں اس وقت بجلی کے علاج سے متعلق جدید ترین مشینیں نصب کی گئی تھیں۔ بالآخر سر راس مسعود کے اصرار پر اقبال نے بھوپال جا کر بجلی کا علاج کرانے کا ارادہ کر ہی لیا۔

ان ہی ایام میں ترکی کی مشہور صحافیہ خالدہ ادیب خانم جو ترکی کی انجمن اتحاد و ترقی کی رکن اور مصطفی کمال پاشا کی شریک کار رہ چکی تھیں، لیکن اس وقت پیرس میں جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہی تھیں، ڈاکٹر انصاری کی دعوت پر جامعہ ملّیہ میں توسیعی خطبات دینے کی غرض سے دہلی آئی ہوئی تھیں۔ جامعۂ ملّیہ کی فرمائش تھی کہ اقبال دہلی آ کر ان کے کسی خطبے کی صدارت کریں۔ اقبال نے بوجہ علالت معذوری کا اظہار کر دیا۔ اس دوران میں خالدہ ادیب خانم کے چند لکچر جامعۂ ملّیہ میں ہوئے جن کا ہندوستان کے اخبارات میں خوب چرچا بھی ہوا، کیونکہ ان کا زاویہ نگاہ خالصتاً سیکولر تھا۔ اقبال کی رائے ان کے متعلق یہ تھی کہ مشرق کی روحانیت اور مغرب کی

مادّیت کے متعلق جن خیالات کا اظہار خالدہ ادیب خانم نے اپنے لکچروں میں کیا ہے، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نگاہ بہت محدود ہے۔

بہر حال بھوپال جانے کی غرض سے اقبال، علی بخش کے ساتھ ۲۹ / جنوری ۱۹۳۵ء کو لاہور سے روانہ ہوئے اور ۳۰ جنوری ۱۹۳۵ء کی صبح دہلی پہنچے۔ دن بھر قیام سردار صلاح الدین سلجوقی کے ہاں افغان قونصل خانے میں رہا۔ شام کو جامعۂ ملیّہ میں خالدہ ادیب خانم سے بات چیت ضرور ہوئی، مگر ان کے خیالات پر کوئی تبصرہ نہ کیا۔ بعد میں رات کی گاڑی سے بھوپال روانہ ہو گئے اور ۳۱ جنوری ۱۹۳۵ء کی صبح وہاں پہنچے۔

اسٹیشن پر سر راس مسعود، ان کے پرسنل سیکرٹری ممنون حسن خان اور نواب بھوپال کے ملٹری سیکرٹری کرنل اقبال محمد خان استقبال کے لیے موجود تھے۔ ممنون حسن خان فرماتے ہیں:

> جب گاڑی آئی تو ایک صاحب افغانی ٹوپی، شلوار اور پنجابی کوٹ میں ملبوس پلیٹ فارم پر اترے۔ سر راس مسعود کی نظر ان پر پڑی تو اس تیزی سے آگے بڑھے اور ان کے منہ کے اس قدر بوسے لیے کہ لوگ حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگے۔

اقبال کا قیام سر راس مسعود کی رہائش گاہ ''ریاض منزل'' میں تھا۔ جب وہاں پہنچے تو بیگم امت المسعود نے ان کا خیر مقدم کیا۔ ممنون حسن خان کو اقبال کی پیشی میں مقرر کیا گیا تھا تاکہ کسی چیز کی ضرورت ہو تو اقبال انھیں اطلاع دیں۔ ممنون حسن خان کہتے ہیں:

> کھانے کے بعد علامہ اقبال کا کمرہ دیکھنے گیا تو مجھے حیرت ہوئی کہ وہ بستر جو سر راس مسعود نے اپنے مہمان عزیز کے لیے بچھوایا تھا، اسے ان کے ملازم (علی بخش) نے اٹھا دیا تھا اور اس کی جگہ اقبال کا معمولی بستر لگا دیا تھا۔ میں نے جب دریافت کیا تو ملازم نے بتایا کہ اقبال ہمیشہ اپنے بستر پر ہی سوتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ علامہ اقبال کے بستر پر دو کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک مثنوی مولانا روم اور دوسری دیوان غالب۔ ملازم نے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب سفر میں زیادہ تر ان کتابوں کو ساتھ رکھتے ہیں۔ ان کے پلنگ کے قریب ہی ایک پنجابی حقہ رکھا ہوا تھا۔

''ریاض منزل'' میں اقبال کا بیشتر وقت مطالعہ یا اشعار لکھنے میں صرف ہوتا۔ ضرب کلیم میں شامل سات نظمیں یہیں تحریر کی گئی تھیں۔

اقبال ۷ / مارچ ۱۹۳۵ء کو بھوپال سے روانہ ہو کر ۸ / مارچ ۱۹۳۵ء کو دہلی پہنچے۔ حسب معمول افغان قونصل خانے میں قیام فرمایا۔ اگلے روز صبح حکیم نابینا کی خدمت میں حاضر

ہوئے اور نبض دکھائی۔ نیز سردار بیگم کی علالت کے متعلق مشورہ کیا۔ رات کو واپس لاہور روانہ ہوئے اور ۱۰؍مارچ ۱۹۳۵ء کی صبح لاہور پہنچے۔

لاہور پہنچنے پر انہوں نے دیکھا کہ سردار بیگم کی حالت پہلے سے کہیں زیادہ خراب ہو چکی ہے۔ ان کا جگر اس قدر بڑھ گیا تھا کہ اس پہلو پر جس طرف جگر ہے، لیٹنا یا سونا ناممکن ہو گیا تھا۔ شدید کھانسی کے دورے پڑتے تھے۔ پاؤں پر ورم تھا اور نہایت کمزور اور لاغر ہو گئی تھیں۔ اپنی بیماری سے بے پروا وہ اقبال کی علالت کے بارے میں فکر مند رہتی تھیں۔ مئی ۱۹۳۵ء کے ابتدائی دنوں میں ان کی حالت مزید تشویش ناک ہو گئی۔ معدے میں پانی بھر گیا، ران پر ایک خوفناک پھوڑا نکلا جس کا آپریشن کیا گیا۔ ۲۰ مئی ۱۹۳۵ء کو جب وہ نئے گھر ''جاوید منزل'' میں منتقل ہوئیں تو بیماری کی حالت میں گاڑی میں وہاں لائی گئیں۔ انہیں چارپائی پر اندر لایا گیا۔ ذکر کیا جا چکا ہے کہ اراضی اور مکان دونوں سردار بیگم اور اقبال کی ملکیت تھے، لیکن شاید اقبال کو احساس ہو گیا تھا کہ سردار بیگم کا آخری وقت آن پہنچا ہے اس لیے ۲۱؍مئی ۱۹۳۵ء کو وہ کچھ کاغذات ہاتھ میں اٹھائے اندر تشریف لائے اور سردار بیگم سے کہا کہ ''جاوید منزل'' راقم کے نام ہبہ کر دو۔ مگر سردار بیگم نہ مانتی تھیں۔ وہ کہتی تھیں کہ مجھے کیا معلوم یہ لڑکا بڑا ہو کر کیسا نکلے۔ میں جلد صحت یاب ہو جاؤں گی، آپ فکر نہ کریں۔ اقبال نے انہیں آگاہ کیا کہ زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اس پر انہوں نے خاموشی سے ہبہ نامہ پر دستخط کر دیئے۔ یوں اس تاریخ سے ''جاوید نامہ'' راقم کے نام منتقل ہوئی۔ اور اقبال نے ایک کرایہ نامہ بھی تیار کرایا جس کی رو سے وہ راقم کے کرایہ دار کی حیثیت سے اس مکان میں رہنے لگے۔

۲۳ مئی ۱۹۳۵ء کو سردار بیگم پر صبح ہی سے غشی کا عالم طاری تھا، کوئی پانچ بجے شام کے قریب جب راقم ان کے پاس گیا تو وہ بستر پر بیہوش پڑی تھیں۔ راقم نے ان کے حلق میں شہد ٹپکایا اور روتے ہوئے کہا اماں جان، میری طرف دیکھو۔ انہوں نے لحظہ بھر کے لیے آنکھیں کھولیں، راقم کی طرف دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر لیں ۔ چند لمحوں بعد اسی حالت میں انہوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ جب ان کی تجہیز و تکفین کی تیاریاں ہونے لگی۔ تو راقم ننھی منیرہ کا ہاتھ پکڑے روتے ہوئے اقبال کے کمرے کی طرف گیا۔ وہ حسب معمول اپنی چارپائی پر نیم دراز تھے۔ راقم اور منیرہ ان کے دروازے تک پہنچ کر ٹھٹک سے گئے۔ یوں روتے کھڑا دیکھ کر انہوں نے انگلی کے اشارے سے دونوں کو قریب آنے کے لیے کہا اور جب

ہم قریب پہنچے تو ایک پہلو میں راقم کو اور دوسرے میں منیرہ کو بٹھا لیا۔ پھر اپنے ہاتھ پیار سے دونوں کے کندھوں پر رکھ کر قدرے کرختگی سے راقم سے گویا ہوئے: تمھیں یوں نہ رونا چاہیے، تم تو مرد ہو اور مرد رویا نہیں کرتے۔ اس کے بعد اپنی زندگی میں پہلی بار انھوں نے راقم اور منیرہ کی پیشانیوں کو باری باری چوما۔

سردار بیگم کو "جاوید منزل" کے نزدیک بیبیاں پاک دامن کے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ اقبال، راقم اور اقبال کے چند احباب جنازے میں شریک تھے۔ انھیں دفناتے وقت اقبال انتہائی پریشانی کے عالم میں قریب کی ایک پختہ قبر کے تھڑے پر دونوں ہاتھوں سے سر کو تھامے بیٹھے رہے۔ ان کے سنگ مزار پر حاجی دین محمد کاتب کے ہاتھ کا لکھا ہوا اقبال کا درج ذیل قطعہ تاریخ کندہ ہے:

راہی سوئے فردوس ہوئی مادر جاوید
لالے کا خیاباں ہے مرا سینہ پرداغ
ہے موت سے مومن کی نگہ روشن و بیدار
اقبال نے تاریخ کہی "سرمۂ مازاغ"
۱۳۵۴ھ

سردار بیگم کے انتقال کے بعد منیرہ کو اقبال کا قرب حاصل تھا اور وہ رات کو عموماً انھی کے بستر میں سو جایا کرتی۔ اس کی ہر خواہش بغیر کسی حیل و حجت کے پوری کر دی جاتی اور اگر راقم کبھی اسے جھڑکتا یا اس پر ہاتھ اٹھاتا تو اس کی شامت آ جاتی۔ انھیں بہن بھائی کے جھگڑے سے بہت رنج ہوتا تھا۔ وہ اپنے احباب سے اکثر مایوسانہ انداز میں کہا کرتے کہ یہ دونوں آپس میں لڑتے رہتے ہیں اور مجھ سے دیکھا نہیں جاتا اور احباب کے کہنے کے باوجود کہ جس گھر میں بچے ہوں، وہاں لڑائی جھگڑا ہوا ہی کرتا ہے، ان کی تسلی نہ ہوتی۔ راقم سے بارہا جل کر کہا کرتے: تمھارا دل پتھر کا ہے۔ تم بڑے سنگدل ہو۔ اتنا نہیں جانتے کہ اس بہن کے سوا تمھارا دنیا میں کوئی نہیں ہے۔

سر راس مسعود کو اقبال کی ذہنی اور مالی پریشانیوں کا بخوبی علم تھا اور وہ خاموشی سے ان کی امداد کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔ وہ اقبال کی خاطر کسی ایسے مستقل وظیفے کی فراہمی کے لیے تگ و دو میں مصروف تھے جس سے انھیں اپنی مالی پریشانیوں سے نجات مل جائے اور وہ

یکسوئی کے ساتھ اپنا تخلیقی کام جاری رکھ سکیں۔ اقبال نے انہیں اپنے ایک خط مورخہ ۱۲ مئی ۱۹۳۵ء میں تحریر کیا:

میری خواہش ہے کہ اعلیٰ حضرت (نواب بھوپال) خود مجھے اپنی ریاست سے پنشن منظور کر دیں تا کہ میں اس قابل ہو جاؤں کہ قرآن پر اپنی کتاب لکھ سکوں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ ایک بے نظیر کتاب ہوگی اور ان کے نام اور شہرت کو بقائے دوام بخشے گی۔ یہ جدید اسلام کے لیے ایک بہت بڑی خدمت ہوگی اور میں شیخی نہیں بگھار رہا ہوں جب یہ کہتا ہوں کہ میں ہی وہ واحد شخص ہوں جو اس کو کر سکتا ہوں۔

سر راس مسعود کی کوششیں بالآخر کامیاب ہوئیں اور انہوں نے اسی ماہ کے آخر میں اقبال کو اطلاع دی کہ نواب بھوپال نے ان کے لیے پانچ سو روپے ماہوار تاحیات وظیفہ مقرر کر دیا ہے اقبال نے انہیں اپنے ایک دوسرے خط مورخہ ۳۰ مئی ۱۹۳۵ء میں جواب دیا:

میں کس زبان سے اعلیٰ حضرت کا شکریہ ادا کروں۔ انہوں نے ایسے وقت میں میری دستگیری فرمائی جب کہ چاروں طرف سے میں آلام و مصائب میں محصور تھا...... باقی آپ کا شکریہ کیا ادا کروں۔ مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی سادات کی آبائی میراث ہے۔ بالخصوص آپ کے خاندان کی۔

لیکن سر راس مسعود ابھی مطمئن نہ ہوئے تھے۔ وہ کوشاں تھے کہ بھوپال کے علاوہ حیدرآباد، بہاولپور اور آغا خان بھی اقبال کے لیے وظیفے مقرر کریں، تا کہ وہ قرآن مجید پر عہد حاضر کی روشنی میں اپنے خیالات آسودگی سے قلم بند کر سکیں۔ اس سلسلے میں اقبال نے ان سے اختلاف کرتے ہوئے اپنے ایک خط مورخہ ۱۱ دسمبر ۱۹۳۵ء میں تحریر کیا۔

آپ کو معلوم ہے کہ اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال نے جو رقم میرے لیے مقرر فرمائی ہے، وہ میرے لیے کافی ہے۔ اور اگر کافی نہ بھی ہو تو میں کوئی امیرانہ زندگی کا عادی نہیں۔ بہترین مسلمانوں نے سادہ اور درویشانہ زندگی بسر کی ہے، ضرورت سے زیادہ کی ہوس کرنا روپیہ کا لالچ ہے جو کسی طرح بھی کسی مسلمان کے شایانِ شان نہیں ہے۔ آپ کو میرے اس خط سے یقیناً کوئی تعجب نہ ہوگا کیونکہ جن بزرگوں کی آپ اولاد ہیں اور جو ہم سب کے لیے زندگی کا نمونہ ہیں، ان کا شیوہ ہمیشہ سادگی اور قناعت رہا ہے۔

مصائب و آلام اور طرح طرح کی الجھنوں کے باوجود اقبال ان مہینوں میں بھی اپنی علمی و شعری کاوشوں، مسلمانوں کی شیرازہ بندی اور ان کے سیاسی مسائل کے حل کے لیے وقت نکالتے

رہے۔ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس کی خاطر انہوں نے نواب بھوپال کو صدارت کے لیے لاہور بلوانے کی کوشش کی۔ زبور عجم مع اردو ترجمہ (جو حواشی کی شکل میں تھا) کی اشاعت کا ارادہ کیا۔ ''صور اسرافیل'' (جو ۱۹۳۶ء میں ضرب کلیم کے نام سے شائع ہوئی) کے لیے اشعار کی تخلیق کا سلسلہ جاری رکھا اور اسی طرح انہی ایام میں احمدیت کی تردید میں اپنا پہلا انگریزی بیان بعنوان ''قادیانیت اور صحیح العقیدہ مسلمان'' تحریر کیا۔ یہ بیان برصغیر کے مختلف انگریزی اخباروں مثلاً ایسٹرن ٹائمز، ٹریبیون، سٹار آف انڈیا، کلکتہ، دکن ٹائمز وغیرہ میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ اردو اخباروں میں اس کا ترجمہ بھی چھپا۔ ۱۴ مئی ۱۹۳۵ء کو سٹیٹسمین نے اسے شائع کیا اور ساتھ اس پر لیڈنگ آرٹیکل بھی لکھا۔

طلوع اسلام بابت اکتوبر ۱۹۳۵ء میں نذیر نیازی نے بھی اس مسئلے پر روشنی ڈالتے ہوئے اقبال کی بعض تحریروں کے اقتباسات پیش کیے جن میں انہوں نے نبوت کے دو اجزا پر بحث کی تھی۔ یعنی نبوت روحانیت کے ایک خاص مقام کی حیثیت سے اور نبوت ایک ایسے ادارے کی حیثیت سے جو نئی اخلاقی فضا تخلیق کر کے انسانوں میں سیاسی اور معاشرتی تغیر کا سبب بنے۔ بقول اقبال اگر دونوں اجزا موجود ہوں تو وہ نبوت ہوگی اور اگر صرف پہلا جزو موجود ہو، تو تصوف یا ولایت۔ اقبال نے تحریر کیا:

> ختم نبوت کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص بعد اسلام اگر یہ دعویٰ کرے کہ مجھ میں ہر دو اجزا نبوت کے موجود ہیں یعنی یہ کہ مجھے الہام وغیرہ ہوتا ہے اور میری جماعت میں داخل نہ ہونے والا کافر ہے تو وہ شخص کاذب ہے۔

بالآخر احمدیوں کی حمایت میں پنڈت جواہر لعل نہرو بھی اس بحث میں کود پڑے اور انہوں نے اپنے تین انگریزی مضامین بعنوان ''اتحاد اسلام'' اقبال کے مضمون پر تبصرہ میں جو کلکتے کے رسالے ماڈرن ریویو میں نومبر ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئے، اقبال کے نظریات کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اقبال نے ان کے مضامین کا ایک نہایت جامع جواب بعنوان ''اسلام اور احمدیت'' تحریر کیا جو اسلام مورخہ ۲۲ جنوری ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا۔ اس طویل جوابی مضمون میں بھی، جو کئی بار چھپ چکا ہے، انہوں نے مسئلہ ختم نبوت کے متعلق مسلمانوں کے موقف کی وضاحت کی۔ نیز ثابت کیا کہ مسلمانوں کے تنزل کا اصل سبب ملائیت، تصوف اور مطلق العنان سلطنت ایسی منفی قوتیں تھیں۔ پھر جدید ترکی میں سیکولر قسم کی اصلاحات کی مدافعت

میں تحریر کیا کہ وہ اسلام کے منافی نہیں ہیں۔ بال آخر اپنے خط بنام پنڈت جواہر لعل نہرو مورخہ ۱۲/ جون ۱۹۳۶ء میں اقبال نے احمدیوں کے سیاسی رویے کا تجزیہ کرتے ہوئے تحریر کیا۔
میرے ذہن میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ احمدی اسلام اور ہندوستان دونوں کے غدار ہیں۔

۱۹۳۵ء میں گورنمنٹ آف انڈیا بل جب برطانوی پارلمینٹ میں زیر بحث آیا تو اس میں کمیونل ایوارڈ کی وہ دفعہ شامل نہ کی گئی تھی جس میں درج تھا کہ مجالس قانون ساز متعلقہ اقوام (ہندو اور مسلمان) کی منشا کے بغیر کوئی ترمیم نہ کریں گی۔ اس پر اقبال نے سیٹھ عبداللہ ہارون، مولانا شفیع داؤدی اور دیگر رہنماؤں کے ساتھ مل کر یکے بعد دیگرے دو بیان ۳ جولائی ۱۹۳۵ء اور ۱۸ جولائی ۱۹۳۵ء کو جاری کیے اور مطالبہ کیا کہ کمیونل ایوارڈ کو عہد کے مطابق، دس برس کی مدت کے لیے بعینہٖ برقرار رکھا جائے اور اس کے بعد جو بھی تبدیلی عمل میں لائی جائے، اس میں مسلم قوم کی منشا دریافت کی جائے اور بین الاقوامی رضامندی معلوم کرنے کے لیے طریق کار وضع کیا جائے۔ مثلاً دس سال بعد جو صوبہ کمیونل ایورڈ کی ترمیم کا طالب ہو، وہ جداگانہ انتخاب اور مخلوط انتخاب کے سوال پر ایک ایک انتخاب عام (ریفرینڈم) کرائے اور بعد میں جو نئی مجلس آئین ساز مرتب ہو، اس کے اندر اسی سال کا دوبارہ فیصلہ رائے شماری کے ذریعے کیا جائے اور مسلم قوم کی تین چوتھائی اکثریت کی حمایت ترمیم کے حق میں حاصل کرنا ضروری اور لازمی تصور کیا جائے۔ ان بیانات کا مدعا یہ تھا کہ دس برس کی مدت گزر جانے کے بعد کمیونل ایوارڈ کا اگر کوئی نعم البدل ہوگا تو وہ ہندو اور مسلم اقوام کے درمیان، ایک مستند بین الاقوامی راضی نامہ ہوگا۔

جولائی ۱۹۳۵ء میں لاہور کے حالات خاصے تشویشناک ہو گئے کیونکہ مسجد شہید گنج کے قضیے نے خطرناک صورت اختیار کر لی تھی۔ گذشتہ دو ایک ماہ میں پنجاب کے مختلف حصوں سے سکھوں کے جتھے لاہور پہنچ رہے تھے۔ ۴ اور ۵ جولائی ۱۹۳۵ء کی ایک رات کو سکھوں نے مسجد کا انہدام شروع کر دیا۔ یہ صورت حال دیکھ کر مسلمان، نظم وضبط برقرار نہ رکھ سکے اور مسجد تک پہنچنے کی کوشش کرتے رہے۔ لاہور میں مارشل نافذ کر دیا گیا اور فوج کے بار بار گولی چلانے سے متعدد مسلمان شہید یا زخمی ہوئے۔ مسجد شہید گنج کا مسئلہ آخری دم تک اقبال کی توجہ کا مرکز بنا رہا، لیکن مسجد پر سکھوں کا قبضہ بدستور رہا اور وہ واگزار نہ ہو سکی۔

برقی علاج کا دوسرا کورس پورا کرنے کی خاطر اقبال کو پھر بھوپال جانا تھا۔ سو وہ ۱۵ جولائی ۱۹۳۵ء کو مع علی بخش اور راقم لاہور سے روانہ ہوئے۔

بھوپال پہنچنے کے بعد اگلے روز حمیدیہ ہسپتال میں ڈاکٹر عبدالباسط کی نگرانی میں اقبال کا معائنہ ہوا اور برقی علاج کا کورس شروع ہو گیا۔ وہ روز صبح حمیدیہ ہسپتال جاتے اور دوپہر کو واپس آتے۔ راقم کو ایک اسکول میں داخل کرا دیا گیا اور اسے پڑھانے کے لیے ایک استاد علی حسین بھی شیش محل آیا کرتے۔ انہی ایام میں محمد دین تاثیر نے راقم کے پڑھنے کے لیے الف لیلہ کا ایک اردو نسخہ بھیجا تھا جسے راقم بڑے شوق سے ہر رات سونے سے پہلے پڑھا کرتا۔

۲۸ اگست ۱۹۳۵ء کو برقی علاج کا کورس ختم ہونے پر اقبال بھوپال سے روانہ ہوئے اور اگلے روز دہلی پہنچے۔ حکیم نابینا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور نبض دکھائی۔ باقی وقت ریلوے اسٹیشن پر قیام کیا۔ رات کو گاڑی پکڑی اور ۳۰ اگست ۱۹۳۵ء کی صبح واپس لاہور پہنچ گئے۔

برقی علاج سے بھی اقبال کی تکلیف میں کوئی خاطر خواہ افاقہ نہ ہوا تھا۔ اسی دوران میں ان کے ایک دوست وی آنا سے ذیابیطس کا علاج کرا کے واپس آئے۔ انہوں نے وی آنا میں اپنے معالج سے اقبال کے عارضے کا ذکر کیا اور انہیں بتایا گیا کہ اگر وہ مریض وی آنا آ جائے تو بالکل تندرست ہو سکتا ہے۔ اس پر اقبال نے بھوپال کے ڈاکٹر رحمن اور ڈاکٹر عبدالباسط کی وساطت سے اپنے سینے کے ایکس ریز اور دیگر رپورٹیں دی آنا بھجوائیں، مگر اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ اقبال نے وی آنا جانے کا ارادہ اس لیے ترک کر دیا کہ ان کے نزدیک اس عمر میں اپنے علاج پر کثیر رقم صرف کرنا بچوں کی حق مارنے کے مترادف تھا۔ چنانچہ اپنی صحت کی مکمل طور پر بحالی کے سلسلے میں مایوسی اور ناامیدی کے عالم میں انہوں نے یہی مناسب سمجھا کہ وصیت نامے کے ذریعے بچوں کے لیے گارڈین مقرر کر دیے جائیں جو ان کی وفات کے بعد نابالغان کی ذات اور جائداد کی دیکھ بھال کر سکیں۔ یہ وصیّت نامہ جو ۱۳ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو تحریر کیا گیا جو حسب ذیل ہے:

منکہ ڈاکٹر سر محمد اقبال بیرسٹرایٹ لاء لاہور کا ہوں۔ اس وقت بہ قائمی ہوش وحواس خمسہ خود اقرار کرتا ہوں اور لکھ دیتا ہوں کہ چونکہ میری ہر دو اولاد نابالغان ہیں اور زندگی کا کوئی اعتبار نہیں ہے، اور من مقر کی صحت بھی اچھی نہیں رہتی، اس لیے میں وصیت کرتا ہوں کہ میری وفات کے بعد اگر میری اولاد مذکورہ نابالغ رہیں تو ان کی جائداد اور ذات کے ولی مندرجہ ذیل ہوں گے۔

۱۔ خواجہ عبدالغنی، ماموں حقیقی نابالغان

۲۔ شیخ اعجاز احمد، سب جج برادر زادہ من مقر

۳۔ چوہدری محمد حسین ایم اے سپرنٹنڈنٹ پریس برانچ لاہور
۴۔ منشی طاہرالدین، جو کئی سال سے میرے کلارک رہے ہیں اور ان کی شرافت و دیانت پر مجھے پورا اعتماد ہے۔
اس وصیّت کی رو سے میں ان جملہ حضرات کو نابالغان کی ذات و جائداد کا ولی مقرر کرتا ہوں۔ تمام امور متعلقہ ذات و جائداد نابالغان کا انتظام اولیاء مذکورہ کثرت رائے سے کیا کریں گے، لیکن جب میرا پسر جاوید اقبال بالغ ہو جائے تو وہ اپنی ہمشیرہ منیرہ کی ذات و جائداد کا ولی ہوگا اور اس کی جائداد و ذات کے متعلقہ انتظامات خود بطور ولی کرے گا۔ اگر ان اولیاء مقرر کردہ میں سے کوئی دستبردار ہو جائے، یا فوت ہو جائے یا کسی دیگر وجہ سے کام کرنے کے ناقابل ہو جائے۔ تو اس صورت میں باقی اولیاء کو اختیار ہوگا کہ کثرت رائے سے اس کا جانشین مقرر کر لیں۔ اگر کسی معاملہ میں اولیائے مذکورہ کی رائے مساوی ہو تو صدر انجمن حمایت اسلام لاہور کی رائے جس فریق کے ساتھ ہو، اسی پر عمل کیا جائے گا اور اسی کے مطابق فیصلہ ہوگا۔
اس وقت جو ملکیت کی چیزیں ہیں، مندرجہ ذیل ہیں:
کتب فلسفہ و لٹریچر وغیرہ۔ ان میں سے چند کتب یعنی اپنی تصنیف کردہ کتب کے مطبوعہ نسخے معہ مسودات، مثنوی مولانا روم، فارسی و انگریزی، مرتبہ ڈاکٹر نکلسن، دیوان مرزا عبدالقادر بیدل قلمی، مراۃ المثنوی (مولانا روم، مطبوعہ حیدرآباد) اپنے پڑھنے کا قرآن شریف باقی اور مسودات و کاغذات میں نے جاوید کو بطور یادگار دے دیے ہیں۔ باقی کتب مطبوعہ انگریزی وغیرہ میری وفات کے بعد اسلامیہ کالج لاہور کی لائبریری میں رکھ دی جائیں۔ باقی میرا اسباب مثلاً دو قالین برنگ سرخ و دری و صوفہ و کرسیاں و بکس اور پہننے کے کپڑے ہیں، ان کی نسبت میری وصیت یہ ہے کہ میری وفات کے بعد میرے پہننے کے تمام کپڑے غربا میں تقسیم کر دیے جائیں۔ محمد اقبال بیرسٹرایٹ لا، لاہور۔ بقلم خود ۱۳ اکتوبر ۱۹۳۵ء
مکرر آنکہ:
اگر نابالغان کے فائدے کی خاطر یا جائداد کے انتظام یا کسی اور جائداد کی خرید وغیرہ کے لیے اولیاء کو روپے کی ضرورت ہو تو وہ کثرت رائے سے بینک سے روپیہ نکالنے کے متعلق فیصلہ کریں۔ دیگر میرے مذہبی اور دینی عقائد سب کو معلوم ہیں۔ میں عقائد دینی میں سلف کا پیرو ہوں۔ نظری اعتبار سے فقہی معاملات میں غیر مقلدّ ہوں۔ عملی اعتبار سے حضرت امام ابوحنیفہؒ کا مقلد ہوں۔ بچوں کی شادی بیاہ کے معاملے میں میرے ورثا کا اور اولیاء مقرر کردہ کا فرض ہے کہ وہ اس بات کا

پورا لحاظ کریں اور رشتہ ناطہ میں شرافت اور دینداری کو علم و دولت اور ظاہری وجاہت پر مقدم سمجھیں

محمد اقبال بیرسٹر

۱۳ اکتوبر ۱۹۳۵ء

۲۵ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو اقبال مع چوہدری محمد حسین، راجہ حسن اختر، نذیر نیازی، علی بخش اور راقم مولانا حالی کے صد سالہ جشن ولادت کی تقریبات میں شرکت کے لیے پانی پت پہنچے اور دو دن وہیں قیام کیا۔ سر راس مسعود بھی بھوپال سے تشریف لائے۔ نیز ہندوستان کے مختلف حصوں سے مولانا حالی کے بے شمار شیدائی پانی پت پہنچے ہوئے تھے۔ اقبال نے پانی پت پہنچتے ہی حضرت شاہ بوعلی قلندر کے مزار پر حاضری دی۔ اگلے روز یعنی ۲۶/اکتوبر ۱۹۳۵ء کو نواب بھوپال کی زیر صدارت حالی مسلم اسکول میں تلاوت قرآن مجید سے جلسے کا آغاز ہوا۔ جلسے کے اختتام پر سب لوگ مزار حالی پر فاتحہ پڑھنے کے لیے گئے۔ شام کے اجلاس میں اقبال ضعف و اضمحلال کے باعث شریک نہ ہوئے اور اگلے روز یعنی ۲۷/اکتوبر ۱۹۳۵ء واپس لاہور پہنچ گئے۔

اقبال نے اپنی علالت اور دیگر وجوہ کے پیش نظر ۲۲/نومبر ۱۹۳۵ء کو انجمن حمایت اسلام کی جنرل کونسل سے استدعا کی تھی کہ صدارت انجمن سے ان کا استعفا قبول کر لیا جائے، لیکن جنرل کونسل نے اپنے اجلاس مورخہ ۱۵/دسمبر ۱۹۳۵ کو انجمن کا مفاد سامنے رکھتے ہوئے ان کا استعفا نامنظور کیا اور چھ افراد پر مشتمل ایک وفد اقبال کی خدمت میں بھیجا گیا تا کہ وہ اپنا استعفا واپس لے لیں۔

جنوری ۱۹۳۶ء کے ابتدائی ہفتوں میں اقبال اپنے مضمون ''اسلام اور احمدیت'' کی تکمیل میں مصروف تھے، اس لیے بھوپال جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ ۱۶ فروری ۱۹۳۶ء کو ایڈیٹر اخبار لائیٹ نے ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ کی موت کو بہانہ بنا کر اپنے افتتاحیہ کالم میں اقبال کی ذات پر حملہ کیا۔ البتہ ہفت روزہ حمایت اسلام نے اس پراپگنڈے کا رد کیا اور جنرل کونسل کی کارروائی کی تفصیل پیش کرتے ہوئے واضح کیا کہ یہ سراسر غلط ہے کہ ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ جونہی میٹنگ سے باہر نکلے اور مر گئے۔ پس شہید اسلام ہیں۔ دراصل کونسل کا اجلاس ۲/فروری ۱۹۳۶ء کو منعقد ہوا تھا اور ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ ۱۱ فروری ۱۹۳۶ء کو فوت ہوئے اور یہ بھی ایک کھلا ہوا دروغ ہے کہ اقبال نے مرزا یعقوب بیگ کو کافر کہا۔

برقی علاج کا تیسرا کورس پورا کرنے کے لیے اقبال ۲۹ فروری ۱۹۳۶ء کو لاہور سے بھوپال روانہ ہوئے۔ علی بخش اس سفر میں بھی ہمراہ تھا۔ یکم مارچ ۱۹۳۶ء کو دہلی پہنچے اور دن بھر کے لیے وہیں رکے رہے۔ قیام بمطابق معمول کچھ ریلوے اسٹیشن پر اور کچھ سردار صلاح الدین سلجوقی کے ساتھ افغان قونصل خانے میں رہا۔ ۲ مارچ ۱۹۳۶ء کو بھوپال پہنچے اور شیش محل میں ٹھہرے۔ اگلے ہی روز ڈاکٹر رحمن اور ڈاکٹر عبدالباسط نے ان کا تفصیلی معائنہ کیا اور بجلی کے علاج کا تیسرا کورس شروع ہو گیا۔

بھوپال میں ۱۳ اپریل ۱۹۳۶ء کی رات کو شیش محل میں سو رہے تھے کہ سر سید احمد خان کو خواب میں دیکھا۔ وہ پوچھتے ہیں: تم کب سے بیمار ہو! جواب دیا: دو سال سے اوپر مدت گزر گئی۔ فرمایا: حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کرو۔ اسی وقت ان کی آنکھ کھل گئی اور حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کی خاطر اشعار ان کی زبان پر جاری ہو گئے۔ اسی عرض داشت نے بال آخر ان کی مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام شرق کی صورت اختیار کی۔

سر سید کو خواب میں دیکھنے کا ذکر انہوں نے سر راس مسعود کے نام اپنے ایک خط مورّخہ ۲۹ جون ۱۹۳۶ء میں بھی کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

> ۳/ اپریل کی شب کو جب میں بھوپال میں تھا میں نے تمہارے دادا کو خواب میں دیکھا۔ مجھ سے فرمایا کہ اپنی علالت کے متعلق حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کر۔ میں اسی وقت بیدار ہو گیا اور کچھ شعر عرض داشت کے طور پر فارسی زبان میں لکھے۔ کل ساٹھ شعر ہوئے۔ لاہور آ کر خیال ہوا کہ یہ چھوٹی نظم ہے اگر کسی زیادہ بڑی مثنوی کا آخری حصّہ ہو جائے تو خوب ہو۔ الحمدللہ کہ یہ مثنوی بھی اب ختم ہو گئی۔ مجھ کو اس مثنوی کا گمان بھی نہ تھا۔ بہر حال اس کا نام ہو گا۔ پس چہ باید کرد اے اقوام شرق۔

۸/ اپریل ۱۹۳۶ء کو برقی علاج کا آخری کورس ختم ہوا اور اقبال اسی روز بھوپال سے روانہ ہو کر ۱۹ اپریل ۱۹۳۶ کو لاہور واپس پہنچ گئے۔ سردار بیگم کی وفات کے بعد گھر کا سارا نظام تہ و بالا ہو چکا تھا۔ رشتہ دار خواتین تھوڑے تھوڑے عرصے کے لیے آ کر منیرہ کے پاس رہتیں، لیکن اس کی تربیت اور دیکھ بھال کا کوئی مستقل بندوبست نہ ہو سکا تھا۔ اسی طرح راقم بھی جو جی میں آئے کرتا اور اسے ٹوکنے والا کوئی نہ تھا، مارچ ۱۹۳۶ء میں ساتویں جماعت کا طالب علم تھا۔

سالانہ امتحان سر پر آیا ہوا تھا، مگر اسے کوئی پروا نہ تھی ۔ اگر کوئی شوق تھا تو کہانیوں کی کتابیں پڑھنے کا۔ باغ و بہار (قصہ چہار درویش)، حاتم طائی، طلسم ہوشربا اورعبدالحلیم شرر کے سب ناول پڑھ ڈالے تھے مگر الف لیلہ نے اسے اس قدر مسحور کر دیا تھا کہ امتحان کی تیاری کے بجائے رات گئے تک الف لیلہ پڑھتا رہتا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ راقم ساتویں جماعت کے امتحان میں فیل ہوگیا۔ بھوپال سے واپسی پر جب اقبال کو یہ معلوم ہوا کہ راقم الف لیلہ میں منہمک ہونے کی وجہ سے فیل ہوا ہے تو خفا نہ ہوئے۔ صرف اتنا کہا کہ اگر تم امتحان میں پاس ہو جانے کے بعد الف لیلہ پڑھتے تو اور بھی لطف آتا۔

لاہور پہنچنے کے بعد ۱۲ اپریل ۱۹۳۶ء کو اقبال نے آخری بار انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں شرکت کی اور ان کی تازہ ترین اردو نظم بعنوان ''نغمہ سرمدی'' (جو لا الہٰ الا اللہ کے عنوان سے ضرب کلیم میں شامل ہے) مسلمان مردوں اور عورتوں کے ایک بہت بڑے اجتماع کے سامنے پڑھی گئی۔ عبدالحمید سالک تحریر کرتے ہیں:

علامہ اقبال ۱۹۳۶ء میں آخری دفعہ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں تشریف لائے۔ ان کی وہ آواز بیٹھ چکی تھی، جس کے شیریں نغمے سالہا سال تک فرزندانِ توحید کے لیے فردوس گوش رہے تھے۔ سٹیج پر ایک کرسی بچھا کر اس پر علامہ اقبال بٹھا دیے گئے تاکہ مسلمان ان کی زیارت سے شادکام ہوں اور علاّمہ اقبال کے ارشاد پر محمد صدیق اور محمد امین نے ان کے وہ چند اشعار گا کر سنائے جن کا مطلع ہے:

خودی کا سرّ نہاں لا الٰہ الا اللہ
خودی ہے تیغ فساں لا الٰہ الا اللہ

اپریل ۱۹۳۶ء تک تحریک بازیابی مسجد شہید گنج وقتی طور پر معطل ہوگئی تھی۔ اس تحریک کے دوران اقبال بھوپال میں تھے۔ ۲۹ ؍اگست ۱۹۳۵ء کو دہلی پہنچے۔ ریلوے اسٹیشن پر ہی قیام تھا۔ مشہور کانگرسی لیڈر ڈاکٹر سید محمود ملنے آئے۔ مسجد شہید گنج کے انہدام کے متعلق گفتگو ہوئی، فرمایا:

آپ مسلمانوں سے مایوس کیوں ہیں؟ آپ نہیں جانتے حکومت اور حکومت کے طرف داروں نے انہیں کس طرح دبا رکھا ہے ۔ ورنہ شاید اس ایک مسجد کے بدلے میں کیا کچھ ہو جاتا۔ مسلمانوں میں قربانی کا بڑا مادّہ ہے ۔مشکل صرف یہ ہے کہ ان کی صفیں منظم نہیں، نہ کوئی ایسا

صاحب نظر اور اولوالعزم انسان ہے جو ان کی رہنمائی کرے۔

جب اقبال لاہور آئے تو بظاہر معاملہ سرد پڑ چکا تھا، لیکن اندر اندر آگ سلگ رہی تھی۔ ہزاروں رضا کار جیلوں میں ٹھونسے گئے تھے اور یہ سلسلہ سارا سال جاری رہا۔ بالآخر بعض مسلمانوں نے محمد علی جناح کو لاہور بلوایا تاکہ وہ کوئی مفاہمت کرا دیں۔ محمد علی جناح ۲۱ فروری ۱۹۳۶ء کو لاہور پہنچے اور اتفاق سے تب بھی اقبال لاہور میں موجود نہ تھے، بلکہ برقی علاج کی خاطر بھوپال گئے ہوئے تھے۔ محمد علی جناح تقریباً دو ہفتے لاہور میں مقیم رہے اور اس دوران میں انہوں نے تحریک شہید گنج کے قائدین سکھ لیڈروں اور گورنر پنجاب وغیرہ سے ملاقاتیں کیں اور فریقین کو کوئی معقول سمجھوتا کرنے کا مشورہ دیا۔ آخر کار محمد علی جناح نے شہید گنج مصالحتی بورڈ قائم کیا جس میں پنجاب کی دیگر شخصیات کے ساتھ اقبال کو ان کی عدم موجودگی میں ممبر نامزد کر دیا گیا۔ تمام سیاسی قیدی رہا ہوئے اور اس طرح محمد علی جناح کی کوششوں سے پنجاب میں وقتی طور پر صلح و امن کی فضا پیدا ہوگئی، مگر پچھلے برس جب تک تحریک زوروں پر تھی تو شہید گنج لیگل ڈیفنس کمیٹی کے ذریعے مسلمانوں کی طرف سے مسجد کی بازیابی کی خاطر ڈسٹرکٹ جج لاہور کی عدالت میں ایک دعویٰ بھی دائر کیا گیا تھا، جس کی پیروی ملک برکت علی ایڈووکیٹ اور دیگر وکلا کر رہے تھے۔ شہید گنج مصالحتی بورڈ تو بیکار ثابت ہوا، تاہم ہر مسلمان بے تابی سے فیصلے کا منتظر تھا۔ بالآخر ڈسٹرکٹ جج لاہور نے ۲۵ رمئی ۱۹۳۶ء کو مسلمانوں کا یہ دعویٰ خارج کر دیا اور مسجد پر سکھوں کا قبضہ بحال رکھتے ہوئے فیصلے میں لکھا کہ مسجد بھی عام غیر منقولہ جائداد کی طرح فریقِ ثانی کے قبضہ مخالفانہ میں جا کر اپنی اصل حیثیت کھو بیٹھتی ہے۔ بہر حال اقبال کے مشورے سے ڈسٹرکٹ جج کے اس فیصلے کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل دائر کر دی گئی، اس لیے معاملہ مزید ایک سال تک لٹک گیا۔

محمد علی جناح جب سے انگلستان سے واپس آئے تھے، بحیثیت صدر مسلم لیگ کو برصغیر میں مسلمانوں کی واحد متحدہ جماعت بنانے کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔ ۱۹۳۷ء میں نئے آئین کے تحت چونکہ عام انتخابات ہونے والے تھے، اس لیے انہوں نے ۱۰راپریل ۱۹۳۶ء کو بمبئی میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس طلب کیا اور اس میں مسلم لیگ کے علاوہ مختلف مسلم سیاسی جماعتوں کے نمائندوں کو بھی مدعو کیا۔ اس اجلاس میں مسلم لیگ کی تاریخ میں پہلی بار اسے عوامی

جماعت بنانے کے عزم کا اظہار کیا گیا۔ نیز طے پایا کہ صوبائی انتخابات میں حصّہ لیا جائے اور انہیں اختیار دیا گیا کہ مختلف مسلم سیاسی جماعتوں کے لیڈروں سے مشورہ کر کے اس بورڈ کے لیے ممبر نامزد کر دیں اور مختلف صوبوں میں بورڈ کی شاخیں قائم کریں۔

اس کے بعد محمد علی جناح نے مختلف صوبوں کے دورے شروع کیے۔ وہ ۲۹ اپریل ۱۹۳۶ء کو لاہور پہنچے۔ سب سے پہلے پنجاب کی یونینسٹ پارٹی کے بانی سر فضل حسین کے گھر گئے، لیکن سر فضل حسین نے ان کی ایک نہ سنی۔ دراصل وہ محمد علی جناح کے متعلق اچھی رائے نہ رکھتے تھے۔ اپنی ڈائری مورخہ پیر ۲/مارچ ۱۹۳۶ء کے اندراج میں تحریر کرتے ہیں:

جناح آپے سے باہر ہو رہے ہیں۔ آغا خان کے خلاف اور میرے خلاف اور کانفرنس کے خلاف یہ امر افسوسناک ہے۔ وہ اپنی ساری زندگی ایسے ہی رہے ہیں۔ اس لیے کانگرس یا مسلم لیگ یا کانفرنس گول میز کسی کے ساتھ بھی نباہ نہ کر سکے۔ آج تک کوئی سیاسی جماعت نہ بنا سکے۔ بمبئی میں ان کا کوئی رسوخ نہ تھا اور انہیں اب بھی وہاں کوئی لیڈر تسلیم نہیں کرتا۔ میرا خیال ہے۔ مجھے ان سے آئندہ اچھی طرح ملنے کی ضرورت نہیں ہے۔

۶/مئی ۱۹۳۶ء کی شام کو جناح اقبال سے ملنے ''جاوید منزل'' آئے۔ فاطمہ جناح ساتھ تھیں۔ راقم کو خوب یاد ہے، ان کے آنے سے پیشتر اقبال نے اسے خاص طور پر بلوا کر کہا تھا کہ ایک مہمان آ رہے ہیں اور جب وہ آ کر بیٹھ جائیں تو راقم کمرے میں داخل ہو اور ان سے آٹوگراف لینے کی استدعا کرے۔ چنانچہ جب مہمان تشریف لے آئے تو راقم اقبال کے حکم کی تعمیل میں کمرے میں داخل ہوا۔ اقبال کے پاس ایک طویل قامت دبلے پتلے مگر نہایت خوش پوش شخص بیٹھے تھے۔ ان کی آنکھوں میں بڑی پھرتی تھی اور ان کے ساتھ سفید کپڑوں میں ملبوس ایک دبلی پتلی خاتون بھی تھیں۔ اقبال نے ان سے راقم کا تعارف کرایا اور راقم نے آٹوگراف کی کتاب اور قلم بڑھا دیے۔ مہمان نے انگریزی میں اس سے پوچھا: کیا تم بھی شعر کہتے ہو؟ راقم نے جواب دیا: جی نہیں، فرمایا: پھر تم بڑے ہو کر کیا کرو گے؟ راقم خاموش رہا۔ اس پر وہ ہنستے ہوئے اقبال سے مخاطب ہوئے، کوئی جواب نہیں دیتا۔ اقبال نے جواب دیا: وہ جواب نہیں دے گا، کیونکہ وہ اس دن کا منتظر ہے جب آپ اسے بتائیں گے کہ اسے کیا کرنا ہے۔ محمد علی جناح نے انہیں مسلم لیگ مرکزی پارلیمانی بورڈ کا کارکن بننے کی دعوت دی جو اقبال نے اپنی علالت اور دیگر ذاتی آلام و مصائب کے باوجود قبول کر لی،

کیونکہ ان کے نزدیک مسلمانوں کے ملّی اتحاد کی تحصیل کے لیے ضروری تھا کہ برصغیر میں ان کی صرف ایک سیاسی تنظیم ہو۔ لاہور میں قیام کے دوران میں محمد علی جناح مجلس اتحاد ملت احرار کے رہنماؤں سے بھی ملے اور وہ بھی تعاون پر رضامند ہو گئے۔ ایک ہفتہ لاہور میں ٹھہرنے کے بعد محمد علی جناح راولپنڈی ہوتے ہوئے کشمیر چلے گئے۔ ۸رمئی ۱۹۳۶ء کو اقبال اور چودہ دیگر صوبائی مسلم رہنماؤں نے مسلمانان پنجاب کے نام مسلم لیگ اور محمد علی جناح کی حمایت میں اپیل کی اور ساتھ ہی یونینسٹ پارٹی کے متعلق انہیں خبردار کیا۔

۱۲رمئی ۱۹۳۶ء کو میاں عبدالعزیز بیرسٹر کے مکان پر مسلم لیگ کا اجلاس ہوا، جس میں اقبال بھی موجود تھے۔ اس اجلاس میں پنجاب مسلم لیگ کی از سرِ نو تنظیم کے سلسلے میں عہدے داروں کا تقرر کیا گیا۔ اقبال دوبارہ صدر اور غلام رسول بیرسٹر سیکرٹری مقرر ہوئے۔ ۲۱راپریل ۱۹۳۶ء کو محمد علی جناح نے سرینگر سے مرکزی پارلیمانی بورڈ کے اراکین کے ناموں کا اعلان کیا، جن میں اقبال کا نام بھی شامل تھا۔ چونکہ تمام ممبران میں سے تین نشستیں مجلس اتحادِ ملت اور چار مجلس احرار کو دی گئیں، اس لیے مولانا ظفر علی خان، صدر مجلس اتحاد ملت مطمئن نہ تھے، ۲۸ مئی ۱۹۳۶ء کو اقبال کی زیر صدارت ''جاوید منزل'' میں مسلم لیگ کا اجلاس ہوا جس میں مرکزی پارلیمانی بورڈ کے پنجابی ممبروں نے شرکت کی۔ اس اجلاس میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر انتخاب لڑنے کے لیے اقبال کی زیر صدارت صوبائی مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ قائم کیا گیا۔ ۶رجون ۱۹۳۶ء کو محمد علی جناح سری نگر سے واپس لاہور پہنچے اور ۸رجون ۱۹۳۶ء کو برکت علی اسلامیہ ہال میں مسلم لیگ کونسل اور مرکزی پارلیمانی بورڈ کے اجلاس کی صدارت کی۔ اس اجلاس میں مسلم لیگ کا انتخابی منشور منظور کیا گیا اور اسی اجلاس میں مجلس اتحادِ ملّت کے لیڈر مرکزی پارلیمانی بورڈ سے مستعفی ہو گئے۔ یہ خبر سن کر سر فضل حسین بڑے خوش ہوئے اور انہوں نے اپنے ایک خط بنام سر سکندر حیات میں تحریر کیا:

> جناح کو اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہو سکی۔ ہم نے اس کے بورڈ میں شامل ہونے سے انکار کیا۔ اتحاد ملت نے بھی انکار کر دیا۔ باقی رہ گئے احرار۔ وہ شامل ہوں یا نہ ہوں۔ ان کا روّیہ ہمارے متعلق یکساں رہے گا۔ البتہ اقبال، شجاع، تاج الدین، برکت علی جیسے چند متفرق شہری باشندے اس بورڈ سے کچھ لے مرنے کی آرزو میں دوڑ دھوپ کر رہے ہیں۔

۹رجون ۱۹۳۶ء کو محمد علی جناح کے نام اپنے ایک خط میں اقبال نے اصرار کیا کہ وہ بورڈ

سے متعلق اپنے بیان میں مسلمانانِ برصغیر کو خبردار کریں کہ اگر مسلم لیگ کی موجودہ اسکیم کو اختیار نہ کیا گیا تو گزشتہ پندرہ برس میں جو کچھ بھی انہوں نے سیاسی طور پر حاصل کیا ہے اسے گنوا بیٹھیں گے، بلکہ اپنا شیرازہ اپنے ہاتھوں سے درہم برہم کردیں گے۔ نیز فرمایا کہ مرکزی اسمبلی کے لیے بالواسطہ انتخاب نے مسلمانوں کے لیے لازمی کردیا ہے کہ صوبائی اسمبلیوں کے مسلم اراکین ایک کل ہند مسلم پالیسی اور پروگرام کے پابند ہوں تاکہ وہ مرکزی اسمبلی میں صرف ایسے نمائندے بھیجیں جو وہاں ہندوستان کی دوسری بڑی قوم کے نمائندوں کی حیثیت سے خالصتاً مسلم نقطۂ نظر پیش کرسکیں۔

اقبال کے لیے علالت کے سبب صوبائی پارلیمانی بورڈ کے ہر اجلاس میں شریک ہونا ممکن نہ رہا تھا۔ اس لیے انہوں نے ۱۳ اگست ۱۹۳۶ء کو صوبائی پارلیمانی بورڈ کی صدارت سے استعفا دے دیا، اگرچہ وہ صوبائی مسلم لیگ کے صدر بدستور رہے۔ پنجاب میں انتخابی مہم کے آغاز سے پیشتر مجلس احرار بھی مسلم لیگ کو چھوڑ چکی تھی۔ بہرحال انتخابی مہم شروع کرنے کے لیے اقبال نے محمد علی جناح کو لاہور بلوایا۔ وہ ۹/اکتوبر ۱۹۳۶ء کو تشریف لائے۔ ۱۱/اکتوبر ۱۹۳۶ء کی شام کو دہلی دروازے کے باغ میں مسلم لیگ کا جلسہ ہوا۔ صدارت اقبال کو کرنا تھی لیکن بوجہ ناسازی طبع نہ کرسکے۔ محمد علی جناح نے یونینسٹ پارٹی کے خلاف بڑی دھواں دار تقریر کی، مگر بقول عاشق حسین بٹالوی جلسہ نہایت مختصر اور بے رونق تھا۔ اور حاضرین کی تعداد مشکل سے ہزار ڈیڑھ ہزار کے قریب تھی۔ مسلم لیگ مسلم حلقوں سے کل سات امیدوار کھڑے کرسکی جن میں سے صرف دو کامیاب ہوئے، ایک ملک برکت علی اور دوسرے راجہ غضنفر علی۔ راجہ غضنفر علی تو یونینسٹ پارٹی میں چلے گئے اور ملک برکت علی اکیلے رہ گئے۔

جولائی ۱۹۳۶ء میں ضربِ کلیم لاہور سے شائع ہوئی اور دو ماہ بعد یعنی ستمبر ۱۹۳۶ء میں فارسی مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق کی اشاعت ہوئی۔ جولائی ۱۹۳۶ء ہی میں جنوبی ہند میں اونچی ذات کے ہندوؤں کے روّیے سے تنگ آ کر اچھوت بڑی تعداد میں مسلمان ہونے لگے اور ان سے متعلق خبریں مصر کے اخباروں میں چھپیں۔ اس پر جامعہ ازہر کے شیخ محمد مصطفی المراغی نے اقبال کو خط لکھا کہ تبلیغ اسلام کی مہم چلانے کی خاطر وہ مصری علماء کا ایک وفد ہندوستان بھیجنے کو تیار ہیں۔ اقبال نے جواب دیا کہ اچھوتوں میں تبلیغ اسلام کی غرض سے مصری علما

کی جماعت کو ہندوستان بھیجنے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ کام ہندوستان کے علماء انجام دے سکتے ہیں۔اس کے علاوہ اگر مصر سے علماء کا وفد آیا تو اس کے سبب ہندو مسلم تعلقات پر ناخوشگوار اثر پڑنے کا اندیشہ ہے بہرحال چونکہ خط و کتابت مسلم اخبارات میں شائع ہوئی اس لیے ہندو پریس نے اقبال کے خلاف زہر اُگلا۔

۱۱؍اکتوبر ۱۹۳۶ء کو اقبال بارود خانے میں محمد دین تاثیر اور کرسٹابل جارج کی شادی میں شریک ہوئے، علی بخش اور راقم بھی ان کے ہمراہ تھے۔فریقین کا نکاح نامہ اقبال نے خود تحریر کیا۔اس کی دو شقیں جو اس زمانے میں بڑی عجیب و غریب سمجھی گئیں، درج ذیل ہیں:

بر بنائے اقرار متذکرہ بالا اور نکاح مجوزہ محمد دین تاثیر مذکور اقرار کرتا ہے کہ جب تک اس کا نکاح کرسٹابل جارج مذکور سے قائم رہے گا، وہ کسی بھی عورت سے نکاح ثانی نہیں کرے گا، خواہ اس کا کوئی بھی مذہب کیوں نہ ہو (یعنی فریقین کی شادی،''مونا گمس'' ہوگی)۔

بر بنائے اقرار متذکرہ بالا اور نکاح مجوزہ محمد دین تاثیر مذکور شرع اسلامی کے تحت اپنا حق طلاق کرسٹابل جارج مذکور کو تفویض کرتا ہے۔

نومبر ۱۹۳۶ء میں ماہنامہ الحکیم کے نمائندے اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے ضبط تولید کے مسئلے پر اظہار خیال کرنے کو کہا۔فرمایا:

شریعت اسلامی نے اجتماعی مسائل میں مصالح امت کو نظر انداز نہیں کیا اور اس کے تصفیے کو اہل علم پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ حالات و مقتضائے وقت کے مطابق ان کا فیصلہ کرلیں۔اس لیے اگر حظ نفس مقصود نہ ہو، حقیقی ضرورت موجود ہو اور فریقین رضامند ہوں تو جہاں تک میرا علم میری رہنمائی کرتا ہے۔(ضبط تولید) شرعاً قابل اعتراض نہیں ہے۔اصول شرعی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی خاوند اپنی بیوی کو اگر وہ اولاد کی خواہش مند نہ ہو، اولاد پیدا کرنے پر باکراہ مجبور نہیں کرسکتا۔

اب اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ختم نبوت کے مسئلے کے متعلق ابتداء ہی سے اقبال کا اپنا ذاتی موقف کیا تھا۔اس ضمن میں سب سے پہلے راقم، اقبال کی نظم بعنوان ''اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب کے مسلمانوں سے'' کا حوالہ دینا چاہتا ہے۔یہ نظم انجمن حمایت اسلامیہ کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۲۲؍فروری ۱۹۰۲ء میں پڑھی گئی۔اس نظم کے نویں بند میں سرور کائنات کی توصیف کی گئی ہے اور درج ذیل شعر میں اقبال فرماتے ہیں:

اے کہ بعد از تو نبوت شد بہ ہر مفہوم شرک

بزم را روشن زنورِ شمعِ عرفاں کردۂ

اس شعر کو نظم میں شامل کرنے سے صاف ظاہر ہے کہ اس زمانے میں عقیدۂ ختم نبوت کے بارے میں احمدیت نے جو الجھاؤ پیدا کر دیا تھا اور جس کے باعث مسلمانوں کے ذہن مضطرب تھے، اس کی تردید مقصود تھی۔ ورنہ کسی بھی مفہوم میں ختم نبوت کے عقیدے کو تسلیم نہ کرنا اقبال کے نزدیک شرک فی النبوت کیوں قرار پاتا۔

احمدی اخبار الفضل مورّخہ ۹/اکتوبر ۱۹۱۵ء میں ایک مضمون بعنوان جناب ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب کی رائے اختلاف جماعت احمدیہ کے بارے میں شائع ہوا۔ یہ مضمون سیّد انعام اللہ شاہ سیالکوٹی کا تحریر کردہ تھا اور احمدیوں میں قادیان پارٹی اور لاہور پارٹی کے اختلاف سے متعلق تھا۔ اس مضمون میں اقبال سے یہ کلمہ منسوب کیا گیا کہ عقائد کے لحاظ سے قادیان والے سچے ہیں، لیکن مجھے لاہور والوں سے ہمدردی ہے۔ اقبال کو اس کی بھی تردید بذریعہ خط بنام ایڈیٹر کرنا پڑی۔ جو پیغام صلح مورّخہ ۱۳ نومبر ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی، اپنی پوزیشن کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے کہا:

> اختلاف سلسلۂ احمدیہ کے متعلق وہی شخص رائے دے سکتا ہے جو مرزا صاحب مرحوم کی تصانیف سے پوری آگاہی رکھتا ہو اور یہ آگاہی مجھے حاصل نہیں ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بدیہی ہے کہ ایک غیر احمدی مسلمان جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی نبی کے آنے کا قائل نہ ہو، وہ کس طرح یہ بات کہہ سکتا ہے کہ عقائد کے لحاظ سے قادیان والے سچے ہیں۔

بہرحال ختم نبوت اور دیگر متعلقہ مسائل پر وقتاً فوقتاً اقبال نے اپنے خیالات کا اظہار بعد کی تحریروں اور منظومات میں بھی کیا ہے، جن سے احمدی عقائد کی تردید ہوتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۳۵ء سے قبل بھی اقبال ختم نبوت اور دیگر متعلقہ مسائل پر احمدی عقائد کو کبھی نہ کبھی اپنی تنقید کا نشانہ بناتے رہتے تھے۔ دوسری یہ کہ ۱۹۳۵ء سے قبل اقبال احمدیوں کو، قطع نظر ان کے عقائد کے، مسلمانوں ہی کا ایک فرقہ سمجھتے تھے اور جماعت احمدیہ کو دائرہ اسلام سے خارج قرار نہ دیتے تھے۔ احمدیت کے متعلق اپنے گذشتہ رویّے کا ان کے پاس یہی جواب تھا کہ وہ اس تحریک سے اچھے نتائج کی توقع رکھتے تھے یا یہ کہ انہیں بحیثیت ایک زندہ اور سوچنے والے انسان کے احمدیت کے بارے میں اپنی رائے تبدیل کر لینے کا حق حاصل تھا۔

اقبال کو تحریک احمدیہ سے کس قسم کے اچھے نتائج کی توقع تھی کہ انہوں نے ۱۹۰۰ء میں

بانی سلسلۂ احمدیہ کے متعلق فرمایا کہ وہ موجودہ دور کے ہندی مسلمانوں میں غالباً سب سے عظیم دینی مفکر ہیں یا ۱۹۱۰ء میں فرمایا کہ فرقہ قادیانی اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ ہے یا ۱۹۳۲ء میں تحریر کیا کہ ''اشاعت اسلام کا جوش جو جماعت احمدیہ کے اکثر افراد میں پایا جاتا ہے، قابل قدر ہے''۔ توقع یہی ہوسکتی تھی کہ تحریک احمدیہ جب سن بلوغ تک پہنچے گی، تو ممکن ہے عامۃ المسلمین کی تکفیر کے جوش وخروش سے نکل کر انہی میں واپس آ جائے، انہی کی فلاح و بہبود کو اپنا شعار بنائے اور اس کے رہنما بھی آغا خان کی طرح اپنی جماعت کے اراکین کو ہدایت دیں کہ تم مسلمان ہو، مسلمانوں ہی کے ساتھ مل کر رہو اور سب مسلمانوں کو اپنے بھائی سمجھو۔ اپنے کردار کو اسلامی سیرت کا نمونہ بنا کر دنیا کے سامنے پیش کرو تا کہ اشاعت اسلام کے لیے تمہارے جوش سے ہر کوئی متاثر ہو۔ بہرحال اس خوش فہمی کا وجود بھی اقبال کی ملّت اسلامیہ کے ساتھ گہری وابستگی اور ناقابل بیان محبت کا آئینہ دار تھا۔

آل انڈیا کشمیر کمیٹی میں اقبال کو تحریک احمدیہ کے ارکان کے ساتھ کام کرتے وقت کس قسم کا تجربہ حاصل ہوا؟ کشمیر کمیٹی کے صدر مرزا بشیر الدین محمود مقرر کیے گئے تھے اور سیکرٹری عبدالرحیم درد (یعنی دونوں اہم عہدے احمدیوں کو سونپے گئے تھے) ان کے علاوہ کمیٹی کے دیگر ارکان مسلمان بھی تھے اور احمدی بھی۔ جولائی ۱۹۳۱ء میں کمیٹی قائم کرتے وقت چونکہ خیال تھا کہ یہ ایک عارضی تنظیم ہے، لہٰذا اس کے لیے کسی قسم کا دستور وضع کرنے یا قواعد و ضوابط مرتب کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی گئی۔ صدر اور سیکرٹری کو وسیع اختیارات حاصل تھے۔ دو ایک برس میں احمدی ارکان پر الزام لگا کہ وہ کشمیر کمیٹی کو احمدیت کی تبلیغ کی خاطر استعمال کر رہے ہیں اور اس کے ذریعے ان کا اصل مقصد کشمیری مسلمانوں کو احمدی بنانا ہے اب شیخ اعجاز احمد کے نزدیک یہ سب احمدیوں کے خلاف احراریوں کا پراپیگنڈا تھا اور ان کے دباؤ یا ڈرانے دھمکانے کے پیش نظر اقبال جیسی شخصیت نے بھی اس الزام کو درست تسلیم کر لیا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا جماعت احمدیہ کے ممبران اپنے عقیدے کی نشر و اشاعت یا تبلیغ میں جوش وخروش کے اظہار کی وجہ سے مشہور یا بدنام نہیں ہیں؟ اگر واقعی ایسا ہے تو اس تہمت پر یقین کرنے والے حق بجانب بھی سمجھے جا سکتے تھے۔

بہرحال کشمیر کمیٹی کے بعض ارکان نے، جن میں اقبال بھی شامل تھے، تجویز پیش کی کہ چونکہ کمیٹی کو بحیثیت ایک تنظیم ابھی کچھ مدت تک قائم رکھنا پڑے گا، اس لیے اس کی خاطر دستور

اور قواعد وضوابط وضع کر لینے چاہئیں تا کہ ہر کام ان کے مطابق انجام دیا جا سکے اور کسی کو کسی کے خلاف شکایت کرنے کا موقع نہ ملے۔ احمدی ارکان کو یہ تجویز منظور نہ تھی، کیونکہ ان کی دانست میں اس کا مقصد ان کے امیر کے لامحدود اختیارات کو محدود کرنا تھا۔ پس اس مرحلے پر مرزا بشیر الدین محمود کمیٹی کی صدارت سے مستعفی ہو گئے، لیکن شیخ اعجاز احمد کے نزدیک یہ حقیقت نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ احراریوں نے اقبال کے ساتھ سازش کر کے فیصلہ کیا تھا کہ مرزا بشیر الدین محمود کو کشمیر کمیٹی کی صدارت سے علیحدہ کیا جائے چنانچہ اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کی خاطر سول اینڈ ملٹری گزٹ میں خبر شائع کرائی گئی کہ کشمیر کمیٹی کا صدر غیر قادیانی مسلمان ہونا چاہیے اور اس کے بعد مرزا بشیر الدین محمود کو کمیٹی کا اجلاس برائے انتخاب عہدہ داران بلانے کے لیے تحریر کیا گیا۔ انہوں نے وہ اجلاس بلوایا اور انتخاب عہدہ داران کے لیے رستہ صاف کرنے کی غرض سے اپنا استعفا پیش کر دیا۔ یہاں بھی ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ کیا کشمیری مسلمانوں میں احمدی عقیدے کی تبلیغ کے الزام کو ثابت کرنے کے لیے احمدی ارکان نے کوئی قدم اٹھایا؟ جواب ہے: نہیں۔ اس کی نوبت ہی نہ آئی کیونکہ مرزا بشیر الدین محمود نے اپنا استعفا پیش کر دیا تھا۔

مرزا بشیر الدین محمود کی جگہ اقبال کو کشمیر کمیٹی کا قائم مقام صدر منتخب کیا گیا، اور جب اقبال نے کمیٹی کے دستور کا مسوّدہ تیار کر کے اجلاس میں پیش کیا تو احمدی ارکان نے ان کی مخالفت کی، بلکہ دوران بحث اقبال پر واضح کر دیا کہ احمدیوں کے نزدیک کشمیر کمیٹی یا مسلمانوں کی کسی بھی تنظیم کی کوئی اہمیت نہیں کیونکہ وہ اپنے عقیدے کے مطابق کسی وفاداری کے پابند ہیں تو صرف ان کی امیر کے ساتھ وفاداری ہے۔ یعنی وہ مسلمانوں کی اکثریت کی بنا پر وضع کیے ہوئے کسی دستور کے پابند نہیں ہو سکتے، بلکہ وہ تو وہی کریں گے جو ان کے امیر کا حکم ہو گا۔ بالفاظ دیگر احمدی بظاہر کشمیر کمیٹی کو قائم رکھتے ہوئے اسے اندر سے دو حصوں یعنی مسلمانوں اور احمدیوں میں تقسیم کرنے کے درپے تھے۔ یہ صورت حال اقبال کے لیے ناقابل قبول تھی، اس لیے انہوں نے کشمیر کمیٹی سے استعفا دے دیا اور مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ اگر مسلمانانِ ہند اپنے کشمیری بھائیوں کی امداد اور رہنمائی کرنا چاہتے ہیں تو کوئی اور کشمیر کمیٹی بنائیں جو صرف مسلمانوں پر مشتمل ہو، لیکن شیخ اعجاز احمد فرماتے ہیں کہ اقبال احراریوں کے ایماء پر کشمیر کمیٹی کی تخریب میں

مصروف ہو گئے اور احراریوں کی حوصلہ افزائی کرنے لگے۔ خیر یہ بحث تو بعد میں کی جائے گی کہ اقبال کی نگاہ میں احراریوں کی حیثیت کیا تھی اور اگر انہوں نے ان کی حوصلہ افزائی کی بھی تو وہ کس اضطراری کیفیت یا مصلحت کے تحت کی۔ یہاں اتنا بتا دینا کافی ہے کہ بعد میں احمدیوں نے ''تحریک کشمیر'' کے نام سے ایک نئی جماعت قائم کی اور اقبال کو اس کی صدارت پیش کی لیکن اقبال نے اس پیش کش کو ٹھکراتے ہوئے اپنے ایک بیان مورخہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۳۳ء میں فرمایا:

قادیانی ہیڈ کوارٹرز کی طرف سے ابھی تک ایسا کوئی واضح اعلان جاری نہیں ہوا کہ اگر قادیانی حضرات مسلمانوں کی کسی سیاسی تنظیم میں شامل ہوں گے تو ان کی وفاداریاں منقسم نہیں ہوں گی۔ دوسری طرف واقعاتی طور پر یہ ظاہر ہو گیا ہے کہ جسے قادیانی پریس ''تحریک کشمیر'' کے نام سے پکارتا ہے اور جس میں بقول قادیانی اخبار الفضل مسلمانوں کو محض اخلاقی طور پر شامل ہونے کی اجازت دی گئی ہے، ایک ایسی تنظیم ہے جس کے مقاصد اور محرکات آل انڈیا کشمیر کمیٹی سے مختلف ہیں۔

کشمیر کمیٹی میں احمدیوں کے ساتھ ملکر کام کرنے میں اقبال کا ذاتی تجربہ تھا اور اس ضمن میں ان کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ احمدیوں سے مایوس ہوئے تھے۔ یہاں یہ بات بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ اقبال احمدیوں سے من حیث الجماعت ۱۹۳۳ء میں مایوس ہوئے، لیکن انہوں نے تحریک احمدیہ کے خلاف اپنا پہلا بیان دو سال بعد ۱۹۳۵ء میں جاری کیا۔ احراریوں کی جماعت احمدیہ سے پرانی عداوت تھی اور جب اقبال کشمیر کمیٹی میں احمدیوں سے مایوس ہوئے تو عین ممکن ہے کہ احراریوں نے احمدیوں کے خلاف ان سے مفاہمت کرنے کی کوشش کی ہو کیونکہ یہ صورت حال دونوں فریقوں کو ایک دوسرے کے قریب تر لانے کا ذریعہ بنتی تھی، مگر اس صورت حال کے صحیح تجزیے کے لیے تین چار دیگر امور بھی ذہن میں رکھنے چاہئیں، جنہوں نے مستقبل میں بالخصوص پنجاب کی مسلم سیاست پر اثر انداز ہونا تھا۔ یہ امور تھے: کمیونل ایوارڈ، محمد علی جناح کے ہاتھوں ۱۹۳۴ء میں مسلم لیگ کا احیائ، ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت صوبائی خودمختاری کا مسئلہ، سر فضل حسین کی یونینسٹ پارٹی کا پروگرام اور پنجاب میں مسلم اکثریت کو بروئے کار لانے کے سلسلے میں درپیش خطرات، ان امور کے پس منظر میں محمد علی جناح، اقبال اور پنجاب کے دیگر مسلم لیگی رہنماؤں احراریوں، یونینسٹوں اور احمدیوں کے سیاسی عزائم نے ۱۹۳۵ء تک جو شکل اختیار کی، ان کی روشنی ہی میں

اقبال کے تحریک احمدیہ کے خلاف بیانات کو پوری طرح سمجھا جا سکتا ہے۔

اقبال اور مجلس احرار کے نظریات میں ہمیشہ فرق رہا۔ مجلس احرار خلافت کمیٹی کی کوکھ سے نکلی تھی اور نظریات کے اعتبار سے جمعیت العلماء ہند کی طرح نیشنلسٹ مسلمانوں کی جماعت اور کانگرس کی ہم نوا تھی۔ احراری قائدین نے عام طور پر اقبال اور ان کے نظریات کی مخالفت کی۔ مولانا حسین احمد مدنی کے نظریۂ قومیت کے خلاف اظہار رائے کرتے ہوئے کمال جرأت اور بے باکی سے فرمایا تھا:

> حقیقت یہ ہے کہ مولانا حسین احمد مدنی اور ان کے ہم خیال قومیت کے بارے میں جو نظریہ رکھتے ہیں، وہ ایک لحاظ سے اسی طرح ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے سے انکار کرنے میں قادیانیوں کا ہے۔ دوسرے الفاظ میں قومیت کے علم بردار یہ چاہتے ہیں کہ موجودہ زمانے کی ضروریات کے پیش نظر مسلمانوں کو ہر زمان و مکاں کے لیے قانون الٰہی کے ساتھ نئی پوزیشن اختیار کرنی چاہیے۔ جس طرح قادیانی ایک نئی نبوت کی اختراع سے قادیانیوں کو فکر و نظر کی ایک نئی راہ اختیار کرنے کو کہتے ہیں، جس سے بال آخر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم المرسلین ہونے سے انکار کی منزل آ جاتی ہے۔ بظاہر قومیت کا یہ تصور ایک سیاسی نظریہ ہے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے سے قادیانیوں کا انکار ایک دینی مسئلہ ہے، لیکن ان دونوں کے درمیان ایک گہرا داخلی تعلق ہے جس کو واضح طور پر اس وقت پیش کیا جا سکے گا جب کوئی خداداد بصیرت سے بہرہ ور مسلمان مورّخ ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ مرتّب کرے گا اور اس میں بعض بظاہر جاندار فرقوں کے مذہبی فکر کو خاص طور پر پیش نظر رکھے گا۔

یہاں یہ واضح کر دینا مناسب ہوگا کہ برصغیر میں سیاسی بیداری کے دور میں بھی تحریک احمدیہ انگریزی حکومت کی اطاعت اور وفاداری کا دم بھرتی تھی۔ اپنے ابتدائی ایام ہی میں اس نے جہاد کی حرمت کا اعلان کر رکھا تھا اور اس سے مراد یہ لی گئی تھی کہ احمدیوں کے نزدیک انگریز کے ساتھ وفاداری کو اس قدر اہمیت حاصل تھی کہ اس کے خلاف سیاسی آزادی کے لیے جدو جہد کرنا بھی حرام قرار دیا گیا تھا۔ تحریک احمدیہ کا تعلق خالصتاً پنجاب کی سرزمین سے تھا۔ پنجاب میں غیر مسلموں کے مقابلے میں مسلمانوں کی اکثریت تھوڑی سی تھی اور اس اکثریت کے بل بوتے پر یہاں کسی مستحکم مسلم وزارت تشکیل دینے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ البتہ اگر مسلمانوں میں اتحاد برقرار رکھا جا سکتا تو وہ مخلوط وزارت قائم کر سکتے تھے۔ چنانچہ پنجاب میں سر فضل حسین نے غیر

فرقہ وارانہ سیاسی جماعت یونینسٹ پارٹی قائم کر رکھی تھی۔ سر فضل حسین کے والد کے بانی تحریک احمدیہ سے خاندانی مراسم تھے۔ جب سر فضل حسین انگلستان سے اپنی تعلیم کی تکمیل کے بعد واپس تشریف لائے تو ان کے والد انہیں ساتھ لے کر مرزا غلام احمد کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے لیے دعا کی درخواست کی۔ بعد میں ۱۹۲۶ء میں جب سر ظفر اللہ خان پنجاب کی کونسل کے لیے منتخب ہوئے تو مرزا بشیر الدین محمود (سلسلۂ احمدیہ کے دوسرے جانشین) نے انہیں ہدایت کی کہ کونسل میں اور سیاسی میدان عمل میں سر فضل حسین کے ساتھ پورا تعاون کیا جائے۔ سر ظفر اللہ خان فرماتے ہیں:

میں تو پہلے ہی میاں صاحب کا مداح اور ممنون احسان تھا اس لیے حضور کے ارشاد کی تعمیل میرے لیے آسان تھی۔

سو پنجاب میں جماعت احمدیہ نے سیاسی میدان عمل میں سر فضل حسین کی یونینسٹ پارٹی کے ساتھ تعاون کے ذریعے اپنی سیاسی زندگی کی ابتداء کی۔ سر ظفر اللہ خان نے مرزا بشیر الدین محمود کی ہدایت کے تحت یونینسٹ پارٹی میں شمولیت اختیار کی اور یہ تعلق آخر تک قائم رہا۔ سر فضل حسین کے بارے میں ان کے فرزند عظیم حسین کی تحریر کردہ کتاب کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنی رائے سے اختلاف کرنے والوں کو قطعی پسند نہ کرتے تھے اور اپنے اردگرد صرف ایسے لوگوں کو دیکھنے کے خواہشمند تھے، جو ان کی ہاں میں ہاں ملاتے رہیں یا ان کی رائے سے اتفاق کرتے رہیں۔ سر ظفر اللہ خان بھی اسی سبب ان کے منظور نظر تھے۔ ان کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے اپنے ایک خط محرّرہ یکم دسمبر ۱۹۳۰ئ میں فرماتے ہیں:

ظفر اللہ ایک اچھا خاموش شخص ہے جو اپنے آپ کو آگے کرنے کی خواہش نہیں رکھتا اور ہر وہ کام کرنے کے لیے تیار ہے جو اسے کرنے کو کہا جائے۔

اس زمانے میں احمدی، مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے سلسلے میں تعلیمی اور دیگر اداروں میں تو ان کے ساتھ تعاون کرتے تھے، مگر برصغیر کی مسلم سیاسیات میں صرف اسی حد تک حصّہ لیتے جس حد تک سر فضل حسین یا یونینسٹ پارٹی کے مفادات اجازت دیتے تھے۔ پس اگر انہوں نے مسلم کانفرنس میں شمولیت اختیار کی تو سر فضل حسین کے اشارے پر اور اگر سر ظفر اللہ خان مسلم لیگ کے صدر بنے تو لیگ کے متعلق سر فضل حسین کی پالیسی کو عملی جامہ پہنانے کی خاطر۔

بہر حال گول میز کانفرنسوں، کمیونل ایوارڈ (فرقہ وارانہ فیصلہ) اور گورنمنٹ آف انڈیا

ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت صوبائی خود مختاری کے حصول کے امکانات نے پنجاب میں مسلم سیاست کا رخ بدل دیا۔ صوبائی خود مختاری مسلمانان برصغیر کے متحدہ مطالبے کے نتیجے میں حاصل ہوئی تھی۔ پنجاب ایک مسلم اکثریتی صوبہ تھا لیکن اس میں سر فضل حسین اور اُن کے حامیو ں نے صوبائی اسمبلی میں اپنا اقتدار قائم رکھنے کی خاطر غیر فرقہ وارانہ یونینسٹ پارٹی بنا کر اس کے ٹکٹ پر انتخابات لڑنے کا قصد کر رکھا تھا۔ دوسری طرف محمد علی جناح اور اقبال کی کوشش یہ تھی کہ مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد متحدہ جماعت بنا دیا جائے تا کہ صوبائی اسمبلیوں کے مسلم اراکین ایک کل ہند مسلم پالیسی اور پروگرام کے پابند ہوں اور وہ مرکزی اسمبلی میں صرف ایسے نمائندے بھیجیں جو وہاں ہندوستان کی دوسری بڑی قوم کے نمائندوں کی حیثیت سے خالصتاً مسلم نقطۂ نظر پیش کر سکیں۔ ان حالات میں ظاہر ہے پنجاب میں کسی نہ کسی مرحلے پر مسلم لیگ کا مقابلہ یونینسٹ پارٹی سے ہونا تھا۔

اسی دور میں کشمیر کمیٹی میں اقبال کو خالصتاً احمدی قیادت میں کام کرنے کا تجربہ حاصل ہوا۔ کشمیر کمیٹی ایک عارضی تنظیم کی صورت میں عجلت میں بنائی گئی تھی۔ اس کا نہ تو کوئی دستور تھا اور نہ قواعد وضوابط۔ جب احمدی ارکان پر الزام لگا کہ وہ کشمیر کمیٹی کو کشمیر میں احمدیت کی تبلیغ کی خاطر استعمال کر رہے ہیں، تو اس قسم کے الزامات کے تدارک کے لیے تجویز پیش کی گئی کہ کشمیر کمیٹی کے لیے دستور اور قواعد وضوابط وضع کر لیے جائیں تا کہ کسی کو کسی کے خلاف شکایت کرنے کا موقع مل نہ سکے، لیکن بجائے اس کے کہ الزام کو غلط ثابت کرنے کے لیے قدم اٹھایا جاتا، احمدیوں نے اس تجویز کو اپنے امیر کے لامحدود اختیارات کو محدود کرنے کے لیے ایک چال تصور کیا اور مرزا بشیر الدین محمود نے کشمیر کمیٹی سے استعفا دے دیا۔ جب اقبال کشمیر کمیٹی کے قائم مقام صدر منتخب ہوئے تو احمدی اراکین نے ان کے ساتھ تعاون کرنے سے انکار کر دیا اور بقول اقبال ان پر واضح کر دیا کہ احمدیوں کے نزدیک کشمیر کمیٹی یا مسلمانوں کی کسی بھی تنظیم کی کوئی اہمیت نہیں اور ان کے عقیدے کے مطابق اگر وہ کسی وفاداری کے پابند ہیں تو صرف ان کی امیر کے ساتھ وفاداری ہے۔ پس اقبال پر یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ احمدی اگر مسلمانوں کی کسی سیاسی تنظیم میں شامل ہوں گے تو ان کی وفاداریاں یقیناً منقسم ہوں گی۔ یعنی ان کی اوّلیں وفاداری اپنی جماعت کے ساتھ ہوگی نہ کہ ملت اسلامیہ کے ساتھ۔ یہ وہ وقت تھا جب مسلمانوں میں اور بالخصوص پنجاب کے مسلمانوں میں اتحاد کی اشد ضرورت تھی۔ بعد ازاں اقبال کے کان میں کسی

احمدی کے منہ سے نکلی ہوئی دو ایک ناخوشگوار باتیں پڑیں جن کے سبب وہ جماعت احمدیہ سے بیزار ہوگئے۔ یہ سب ۱۹۳۳ء میں ہوا، لیکن اقبال نے احمدیت کے خلاف اپنا پہلا بیان ۱۹۳۵ء میں جاری کیا۔

اپریل ۱۹۳۵ء میں سر فضل حسین وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل سے ریٹائر ہو کر واپس لاہور پہنچے اور اپنی صحت کی خرابی کے باوجود انہوں نے پنجاب میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر انتخابات لڑنے اور مسلم لیگ کا مقابلہ کرنے کے لیے یونینسٹ پارٹی کی تنظیم نو کا ارادہ کیا۔ سر فضل حسین نے شہری اور دیہاتی کا امتیاز پیدا کر کے پنجاب میں شہری مسلم قیادت پنپ سکنے کے تمام راستے بند کر دیے تھے۔ اب وہ خود تو بستر مرگ پر لیٹے تھے، لیکن مستقبل میں پنجاب میں صحیح الخیال مسلم لیڈر شپ پیدا ہونے کے امکانات کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ اقبال نے ان کے کردار پر بھی اسی قسم کا تبصرہ کرتے ہوئے ایک بیان میں فرمایا:

> یہ کس قدر افسوسناک امر ہے کہ پنجاب میں شہری دیہاتی کا جو جھگڑا چل رہا ہے، اسے سر فضل حسین کی امداد حاصل ہے۔ فضل حسین کو ابتدا میں قیادت کا منصب اس لیے حاصل نہیں ہوا تھا کہ وہ دیہاتی تھے، بلکہ اس لیے کہ وہ صوبے میں مسلمانوں کے لیڈر تھے۔ لیکن انہوں نے قیادت حاصل کرنے کے بعد جان بوجھ کر شہری دیہاتی جھگڑے کو تیز کرنا شروع کر دیا، تاکہ اس طرح ان کا منصب بحال رہے۔ اس جھگڑے سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے بعض ایسے ناکارہ اور تیسرے درجے کے آدمیوں کو اپنا رفیق منتخب کیا جو حکومت کے قطعاً اہل نہ تھے اور جن میں اتنی صلاحیت بھی نہ تھی کہ وہ اس اقتدار اور وقار کو برقرار رکھ سکیں جو وزارت کا لازمہ ہوتا ہے نتیجہ یہ ہوا کہ تیسرے درجے کے لوگ جو اپنے موجودہ عروج کے لیے فضل حسین کے ممنون ہیں، خود ادنیٰ صلاحیت کے مالک ہونے کے باعث فضل حسین کو گویا ایک فوق البشر سمجھنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ حکومت کے بعض کارندوں نے بھی اس پالیسی کی حمایت کی، کیونکہ اس طرح وہ ۱۹۱۹ء کی اصلاحات کا زور توڑنے میں کامیاب ہو سکتے تھے۔ ان تمام اسباب و محرّکات کا نتیجہ یہ نکلا کہ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان میں صحیح لیڈر شپ مفقود ہو چکی ہے اور سیاسی میدان چند حد درجہ نالائق مقدر آزماؤں کے قبضے میں چلا گیا ہے۔

اقبال کے نزدیک شمال مغربی ہند کے مسلمانوں کے سیاسی مستقبل کی بہتری کے لیے پنجاب

کے مسلمانوں نے نہایت اہم کردار ادا کرنا تھا، بلکہ اس خطّے کے مسلمانوں کو اپنے تحفّظ کی خاطر جو لڑائیاں آئندہ لڑنا تھیں، وہ پنجاب کے میدانوں ہی میں لڑی جانا تھیں۔ اس خیال کا اظہار اقبال نے اپنے ایک خط مورخہ ۲۷ ستمبر ۱۹۳۶ء بنام بابائے اردو مولوی عبدالحق میں یوں کیا ہے:

مسلمانوں کو اپنے تحفّظ کے لیے جو لڑائیاں آئندہ لڑنا پڑیں گی، ان کا میدان پنجاب ہوگا۔ پنجابیوں کو اس میں بڑی بڑی دقتیں پیش آئیں گی، کیونکہ اسلامی زمانے میں یہاں کے مسلمانوں کی مناسب تربیت نہیں کی گئی، مگر اس کا کیا علاج کہ آئندہ رزم گاہ یہی سرزمین معلوم ہوتی ہے۔

سو پنجاب کے مسلمانوں میں اتحاد کی اشد ضرورت تھی اور ان کی دینی تعلیم و تربیت کے لیے اقبال کی انتہائی کوشش تھی کہ کسی نہ کسی طرح ہندوستان بھر کے علماء کو پنجاب میں آباد ہونے کی ترغیب دی جائے، لیکن اس اتحاد کو سیاسی طور پر توڑنے کی ذمہ داری اقبال کی رائے میں سر فضل حسین اور ان کی یونینسٹ پارٹی پر عائد ہوتی تھی، جسے مغلوب کرنے کے لیے پنجاب کے مسلمانوں کو مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع کرنے اور مسلم لیگ کو ایک عوامی سیاسی تنظیم کی صورت میں مضبوط بنانے کی ضرورت تھی۔ دوسری طرف مذہبی طور پر اس اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کی ذمے داری اقبال کے نزدیک جماعت احمدیہ پر عائد ہوتی تھی۔ اقبال کو احساس تھا کہ فی الحال احمدی اپنی تعداد میں کمی کے سبب پنجاب میں سیاسی طور پر مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کے علاوہ ایک چوتھا مذہبی فرقہ بننے کے قابل نہ تھے، لیکن انہیں خدشہ تھا کہ اگر ان کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہو گیا تو وہ انگریزی حکومت کے اشارے پر یا یونینسٹ پارٹی کے اثر ورسوخ کے ذریعے مسلمانوں کی تھوڑی سی اکثریت کو صوبائی لیجسلیچر میں شدید نقصان پہنچا سکتے ہیں، بلکہ صوبے میں مسلمانوں کی اکثریت کو (جنہیں وہ من حیث الملت کافر سمجھتے تھے) اقلیّت میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ چنانچہ جب پنڈت جواہر لعل نہرو احمدیوں کی حمایت میں اس بحث میں کودے تو اقبال نے اسی خدشے کے پیش نظر صاف صاف کہہ دیا کہ پنڈت جواہر لعل نہرو برداشت نہیں کر سکتے کہ شمال مغربی ہند کے مسلمانوں کے دل میں حق خود ارادیت کا جذبہ پیدا ہو۔

یہاں ایک اور بات بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ ۱۹۳۵ء میں کوئی گمان بھی نہ کر سکتا تھا کہ بارہ برس بعد انگریز برصغیر سے رخصت ہو جائے گا اور مسلمانوں کے وطن کی صورت میں اقبال کی خواہش کے مطابق محمد علی جناح کے ہاتھوں شمال مغربی ہند میں ایک مقتدر اور آزاد مسلم مملکت قائم ہو جائے گی۔ اس مرحلے پر صوبہ سرحد، سندھ یا بلوچستان میں مسلم لیگ

اکثریت کو بروئے کار لانے میں بظاہر کوئی خطرہ درپیش نہ تھا، لیکن انگریز کی مضبوط ایڑی کے نیچے پنجاب کی صورت حال مختلف تھی، اس لیے اقبال کو یہی فکر دامن گیر تھا کہ مسلمانانِ پنجاب کے سیاسی اور مذہبی اتحاد کو نقصان پہنچانے والے عناصر کی نشاندہی کر کے ان کا قلع قمع کیا جائے۔ سو یونینسٹ پارٹی کا مقابلہ کرنے کے لیے تو انہوں نے سیاسی طریق کار اپنانے کی تلقین کی، مگر تحریک احمدیہ کے عقائد کو باطل ثابت کرنے یا احمدیوں کو مسلمانوں سے علیحدہ مذہبی فرقہ قرار دینے کی خاطر اقبال کو مناظرانہ رویّہ اختیار کرنا پڑا، جو ان کے مزاج سے مطابقت نہ رکھتا تھا اور شاید اسی سبب اقبال نے پنڈت جواہر لعل نہرو کو تحریر کیا کہ دینیات میں انہیں کوئی دلچسپی نہیں، لیکن احمدیوں کے ساتھ ان کے اپنے میدان میں نبرد آزما ہونے کے لیے انہیں اس موضوع سے تھوڑی بہت مدد لینا پڑی۔

شیخ اعجاز احمد، احمدی حلقوں، سرفضل حسین یا عظیم حسین کے خیال میں اقبال نے احمدیت کی مخالفت اپنی سیاسی اغراض کے حصول کی خاطر کی تھی، لیکن اوپر واضح کیا جا چکا ہے کہ اقبال کی سب سے اہم سیاسی غرض مسلمانان برصغیر کے مفادات کا تحفّظ تھی۔ نظریاتی اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک شرک سب سے بڑا گناہ ہے، کیونکہ مشرک اللہ تعالیٰ کی توحید، یکتائیت اور خودی کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے اور اس کی پاداش میں دوزخ میں جھونکا جاتا ہے، لیکن اقبال کے ہاں امت محمدیہ یا ملّتِ اسلامیہ کے اتحاد، یگانگت، یک جہتی اور سالمیت کو پارہ پارہ کرنے والا تو اس کی اجتماعی خودی کا منکر ہے لہٰذا ایسا گنہگار ہے جسے دوزخ بھی قبول کرنے کو تیار نہیں۔

کیا اقبال نے اپنی کسی ذاتی غرض کی تحصیل کی خاطر یا احساس محرومی کے سبب تحریک احمدیہ کی مخالفت کی تھی؟ شیخ اعجاز احمد یہ تحریر کرتے ہیں کہ اس زمانے میں چونکہ انگریزی حکومت نے اقبال کے بجائے سر ظفر اللہ خان کو مستقل طور پر وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کا رکن مقرر کر دیا تھا، اس لیے اقبال نے تحریک احمدیہ کی مخالفت میں بیان جاری کرنے شروع کر دیے۔ یہ عذر کچھ اسی قسم کا ہے جو ہندو اخبار ٹریبیون نے اقبال کے خطبۂ الہ آباد ۱۹۳۰ء کے موقع پر پیش کیا تھا۔ یعنی اقبال نے برصغیر میں علیحدہ مسلم ریاست کا تصور انتقاماً دیا، کیونکہ حکومت برطانیہ نے انہیں پہلی گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے مدعو نہ کیا تھا۔ اقبال کو اگر انگریزی حکومت کی ملازمت ہی کرنا تھی تو سر فضل حسین سے بنا کر رکھتے یا ان کی یونینسٹ پارٹی سے آخری دم تک

وابستگی قائم رکھتے۔ انگریز حکمران سر فضل حسین پر بہت اعتماد کرتے تھے، اس لیے ۱۹۳۲ء میں جب وہ چار ماہ کی رخصت پر گئے تو سر فضل حسین کی سفارش پر ہی سر ظفر اللہ خان کو عارضی طور پر وائسرائے کی کونسل کا رکن مقرر کیا گیا۔ اسی طرح جب اکتوبر ۱۹۳۴ء میں مستقل طور پر سر ظفر اللہ خان کے اس منصب پر تقرر کا اعلان ہوا تو اسے بھی سر فضل حسین کی کوششوں کا نتیجہ سمجھا گیا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا ظفر علی خان کے زمیندار، ویکلی میل اور مجاھد میں تندوتیز بیانات یا احراریوں کی ایجی ٹیشن صرف سر ظفر اللہ خان کے تقرر یا احمدیوں کے خلاف ہی نہ تھی بلکہ سر فضل حسین اور یونینسٹ پارٹی کے خلاف بھی تھی۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اسی اثنا میں سر ہربرٹ ایمرسن کے خطبے کے جواب کی صورت میں اقبال کو بھی یونینسٹ احمدی گٹھ جوڑ پر کھل کر تبصرہ کرنے کا موقع ملا اور انہوں نے احمدیت کی تردید کے ساتھ ساتھ سر فضل حسین کے کردار پر بھی کڑی نکتہ چینی کی۔ سر فضل حسین پر الزام لگایا گیا کہ وہ انگریز حاکموں کے اشارے پر شہری دیہاتی تفریق کے ساتھ احمدیوں کو آگے بڑھا کر پنجاب میں مسلمانوں کے اتحاد پر ضرب کاری لگا رہے ہیں۔ سر فضل حسین وائسرائے کی کونسل میں سر ظفر اللہ خان کے تقرر پر مسلمانوں میں اضطراب سے بخوبی آگاہ تھے۔ انہوں نے اپنے ایک خط مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۳۴ء بنام سر ظفر اللہ خان میں اس اضطراب کی وجوہات بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کی ہیں، لیکن ساتھ ہی تحریر کیا:

> اب انہوں نے اپنی تمام تر توجہ میری طرف مبذول کر لی ہے اور کہتے ہیں کہ زیادہ عرصے تک اونچے منصب پر فائز رہنے کے سبب میں مسلم رائے عامہ سے بے پروا ہو گیا ہوں اور میں نے آمرانہ رویہ اختیار کر لیا ہے خیر مجھے توقع ہے کہ اب تک آپ کے تقرر کا فیصلہ ہو چکا ہوگا۔ گو میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ تقرر کے اعلان سے مخالفت ختم ہو جائے گی، بلکہ کچھ بڑھ ہی جائے گی۔ بہر حال میں دیکھوں گا کہ اس کے خاتمے کے لیے کیا قدم اٹھانے چاہئیں۔

اقبال کی اگر وائسرائے کی کونسل کی رکنیت میں دلچسپی تھی تو سر فضل حسین کی ڈائری یا خطوط میں اس کا کہیں ذکر ملتا یا عظیم حسین کی تصنیف میں اس کی طرف کوئی اشارہ ہوتا۔ دراصل عظیم حسین کا تو گلہ ہی یہی ہے کہ ان کے والد سر فضل حسین، اقبال کو انگریزی حکومت میں کسی بلند عہدے پر فائز کروانے کے لیے بار بار کوشش کرتے تھے، مگر اقبال ہر بار انگریزی حکومت پر

نکتہ چینی کر کے حکومتی حلقوں کا اعتماد کھو دیتے۔ یہاں یہ بات بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ انگریز حکمران اتنے کمزور نہیں تھے کہ احراریوں کی ایجی ٹیشن پر یا سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا ظفر علی خان کے اخبارات میں اقبال کا نام لینے پر انہیں وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کا رکن مقرر کر دیتے۔ یہ درست ہے کہ اس منصب پر سر ظفر اللہ خان کی متوقع تقرری کے خلاف زمیندار اور دیگر اخباروں میں سخت احتجاج ہو رہا تھا اور کہا جا رہا تھا کہ ایک احمدی کے بجائے کسی جلیل القدر مسلمان کو یہ منصب دیا جائے، اور اس ضمن میں اقبال کا نام بھی لیا جا رہا تھا، لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ اقبال اس منصب کے لیے امیدوار تھے، درست نہیں۔ انگریز حکمرانوں کو اس قسم کے تقرر کرتے وقت سب سے پہلے ایسے لوگوں کی تلاش ہوتی تھی جو ان کے اطاعت گذار اور وفا دار ہوں، نہ کہ ان کے نقاد۔ اس لیے یہ بات پنجاب میں ہر کوئی جانتا تھا کہ وائسرائے کی کونسل کی رکنیت کے لیے اسی شخص کا تقرر ہو گا جو انگریز حاکموں کی توقعات کے مطابق سر فضل حسین کا صحیح جانشین ہو، جسے سر فضل حسین یا انہی کی طرح کی کسی شخصیت کی حمایت حاصل ہو اور اگر یہ محسوس کیا جاتا کہ مسلم ایجی ٹیشن کے سبب سر ظفر اللہ خان کا تقرّر مناسب نہ رہے گا تو اس منصب کے لیے سر فضل حسین کو کسی اور جانشین کی سفارش کرنے کے لیے کہا جاتا، لیکن اقبال جیسی شخصیت کے تقرر کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا، جس نے کئی بار انگریزی حکومت کو تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔

اس ضمن میں شیخ اعجاز احمد، میاں محمد شفیع (م۔ش) کے بیان کو سند کے طور پر پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جن ایّام میں سر فضل حسین کے جانشین کے تقرر کا معاملہ زیر غور تھا، وائسرائے لارڈ ولنگڈن نے ایک ملاقات میں اقبال کو یہ کہہ کر کہ اب ہم اکثر ملتے رہیں گے، سر فضل حسین کی جگہ ان کے تقرر کی طرف اشارہ بھی کر دیا تھا۔ راقم کو اس روایت کی صحت پر کئی اعتراض ہیں۔ اوّل یہ کہ ۱۹۳۴ء یا ۱۹۳۵ء میں میاں محمد شفیع (م۔ش) سے اقبال کے کسی قسم کے روابط قائم نہ ہوئے تھے، بلکہ اس زمانے میں وہ میاں محمد شفیع (م۔ش) کو جانتے تک بھی نہ تھے۔ دوم یہ کہ ان دو سالوں میں ایسی کوئی شہادت راقم کی نظر سے نہیں گزری جس سے ثابت ہو سکے کہ اقبال کی لارڈ ولنگڈن سے ملاقات ہوئی تو کہاں ہوئی تھی۔ سوم یہ کہ جس روایت کا شنید پر انحصار ہو اور جس کی تائید کسی واقف حال ہمعصر شخصیت کے بیان یا کسی معتبر تحریری ذریعے سے نہ ہوتی ہو، وہ تحقیقی نقطۂ نظر سے قابل اعتماد نہیں سمجھی جا سکتی۔

مئی ۱۹۳۵ء میں جب احمدیت کے خلاف اقبال نے اپنا پہلا بیان جاری کیا تو گلے کا عارضہ لاحق ہوئے ڈیڑھ برس کی مدت گزر چکی تھی۔ بھوپال سے برقی علاج کا پہلا کورس مکمل کر کے واپس لاہور آئے تھے۔ آواز بہت نحیف تھی۔ صحت مسلسل گر رہی تھی اور مستقل طور پر صاحب فراش ہو چکے تھے بلکہ انہی ایّام میں سردار بیگم کی تشویش ناک بیماری، پھر ناگہانی موت اور نابالغ بچوں کی نگہداشت وغیرہ ایسے مصائب و آلام نے انہیں بالکل نڈھال کر دیا تھا۔ آواز کی خرابی کے سبب تقریباً ڈیڑھ برس سے وکالت بھی چھوٹ چکی تھی۔ یہ درست ہے کہ اقبال کو مالی فراغت یا آسودگی کبھی نصیب نہ ہوئی، لیکن ۱۹۳۴ء اور ۱۹۳۵ء میں تو بوجہ علالت وہ اس قابل ہی نہ رہے تھے کہ وائسرائے کی کونسل کی رکنیت قبول کرتے۔ اسی زمانے میں سر فضل حسین نے اپنے ایک خط مورخہ ۲ مئی ۱۹۳۴ء بنام میاں امیر الدین میں تحریر کیا:

> اقبال کا کیا حال ہے، کچھ عرصہ ہوا میں نے سنا تھا کہ وہ علیل ہیں اور مالی مشکلات سے دوچار۔ مجھے بڑی مسرت ہوگی اگر آپ مجھے بصیغۂ راز اطلاع دیں کہ صحیح پوزیشن کیا ہے۔ میں کالج کے ایّام سے ان کا بڑا مداح رہا ہوں اور ایک بار پھر ان کی امداد کی کوشش کرنا چاہتا ہوں۔ اگر مجھے معلوم ہو سکے کہ صحت اور مالی اعتبار سے وہ کس حال میں ہیں اور اگر واقعی پریکٹس کر رہے ہیں تو فی الحال اس سے آمدنی کی کیا صورت ہے۔

میاں امیر الدین نے انہیں جواب دیا کہ اقبال علالت کے سبب ایک مدت سے وکالت ترک کر چکے ہیں۔ ان کی صحت اور مالی حالت دونوں خراب ہیں اور ان کی آواز بڑی سرعت کے ساتھ بیٹھی چلی جا رہی ہے۔ اس حالت میں یہ کہنا کہ اقبال وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کی رکنیت کے امیدوار تھے یا اس منصب پر تقرری کے خواب دیکھ رہے تھے اور جب ان کی بجائے یہ منصب وزیرِ ہند نے سر ظفر اللہ خان کو سونپ دیا تو وہ انتقاماً احمدیت کی مخالفت میں بیانات جاری کرنے لگے، اصل حقائق سے بے خبری ہے یا انہیں تعصب کی عینک سے دیکھنے والوں کی آنکھ سے دیکھنا ہے۔

باب: ۲۱

آخری ایّام

اقبال کی حالت روز بروز بگڑتی چلی جارہی تھی۔ ۱۹۳۷ء میں حکیم نابینا کا علاج جاری رہا۔ سید نذیر نیازی کے دہلی سے لاہور چلے آنے کے بعد کچھ مدت تک تو اقبال کے برادر نسبتی خواجہ عبدالغنی جو دہلی میں مقیم تھے، حکیم نابینا سے دوائیں لے کر بھیجتے رہے۔ بعدازاں اقبال کے بھتیجے شیخ اعجاز احمد بھی دہلی پہنچ گئے اور دوائیں بھجوانے کا اہتمام کرنے لگے۔ اقبال براہ راست خط وکتابت کے ذریعے حکیم نابینا کو اپنے عوارض کی تفصیل بتاتے رہتے تھے۔ اسی اثناء میں انہوں نے دوایک مرتبہ دہلی کا سفر بھی کیا اور حکیم نابینا سے مل کر علاج کے متعلق اپنی تسلی کرلی، مگر دہلی سے ادویات کا سلسلہ تب ٹوٹا جب حکیم نابینا، نظام کی ملازمت اختیار کر کے حیدرآباد تشریف لے گئے تھے۔ پھر بھی کچھ عرصہ تک ڈاکٹر مظفرالدین قریشی پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی کے توسّط سے دوائیں لاہور پہنچتی رہیں، لیکن ۱۹۳۸ء کے آغاز سے یہ سلسلہ قطعی طور پر منقطع ہوگیا اور اس کی اصل وجہ حکیم نابینا کی اپنی ضعیف العمری تھی۔ سوعلاج مقامی ڈاکٹروں اور طبیبوں کے ہاتھ میں چلا گیا۔

مختلف نوع کے عوارض کے سبب ملک سے باہر جا کر لکچر دینے کے تمام ارادے منسوخ کیے جا چکے تھے۔ جنوری ۱۹۳۷ء کے اوائل میں لاہور میں انتخابات کی گرم بازاری تھی اور پنجاب میں تو اس سلسلے میں دوتین قتل کی وارداتیں بھی ہوچکی تھیں۔ اقبال نے آنکھوں کا معائنہ کرایا اور چونکہ موتیا اترنے کے آثار تھے، اس لیے ڈاکٹر نے لکھنا پڑھنا بند کروا دیا۔ اب صرف ایک قصد باقی رہ گیا تھا، جس کا اظہار انہوں نے اپنے ایک خط محررہ ۱۵ رجنوری ۱۹۳۷ء بنام سرراس مسعود میں یوں کیا ہے:

> ان شاء اللہ امید کہ سال (آئندہ) حج بھی کروں گا اور دربار رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضری بھی دوں گا اور وہاں سے ایک ایسا تحفہ لاؤں گا کہ مسلمانان ہند یاد کریں گے۔

یہ تحفہ کیا ہونا تھا؟ ان کی کتاب ارمغان حجاز جو انہوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام

میں مرتب کی اور جوان کے انتقال کے بعد نومبر ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی۔

جامعہ ازہر کے شیخ محمد مصطفی المراغی اچھوتوں میں تبلیغ اسلام کی مہم جاری کرنے کی خاطر مصری علماء کا ایک وفد ہندوستان بھیجنے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن باوجود اس کے کہ اقبال نے انہیں تحریر کر دیا تھا کہ یہ کام ہندوستان کے علماء انجام دے سکتے ہیں، علمائے مصر کا وفد ۱۱ دسمبر ۱۹۳۶ء کو بمبئی پہنچ گیا اور ۳۰ دسمبر ۱۹۳۶ء سے دہلی میں چند یوم گزارنے کے بعد اوائل جنوری ۱۹۳۷ء میں لاہور آیا، وفد کے معتمد شیخ حبیب احمد آفندی اور نائب معتمد شیخ صلاح الدین التجار (جو انگریزی زبان سے شناسا تھے) اہم مسلم شخصیتوں اور تبلیغی انجمنوں کے ذریعے اچھوتوں میں تبلیغ اسلام کی خاطر مناسب مواقع پیدا کرنے کے سلسلے میں معلومات جمع کرتے رہے۔ وفد کے اراکین نے اقبال سے بھی ملاقات کی، مگر اقبال نے ان کی توجہ عالم اسلام کے حقیقی مسائل کی طرف مبذول کرائی اور ان پر واضح کیا کہ یہ مسائل محض تبلیغ اسلام کے ذریعے حل نہیں کیے جا سکتے۔ ۲۷ جنوری ۱۹۳۷ء کی دوپہر کو اقبال نے مصری وفد کے اعزاز میں اسپنسر ہوٹل ۶۔ منٹگمری روڈ لاہور میں ایک دعوت طعام بھی دی جس میں دیگر شخصیات کے ساتھ راقم بھی شریک تھا۔ کھانے کے بعد شرکائے دعوت کا گروپ فوٹو لیا گیا۔ اس فوٹو میں اقبال کی صورت دیکھ کر اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان دنوں وہ کس قدر نحیف اور کمزور ہو گئے تھے۔ یہ غالباً زندگی میں ان کی آخری تصویر تھی۔ وفد مارچ ۱۹۳۷ئ میں واپس مصر چلا گیا۔

۱۵ فروری ۱۹۳۷ء کو انجمن اردو پنجاب کی طرف سے لاہور کے وائی۔ ایم۔ سی۔ اے ہال میں یوم غالب منایا گیا۔ اس موقع پر انجمن کے سیکرٹری میاں بشیر احمد، مدیر ھمایوں نے اقبال کا ارسال کردہ تحریری پیغام پڑھ کر سنایا۔ پیغام تھا:

> مرزا آپ کو اپنے فارسی کلام کی طرف دعوت دیتے ہیں...... اگر آپ اسے قبول کرنے کا فیصلہ کر لیں تو ان کے فارسی کلام کی حقیقت اور ان کی تعلیم کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے کے لیے دو باتوں کا جاننا ضروری ہے۔ اوّل یہ کہ عالم شعر میں میرزا عبدالقادر بیدل اور مرزا غالب کا آپس میں تعلق ہے۔ دوم یہ کہ میرزا بیدل کا فلسفہ حیات غالب کے دل و دماغ پر مؤثر کہاں تک ہوا اور مرزا غالب اس فلسفۂ حیات کو سمجھنے میں کس حد تک کامیاب ہوئے۔ مجھ کو یقین ہے کہ اگر آج کل کے وہ نوجوان جو فارسی ادب میں دلچسپی رکھتے ہیں، اس نقطۂ نگاہ سے مرزا غالب کے فارسی کلام کا مطالعہ کریں تو بہت فائدہ اٹھائیں گے۔

چودھری محمد حسین کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں اقبال کے ہاں عقل و فلسفہ سب عشق رسولؐ کے تابع ہو چکے تھے۔ اسی عالم میں مندرجہ ذیل رباعی کہی گئی:

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر
روز محشر عذر ہائے من پذیر
در حسابم را تو بینی ناگزیر
از نگاہ مصطفی پنہاں بگیر

رباعی غالباً ارمغان حجاز میں شامل ہونا تھی، لیکن عین ممکن ہے اقبال نے اسے اپنے بعض احباب کے سامنے پڑھا ہو۔ چنانچہ مولوی ابراہیم سب جج گوجرانوالا نے یہ رباعی محمد رمضان انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول ڈیرہ غازی خان کے روبرو پڑھی۔ محمد رمضان صوفی مزاج کے آدمی تھے۔ رباعی نے ان کے دل پر اس قدر گہرا اثر کیا کہ سنتے ہی اچانک گر پڑے، چوٹ کھائی اور بے ہوش ہو گئے۔ بعدازاں اقبال کی خدمت میں خط تحریر کیا، جس میں التجا کی کہ رباعی انہیں بخش دی جائے تاکہ مرنے کے بعد یہ رباعی ان کے ماتھے پر لکھ کر انہیں دفن کیا جائے۔ اقبال نے انہیں رباعی عطا کرتے ہوئے اپنے ایک خط مورّخہ ۱۹رفروری ۱۹۳۷ء میں تحریر کیا:

شعر کسی کی ملکیت نہیں۔ آپ بلاتکلف، وہ رباعی جو آپ کو پسند آ گئی ہے۔ اپنے نام سے مشہور کریں مجھے کوئی اعتراض نہیں۔

اقبال نے اس رباعی کے بجائے اسی موضوع سے متعلق ایک اور رباعی کہی جو ارمغان حجاز میں موجود ہے:

بہ پایاں چو رسد ایں عالم پیر
شود بے پردہ ہر پوشیدہ تقدیر
مکن رسوا حضور خواجہؐ مارا
حساب من ز چشم او نہاں گیر

اسی دور میں کسی نے خط میں تحریر کیا کہ خواب میں رسول اللہ کی سخت جلالی رنگ میں زیارت نصیب ہوئی ہے۔ اس کی تعبیر کیا ہو سکتی ہے؟ اقبال نے جواباً فرمایا:

عام مسلمانوں کی طرح میرا بھی یہ عقیدہ ہے کہ حضوؐر رسالت مآب کی زیارت خیر و برکت کا باعث ہے۔ گذشتہ دس پندرہ سال میں لوگوں نے مجھ سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے حضور

رسالت مآبؐ کو جلالی رنگ میں یا سپاہیانہ لباس میں خواب میں دیکھا ہے۔ میرے خیال میں یہ علامت احیائے اسلام کی ہے۔

فروری ۱۹۳۷ء میں انتخابات کے نتائج بھی نکل آئے۔ اقبال کو اس بات کا احساس تھا کہ ہندوستان میں مسلمان اس مرکزیت سے محروم ہیں، جو ہندوؤں کو کانگرس کی انتخابات میں کامیابی کے سبب حاصل ہوگئی تھی۔ مسلم اکثریتی صوبوں میں کسی آل انڈیا مسلم سیاسی تنظیم کے بجائے ہر صوبے میں علیحدہ علیحدہ غیر فرقہ وارانہ جماعتیں، برسر اقتدار تھیں جن کا آپس میں کوئی تعلق واسطہ نہ تھا اور مسلم اقلیتی صوبوں میں تو ویسے ہی مسلمانوں کو کوئی سیاسی اہمیت حاصل نہ تھی۔ ہندو لیڈروں کو توقع تھی کہ مسلم اقلیتی اور مسلم اکثریتی صوبوں میں مسلمانوں کی منتشر ٹولیاں بالآخر کانگرس میں جذب ہو جائیں گی۔ اسی اندیشے کے پیش نظر اقبال نے محمد علی جناح کو اپنے ایک خط محررہ ۲۰ مارچ ۱۹۳۷ء میں مشورہ دیا:

مجھے توقع ہے کہ آپ نے پنڈت جواہر لعل نہرو کا وہ خطبہ ملاحظہ فرما لیا ہوگا، جو انہوں نے آل انڈیا نیشنل کنونشن میں دیا ہے اور اس خطبے میں مسلمانانِ ہند کے بارے میں جس پالیسی کا اعلان کیا گیا، اسے بھی آپ نے بخوبی سمجھ لیا ہوگا۔...... آپ یقیناً اس بات سے بھی آگاہ ہوں گے کہ نئے آئین نے ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے کم از کم ایک ایسا نادر موقع فراہم کر دیا ہے کہ وہ ہندوستان اور مسلم ایشیا میں رونما ہونے والے سیاسی حالات کے پیش نظر، اپنی قومی تنظیم کر سکیں۔ اگرچہ ہم ملک کی دیگر ترقی پسند جماعتوں کے ساتھ تعاون کرنے کو تیار ہیں، لیکن ہمیں اس حقیقت کو نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ ایشیا میں اسلام کی اخلاقی اور سیاسی قوت کے مستقبل کا انحصار بہت بڑی حد تک خود ہندی مسلمانوں کی مکمل قومی تنظیم پر ہے۔ اس لیے میری رائے میں آل انڈیا نیشنل کنونشن کو ایک موثر جواب دینا بے حد ضروری ہے۔...... آپ کو چاہیے کہ فوراً دہلی میں ایک آل انڈیا مسلم کنونشن کا انعقاد کریں، جس میں شرکت کے لیے نئی صوبائی اسمبلیوں کے ممبروں کے علاوہ دیگر اہم مسلم قائدین بھی مدعو کیے جائیں۔ اس کنونشن میں آپ پوری وضاحت اور پورے زور کے ساتھ یہ حقیقت بیان کریں کہ ہندی مسلمانوں کا ایک جداگانہ سیاسی ہستی کی حیثیت سے کیا سیاسی مطمح نظر ہے۔ یہ امر بے حد ضروری ہے کہ اندرون اور بیرون ہند کی ساری دنیا کو بتا دیا جائے کہ ملک میں صرف اقتصادی مسئلہ ہی تنہا ایک مسئلہ نہیں ہے، بلکہ مسلم نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو مسلمانان ہند کے لیے ان کے کلچر کا مسئلہ کہیں زیادہ اہم ہے۔

بہر حال کلچر کا مسئلہ اقتصادی مسئلہ سے کسی طرح بھی کم اہم نہیں ہے۔

اقبال غالباً اپریل ۱۹۳۷ء کے پہلے ہفتے میں حکیم نابینا کو نبض دکھانے کی خاطر دہلی گئے۔ افغان قونصل صلاح الدین سلجوقی کے ہاں قیام کیا، لیکن محمد علی جناح سے ملاقات نہ ہوسکی۔ واپس لاہور آئے تو کانگرس کی نیشنل کنونشن ابھی تک ان کے ذہن پر چھائی ہوئی تھی۔ چنانچہ اپنے ایک خط مورخہ ۲۲/اپریل ۱۹۳۷ء میں انہوں نے محمد علی جناح کو تحریر کیا:

مجھے معلوم نہیں کہ میرا وہ خط جو میں نے دو ہفتے ہوئے لکھا تھا آپ تک پہنچا بھی ہے یا نہیں۔ میں نے وہ خط آپ کو نئی دہلی کے پتے پر بھیجا تھا اور جب میں نے دہلی پہنچ کر دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ آپ وہاں سے جا چکے ہیں۔ اُس خط میں میں نے تجویز پیش کی تھی کہ ہمیں فوراً دہلی میں آل انڈیا مسلم کنونشن منعقد کر کے حکومت اور ہندوؤں کو ایک بار پھر مسلمانان ہند کی پالیسی سے آگاہ کر دینا چاہیے۔ حالات نازک صورت اختیار کرتے چلے جا رہے ہیں اور بعض ایسے وجوہ سے، جن کی تفصیل بیان کرنے کی ضرورت نہیں، پنجاب کے مسلمانوں کا رجحان بڑی سرعت کے ساتھ کانگرس کی طرف بڑھتا چلا جا رہا ہے اس لیے میں آپ سے درخواست کروں گا کہ آپ جلد از جلد غور فرما کر میری تجویز کے بارے میں فیصلہ کریں۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس تو آئندہ اگست تک ملتوی ہو چکا ہے، لیکن حالات ایسے ہیں کہ مزید انتظار کیے بغیر مسلمانوں کی قومی پالیسی کا دوبارہ اعلان کر دینا بے حد ضروری ہے۔ اگر کنونشن کے انعقاد سے پیشتر چند اہم مسلم لیڈر ملک کا دورہ کر لیں تو کنونشن یقیناً کامیاب رہے گی۔ مہربانی کر کے میرے اس خط کا جواب جتنی جلد ممکن ہو سکے دیں۔

کانگرس نے اپنی واضح اکثریت والے صوبوں میں بالآخر وزارتیں بنائیں اور ساتھ ہی پنڈت جواہر لعل نہرو کی قیادت میں تحریک رابطۂ مسلم عوام بڑے زور شور سے شروع کی گئی۔ تحریک کا مقصد یہ تھا کہ مسلم قائدین کو نظر انداز کر کے ملک بھر میں مسلم عوام تک کانگرس کا پیغام پہنچایا جائے اور انہیں کسی نہ کسی طرح کانگرس کے دام میں لایا جائے۔ مئی ۱۹۳۷ء میں تحریک رابطہ مسلم عوام پنجاب میں داخل ہوئی۔ یہاں مرکزی اسمبلی کی ایک خالی نشست کے لیے ضمنی انتخاب میں مولانا ظفر علی خان کھڑے ہوئے، لیکن کانگرس نے ان کے مقابلے میں ایک غیر معروف شخص میاں عبدالعزیز کو کھڑا کر دیا۔ اقبال نے اس امیدوار کے والد سے بارہا کہا کہ اپنے بیٹے کو مولانا ظفر علی خان کے مقابلے سے دستبردار کرائے۔ چنانچہ معاملہ ایک ایسے ثالثی بورڈ کے سامنے پیش ہوا جس کے اقبال بھی رکن تھے۔ بالآخر میاں عبدالعزیز دستبردار ہوئے

اور مولانا ظفر علی خان اس نشست کے لیے بلا مقابلہ منتخب ہو گئے۔

اقبال کو اس بات کا بھی احساس تھا کہ مسلم لیگ ابھی تک حقیقی معنوں میں مسلم عوام کے ساتھ رابطہ قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی۔ لہٰذا وہ اسے جلد از جلد ایک عوامی تنظیم بنانے کے خواہش مند تھے۔ عاشق حسین بٹالوی تحریر کرتے ہیں کہ اس ضمن میں اقبال کی زیر ہدایت صوبائی مسلم لیگ کے ایک اجلاس منعقدہ ۲۵ اپریل ۱۹۳۷ء میں ملک زمان مہدی خان کی قیادت میں ایک کمیٹی بنائی گئی جس کے ذمے پنجاب میں مسلم لیگ کی ضلع وار اور مقامی شاخیں قائم کرنے اور مسلم عوام کے ساتھ لیگ کا ربط وضبط بڑھانے کا کام سونپا گیا۔ کمیٹی نے مئی کے پہلے ہفتے میں اپنی اسکیم مرتب کی، جسے اقبال نے منظور کیا۔ چنانچہ مئی کے دوسرے ہفتے سے صوبائی مسلم لیگ کے کارکنان نے پنجاب کا دورہ شروع کیا۔

کانگرس پنجاب میں اپنی مہم کی کامیابی کی خاطر ہر حربہ استعمال کر رہی تھی۔ مثلاً اگر اقبال نے بعض مسلم نوجوانوں کو یہ مشورہ دیا کہ اسلام کے اقتصادی پہلوؤں کے متعلق پُر جوش ذہنی انہماک پیدا کرنے کے لیے ایک مسلم انڈیا سوسائٹی قائم کی جائے، تو افواہ اڑا دی گئی کہ اقبال آل انڈیا مسلم لیگ کے بجائے کوئی دوسری جماعت بنانے کے آرزو مند ہیں۔ یہ غلط فہمی دور کرنے کی خاطر اقبال کو اپنا بیان مورخہ ۷ رمئی ۱۹۳۷ء جاری کرنا پڑا جس میں واضح کیا:

آل انڈیا مسلم لیگ کو توڑنے کا خیال میرے دماغ سے اس قدر بعید ہے جس قدر کہ ممکن ہو سکتا ہے۔ مسلم لیگ مسلمانان ہند کی سب سے پرانی سیاسی جماعت ہے جسے تمام مسلمانوں کا مکمل اعتماد حاصل ہونا چاہیے۔ خصوصاً اس وقت جب کہ اس کی عنان قیادت مسٹر محمد علی جناح ایسے رہنما کے ہاتھ میں ہے، جنہیں تمام مسلمانوں کا اعتماد حاصل ہے۔

کانگرس کی رابطہ مسلم عوام مہم کا اصل جواب تو یہی تھا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کو نہ صرف صحیح معنوں میں ایک عوامی تنظیم بنا دیا جائے بلکہ اس کے ذریعے مسلمانوں کے معاشی مسائل کا حل بھی پیش کیا جائے۔ ان امور کے بارے میں اقبال کی رائے صاف اور واضح تھی اور اس کا دوٹوک اظہار انہوں نے محمد علی جناح کے نام اپنے ایک خط مورّخہ ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء میں کیا۔ انہوں نے فرمایا:

لیگ کو آخر کار یہ فیصلہ کرنا ہی پڑے گا کہ کیا وہ ہندوستان کے مسلمانوں کے اونچے طبقے کی نمائندہ بنی رہے گی یا مسلم عوام کی نمائندگی کا حق ادا کرے گی۔ جنہوں نے اب تک بجا طور پر اس میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ جہاں تک میری ذاتی رائے کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ کوئی بھی

سیاسی جماعت جو عامۃ المسلمین کی بہبودی کی ضامن نہ ہو، عوام کے لیے باعث کشش نہیں ہو سکتی۔ ...... البتہ میرے ذہن میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ ہندو دھرم کا سوشل ڈیما کریسی اختیار کر لینا خود ہندو دھرم کا خاتمہ ہے۔ اسلام کے لیے سوشل ڈیما کریسی کی کسی موزوں شکل میں ترویج جب اسے شریعت کی تائید حاصل ہو، درحقیقت کوئی انقلاب نہیں بلکہ اسلام کی اصل پاکیزگی کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ اس لیے مسائل حاضرہ کا حل مسلمانوں کے لیے ہندوؤں سے کہیں زیادہ آسان ہے۔ لیکن جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں مسلم ہند میں ان مسائل کے حل بہ آسانی رائج کرنے کی خاطر ملک کی تقسیم کے ذریعے ایک یا زائد مسلم ریاستوں کا قیام اشد ضروری ہے۔ کیا آپ کی رائے میں اس مطالبے کا وقت آن نہیں پہنچا؟ شاید جواہر لعل کی دہریہ سوشلزم کا آپ کے پاس یہ بہترین جواب ہے۔

انہی ایام میں اقبال نے راقم اور بالخصوص منیرہ کی نگہداشت کی خاطر اور گھر کے عام انتظام کے لیے پروفیسر رشید احمد صدیقی اور چند دیگر احباب کے ذریعے علی گڑھ سے ایک جرمن خاتون کو بلوانے کا فیصلہ کیا جو اردو بول سکتی تھیں اور اسلامی معاشرت سے واقف تھیں۔ ان کا نام مسز ڈورس احمد تھا۔ وہ علی گڑھ کے ایک پروفیسر کی بیوی کی بہن تھیں اور کچھ مدت سے علی گڑھ ہی میں مقیم تھیں۔

اقبال کے دل میں اپنی معذوری کے باوجود حج کے لیے جانے کی خواہش روز بروز بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ اس خواہش کا اظہار انہوں نے اپنے ایک خط بنام سر اکبر حیدری مورخہ ۱۳؍جون ۱۹۳۷ء میں ان الفاظ میں کیا ہے:

ایک ہی خواہش جو ہنوز میرے جی میں خلش پیدا کرتی ہے، یہ رہ گئی ہے کہ اگر ممکن ہو سکے تو حج کے لیے مکہ جاؤں اور وہاں سے اس ہستیؐ کی تربت پر حاضری دوں جس کا ذات الٰہی سے بے پایاں شغف میرے لیے وجہ تسکین اور سر چشمۂ الہام رہا ہے۔ میری جذباتی زندگی کا سانچا کچھ ایسا واقع ہوا ہے کہ انفرادی انسانی شعور کی ابدیت پر مضبوط یقین رکھے بغیر ایک لمحہ بھی زندہ رہنا میرے لیے ممکن نہیں۔ یہ یقین مجھے پیغمبر اسلام کی ذات گرامی سے حاصل ہوا ہے۔ میرا ذرہ ذرہ آنحضورؐ کی احسان مندی کے جذبات سے لبریز ہے اور میری روح ایک ایسے بھرپور اظہار کی طالب ہے جو صرف آنحضورؐ کے روضہ مقدس پر ہی ممکن ہے۔ اگر خدا نے مجھے توفیق بخشی تو میرا حج اظہار تشکر کی ایک شکل ہوگی۔

اسی طرح عبداللہ چغتائی کو بھی اپنے ایک خط مورخہ ۱۳؍جون ۱۹۳۷ء میں تحریر کیا:

بحیثیت مجموعی ایک دائم المریض کی زندگی بسر کر رہا ہوں۔ تاہم صابر اور شاکر ہوں۔ انشاء اللہ جب موت آئے گی تو مجھے متبسم پائے گی۔ قصد تو یہ تھا کہ زندگی کے باقی دن جرمنی اور اٹلی میں گزاروں، مگر بچوں کی تربیت کس پر چھوڑوں، خصوصاً جب کہ میں ان کی مرحوم ماں سے یہ عہد کر چکا ہوں کہ جب تک یہ بالغ نہ ہو جائیں ان کو اپنی نظر سے اوجھل نہ کروں۔ ان حالات میں یورپ کا سفر اور وہاں کی اقامت ناممکن نہیں تو محال ضرور ہے۔ اگر توفیق الٰہی شامل حال رہی تو زیادہ سے زیادہ مکہ ہوتا ہوا ممکن ہے مدینہ تک پہنچ سکوں۔ اب مجھ ایسے گنہگار کے لیے آستان رسالتؐ کے سوا اور کہاں جائے پناہ ہے۔

مسلم اقلیتی صوبوں میں کانگرس نے اپنی وزارتیں ترتیب دیتے وقت یہ اصول وضع کیا تھا کہ کسی غیر کانگرسی کو وزارت میں نہیں لیا جائے گا، مگر بعد میں صوبۂ سرحد میں کانگرسیوں کے ساتھ چند غیر کانگرسی اراکین شامل کر کے ایک کانگرسی وزارت بنائی گئی۔ پس کانگرس کے روّیے سے ظاہر تھا کہ وہ مسلم اکثریتی صوبوں میں بھی کسی نہ کسی طرح اقتدار پر متمکن ہونے کی کوشش کرے گی اور اس مقصد کی تحصیل کے لیے اپنے ہی بنائے ہوئے اصولوں کو پاؤں تلے روندنے سے باز نہیں رہے گی۔ مسلمان اکثریتی اور اقلیتی صوبوں میں بدستور انتشار کا شکار تھے۔ ان کے سامنے کوئی واضح نصب العین نہ تھا۔ اسی صورت حال کے پیش نظر اقبال بار بار محمد علی جناح کو تحریر کرتے تھے اور اپنے خدشات کا اظہار ان کے سامنے کرتے تھے۔ مثلاً اپنے ایک خط مورخہ ۲۱ رجون ۱۹۳۷ء میں انہیں لکھا:

میں جانتا ہوں کہ آپ ایک انتہائی مصروف شخص ہیں لیکن مجھے امید ہے کہ میرے بار بار لکھنے پر آپ برا نہ منائیں گے۔ دراصل اس وقت مسلم قوم کو اس طوفان بلا میں جو شمال مغربی ہند اور شاید ملک کے گوشے گوشے سے اٹھنے والا ہے، صرف آپ ہی کی ذات گرامی سے رہنمائی کی توقع ہے۔...... میرے خیال میں نیا آئین ہندوستان کو ایک ہی وفاق میں مربوط کر لینے کی تجویز کی بنا پر حد درجہ یاس انگیز ہے۔ ہندوستان میں قیام امن اور مسلمانوں کو غیر مسلموں کے غلبے اور تسلط سے بچانے کی واحد ترکیب وہی ہے جس کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے۔ یعنی مسلم صوبوں پر مشتمل ایک جداگانہ وفاق کا قیام۔ شمال مغربی ہند اور بنگال کے مسلمانوں کو ہندوستان اور بیرون ہندوستان کی دیگر اقوام کی طرح حق خود اختیاری سے کیونکر محروم کیا جا سکتا ہے۔ میری ذاتی رائے تو یہ ہے کہ شمال مغربی ہند اور بنگال کے مسلمانوں کو فی الحال مسلم اقلیت کے صوبوں کو نظر انداز کر دینا

چاہیے۔ مسلم اکثریت اور مسلم اقلیت کے صوبوں کا بہترین مفاد اس طریق سے وابستہ ہے۔ لہٰذا لیگ کا آئندہ اجلاس کسی مسلم اقلیت کے صوبے میں منعقد کرنے کے بجائے پنجاب میں منعقد کرنا بہتر ہوگا۔ لاہور میں اگست کا مہینہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔ میری رائے میں آپ کو لاہور میں وسط اکتوبر میں جب موسم خوشگوار ہو جاتا ہے، لیگ کے اجلاس کے انعقاد کے امکان پر غور کرنا چاہیے پنجاب میں آل انڈیا مسلم لیگ سے دلچسپی بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہے، اور لیگ کے آئندہ اجلاس کا لاہور میں انعقاد پنجابی مسلمانوں کی سیاسی بیداری کے لیے از حد مفید ہوگا۔

جولائی ۱۹۳۷ء کے اوائل میں اقبال نے گرمیوں کے چند ماہ کشمیر میں گزارنے کا ارادہ کیا۔ خیال تھا کہ موسم گرما کی تعطیلات کے لیے راقم کا اسکول بند ہونے پر (راقم ان ایّام میں سنٹرل ماڈل سکول میں پڑھتا تھا) ۱۲ جولائی ۱۹۳۷ء کے بعد سری نگر روانہ ہوا جائے۔ اقبال کے ایک عقیدت مند سید مراتب علی نے سفر کے لیے اپنی اسٹیشن ویگن جس میں سات آٹھ آدمی بیٹھ سکتے تھے، دینے کا وعدہ کیا تھا، لیکن کشمیر میں اقبال کا داخلہ تحریک کشمیر کے ایّام سے ممنوع تھا۔ چنانچہ ریاستی حکام سے اس سلسلے میں اجازت حاصل کرنے کے لیے خط و کتابت کی گئی۔ پہلے تو خاصی مدت تک اقبال کو کوئی جواب موصول نہ ہوا، مگر بالآخر جب ریاستی حکام نے سفر کشمیر کی اجازت دی، تو موسم گرما گزر چکا تھا۔ یوں وہ زندگی میں آخری بار اپنے آبائی وطن کی زیارت کرنے سے بھی محروم رہے۔

اسلامی علوم کے احیاء اور تعلیمات کی وقت کے جدید تقاضوں کے مطابق تعبیر کے سلسلے میں اقبال کی بہت سی تمناؤں میں سے ایک تمنا یہ بھی تھی کہ کسی مسلم یونیورسٹی کے اندر یا کسی پر سکون مقام پر ایک چھوٹی سی بستی کی صورت میں ایسا ادارہ قائم کیا جائے، جس میں بہترین دل و دماغ کے مسلم نوجوان خالص اسلامی ماحول میں اسلامی ریاضیات، طبعیات، کیمیا، تاریخ، فقہ اور دینیات کی تعلیم حاصل کر کے علوم جدیدہ کا علوم قدیمہ سے تعلق دریافت کر سکیں اور یوں نہ صرف ان میں جدید مذہبی، سیاسی اقتصادی، قانونی، علمی، سائنسی اور فنی مسائل کی اہمیت کو سمجھنے کا احساس بیدار کر دیا جائے بلکہ ان میں مسلمانان عالم کی ہر شعبے میں صحیح رہنمائی کی اہلیت بھی پیدا ہو جائے۔

چوہدری نیاز علی خان نے اس طرح کے ادارے کے قیام کے بارے اقبال کو خط تحریر کیا اور اپنے ادارے کے متعلق مزید گفتگو کرنے کے لیے ملنے کی خواہش ظاہر کی، اقبال نے انہیں اپنے خط مورخہ ۲۰ جولائی ۱۹۳۷ء میں لکھا:

آپ ضرور تشریف لائیں۔ میں ادارے کے متعلق گفتگو کروں گا۔ اسلام کے لیے اس ملک میں نازک زمانہ آ رہا ہے، جن لوگوں کو کچھ احساس ہے ان کا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کے لیے ہر ممکن کوشش اس ملک میں کریں۔ ان شاء اللہ آپ کا ادارہ اس مقصد کو باحسن وجوہ پورا کرے گا۔ علماء میں مداہنت آ گئی ہے۔ یہ گروہ حق کہنے سے بھی ڈرتا ہے۔ صوفیہ اسلام سے بے پروا اور حکام کے تصرف میں ہیں۔ اخبار نویس اور آج کل کے تعلیم یافتہ لیڈر خود غرض ہیں اور ذاتی منفعت و عزت کے سوا کوئی مقصد ان کی زندگی کا نہیں عوام میں جذبہ موجود ہے، مگر ان کا کوئی بے غرض رہنما نہیں ہے۔

اگست ۱۹۳۷ء کے اوائل میں چودھری نیاز علی خان پھر اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مصر سے کسی اہل عالم کو بلوانے کے لیے انہیں مولانا مودودی کا عربی میں تیار کردہ ابتدائی مسودۂ خط بنام شیخ مصطفی المراغی دکھایا۔ اقبال نے اسے پسند فرمایا اور بالآخر ۱۵/ اگست ۱۹۳۷ء کو عربی میں تحریر کردہ یہی خط اقبال کے نام سے شیخ مصطفی المراغی کو ارسال کیا گیا۔

شیخ مصطفی المراغی کے جوابی مکتوب مورخہ ۲۱/ اگست ۱۹۳۷ء سے ظاہر ہوتا ہے کہ جامعہ ازہر میں اقبال کے حسب منشا کوئی ایسا مصری عالم نہ تھا، جسے جامعہ ازہر کی طرف سے ہندوستان روانہ کیا جا سکتا۔ بعد ازاں بقول چوہدری نیاز علی خان، اس سلسلے میں چونکہ ان کی خط و کتابت مولانا مودودی سے جاری تھی، اس لیے اقبال کی نظر بھی آخر مولانا مودودی ہی پر پڑی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا مودودی ۱۹۳۷ء کے آخری حصّے میں حیدرآباد دکن سے پٹھان کوٹ میں اس ادارے کا موقع محل دیکھنے کی خاطر تشریف لائے اور اقبال کی خدمت میں حاضر ہو کر تین صحبتوں میں ان سے مفصل گفتگو کے بعد اس کا نام ''دارالسلام'' تجویز کیا اور نقل مکانی کرنے کا فیصلہ بھی کر لیا، مگر چوہدری نیاز علی خان کا قائم کردہ ادارہ بھی اقبال کی توقعات پر پورا نہ اتر سکا۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ اس ادارے کے متعلق اقبال کے کیا کیا بلند ارادے تھے، ان کا اب اپنی بے بضاعتی کے پیش نظر ذکر کرنا بھی زیب نہیں دیتا۔ دراصل اقبال کے حسب منشا تمدن اسلام کے احیاء کے لیے ادارہ آج تک دنیائے اسلام کے کسی بھی ملک میں وجود میں نہیں لایا جا سکا۔

جولائی ۱۹۳۷ء ہی میں فلسطین سے متعلق حکومت برطانیہ کے مقرر کردہ رائل کمیشن کی رپورٹ شائع ہوئی جس میں تقسیم فلسطین کی تجویز پیش کی گئی تھی۔ اقبال اس تجویز سے بے حد مضطرب تھے اور چاہتے تھے کہ مسلم لیگ فی الفور لاہور میں ایک جلسہ عام منعقد کرے، جس

میں اس تجویز کے خلاف احتجاج کیا جائے۔ اُنھوں نے رائل کمیشن کی تجویز تقسیم فلسطین کے خلاف ایک زبردست بیان انگریزی میں تیار کیا۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کا بیان لیگ کے جلسہ عام میں پڑھ کر سنایا جائے۔ چنانچہ ۲۶/جولائی ۱۹۳۷ء کو مسلم لیگ کا جلسۂ عام زیر صدارت ملک برکت علی موچی دروازے کے باغ میں منعقد ہوا۔ جلسے میں غلام رسول خان نے اقبال کے بیان کا اردو ترجمہ پڑھ کر سنایا اور تقسیم فلسطین کے متعلق حکومت برطانیہ کے رویے کی مذمت کی گئی۔ اقبال نے اپنی زندگی کے آخری سال کی اس اہم تحریر میں واضح کیا:

> مجھے نہایت افسوس ہے کہ میں اس جلسۂ عام میں جو مسلمانان لاہور آج فلسطین رپورٹ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کی غرض سے منعقد کر رہے ہیں، شمولیت سے قاصر ہوں۔ لیکن میں مسلمانوں کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ عربوں کے ساتھ جو ناانصافی برتی گئی ہے۔ مجھے اس کا ایسا ہی شدید احساس ہے جیسا مشرق قریب کی صورت حالات سے واقف کسی بھی شخص کو ہو سکتا ہے، مجھے قوی امید ہے کہ اہل برطانیہ کو اب بھی اس وعدہ کے ایفا پر مائل کیا جا سکتا ہے جو انگلستان کی طرف سے عربوں سے کیا گیا تھا۔ قضیۂ فلسطین ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا شدید اثر تمام دنیائے اسلام پر ہوگا۔...... منصبِ خلافت کی تنسیخ کے بعد عالم اسلام کے لیے یہ پہلا بین الاقوامی مسئلہ ہے جس کی نوعیت بیک وقت مذہبی اور سیاسی ہے اور جس سے نبرد آزما ہونے کے لیے زمانے کی طاقتیں اور تاریخ کے تقاضے آزاد اسلامی ممالک کو پکار رہے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ یہی مسئلہ آگے چل کر ایشیا کے آزاد اسلامی ممالک کو اس اینگلو فرانسیسی ادارے سے، جسے غلطی سے جمعیت اقوام کا نام دے دیا گیا ہے، اس قدر بدگمان اور برگشتہ کر دے کہ وہ اپنے تحفظ کے لیے اقوام مشرق کی ایک علیحدہ جمعیت قائم کرنے کے امکانات پر غور کرنے کے لیے مجبور ہو جائیں۔

مسئلہ فلسطین کے بارے میں اقبال نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے دو مکتوب مورخہ ۲۰/جولائی ۱۹۳۷ء اور ۶/ستمبر ۱۹۳۷ء نیشنل لیگ آف انگلینڈ کی مس فارقوہرسن کو بھی تحریر کیے، ان خطوط سے واضح ہوتا ہے کہ مسلمانانِ لاہور کے علاوہ دہلی میں تقریباً پچاس ہزار مسلمانوں کے اجتماع نے تقسیم فلسطین کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور کانپور میں اسی سلسلے میں کئی مسلمانوں کی گرفتاریاں بھی عمل میں آئیں۔

۲۸/اپریل ۱۹۳۷ء کو اقبال اپنی زندگی میں آخری بار انجمن حمایت اسلام کے صدر منتخب ہوئے تھے، لیکن تقریباً تین ماہ بعد یعنی ۲۱/جولائی ۱۹۳۷ء کو بوجہ خرابی صحت صدارت سے سبکدوش ہو گئے۔

جولائی ۱۹۳۷ء کے آخری ہفتے میں جرمن خاتون مسنز ڈورس احمد، علی گڑھ سے لاہور تشریف لائیں۔ ریلوے اسٹیشن پر ان کا استقبال کرنے کے لیے میاں محمد شفیع، علی بخش اور منیرہ موجود تھے۔ وہ میاں محمد شفیع اور منیرہ کے ساتھ تانگے پر ''جاوید منزل'' تشریف لائیں اور وہاں پہنچتے ہی اقبال سے ملیں جو معمول کے مطابق تہبند اور بنیان پہننے کے بجاے ان کی تعظیم کی خاطر شلوار اور قمیض زیب تن کیے صوفے پر بیٹھے ان کے منتظر تھے۔ اقبال نے انہیں گھر کے انتظام اور منیرہ و راقم کی نگہداشت کی ذمہ داریاں سونپیں اور یوں مسز ڈورس احمد نے ''جاوید منزل'' میں مستقل رہائش اختیار کی۔

۱۹۳۷ء کے آخری چند مہینوں میں اقبال نے مسلم طلبہ کے نام دو پیغام بھیجے۔ پہلا پیغام ۱۹ رستمبر ۱۹۳۷ء کو پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے زیر اہتمام اسلامیہ کالج کے حبیبیہ ہال میں طلبہ کے ایک جلسہ میں پڑھا گیا۔ اس پیغام میں مسلم طلبہ کو محمد علی جناح کی زیر قیادت آل انڈیا مسلم لیگ کے جھنڈے تلے ایک محاذ پر جمع ہونے اور مستقبل کا بوجھ اور ذمہ داریاں اپنے کندھوں پر اٹھانے کی تلقین کی گئی تھی۔ دوسرا پیغام آل انڈیا مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے اجلاس کلکتہ کی صدارت قبول کرنے کی درخواست کے جواب میں انگریزی کے ایک خط کی صورت میں دیا گیا۔ یہ خط مسز ڈورس احمد سے لکھوایا گیا ،اور اس کا اردو ترجمہ انقلاب مورخہ ۹ را کتوبر ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا۔ اس پیغام میں اپنی مسلسل علالت اور کمزوری نظر کے پیش نظر صدارت قبول کرنے سے معذرت کی گئی تھی، لیکن اس امید کا اظہار کیا گیا تھا کہ مسلمانوں کی نوجوان نسل اس نازک سیاسی دور کی اہمیت کو سمجھے گی، جس میں سے مسلمانانِ ہند گزر رہے ہیں۔ آخر میں فرمایا:

> مخالف قوتوں سے ہرگز مت ڈرو۔ جد وجہد جاری رکھو، کیونکہ جدوجہد ہی میں زندگی کا راز مضمر ہے۔

مسلسل علالت کے سبب اقبال تعلیمات قرآنی یا فقۂ اسلامی کی تدوین نو کے بارے میں اپنی کتاب بھی تحریر نہ کر سکے۔ اس سلسلے میں انہوں نے انگریزی میں اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی بعض تحریریں، جنہیں ان کی تصنیف کا خاکہ یا پلان سمجھنا چاہیے، میاں محمد شفیع کو دیں۔ یہ نوٹس، بقول میاں محمد شفیع ۱۹۳۵ء میں تحریر کیے گئے تھے، اور اقبال انہیں کتابی شکل میں ڈکٹیٹ کرانا چاہتے تھے، مگر اب صرف اس تصنیف کے خاکے ہی کے طور پر [illegible]ط ہیں۔

اقبال کی بصارت کی کمزوری کے سبب ان کے احباب یا اعزہ و اقارب ہی انہیں روزانہ اخبار یا خطوط پڑھ کر سنایا کرتے اور اقبال انہی سے خطوط کے جوابات اپنے اشعار یا دیگر نثری مضامین بھی لکھواتے تھے۔ میاں محمد شفیع اور سید نذیر نیازی کے سپرد یہی کام تھا، لیکن ان کی عدم موجودگی میں بعض اوقات مسز ڈورس احمد یا راقم بھی یہ خدمت انجام دینے کے لیے حاضر ہوتے ۔کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا کہ جو کوئی بھی پاس بیٹھا ہوتا اس سے پڑھوا یا لکھوا لیتے ۔ مثلاً ایک عقیدت مند نصر اللہ خان، جو ان دنوں زمیندار سے وابستہ تھے، کبھی کبھار ان کی خدمت میں حاضر ہو کر سول اینڈ ملٹری گزٹ یا ٹریبیون کے لیڈز پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ نصر اللہ خان اپنے کسی دہریے دوست کو ساتھ لے کر اقبال کے پاس پہنچے اور عرض کی کہ یہ خدا کو نہیں مانتے انہیں سمجھائیے۔ اس پر اقبال کی رگ ظرافت پھڑک اٹھی۔ مسکراتے ہوئے فرمایا کہ جس کو اللہ نہ سمجھا سکا اس کو میں کیا سمجھا سکوں گا۔

''جاوید منزل'' میں اقبال کی زندگی سے متعلق چند یادیں راقم کے ذہن میں محفوظ ہیں۔ اس زمانے میں علی بخش کے علاوہ رحمن اور دیوان علی بھی گھر کا کام کاج کرتے تھے۔ عبدالمجید خانساماں کھانا پکاتا تھا اور رحمت بی، منیرہ کی دیکھ بھال کے لیے مامور تھیں۔ رحمن کے سپرد مالی کا کام بھی تھا۔ سودا سلف علی بخش لاتا اور رحمن بھی اس کا ہاتھ بٹاتا۔ اس کے علاوہ علی بخش، رحمن اور دیوان علی باری باری اقبال کے پاؤں، پیٹھ یا شانے دابتے تھے، علی بخش منیرہ کو تانگے پر اسکول چھوڑنے یا لینے جاتا۔ راقم علیحدہ تانگے پر اسکول جایا کرتا۔ ان دنوں موٹر کار بہت کم استعمال میں لائی جاتی تھی۔ دیوان علی اچھا خاصا گا لیتا تھا۔ کبھی کبھار اقبال کو ہارمونیم کے ساتھ خواجہ غلام فرید، سلطان باہو، بلھے شاہ اور دیگر شعراء کا کلام سنایا کرتا۔ آخری ایام میں اقبال کی خدمت میں اکثر و بیشتر موجود رہنے والے عقیدت مند میاں محمد شفیع، سیّد نذیر نیازی، چوہدری محمد حسین، حکیم محمد حسن قرشی، راجہ حسن اختر اور ڈاکٹر عبدالحمید تھے۔ ڈاکٹر جمعیت سنگھ بھی بسا اوقات انہیں دیکھنے کے لیے آجاتے۔ بعض اوقات راجہ حسن اختر اپنے ساتھ سجاد سرور نیازی کو لاتے اور سجاد سرور نیا زی، اقبال کو غالب، حالی یا ان کا اپنا کلام ہارمونیم کے ساتھ گا کر سناتے۔ اسی طرح کبھی کبھار اقبال کی فرمائش پر فقیر نجم الدین ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور انہیں ستار یا شاید طاؤس بجا کر سناتے۔ انہی ایام میں ایک عرب بھی روزانہ اقبال سے ملنے آیا کرتے تھے۔ جو انہیں قرآن

مجید پڑھ کر سناتے۔ راقم نے بھی ان سے چند ماہ قرآن مجید پڑھا ہے، وہ نہایت خوش الحان تھے۔ اقبال جب کبھی ان سے قرآن مجید سنتے، راقم کو بلوا بھیجتے اور اپنے پاس بٹھا لیتے۔ ایک بار انہوں نے سورۂ مزمل پڑھی، تو اقبال اتنا روئے کہ تکیہ آنسوؤں سے تر ہو گیا۔ جب وہ ختم کر چکے تو انہوں نے سر اٹھا کر راقم کی طرف دیکھا اور مرتعش لہجے میں بولے: تمہیں یوں قرآن پڑھنا چاہیے۔ اسی طرح راقم کو ایک مرتبہ مسدس حالی پڑھنے کے لیے کہا، اور خاص طور پر وہ بند...... جب قریب بیٹھے ہوئے میاں محمد شفیع نے دہرایا:

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا

تو اقبال سنتے ہی آبدیدہ ہو گئے۔ راقم نے سردار بیگم کی وفات پر انہیں آنسو بہاتے نہ دیکھا تھا، مگر قرآن مجید سنتے وقت، اپنا کوئی شعر پڑھتے وقت یا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم مبارک کسی کی نوک زبان پر آتے ہی ان کی آنکھیں امنڈ آیا کرتیں۔

سردیوں میں تو اقبال اپنے کمرے میں سوتے، لیکن گرمیوں میں باہر دالان میں سویا کرتے۔ راقم کی چارپائی ان کے قریب ہوا کرتی۔ پنکھا لگانا پسند نہ کرتے تھے۔ رات گئے تک وہ جاگتے رہتے، کیونکہ انہیں عموماً رات کو تکلیف ہوتی تھی۔ اور جب شعر کی آمد ہوتی تو ان کی طبیعت اور بھی زیادہ بے چین ہو جایا کرتی۔ چہرے کا رنگ بدل جاتا، بستر پر کروٹیں بدلتے، کبھی اٹھ کر بیٹھ جاتے اور کبھی گھٹنوں میں سر دے دیتے۔ بسا اوقات وہ رات کے دو یا تین بجے علی بخش کو تالی بجا کر بلاتے اور اسے اپنی بیاض اور قلم دوات لانے کو کہتے۔ جب وہ لے آتا تو بیاض پر اشعار لکھ دیتے۔ اشعار لکھ چکنے کے بعد ان کے چہرے پر آہستہ آہستہ سکون کے آثار نمودار ہو جاتے اور وہ آرام سے لیٹ جایا کرتے۔ بعض اوقات تو علی بخش کو اس غرض کے لیے بھی بلواتے کہ پائنتی پر پڑی چادر ان کے اوپر ڈال دے۔ اقبال کی عادت سر کے نیچے بازو رکھ کے بستر پر ایک طرف سونے کی تھی۔ اس حالت میں ان کا ایک پاؤں عموماً ہلتا رہتا، جس سے دیکھنے والا یہ اندازہ کر سکتا کہ وہ ابھی سوئے نہیں، بلکہ کچھ سوچ رہے ہیں۔ مگر جب وہ گہری نیند سو جاتے تو خراٹے لیا کرتے جس کے سبب نہایت بھیانک قسم کی آوازیں نکلتیں۔ کئی بار ان کے خراٹوں سے راقم ڈر جایا کرتا۔

ان ایام میں راقم نے اقبال کو بیسیوں مرتبہ خود بخود مسکراتے یا روتے دیکھا ہے۔ جب کبھی

تنہائی میں بیٹھے اپنا یا کسی اور کا کوئی شعر گنگناتے تو ان کا بے جان سا ہاتھ عجیب تغافل کے عالم میں اٹھتا اور ہوا میں گھوم کر اپنی جگہ پر آ گرتا۔ ساتھ ہی ان کے سر کو ہلکی سی جنبش ہو جاتی۔ صبح کی نماز بہت کم چھوڑتے تھے۔ گرمیوں میں دالان میں رکھے ہوئے تخت پوش ہی پر نیت باندھ لیتے۔ دھوتی اور بنیان زیب تن ہوتی اور سر پر تولیہ رکھ لیتے۔ سردیوں میں دھوتی اور قمیض پر دھسّا اوڑھ لیا کرتے۔ ان کے کمرے کی حالت پریشان سی رہتی تھی۔ دیواریں گرد وغبار سے اٹی ہوتیں۔ بستر ان کی اپنی دھوتی اور بنیان کی طرح میلا ہو جاتا مگر انہیں بدلوانے کا خیال نہ آتا۔ منہ دھونے اور نہانے سے گھبراتے اور اگر کبھی مجبوراً باہر جانا پڑ جاتا مثلاً دانتوں کے ڈاکٹر کے پاس، تو کپڑے بدلتے وقت سرد آہیں بھرا کرتے۔ وہ فطرتاً سست تھے۔ اس لیے اگر کہیں وقت کی پابندی ہوتی تو انہیں عموماً دیر ہو جایا کرتی۔ ویسے چارپائی پر نیم دراز پڑے رہنے میں بڑے مطمئن تھے۔ بارہا دوپہر کا کھانا کسی کتاب میں منہمک ہونے کے سبب بھول جایا کرتے اور جب وہ کتاب ختم ہو جاتی تو علی بخش کو بلوا کر معصومانہ انداز میں پوچھتے: کیوں بھئی! میں نے کھانا کھا لیا ہے؟ شام کو ''جاوید منزل'' کے دالان ہی میں دو تین چکر پیدل لگا لیا کرتے۔

سردار بیگم کی وفات کے بعد اقبال شاید صرف ایک بار زنانہ میں آئے اور وہ بھی اس وقت جب راقم کو بخار ہو گیا تھا۔ انہیں تب پہلی بار معلوم ہوا کہ زنانہ حصے میں کمروں کی تعداد کتنی ہے۔ وہ یہ دیکھ کر بھی خوش ہوئے کہ ایک کمرے میں سردار بیگم کی بہت بڑی تصویر لگی ہوئی ہے۔ اسی طرح سردار بیگم کی وفات کے بعد اقبال نے خضاب لگانا بھی ترک کر دیا تھا۔ ایک دن راقم نے انہیں ازسرِنو خضاب لگانے کو کہا تو مسکرا کر بولے: میں اب بوڑھا ہو چکا ہوں۔ راقم نے دوبارہ کہا: لیکن ہم سب تو آپ کو جوان دیکھنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ شاید اس خیال سے کہ بچے ان کے سفید بالوں کو دیکھ کر انہیں ضعیف سمجھنے لگے ہیں، انہوں نے پھر سے خضاب لگانا شروع کر دیا۔ مگر چند ماہ بعد پھر چھوڑ دیا اور راقم کو ہمت نہ پڑی کہ انہیں دوبارہ شروع کرنے کے لیے کہے۔

آخری چند سالوں میں غالباً رمضان کے مہینے میں ایک بار ایک چور ''جاوید منزل'' میں گھس آیا، لیکن سحری کے وقت ملازموں نے اسے پکڑ لیا۔ اس زمانے میں شیخ عطا محمد کے منجھلے فرزند شیخ امتیاز احمد اپنے اہل وعیال سمیت یہاں مقیم تھے۔ شیخ امتیاز احمد نے چور کو تین چار تھپڑ رسید کیے اور اس کی شلوار کی جیبوں میں سے چوری کی ہوئی اشیاء جو کہ معمولی سی تھیں اور جن میں

راقم کی کھلونا پستول بھی تھی، برآمد کرلیں، انہوں نے چور کو رسّی سے باندھ رکھا تھا اور تھانے میں اطلاع بھی بھجوا دی تھی۔ چور ایک دبلا پتلا نحیف اور مسکین سا نوجوان تھا، جو اقبال کی خواب گاہ سمیت گھر کے تمام کمروں میں پھرتا رہا تھا۔ جب اقبال کو یہ سب معلوم ہوا تو چور کی حالت پر ترس کھا کر حکم دیا کہ اسے روٹی کھلوا کر چھوڑ دیا جائے۔ چنانچہ اسے سحری کے وقت پکے ہوئے پراٹھے اور سالن کھلوایا گیا۔ اتنے میں پولیس آ گئی اور چور کو پکڑ کر لے گئی۔

مسز ڈورس احمد کے گھر میں آنے سے ''جاوید منزل'' کے سب مکینوں کی گھریلو زندگی میں ایک ترتیب سی آ گئی۔ اِن کے اصرار پر کچھ مدت کے لیے اقبال بھی بچوں کے ساتھ کم از کم دوپہر کا کھانا کھانے والے کمرے میں کھانے لگے۔ راقم اور منیرہ کو احساس ہوا کہ سب ایک خاندان کے رکن ہیں۔ منیرہ چند ہی دنوں میں مسز ڈورس احمد سے مانوس ہوگئی۔ ان کی خواہش کے مطابق ہر کوئی انہیں ''آپا جان'' کہتا تھا۔ منیرہ اور آپا جان ہر شام اقبال کے پاس بیٹھا کرتیں۔ اقبال راقم اور منیرہ کو بچپن ہی سے ببّا اور ببّی کہہ کر بلاتے تھے۔ وہ جرمن زبان سے بھی شناسا تھے۔ اس لیے کبھی کبھی آپا جان سے جرمن میں گفتگو کرتے اور منیرہ سے بھی کہتے کہ جرمن زبان سیکھو، جرمن عورتیں بڑی دلیر ہوتی ہیں۔ منیرہ اُن دنوں جرمن زبان کے چند فقرے سیکھ گئی تھی۔ اس لیے وہ بھی ان سے جرمن میں بات چیت کرنے کی کوشش کرتی اور خوب ہنسی مذاق ہوتا۔ آپا جان، راقم اور منیرہ کے ساتھ شام کو بعض اوقات گھر کے عقب میں ریلوے کالونی میں سیر کے لیے نکل جاتیں۔ انہوں نے لان میں بیڈمنٹن کورٹ بھی بنوا رکھا تھا اور راقم اور منیرہ کی شامیں آپا جان کے ساتھ بیڈمنٹن کھیلتے گزرتیں۔

ہر ماہ گھر کے اخراجات کے لیے رقم منشی طاہرالدین آپا جان کو دے جایا کرتے، کیونکہ آمدنی اور خرچ کا حساب وہی رکھتے تھے۔ راقم کو خوب یاد ہے کہ وفات سے چند ہفتے پیشتر ایک شام اقبال نے منشی طاہرالدین کو بلوایا اور انہیں ٹین کی تین چار صندوقچیاں کھولنے کو کہا، جن میں مختلف قسم کے مسودات، تصویریں، خطوط اور کاغذوں کے پرزے وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ اس وقت ان کے کمرے میں اور کوئی موجود نہ تھا۔ منشی طاہرالدین صندوقچیوں میں سے ہر کاغذ نکال کر اس کی تفصیل انہیں بتاتے جاتے اور پھر اسے اقبال کی منشا کے مطابق یا تو سنبھال کر ایک طرف رکھ لیتے یا سامنے انگیٹھی میں جلتی ہوئی آگ میں پھینک دیتے تھے۔ راقم اتفاق سے

کمرے میں داخل ہوا اور انگیٹھی میں مختلف قسم کے کاغذات وغیرہ کو جلتے ہوئے پایا۔ پس وہی مسودات اور کاغذات بچے جو اقبال ط رکھنا چاہتے تھے۔ باقی سب تصویروں سمیت نذرِ آتش کر دیے گئے۔

راقم کو مصوری سے بھی دلچسپی تھی، لیکن اقبال کو راقم کے اس شوق کا علم نہ تھا۔ ایک مرتبہ راقم نے ایک تصویر بنائی جو اتفاق سے اچھی خاصی بن گئی۔ ان دنوں شیخ عطا محمد سیالکوٹ سے لاہور آئے ہوئے تھے اور جاوید منزل میں مقیم تھے۔ شیخ عطا محمد نے جب راقم کی بنائی ہوئی تصور دیکھی تو بہت خوش ہوئے۔ فوراً تصویر ہاتھ میں لے کر اقبال کو دکھانے کے لیے ان کے کمرے کی طرف چلے۔ راقم بھی ان کے پیچھے پیچھے گیا۔ اقبال کو پہلے تو یقین نہ آیا کہ تصویر راقم نے بنائی ہے، لیکن جب یقین آ گیا کہ تصویر راقم نے بنائی ہے، تو راقم کی حوصلہ افزائی کرنے لگے۔ کچھ مدت کے بعد انہوں نے اپنے احباب کے ذریعے فرانس، اطالیہ اور انگلستان سے راقم کے لیے خاص طور پر آرٹ کی کتابیں منگوائیں۔ انہیں خیال تھا کہ دنیا کے بہترین مصوّروں کے شاہکار دیکھ کر راقم کا مصوری کے لیے شوق بڑھے گا، مگر ایسا نہ ہوا۔ مصوّری کے شاہکار دیکھ کر راقم نے اس خیال سے ہمت ہار دی کہ اگر وہ ساری عمر بھی کوشش کرے تو ایسی خوب صورت تصویریں نہیں بنا سکتا۔

اقبال کی بڑی خواہش تھی کہ راقم تقریر کرنا سیکھے۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ راقم کشتی لڑا کرے۔ چنانچہ اس سلسلے میں راقم کے لیے گھر کے عقب میں ایک اکھاڑا بھی کھدوا دیا گیا تھا۔ وہ اکثر کہا کرتے کہ اکھاڑے کی مٹی میں ڈنڈ پیلنا یا لنگوٹ باندھ کر لیٹ رہنا صحت کے لیے نہایت مفید ہے۔ پھر بڑی عید کے روز راقم کو ہمیشہ تلقین کیا کرتے کہ بکرے کے ذبح ہوتے وقت وہاں موجود ہو لیکن ان کا اپنا یہ حال تھا کہ کسی کا خون بہتے نہ دیکھ سکتے تھے۔ اقبال میں قوت برداشت کی انتہا تھی مگر جب ایک مرتبہ کسی سے ناراض ہو جاتے تو پھر ساری عمر اس کا چہرہ دیکھنے کے روادار نہ ہوتے۔ انہیں کبوتر بازی کا شوق بھی رہ چکا تھا۔ آخری عمر میں ان کی خواہش تھی کہ گھر کی چھت پر ایک وسیع پنجرہ بنوایا جائے جس میں لاتعداد کبوتر چھوڑ دیے جائیں اور ان کی چارپائی ہر وقت کبوتروں کے درمیان رہا کرے۔ انہیں یقین تھا کہ کبوتروں کے پروں کی ہوا صحت کے لیے فائدہ مند ہوتی ہے۔

آخری ایام میں انہیں انگریزی لباس سے نفرت ہوگئی تھی۔ راقم کو ہمیشہ شلوار اور اچکن پہننے کی تلقین کرتے۔ منیرہ بھی اگر اپنے بالوں کو دو حصوں میں گوندھتی تو ناپسند کرتے اور کہتے: اپنے بال اس طرح مت گوندھا کرو۔ یہ یہودیوں کا طریقہ ہے اور اگر راقم کبھی غلطی سے قمیض یا شلوار کے لیے بڑھیا قسم کا کپڑا خرید لاتا تو بہت خفا ہوتے اور کہتے: تم اپنے آپ کو کسی رئیس کا بیٹا سمجھتے ہو، تمہاری طبیعت میں امارت کی بو ہے اور اگر تم نے اپنے یہ انداز نہ چھوڑے تو تمہیں کھدر کے کپڑے پہنوا دوں گا۔ راقم کے لیے بارہ آنے گز سے زائد قمیض کا کپڑا خریدنا یا آٹھ روپے سے زائد کے بوٹ خریدنا جرم تھا جس کی سزا کافی کڑی تھی، لیکن اگر انہیں کبھی یہ معلوم ہو جاتا کہ راقم آج پلنگ پر سونے کے بجائے زمین پر سویا ہے یا اسے کبھی نماز پڑھتے دیکھنے کا اتفاق ہو جاتا، تو بے حد متاثر ہوتے۔

اپنی زندگی میں صرف دو بار انہوں نے راقم کو سنیما دیکھنے کی اجازت دی۔ دونوں انگریزی فلمیں تھیں۔ ایک میں فرانسیسی ادیب ایمائیل ذولا کے حالات زندگی کی تفصیل تھی اور دوسری نپولین کی فتوحات کے متعلق تھی۔ اقبال دنیا بھر کے جری سپہ سالاروں سے عقیدت رکھتے تھے۔ راقم کو اکثر فاروق اعظمؓ، حضرت علیؓ، خالد بن ولیدؓ اور طارقؒ کی باتیں سنایا کرتے۔ ایک دفعہ انہوں نے راقم کو بتایا کہ نپولین کے اجداد سرزمین عرب سے آئے تھے اور واسکوڈے گاما کو عربوں ہی نے ہندوستان کا راستہ دکھایا تھا۔

آخری ایام میں اقبال کی نظر بے حد کمزور ہوگئی تھی۔ اس لیے راقم انہیں کبھی کبھار صبح اخبار پڑھ کر سناتا تھا۔ اگر کسی لفظ کا تلفظ غلط ادا ہو جاتا تو بہت خفا ہوتے۔ اسی طرح رات کو راقم انہی کی کوئی غزل گا کر بھی سنایا کرتا۔ ان دنوں راقم کو ان کی صرف ایک غزل یاد تھی:

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر

اقبال کے سامنے وہ غزل پڑھنا راقم کے لیے ایک عذاب ہوا کرتا۔ اگر کوئی شعر غلط پڑھا جاتا تو بہت ناراض ہوتے اور کہتے: شعر پڑھ رہے ہو یا نثر!

انہیں لوگ گھر ہی پر ملنے آتے تھے۔ ہر شام احباب کی محفل جمتی جو رات گئے تک قائم رہتی۔ ان کی چارپائی کے گرد کرسیاں رکھی ہوتیں اور لوگ ان پر آ کر بیٹھ جاتے۔ وہ چارپائی پر لیٹے یا گاؤ تکیے کا سہارا لیے ان سے باتیں کرتے رہتے اور ساتھ ساتھ حقہ بھی پیتے جاتے۔ گفتگو

نہایت سنجیدہ موضوعات پر ہوتی یا کبھی کبھی علی بخش کی چوہدری محمد حسین کے ساتھ نوک جھوک سے محظوظ ہوتے۔ چوہدری محمد حسین بلا ناغہ شام کو ان کے پاس آیا کرتے، بالعموم اس وقت جب اقبال تنہا ہوتے۔ اقبال، چودھری محمد حسین کو اپنا تازہ کلام سناتے۔ ایک پرانے لیمپ کی ماندسی روشنی میں چودھری محمد حسین فارسی یا عربی لغت کی موٹی موٹی جلدوں کے صفحے الٹتے: اشعار میں مضمون کی یک جہتی، الفاظ کی صحت یا جذبات کی ہم آہنگی پر بحث و تمحیص ہوتی، اتنے میں اور لوگ بھی آ جاتے۔ بعض اوقات اسلام، فلسفہ یا سیاسیات پر گفتگو ہوتی یا ہنسی مذاق کی باتیں ہوتیں۔ چودھری محمد حسین بہت کھل کر ہنستے تھے اور ان کے قہقہوں کی آواز اکثر اقبال کے کمرے میں گونجا کرتی۔

چودھری محمد حسین اچھے کھانے کے نہ صرف شوقین تھے، بلکہ خوب کھاتے تھے۔ اقبال مرّغن کھانے خود تو نہ کھا سکتے تھے، مگر بعض اوقات بریانی قورمہ، مرغ مسلم اور کباب خاص طور پر بنوانے کا حکم دیتے اور اپنے روبرو چوہدری محمد حسین، حکیم محمد حسن قرشی یا دیگر احباب کو کھلواتے اور انہیں کھاتے دیکھ کر خوش ہوتے۔ چوہدری محمد حسین کو اقبال کی طرح آموں سے بڑی رغبت تھی۔ گرمیوں کے موسم میں اقبال کے لیے ہندوستان کے مختلف علاقوں سے آموں کے ٹوکرے آیا کرتے اور اُن سے چوہدری محمد حسین کی تواضع کی جاتی۔ سردیوں کے موسم میں شاہ افغانستان کی بھیجی ہوئی سردوں، انگوروں اور خشک میووں کی پیٹیاں آیا کرتیں اور ان میووں کو کھاتے وقت گفتگو برصغیر کی حدوں سے نکل کر مشرق وسطیٰ تک پہنچ جاتی۔ قندھار، غزنی، کابل، تہران اور تبریز سے ان پھلوں کا ذکر اقبال اور چوہدری محمد حسین کو سلاطین، اساتذہ اور صوفیائے کرام تک لے جاتا۔ غرضیکہ عجب سماں بندھتا۔ بات کہاں سے چلتی اور کہاں پہنچ جاتی۔ پھر علی بخش سے مذاق ہونے لگتا اور چودھری محمد حسین کبھی اس کی خضاب زدہ مونچھوں پر پھبتی کستے، کبھی اسے بیاہ رچانے کو کہتے اور کبھی اسے سرکار سے مربعے دلوانے کی حامی بھرتے۔ ایک عرصے تک علی بخش کی مونچھوں کے رنگ کے تعین کے سلسلے میں بحث جاری رہی۔ اقبال کی رائے میں اس کی مونچھوں کا رنگ ''مونچھئی'' تھا۔ انہی ایام میں چودہدی محمد حسین نے ایک نیلے رنگ کا اوورکوٹ بھی سلوایا تھا جو عرصے تک موضوع مذاق بنا رہا۔

اقبال رات کا کھانا نہ کھاتے تھے۔ صرف کشمیری چائے پینے پر اکتفا کرتے یا کبھی کبھار آپا جان کا تیار کردہ شوربا یا یخنی پی لیتے۔ رات گئے تک علی بخش، رحمن، دیوان علی یا میاں محمد شیخ

ان کے پاؤں اور شانے دباتے اور اگر راقم کبھی دبانے کے لیے بیٹھتا تو منع کر دیتے۔ کہتے: تم ابھی چھوٹے ہو۔ تھک جاؤ گے۔

راقم کو خاص طور پر حکم تھا کہ جب بھی اقبال کے پاس لوگ بیٹھے ہوں اور کوئی علمی بحث و مباحثہ ہو رہا ہو تو راقم وہاں ضرور موجود رہے۔ مگر راقم کو ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہ ہوا کرتی، کیونکہ وہ اس کی سمجھ سے بالاتر ہوتیں۔ سو وہ عموماً موقع پا کر وہاں سے کھسک جایا کرتا، جس سے انہیں بہت رنج ہوتا اور وہ اپنے احباب سے شکایتاً کہتے: یہ لڑکا نہ جانے کیوں میرے پاس بیٹھنے سے گریز کرتا ہے۔ دراصل اب وہ تنہائی بھی محسوس کرنے لگے تھے اور اکثر اوقات افسردگی سے کہا کرتے: سارا دن یہاں مسافروں کی طرح پڑا رہتا ہوں، میرے پاس آ کر کوئی نہیں بیٹھتا۔

اُن ایام میں دو ایک بار اقبال کے پرانے دوست میاں شاہ نواز بھی انہیں ملنے کی خاطر آئے۔ میاں شاہ نواز مفلوج تھے اور موٹر کار کی پچھلی سیٹ ہی پر بیٹھے رہتے۔ ان کی آمد پر یا تو اقبال ان کے ساتھ جا کر بیٹھ جاتے یا اقبال کی چارپائی ان کے قریب رکھ دی جاتی اور یوں دونوں کچھ دیر آپس میں باتیں کر کے پرانی یادیں تازہ کر لیتے۔ اس زمانے میں میاں شاہ نواز نے اقبال سے دیرینہ تعلقات کی بنا پر اور ایک چچا کی حیثیت سے راقم کو اپنی اراضی میں سے دس مربعے عطا کیے جن کی قیمت روپوں کی صورت میں ان کی وفات کے کئی برس بعد بیگم شاہنواز نے راقم کے انکار کے باوجود اسے ادا کر دی۔

آخری ایام میں اقبال کو اکثر دم کشی کی تکلیف ہو جاتی تھی۔ بعض اوقات جب ایسے دورے پڑتے تو ضعف اور نقاہت کے سبب ان پر غشی کا عالم طاری ہو جاتا اور ہوش میں آ جانے کے بعد چند لمحوں تک ایک قسم کی مدہوشی کی کیفیت چھائی رہتی۔ راقم نے انہیں دو بار ایسی ہی حالت میں دیکھا ہے۔ ایک بار راقم نے یوں محسوس کیا جیسے وہ میرزا اسد اللہ خان غالب کے ساتھ کسی مسئلے پر بحث کر رہے ہوں اور دوسری بار انہیں مولانا جلال الدین رومی کے ساتھ اسی انداز میں محو گفتگو پایا۔ راقم نے اقبال کی وفات کے بعد اپنے ان مشاہدات کا ذکر چودھری محمد حسین سے کیا تھا، لیکن انہوں نے ایسے مشاہدات کی تشہیر منع کر دی۔ ان کی رائے میں اس قسم کی ذہنی کیفیات اقبال کی بیماری یا علالت کے سبب ان پر طاری ہوتی تھیں اور ان کا کسی قسم کی روحانیت سے قطعی کوئی تعلق نہ تھا، بلکہ ایسی کیفیات اقبال کی تعلیمات کے برعکس اور منافی تھیں۔

مسز ڈورس احمد نے اقبال سے متعلق ایک کتابچے میں اپنے ذاتی تاثرات قلمبند کیے ہیں،

جن میں سے بعض خاصے دلچسپ ہیں۔ مثلاً وہ فرماتی ہیں کہ ان کے آنے پر منیرہ لڑکیوں کے اسلامیہ اسکول میں پڑھتی تھی۔ انجمن حمایت اسلام کی زیر نگرانی قائم شدہ اس اسکول میں شہر کے غریب مسلمانوں کی بیٹیاں اور یتیم بچیاں تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ یہ اسکول جاوید منزل سے خاصا دور تھا اور پھر اسکول کی حالت اچھی نہ ہونے کے سبب منیرہ کے بالوں میں جوئیں بھی پڑ گئیں۔ آخر کار مسز ڈورس احمد کی تحریک پر اسے اس اسکول سے اٹھوا کر قریب ہی لڑکیوں کے ایک عیسائی مشنری اسکول (کنیئرڈ اسکول) میں داخل کروا دیا گیا۔ مگر جب مسز ڈورس احمد کو پتا چلا کہ اس اسکول میں داخل ہر بچی کے لیے عیسائی مذہبی تعلیم کی جماعتوں میں شامل ہو کر انجیل کے سبق لینا لازمی ہے تو وہ فوراً یہ بات اقبال کے نوٹس میں لائیں۔ اقبال نے جواب دیا کہ انہیں منیرہ کے ایسی کلاسوں میں شامل ہونے پر کوئی اعتراض نہیں کیونکہ یوں اس کے علم میں اضافہ ہوگا اور اقبال نے خود بھی انجیل کا گہرا مطالعہ کر رکھا ہے۔ البتہ فرمایا کہ اس کے لیے گھر پر قرآن مجید اور ابتدائی اسلامی دینیات پڑھوانے کا انتظام کر دیا جائے اور چوہدری محمد حسین کی وساطت سے ایسا انتظام کروا دیا گیا۔

ایک شام منیرہ اور مسز ڈورس احمد حسب معمول اقبال کے کمرے میں بیٹھی تھیں۔ منیرہ نے ان سے کہا: آپا جان مہربانی کر کے کہیے: لاالہٰ الہ اللہ۔ مسز ڈورس احمد نے یہ الفاظ دہرائے۔ اس پر منیرہ نے تالیاں بجاتے ہوئے شور مچا دیا: آپ نے کلمہ پڑھ لیا۔ آپ مسلمان ہو گئیں۔ پھر تھوڑی دیر سوچنے کے بعد بولی: میں نے آپ کا نام فاطمہ رکھ دیا ہے۔ منیرہ کی اس شرارت سے اقبال بے حد محظوظ ہوئے۔

مسز ڈورس احمد تحریر کرتی ہیں کہ منیرہ ابھی سات برس کی تھی کہ اقبال کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد نے اس کے لیے سیالکوٹ سے برقع سلوا کر بھجوایا اور ہدایت کی کہ چونکہ اب وہ جوان ہو رہی ہے اس لیے گھر سے باہر نکلتے وقت برقع پہنا کرے۔ مسز ڈورس احمد سخت پریشان ہوئیں۔ برقع ہاتھ میں پکڑے اقبال کے پاس پہنچیں اور کہا کہ وہ کسی حالت میں بھی اسے منیرہ کو نہ پہنائیں گی۔ اس وقت راقم بھی وہیں موجود تھا۔ اقبال نے کہا مجھے آپ سے اتفاق ہے۔ منیرہ بے شک برقع نہ پہنے۔ دیہات اور قصبوں میں تو عورتیں عموماً چادر اوڑھتی ہیں۔ میری والدہ بھی کبھی گھر سے باہر نکلتی تھیں تو چادر اوڑھ لیا کرتی تھیں۔ مگر جب منیرہ بڑی ہوگی تو شاید زمانہ بالکل بدل جائے۔ سو ہمیں یہ فیصلہ اسی پر چھوڑ دینا چاہیے۔ مسز ڈورس احمد لکھتی ہیں کہ اقبال اپنے بڑے بھائی شیخ عطا محمد کا بے حد احترام کرتے تھے اور کبھی ان کے سامنے نہ بولتے تھے، لیکن

اگر کسی بات پر ان سے اختلاف ہوجاتا تو ان کو ناراض کیے بغیر خاموشی سے کرتے وہی تھے، جو ان کے خیال کے مطابق درست ہوتا۔

اقبال کی چھوٹی بہن زینب بی کی ضعیف الاعتقادی کے متعلق مسز ڈورس احمد بیان کرتی ہیں کہ اقبال کے انتقال سے چند ہفتے پیشتر وہ انہیں دیکھنے کے لیے جاوید منزل آئیں اور چند روز یہیں قیام کیا۔ زینب بی نے اصرار کیا کہ ان کے جاننے والے ایک عامل کو بلوایا جائے، کیونکہ انہیں یقین تھا کہ اس کے عمل سے اقبال کی تکلیفیں دور ہوجائیں گی مسز ڈورس احمد نے اجازت دے دی، عامل آیا اور اس نے چند اشیا طلب کیں۔ چنانچہ زینب بی نے علی بخش کو ہدایت کی کہ تین گز سیاہ رنگ کا کپڑا، مختلف قسم کی دالیں شکر، سرسوں کا تیل، آٹا اور ایک کالا مرغ خرید کر لائے۔ علی بخش باقی اشیا تو آسانی سے خرید لایا۔ البتہ اسے کالا مرغ خرید کرتے وقت ذرا دقت پیش آئی۔ بہرحال جب تمام اشیا جمع ہوگئیں تو زینب بی نے مسز ڈورس احمد سے کہا کہ عامل کی خواہش کے مطابق اب کالے مرغ کو ساری رات اقبال کی خواب گاہ میں رکھنے کا بندوبست کیا جائے۔ اقبال کی حالت کے پیش نظر مسز ڈورس احمد نے ایسی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ آخرکار دونوں میں بے حد بحث کے بعد یہ طے پایا کہ علی بخش صبح چار بجے کالے مرغ کو ہاتھ میں اٹھائے اور اس کی چونچ کو انگلیوں میں دبائے اقبال کی خواب گاہ میں پھرا لائے۔ علی بخش نے ایسا ہی کیا۔ خوش قسمتی سے اقبال اس وقت گہری نیند سو رہے تھے اور انہیں پتا بھی نہ چلا۔ اس کے بعد کالے مرغ سمیت تمام اشیاء عامل کو دے دی گئیں جو کچھ دیر اپنا عمل پڑھنے کے بعد انہیں لے کر رفوچکر ہوگیا۔

مسز ڈورس احمد تحریر کرتی ہیں کہ اقبال نے ان سے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ وہ ان کی وفات کے بعد اتنی مدت منیرہ اور راقم کے پاس ضرور رہیں جب تک کہ وہ بڑے نہیں ہو جاتے، کیونکہ ان کے آنے سے بچوں کو ایک بار پھر صحیح معنوں میں گھر کا سکون نصیب ہوا تھا۔ پس اقبال کے انتقال کے بعد مسز ڈورس احمد تقریباً پچیس برس تک جاوید منزل میں مقیم رہیں اور بعد ازاں واپس برلن (جرمنی) چلی گئیں۔

۳۱؍اکتوبر ۱۹۳۷ء کو سر سکندر حیات اپنے چند رفقا سمیت اقبال سے ملنے آئے، اور اس ملاقات میں مسلم لیگ اور یونینسٹ پارٹی کے باہمی اختلافات پر گفتگو ہوئی۔ سکندر جناح میثاق کے متعلق سر سکندر حیات کا موقف یہ تھا کہ محمد علی جناح اس بات پر رضامند ہوگئے تھے کہ صوبائی

مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ، یونینسٹ پارٹی کی نگرانی میں کام کرے اور اس بنا پر ان کا مطالبہ تھا کہ بورڈ کے ممبران میں یونینسٹ پارٹی کی اکثریت ہونی چاہیے۔اس کے علاوہ وہ صوبائی مسلم لیگ کے تمام عہدے داروں بالخصوص سیکرٹری کو بدلنے کے درپے تھے اور لیگ کی آمدنی اور خرچ کو بھی یونینسٹ پارٹی کے کنٹرول میں لانا چاہتے تھے،مگر اقبال نے ان سے اتفاق نہ کیا۔

اقبال کے یونینسٹ پارٹی کے بانی سر فضل حسین سے تعلقات ان کی ہٹ دھرمی، انگریز کے ساتھ ذلّت آمیز وفاداری ،مسلمانوں کے بجائے احمدیوں کو ترجیح دینے یا انہیں زندگی میں آگے بڑھانے اور پنجاب میں اپنی لیڈری کا بھرم قائم رکھنے کی خاطر مسلم لیگ یا محمد علی جناح کی مخالفت کے باعث خراب ہوئے تھے، اسی طرح سر عبدالقادر کی ابن الوقتی اور سرکار پرستی کے سبب اقبال ان سے دور ہٹ گئے اور اگر ان کے ساتھ کسی قسم کا کوئی تعلق رہا تو محض رسمی تھا۔سر عبدالقادر بھی ساری عمر پبلک پلیٹ فارم پر منافقانہ طور پر اقبال سے دوستی کا دم بھرتے رہے،مگر اپنے خاص حلقۂ احباب میں یا ہندوؤں کے ساتھ گفتگو کرتے وقت اقبال کے متعلق کذب گوئی سے کام لینے یا ان کے خلاف بہتان تراشنے سے باز نہ آتے تھے۔اس کی ایک مثال گوپال متل نے اپنی تصنیف لاہور کا جو ذکر کیا میں پیش کی ہے، جو قابل توجہ ہے۔

نواب سر ذوالفقار علی خان سے بھی ان کی وفات سے پیشتر اقبال کے تعلقات قریب قریب ختم ہو چکے تھے۔ پرانے احباب میں سے مرزا جلال الدین سمیت صرف چند باقی رہ گئے تھے، جو ان کے زاویۂ نگاہ میں تغیر کے سبب شاذ و نادر ملنے آتے تھے۔ دراصل آخری عمر میں اقبال اپنے سیاسی نظریات کے معاملے میں بہت زیادہ حساس ہو گئے تھے۔وہ ملّتِ اسلامیہ کی تمدنی یک جہتی، ہندی مسلمانوں کے اتحاد و مستقبل، مسلم لیگ کے ساتھ ان کی وابستگی کی اشد ضرورت یا محمد علی جناح کی قیادت اور مشن کی کامیابی کے بارے میں کسی قسم کے اختلاف رائے کو قبول یا برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔

سو یکم نومبر ۱۹۳۷ء سے لے کر ۹ رنومبر ۱۹۳۷ء تک اقبال کی سر سکندر حیات اور ان کے رفقاء کے ساتھ کئی ملاقاتیں ہوئیں، مگر باہمی مصالحت کی کوئی صورت نہ بنی۔اقبال، سر سکندر حیات کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہ دیکھتے تھے اور ان کی شاطرانہ سیاست کے سبب ان پر اعتماد بھی نہ کرتے تھے۔ بالآخر اقبال کو یقین ہو گیا کہ سر سکندر حیات اور ان کے احباب صوبائی مسلم لیگ میں شریک ہونا نہیں بلکہ اس پر قابض ہونا چاہتے ہیں۔

اقبال کی رائے میں سکندر جناح میثاق صوبائی لیگ کے لیے ایک نقصان دہ معاہدہ تھا۔ یہی رائے صوبائی لیگ کے دیگر قائدین کی تھی۔ مثلاً ملک برکت علی کے خیال میں اگر محمد علی جناح، سر سکندر حیات سے مفاہمت نہ کرتے تو بھی پنجاب میں مسلم لیگ کو عوامی سیاسی تنظیم بنانے کی خاطر یونینسٹ پارٹی کے خلاف جدوجہد جاری رہتی۔

عاشق حسین بٹالوی لکھتے ہیں کہ اقبال کی ہدایت کے مطابق سکندر جناح میثاق کے قضیے سے آنکھیں بند کر کے کارکنان صوبائی مسلم لیگ نے اپنی مہم جاری رکھی۔ لیگ کا سرمایہ ختم ہو چکا تھا، اس لیے لیگ کا دفتر غلام رسول خان بیرسٹر کے گھر پر قائم کیا گیا۔ سرمایہ کی کمی اور دیگر نامناسب حالات میں جس جاں فشانی کے ساتھ کارکنان لیگ نے پنجاب کے مختلف اضلاع میں اپنا کام جاری رکھا، وہ یہاں کے مسلمانوں کی اجتماعی سیاسی زندگی میں ایک مثال کی حیثیت رکھتا ہے۔

دسمبر ۱۹۳۷ء کے آغاز ہی سے اقبال نے حج پر جانے کے لیے مختلف جہاز ران کمپنیوں سے خط و کتابت شروع کر دی، لیکن ان کی صحت خراب سے خراب تر ہوتی جا رہی تھی اور اب کسی قسم کا سفر کرنا ان کے لیے ممکن نہ رہا تھا۔ بینائی تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر متھراداس نے معائنہ کیا۔ ان کا خیال تھا کہ مارچ ۱۹۳۸ء تک ممکن ہے، آنکھ آپریشن کے لائق ہو جائے، لیکن بعد میں دمے کے شدید دوروں کے پیش نظر آپریشن ملتوی کرنا پڑا۔ ایک دن حج پر جانے کی باتیں کرتے ہوئے کہنے لگے کہ عراق ہو کر بھی لوگ حجاز جاتے ہیں، مگر دریافت کروانے پر معلوم ہوا کہ اس راستے میں اور دشواریاں ہیں۔ قریب ہی ان کی بہن زینب بی بیٹھی تھیں۔ بولیں: عام صحت کی خرابی کے علاوہ آپ کی آنکھوں میں پانی بھی تو اتر رہا ہے، ایسی حالت میں حج کا سفر کس طرح کر سکتے ہیں۔ اللہ خیر سے رکھے۔ اگلے سال آپریشن کے بعد چلے جایئے گا۔ اس پر بڑے دردانگیز لہجے میں فرمایا: آنکھوں کا کیا ہے۔ آخر اندھے بھی تو حج کر ہی آتے ہیں۔ اتنا کہنے کے بعد آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں جاری ہو گئیں، گویا کہہ رہے ہوں:

نسیما جانبِ بطحا گذر کن
ز احوالم محمدؐ را خبر کن

دسمبر ۱۹۳۷ء ہی میں انٹر کالجیٹ مسلم برادر ہڈ کے زیر اہتمام لاہور میں یوم اقبال کی تقریب منانے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ اِس موقع پر سر سکندر حیات نے اپنے ایک اخباری بیان مورخہ ۵؍دسمبر ۱۹۳۷ء میں ہندوستانیوں کو بالعموم اور پنجابیوں کو بالخصوص یوم اقبال کی

تقریب کو ایک مقدس مذہبی فریضہ سمجھ کر اس میں سرگرمی سے حصّہ لینے کی تلقین کرتے ہوئے کہا:

اس سلسلے میں یہ تجویز پیش کرتا ہوں کہ جس جس شہر میں یوم اقبال منایا جائے، وہاں کے باشندوں کو چاہیے کہ وہ شاعراعظم کی خدمت میں ایک تھیلی نذر کریں۔ اس تجویز پر عمل کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اقبال کمیٹی کو چاہیئے کہ امپیریل بنک آف انڈیا میں یوم اقبال فنڈ کے نام سے حساب کھول دے۔ اقبال کے نیازمندوں اور ان کی شاعری کے مدّاحوں کا فرض ہے کہ وہ جملہ رقوم براہ راست بنک کو ارسال کر دیں جو انجام کار ہمارے محبوب شاعر کی خدمت میں پیش کی جائیں گی۔

اقبال نے اپنی زندگی میں یوم اقبال کی تقریب منانے کے بارے میں رضامندی کا اظہار اس لیے کیا تھا کہ نوجوانان ملت میں ان کے افکار و نظریات کی تشہیر ہو تا کہ وہ مستقبل میں عالم اسلام کی رہنمائی کرتے ہوئے اس نئے اسلامی معاشرے کو وجود میں لا سکیں جس کا خواب اقبال نے دیکھا تھا۔ مگر سر سکندر حیات نے اسے ''شاعراعظم'' کی ذاتی ضروریات کے لیے روپیہ اکٹھا کرنے کا ایک ذریعہ قرار دیتے ہوئے دراصل اقبال کی غریبی کا مذاق اڑایا۔ پس اقبال نے فوراً ان کی تجویز کے جواب میں ایک بیان مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۹۳۷ء کو جاری کیا جس میں فرمایا:

سر سکندر حیات خان نے انٹر کالجیٹ مسلم برادرہڈ کے نام اپنے پیغام میں میرے متعلق جن پرخلوص جذبات کا اظہار کیا ہے میں ان کا ممنون ہوں، لیکن میں ان کی پیش کردہ تجویز کہ میرے کلام اور افکار میں دلچسپی رکھنے والے سب مل کر مجھے تھیلی پیش کریں، کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ حالات میں قوم کی اجتماعی ضروریات اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کے مقابلے میں ایک شخص کی انفرادی ضرورت کوئی حیثیت نہیں رکھتی، اگرچہ اس شخص کی شاعری نے کئی انسانوں کی روح کو جلا ہی کیوں نہ بخشی ہو۔ فرد اور اس کی احتیاج بہر حال ختم ہو جانے والی چیز ہے، لیکن قوم اور اس کی احتیاج ہمیشہ باقی رہے گی۔ آج وقت کی سب سے اہم ضرورت یہ ہے کہ اسلامی علوم کی جدید طریقوں کے مطابق تحقیق کے لیے لاہور کے اسلامیہ کالج میں ایک شعبہ قائم کیا جائے۔ اسلامی تاریخ، دینیات، فقہ اور تصوّف کے بارے میں مروّجہ لاعلمی اور جہالت سے، جس قدر فائدہ غرض مند لوگوں نے پنجاب میں اٹھایا ہے، اس کی مثال ہندوستان بھر میں کہیں نہیں ملتی۔ اب وقت آ گیا ہے کہ اسلامی فکر اور طرز حیات کا بغور مطالعہ کر کے عوام کو بتایا جائے کہ اسلام کا اصل مقصد کیا ہے اور مسلم ہند میں اُسے کس طرح تہ بہ تہ پردوں میں چھپا کر اسلام کی روح کو مسخ کر دیا گیا۔ اب فوری طور پر ان پردوں کو ہٹانے کی ضرروت ہے تا کہ نئی

نسل کے نوجوان اسلام کی حقیقی شکل وصورت سے آگاہ ہو کر اپنے ضمیر کا اظہار قدرتی آزادی کے ساتھ کر سکیں۔ ایسا شعبہ صرف مسلمانوں ہی کے لیے نہیں بلکہ غیر مسلموں کے لیے بھی مفید ثابت ہوسکتا ہے، کیونکہ اسلام اگر ایشیا کے باشندوں کی زندگی میں ایک اہم عنصر کی حیثیت سے کارفرما رہا ہے تو اس نے بنی نوع انسان کے ذہنی اور مذہبی ارتقا میں بھی بڑا نمایاں حصہ لیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ میری تجویز کو وزیر اعلیٰ پسند فرمائیں گے اور اپنے اثر ورسوخ سے اسے کامیاب بنانے کی کوشش کریں گے۔ تاہم میں ایک سو روپے کی حقیر رقم اس مجوزہ فنڈ کی نذر کرتا ہوں۔

سر سکندر حیات، اقبال کی خواہش کیونکر پوری کر سکتے تھے، اوّل تو انہیں اسلام یا اُس کے تمدن میں کوئی دلچسپی نہ تھی اور دوم وہ ایک ایسی علاقائی سیاسی تنظیم کے مسلم لیڈر تھے جو غیر فرقہ وارانہ تھی۔ پس اقبال کے جوابی بیان نے انہیں لاجواب کر دیا۔

اقبال کو یقین تھا کہ روحانی عقائد اور اخلاقی اقدار سے عاری سائنس اور ٹیکنالوجی کی بنیادوں پر قائم مادیّت پرست جدید مغربی تہذیب بالآخر اپنے خنجر سے (یعنی اپنی ہی سائنس اور ٹیکنالوجی کے ذریعہ) آپ ہی خودکشی کرے گی۔ ایسی خودکشی کے لیے کتنی عالمی جنگیں درکار تھیں! اس کے متعلق تو انہوں نے کوئی پیش گوئی نہ کی تھی۔ بہرحال ایک عالمی جنگ اقبال کی زندگی میں گزر چکی تھی اور دوسری کے وہ منتظر تھے۔ روز پوچھا کرتے کہ جنگ شروع ہوئی ہے کہ نہیں۔ اقبال جدیدیت سے نہیں مغربیت سے برگشتہ تھے۔ کیونکہ انہیں اس کی بقا کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ اسی پس منظر میں انہوں نے یکم جنوری ۱۹۳۸ء کو نئے سال کا پیغام دیا جو آل انڈیا ریڈیو لاہور سے نشر کیا گیا۔ آپ نے فرمایا:

عہد حاضر علم ودانش اور سیاسی اختراعات میں اپنی بے مثال ترقی پر بجا طور پر متفخر ہے۔ آج زمان ومکاں کی تمام وسعتیں سمٹ رہی ہیں اور انسان قدرت کے راز افشا کر کے اس کی قوتوں کو اپنے مقاصد کی خاطر استعمال کرنے میں حیرت انگیز کامیابیاں حاصل کر رہا ہے، لیکن تمام ترقی کے باوجود اس زمانے میں ملوکیت کے جبر و استبداد نے ڈیماکریسی، (جمہوریت)، نیشنلزم (قوم پرستی)، کمیونزم (اشتراکیت)، فاشیزم (فسطائیت) اور نہ جانے کیا کیا نقاب اوڑھ رکھے ہیں۔ ان نقابوں کی آڑ میں دنیا کے کونے کونے میں قدرِ حریت اور شرفِ انسانیت کی ایسی مٹی پلید ہو رہی ہے کہ تاریخ عالم کا کوئی تاریک سے تاریک ورق بھی اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا۔......

یاد رکھو، اس دنیا میں انسان کی بقا انسانیت کے احترام کو ملحوظ خاطر رکھنے ہی سے ممکن ہے......سو صرف ایک ہی قسم کا اتحاد قابل اعتماد ہے اور اس اتحاد کی بنا ہے اخوتِ انسانی، جو نسل، قومیت،

رنگ اور زبان سے بالاتر ہو۔ جب تک اس نام نہاد ڈیما کریسی، لعنتی نیشنلزم اور ذلت آمیز امپیریلزم کا قلع قمع نہیں کیا جاتا، جب تک انسان اپنے اعمال کے ذریعے یہ مظاہرہ نہیں کرتے کہ ان کے عقیدے کے مطابق ساری دنیا خداوند تعالیٰ کا ایک واحد خاندان ہے، جب تک نسل ، رنگ اور علاقائی قومیتوں کے امتیازات قطعی طور پر مٹا نہیں دیے جاتے، اس دنیا میں انسانوں کو کبھی بھی خوشی، مسرت اور اطمینان کی زندگی نصیب نہ ہوگی اور آزادی، مساوات اور اخوت کے حسین تخیل کو کبھی بھی حقیقت کا جامہ نہ پہنایا جا سکے گا، پس ہمیں نئے سال کی ابتداء اس دعا سے کرنا چاہیے کہ خداوند کریم دنیا کے حاکموں کو انسانیت اور نوع انسان کی محبت عطا فرمائے۔

۹رجنوری ۱۹۳۸ء کو انٹر کالجیٹ مسلم برادرہڈ کے زیر اہتمام مینارڈ ہال، لاہور میں بڑے تزک و احتشام کے ساتھ یوم اقبال منایا گیا۔ برصغیر کے دیگر بڑے شہروں میں بھی ایسی تقریبات منعقد ہوئیں اور مختلف اخباروں یا رسالوں نے اقبال نمبر شائع کیے۔ لاہور کی تقریب میں جہاں راقم بھی موجود تھا، اقبال کے فکروشاعری پر کئی مقالات پڑھے گئے اور ہجوم اس قدر تھا کہ ہال سے باہر برآمدوں میں بھی لوگ کھڑے تھے۔ راقم خواجہ غلام السیّدین کے ہمراہ موٹر کار میں بیٹھ کر ماڈل ٹاؤن میں ان کے بعض عزیزوں یا دوستوں کو ملنے چلا گیا۔ گھر میں کسی کو خبر نہ تھی۔ شام کو واپسی ہوئی تو اقبال کو شدید پریشانی میں مبتلا پایا۔ انہیں گمان تھا کہ راقم کہیں کھو گیا ہے یا اسے کسی نے اغوا کر لیا ہے۔ بہرحال راقم کو خواجہ غلام السیدین کی معیّت میں زندہ و سلامت دیکھ کر ان کی جان میں جان آئی۔ اقبال اپنی حیات میں یوم اقبال کی تقریبات منائے جانے پر خاصے مطمئن تھے۔ چنانچہ ایک خط میں انہوں نے اپنے تاثرات ان الفاظ میں بیان کیے ہیں:

وہ تقریب جسے یوم اقبال کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، اس میں میرے لیے صرف یہ خیال باعث طمانیت قلب ہے کہ جس زمین میں مَیں نے اپنا بیج پھینکا تھا وہ زمین شور نہیں۔

۱۰رجنوری ۱۹۳۸ء کو نظام حیدرآباد دکن کے صدراعظم سر اکبر حیدری نے غالباً سر سکندر حیات کے گذشتہ بیان سے متاثر ہو کر، ایک ہزار روپے کا چیک اقبال کو ارسال کیا اور ساتھ تحریر کیا کہ یہ رقم شاہی توشہ خانے سے، جس کا انتظام ان کے ذمّے ہے، بطور تواضع بھیجی جا رہی ہے۔ اس پر اقبال سخت برہم ہوئے۔ چیک لوٹا دیا گیا اور سر اکبر حیدری کے نام اشعار بھی لکھے جو ارمغان حجاز میں شامل ہیں۔

جنوری ۱۹۳۸ء کی ایک شام لارڈ لوتھیان اقبال سے ملنے آئے۔ وہ اقبال کے مداحوں میں سے تھے اور برصغیر میں مسلم ریاست کے قیام کے متعلق اقبال کی تجویز کو ہندوستان کے فرقہ وارانہ مسئلے کا مناسب حل خیال کرتے تھے۔ انہی کی کوششوں سے ۱۹۳۴ء میں اقبال کے انگریزی خطبات کا دوسرا ایڈیشن آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے شائع کیا تھا اور انہی کی وساطت سے اقبال کو آکسفورڈ یونیورسٹی میں روڈز لیکچروں کی دعوت دی گئی تھی۔ اقبال نے اپنے لیکچروں کے لیے مسلم فکر میں زمان و مکاں کا تصوّر موضوع چنا تھا، مگر اپنی مسلسل علالت کے سبب وہ اس ارادے کی تکمیل نہ کر سکے۔ ۱۹۳۸ء میں لارڈ لوتھیان ہندوستان کا دورہ کر رہے تھے اور اسی دوران میں انہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کانووکیشن سے بھی خطاب کیا۔

۸ جنوری ۱۹۳۸ء کو مولانا حسین احمد مدنی نے دہلی کے ایک جلسے میں اپنی تقریر میں فرمایا کہ موجودہ زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں اور یہ کہ انگلستان میں بسنے والے سب ایک قوم سمجھے جاتے ہیں، حالانکہ ان میں یہودی بھی ہیں، عیسائی بھی، پروٹسٹینٹ بھی اور کیتھولک بھی۔ نیز امریکہ، جاپان اور فرانس وغیرہ میں بھی یہی حال ہے۔ اس تقریر کی تفصیل دہلی اور لاہور کے اخباروں میں شائع ہوئی اور اقبال کی نظروں سے بھی گزری۔ اقبال ایک عرصے سے مغرب کے اس غیر اسلامی نظریۂ وطنیت کے خلاف جہاد کرتے رہے تھے، اس لیے انہیں مولانا حسین احمد مدنی جیسے عالم دین کی زبان سے یہ الفاظ سن کر بے حد صدمہ پہنچا۔ چنانچہ اسی پس منظر میں ۲۸ جنوری ۱۹۳۸ء کو سید نذیر نیازی سے کہا کہ درج ذیل تین شعر درج بیاض کر دیں:

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ
ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
سرود بر سرِ منبر کہ ملّت از وطن است
چہ بے خبرز مقام محمد عربی است
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

جنوری ۱۹۳۸ء کے آخری حصّے میں ایک دن پنڈت جواہر لعل نہرو بھی اقبال سے ملنے جاوید منزل میں تشریف لائے۔ وہ ڈاکٹر محمد عالم بیرسٹر کے مقدمہ ازالہ حیثیت عرفی برخلاف

سول اینڈ ملٹری گزٹ وغیرہ میں شہادت دینے کی خاطر بطور گواہ لاہور آئے تھے اور میاں افتخار الدین کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اس وقت تک ہندو اور مسلم قائدین کے درمیان خلیج اس قدر وسیع ہو چکی تھی کہ اس ملاقات کے مختلف پہلوؤں کو بھی متنازعہ فیہ بنا دیا گیا۔ مثلاً پہلا اہم سوال یہ اٹھایا گیا کہ اقبال نے انہیں پیغام بھیج کر بلوایا تھا یا وہ خود اقبال سے ملاقات کے لیے آئے۔ پنڈت جواہر لعل نہرو نے اپنی انگریزی تصیف ہندوستان کی دریافت میں اس واقعے کا ذکر یوں کیا ہے:

> رحلت سے چند ماہ قبل جب کہ وہ صاحب فراش تھے انہوں نے مجھے یاد فرمایا اور میں نہایت خوشی سے ارشاد کی تعمیل میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں نے محسوس کیا کہ اختلافات کے باوجود ہمارے درمیان کس قدر باہمی اشتراک موجود تھا اور مجھے یہ بھی محسوس ہوا کہ ان جیسی شخصیت کے ساتھ کام کرنا کتنا آسان ہے۔ وہ اس وقت پرانی یادیں تازہ کر رہے تھے، اور گفتگو مختلف موضوعات پر ہوتی رہی۔ جس میں میں نے خود بہت کم حصّہ لیا اور زیادہ تر انہی کی باتیں سنتا رہا۔ میں ان کی شاعری کا مداح ہوں اور مجھے یہ معلوم کر کے بے حد مسرت ہوئی کہ وہ بھی مجھے پسند فرماتے ہیں اور میرے متعلق اچھی رائے رکھتے ہیں۔

پنڈت جواہر لعل نہرو کے استقبال کے لیے اقبال نے راقم اور میاں محمد شفیع کو برآمدے میں منتظر کھڑے رہنے کا حکم دیا۔ پنڈت جواہر لعل نہرو تقریباً آٹھ بجے شام تشریف لائے۔ ان کے ساتھ ایک اور صاحب بھی تھے اور شاید دو ایک خواتین اور ان کے میزبان میاں اور بیگم افتخار الدین، پنڈت جواہر لعل نہرو راقم سے بڑی محبت اور شفقت سے پیش آئے اور کمر میں ہاتھ ڈالے اسے اپنے ساتھ اندر لے گئے۔ اقبال اپنی خواب گاہ میں بستر پر نیم دراز تھے۔ کمرے میں مہمانوں کے بیٹھنے کے لیے کرسیاں رکھ دی گئی تھیں لیکن پنڈت جواہر لعل نہرو اور اُن کے ساتھی کرسیوں پر نہ بیٹھے بلکہ تعظیماً فرش پر بچھے ہوئے غالیچے پر بیٹھے۔

اس ملاقات کے متعلق دوسرا اہم سوال یہ اٹھایا گیا کہ دونوں کی آپس میں کیا گفتگو ہوئی۔ اس ضمن میں راجہ حسن اختر اور میاں فیروز الدین کے حوالے سے عاشق حسین بٹالوی تحریر کرتے ہیں کہ اس زمانے میں پنڈت جواہر لعل نہرو سمجھتے تھے، ہندوستان کے تمام مصائب کا حل سوشلزم ہے، لیکن کانگرس کے دیگر لیڈروں میں کوئی بھی ان کا ہم خیال نہ تھا۔ اقبال نے ان سے پوچھا کہ سوشلزم کے بارے میں کانگرس کے کتنے لیڈر ان کے ہم خیال تھے۔ پنڈت جواہر لعل نہرو

نے جواب دیا کہ تقریباً چھ۔ اس پر اقبال نے کہا کہ اگر ان کے ہم خیالوں کی تعداد اس قدر قلیل ہے تو وہ دس کروڑ مسلمانوں کو کانگرس میں شامل ہوجانے کا مشورہ کیونکر دے سکتے ہیں۔ بعدازاں ہندو مسلم کشیدگی کا ذکر چھڑا تو اقبال نے ان پر واضح کیا کہ مغربی ایشیا دراصل مسلم ایشیا ہے اور آئندہ سیاسیات عالم میں اس خطّے کی اہمیت بہت بڑھ جائے گی، لہٰذا اگر برصغیر میں ہندوؤں نے مسلمانوں سے اچھا سلوک نہ کیا یا انہیں ناراض کرلیا تو مغربی ایشیا کے مسلم ممالک کے ساتھ ان کے تعلقات خراب ہوجائیں گے۔ پس ہندوؤں کا فائدہ اسی میں ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ تعلقات خوشگوار رکھیں۔ عاشق حسین بٹالوی مزید لکھتے ہیں:

ابھی ان دو عظیم المرتبت انسانوں کے ساتھ گفتگو جاری تھی کہ یکایک میاں افتخار الدین بیچ میں بول اٹھے کہ: ڈاکٹر صاحب آپ مسلمانوں کے لیڈر کیوں نہیں بن جاتے۔ مسلمان مسٹر جناح سے زیادہ آپ کی عزت کرتے ہیں۔ اگر آپ مسلمانوں کی طرف سے کانگرس کے ساتھ بات چیت کریں تو نتیجہ بہتر نکلے گا۔ ڈاکٹر صاحب لیٹے ہوئے تھے۔ یہ سنتے ہی غصّے میں آ گئے اور اٹھ کر بیٹھ گئے اور انگریزی میں کہنے لگے: اچھا تو یہ چال ہے کہ آپ مجھے بہلا پھسلا کر مسٹر جناح کے مقابلے میں کھڑا کرنا چاہتے ہیں۔ میں آپ کو بتادینا چاہتا ہوں کہ مسٹر جناح ہی مسلمانوں کے اصل لیڈر ہیں اور میں ان کا ایک معمولی سپاہی ہوں۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب بالکل خاموش ہوگئے اور کمرے میں تکدّر آمیز سکوت طاری ہوگیا۔ پنڈت نہرو نے فوراً محسوس کرلیا کہ میاں افتخار الدین کے دخل درمعقولات نے ڈاکٹر صاحب کو ناراض کردیا اور اب مزید گفتگو جاری رکھنا بے سود ہے۔ چنانچہ وہ اجازت لے کر رخصت ہوگئے۔

پنڈت جواہر لعل نہرو کی اقبال سے ملاقات کا مقصد ہندو مسلم مفاہمت کے سلسلے میں کوئی بات چیت کرنا قطعی نہ تھا۔ اقبال نے سیاسی اختلافات کے باوجود پنڈت جواہر لعل نہرو کو ہمیشہ پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔ ویسے بھی اقبال مدت سے علیل تھے اور پنڈت جواہر لعل نہرو لاہور میں موجود ہونے کے سبب ان کی مزاج پرسی کے لیے آسکتے تھے۔ اس لیے یہ بحث بیکار ہے کہ ملاقات میں پہل کس کی طرف سے ہوئی۔ راقم کے خیال میں تو ان کو آپس میں ملانے کی تحریک شاید ڈاکٹر چکرورتی نے کی تھی۔ عین ممکن ہے کہ جس طرح انہوں نے اقبال کو پنڈت جواہر لعل نہرو سے ملاقات کرنے پر رضامند کیا، اسی طرح انہوں نے پنڈت جواہر لعل نہرو سے بھی ذکر کیا ہو کہ اقبال ان سے ملاقات کے خواہش مند ہیں۔ بہرحال ملاقات کے دوران میں جو باتیں

ہوئیں وہ بھی مختلف موضوعات پر سرسری نوعیت کی تھیں اور انہیں کوئی سیاسی اہمیت حاصل نہ تھی۔ البتہ عاشق حسین بٹالوی اور سید نذیر نیازی جیسے مورّخین نے راجہ حسن اختر یا اقبال کے حوالے سے اس ملاقات میں اقبال اور محمد علی جناح کے متعلق جو باتیں میاں افتخار الدین سے منسوب کی ہیں، ان کی بیگم افتخار الدین سختی سے تردید کر چکی ہیں۔ بیگم افتخار الدین اس موقع پر خود موجود تھیں۔ وہ فرماتی ہیں کہ اقبال کی علالت کے پیش نظر پنڈت جواہر لعل نہرو اور ان کے سب ساتھی خاموشی سے ان کی باتیں سنتے رہے اور میاں افتخار الدین نے گفتگو میں کوئی حصّہ لیا نہ وہ باتیں کیں جو ان سے منسوب کی گئی ہیں۔

اقبال چاہتے تھے کہ سر سکندر حیات اور یونینسٹ پارٹی کے مسلم ممبر مسلم لیگ کے حلف نامے پر دستخط کریں مگر انہوں نے ایسا نہ کیا۔ اقبال جب ان سے قطعی مایوس ہو گئے تو انہوں نے سوچا کہ پنجاب کے مسلم عوام کو حقیقی پوزیشن سے آگاہ کیا جائے۔ اس سلسلے میں انہوں نے فروری ۱۹۳۸ء میں اخبارات میں اشاعت کے لیے ایک بیان تحریر کروایا اور اس کی ایک نقل محمد علی جناح کو ارسال کی لیکن محمد علی جناح نے مشورہ دیا کہ سر سکندر حیات اور اُس کی پارٹی سے اس مرحلے پر ٹکر لینا درست نہیں، اس لیے یہ بیان شائع نہ کیا جائے۔ اقبال نے محمد علی جناح کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے وہ بیان جاری نہ کیا۔ یہ اقبال کے پارٹی ڈسپلن کے احترام کی ایک نہایت عمدہ مثال ہے۔ یعنی باوجود اس کے کہ وہ سمجھتے تھے کہ یونینسٹ پارٹی کے مسلم لیڈروں کے منافقت آمیز روّیے کی قلعی کھول دینا چاہیے، انہوں نے صدر آل انڈیا مسلم لیگ کے حکم کی تعمیل میں ایسا نہ کیا۔ اقبال کا یہ معرکۃ الآرا بیان جس کی اشاعت محمد علی جناح کے کہنے پر روک دی گئی، اقبال کی آخری سیاسی تحریر ہے۔

پنجاب پروونشل مسلم لیگ نے اپنے الحاق کی درخواست بھیج رکھی تھی لیکن ۵/اپریل ۱۹۳۸ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے دفتر سے اطلاع موصول ہوئی کہ بعض تکنیکل وجوہ کے پیش نظر اس کا الحاق آل انڈیا مسلم لیگ سے نہیں ہوسکتا۔ اس پر اقبال سے مشورے کے بعد غلام رسول خان نے ۱۲/اپریل ۱۹۳۸ء کو پنجاب مسلم لیگ کونسل کا اجلاس بلوا کر آل انڈیا مسلم لیگ کے اعتراضات رفع کیے اور الحاق کی نئی درخواست دہلی روانہ کر دی گئی۔ بالآخر آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس بتاریخ ۱۸/اور ۱۹/اپریل ۱۹۳۸ء میں شرکت کے لیے پنجاب کا مسلم لیگی گروپ کلکتہ پہنچا اور اپنے الحاق کی نئی درخواست کی منظوری کے لیے تگ ودو کرنے لگا۔ معلوم ہوتا ہے اس

وقت آل انڈیا مسلم لیگ کی پالیسی یہی تھی کہ سر سکندر حیات اور ان کے آدمیوں کو لیگ کونسل میں داخل کیا جائے اور وہی پنجاب میں مسلم لیگ کی جیسی شاخیں چاہیں قائم کریں۔ الحاق کی نئی درخواست کی منظوری یا نامنظوری کے متعلق تو کوئی ہدایت جاری نہ کی گئی، البتہ محمد علی جناح کے حکم کے مطابق پنجاب میں ایک نئی صوبائی مسلم لیگ قائم کی گئی جسے مرتب کرنے کے لیے انہوں نے سر سکندر حیات کی زیر قیادت ان کے سمیت پینتیس افراد پر مشتمل ایک انتظامیہ کمیٹی مقرر کی۔ اس کمیٹی میں شامل پچیس افراد کا تعلق تو یونینسٹ پارٹی کے ساتھ تھا اور اقبال سمیت دس افراد مسلم لیگی گروپ سے لیے گئے۔ مسلم لیگی گروپ اس فیصلے سے مطمئن نہ تھا۔ یہ لوگ ۲۱/اپریل ۱۹۳۸ء کو صبح نو بجے کلکتہ سے لاہور پہنچے اور ریلوے اسٹیشن پر ہی انہوں نے خبر سن لی کہ اقبال فوت ہو گئے۔

یہ حقیقت ہے کہ یونینسٹ پارٹی کے خلاف جو قدم اقبال ۱۹۳۸ء میں اٹھانا چاہتے تھے، وہ محمد علی جناح کو بالآخر چھ سال بعد یعنی ۱۹۴۴ء میں اٹھانا پڑا۔ محمد علی جناح کا نصب العین یہی رہا ہے کہ پنجاب میں جب مسلم لیگ عوامی جماعت بن جائے گی تو اس وقت یونینسٹ پارٹی سے ٹکر لے کر اسے پچھاڑنا آسان ہوگا اور اقبال کی وفات کے چھ سال بعد یعنی ۱۹۴۴ء میں یہی ہوا۔ یونینسٹ پارٹی کی مسلم لیگ کے ساتھ جنگ میں یونینسٹ پارٹی کا نام ونشان ہمیشہ کے لیے مٹ گیا، لیکن ان سالوں کی سیاسی کشمکش سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ پنجاب کی سیاست کے متعلق اقبال اور محمد علی جناح کے آپس میں اختلافات تھے، یا ان کے راستے جدا جدا ہو چکے تھے، درست نہیں۔ اقبال کو محمد علی جناح کی سیاسی بصیرت اور اخلاقی دیانت داری پر پورا اعتماد تھا اور اسی اعتماد کی بنا پر وہ اپنے آپ کو ان کا معمولی سپاہی تصور کرتے تھے۔ نیز ان کے حکم کی تکمیل میں انہوں نے سر سکندر حیات کے خلاف اپنا فروری ۱۹۳۸ء کا بیان جاری نہ کیا تھا اور محمد علی جناح بھی ہر مرحلے پر اقبال کی رائے سے اتفاق کرتے تھے۔ البتہ ان دونوں کے سیاسی انداز فکر میں وقت کے تعین کا فرق ضرور رہا۔ میاں محمد شفیع جو بقول ان کے اقبال کے دور صدرات میں پنجاب مسلم لیگ کے پبلسٹی سیکرٹری تھے، فرماتے ہیں:

مجھے اب تک یاد ہے کہ قائد اعظم نے حضرت علاّمہ کو ایک خط کے جواب میں لکھا تھا: آپ کا سیاسیات ہند کا تجزیہ بالکل درست ہے۔ میں آپ سے لفظاً لفظاً متفق ہوں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وقت آنے پر آپ کے فرمودات کے مطابق مسلمانانِ ہند کے لیے ان کے سیاسی

چارٹر کا مطالبہ آل انڈیا مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے پیش کیا جائے گا۔ وقت کا تعین آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ میں آپ کو قطعاً مایوس نہ کروں گا۔

میاں محمد شفیع کے بیان کی تصدیق محمد علی جناح کے پرائیویٹ سیکرٹری جناب مطلوب الحسن سید کی تحریر سے ہوتی ہے۔ وہ اپنی انگریزی تصنیف محمد علی جناح (ایک سیاسی مطالعہ) میں ۱۹۴۰ء میں قرارداد لاہور یا قرارداد پاکستان کے منظور کیے جانے کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ محمد علی جناح نے ان سے فرمایا:

اقبال اب ہمارے درمیان نہیں ہیں، لیکن اگر وہ زندہ ہوتے تو یہ معلوم کر کے خوش ہوتے کہ ہم نے بعینہٖ وہی کیا جو وہ ہم سے کروانا چاہتے تھے۔

فروری ۱۹۳۸ء میں مولانا حسین احمد مدنی کے متعلق لکھے ہوئے اقبال کے قطعے پر ہنگامہ جاری رہا۔ اخباروں میں مضامین پر مضامین چھپ رہے تھے۔ مولانا حسین احمد مدنی کے طرف داروں نے اقبال پر دیگر الزامات کے ساتھ یہ الزام بھی لگایا تھا کہ انہوں نے اپنی سیاسی اغراض کے حصول یا آل انڈیا مسلم لیگ کے پراپیگنڈے کی خاطر مولانا حسین احمد مدنی کی شان میں گستاخی کی ہے۔ اسی اثنا میں ایک صاحب طالوت نے خط وکتابت کے ذریعے اقبال اور مولانا حسین احمد مدنی کے درمیان اختلافات یا غلط فہمی دور کرانے کی کوشش کی۔ اقبال نے انہیں اپنے ایک خط مورخہ ۱۸ر فروری ۱۹۳۸ء میں تحریر کیا:

جو اقتباسات آپ نے ان (مولانا حسین احمد مدنی) کے خط سے درج کیے ہیں، اُن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب نے فرمایا کہ آج کل قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔...... میرے نزدیک ایسا مشورہ مولوی صاحب کے شایان شان نہیں اور وہ مسلمانان ہند کی گمراہی کا باعث ہوگا۔ اگر مولوی صاحب نے میری تحریروں کو پڑھنے کی کبھی تکلیف گوارا فرمائی ہے تو انہیں معلوم ہو گیا ہوگا کہ میں نے اپنی عمر کا نصف حصہ اسلامی قومیت اور ملّت کے اسلامی نقطۂ نظر کی تشریح وتوضیح میں گزارا ہے۔ محض اس وجہ سے کہ مجھ کو ایشیا کے لیے اور خصوصاً اسلام کے لیے فرنگی سیاست کا یہ نظریہ ایک خطرہ عظیم محسوس ہوتا تھا، کسی سیاسی جماعت کا پروپیگنڈا کرنا نہ میرا اس سے پہلے مقصد تھا نہ آج مقصود ہے۔ بلکہ وہ شخص جو دین کو سیاسی پروپیگنڈے کا پردہ بناتا ہے، میرے نزدیک لعنتی ہے۔

لیکن پیشتر اس کے کہ اختلاف یا غلط فہی دور ہو سکے، مولانا حسین احمد مدنی نے اس بحث کے سلسلے میں اپنا ایک خط بیان کی صورت میں اخبار انصاری میں شائع کرا دیا۔ اس بیان میں

مولانا حسین احمد مدنی نے اپنی گذشتہ تقریر کی وضاحت کرتے ہوئے یہ موقف اختیار کیا کہ انہوں نے کہا تھا موجودہ زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔نسل یا مذہب سے نہیں بنتیں۔ انہوں نے یہ ہرگز نہیں کہا تھا کہ مذہب وملت کا دارومدار وطنیت پر ہے۔ بالفاظ دیگر مولانا حسین مدنی نے قوم اور ملت کی لفظی بحث چھیڑ دی اور بیان کیا کہ ''قوم'' تو وطن ہی سے بنتی ہے، البتہ ''ملت'' وطن سے نہیں بنتی۔ لہٰذا ان کا فرمان کہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں، قابل اعتراض نہ تھا۔

اقبال نے مولانا حسین احمد مدنی کے بیان کے جواب میں ایک مدلل مضمون تحریر کیا جو اخبار احسان مورخہ ۹/مارچ ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔ اقبال نے تحریر کیا:

مولانا حسین احمد مدنی عالم دین ہیں اور جو نظریہ انہوں نے قوم کے سامنے پیش کیا ہے، امت محمدؐیہ کے لیے اس کے خطرناک عواقب سے وہ بے خبر نہیں ہو سکتے۔ انہوں نے لفظ قوم استعمال کیا یا لفظ ملت، ہر اس لفظ سے اس جماعت کی تعبیر کرنا جو ان کے تصور میں امت محمدؐیہ ہے اور اس کی اساس وطن قرار دینا ایک نہایت دل شکن اور افسوسناک امر ہے۔...... آپ نے سوچا نہیں کہ آپ اس توضیح سے دو غلط اور خطرناک نظریے مسلمانوں کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ ایک یہ کہ مسلمان بحیثیت قوم اور ہو سکتے ہیں اور بحیثیت ملّت اور دوسرا یہ کہ از روئے قوم چونکہ وہ ہندوستانی ہیں، اس لیے مذہب کو علیحدہ چھوڑ کر انہیں باقی اقوام کی قومیت یا ہندوستانیت میں جذب ہونا چاہیے...... یعنی یہ کہ مذہب اور سیاست جدا جدا چیزیں ہیں۔...... کیوں نہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کو محض ایک ہمہ گیر معمولی ملّت سمجھ کر بلحاظ قوم یا قومیت ابوجہل اور ابو لہب کو اپنا بنائے رکھا اور ان کی دلجوئی کرتے رہے؟ بلکہ کیوں نہ عرب کے سیاسی امور میں ان کے ساتھ رشتۂ قومیت وطنی قائم رکھا!...... اگر حضوؐر، نعوذ باللہ، یہ راہ اختیار کرتے تو اس میں شک نہیں کہ یہ ایک وطن دوست کی راہ ہوتی، لیکن نبی آخر الزمان کی راہ نہ ہوتی...... مسلمان ہونے کی حیثیت سے انگریز کی غلامی کے بند توڑنا اور اس کے اقتدار کا خاتمہ کرنا ہمارا فرض ہے اور اس آزادی سے ہمارا مقصد یہی نہیں کہ ہم آزاد ہو جائیں، بلکہ ہمارا اوّل مقصد یہ ہے کہ اسلام قائم رہے اور مسلمان طاقتور بن جائے۔ اس لیے مسلمان کسی ایسی حکومت کے قیام میں مددگار نہیں ہو سکتا جس کی بنیادیں اُنہی اصولوں پر ہوں جن پر انگریزی حکومت قائم ہے۔ ایک باطل کو مٹا کر دوسرے باطل کو قائم کرنا چہ معنی دارد؟ ہم تو چاہتے ہیں کہ ہندوستان کلیتاً نہیں تو ایک بڑی حد تک دارالاسلام بن جائے لیکن اگر آزادی ہند کا نتیجہ یہ ہو کہ جیسا دارالکفر ہے ویسا ہی رہے، یا اس سے بھی بدتر بن جائے تو مسلمان ایسی آزادی وطن پر ہزار مرتبہ لعنت بھیجتا ہے۔

اس پُرمغز مقالے کے ذریعے اقبال نے اپنے سیاسی فکر کے مرکز یعنی ''مسلم قومیت'' کے اصول کی وضاحت کی اور ساتھ یہ بھی واضح کر دیا کہ مسلمانان عالم کی عملی سیاست کا محور یہی اصول ہونا چاہیے۔ اقبال کی وفات کے چند ماہ بعد مولانا حسین احمد مدنی نے ''متحدہ قومیّت اور اسلام'' کے نام سے ایک کتابچہ شائع کیا، جس میں اقبال کو ''ساحرین برطانیہ کے سحر میں مبتلا'' قرار دیا اور انہیں ''کودک نادان'' کے لقب سے نوازا۔ نیز اس کتابچے میں انہوں نے اپنے سابقہ موقف سے انحراف کرتے ہوئے لکھا کہ مسلمانان ہند کو قومیت متحدہ میں شریک ہونے کا مشورہ دینے کو وہ خلاف دیانت یا ناجائز نہیں سمجھتے یہاں تک کہ انہوں نے اس مشورے کو اسلامی تعلیمات کی رو سے جائز ثابت کرنے کے لیے اپنی علمیت کا پورا زور صرف کیا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ اقبال کی وفات کے بعد نومبر ۱۹۳۸ء میں ارمغان حجاز کی ترتیب دیتے وقت چوہدری محمد حسین نے مولانا حسین احمد مدنی سے متعلق اشعار اس میں شامل کرنا ضروری خیال کیا اور وہ اشعار آج تک شائع ہوتے چلے آ رہے ہیں۔ اس ضمن میں محمد احمد خان تحریر فرماتے ہیں:

> اگر حضرت علاّمہ نے ان کے اخراج کی ہدایت نہ فرمائی اور ان کے انتقال کے بعد یہ اشعار شائع ہوتے رہے تو یہ کوئی غلط کاری نہ تھی۔ کیونکہ، مولانا مدنی آخر دم تک متحدہ قومیت کا دم بھرتے رہے اور اپنے اسی موقف کو صحیح ثابت کرنے کے لیے انہوں نے ''متحدہ قومیت اور اسلام'' نامی کتابچہ تحریر فرمایا تھا۔ اگر علاّمہ اقبال مرحوم زندہ ہوتے اور ان کے افکار و نظریات کا مطالعہ فرماتے جو مولانا نے اپنی خودنوشت سوانح حیات اور اس کتابچے میں ظاہر کیے ہیں تو یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ ان اشعار کو واپس لینا تو کجا ان سے زیادہ سخت الفاظ میں اپنے جذبات و احساسات کا اظہار فرماتے۔

جب مولانا حسین احمد مدنی نے اقبال کی رحلت کے بعد انہیں اپنے کتابچے میں طنز، تعریض اور تضحیک کا نشانہ بنانے سے گریز نہ کیا تو ان کے معتقدین کیونکر چُپ بیٹھے رہ سکتے تھے۔ انہوں نے مرنے کے بعد بھی اقبال کو نہ بخشا۔

بہر حال بعض ایسے مخصوص حلقوں میں اقبال پر دشنام طرازی کا سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ اقبال کے کاغذات میں پائے گئے دو ایک گمنام خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے نظریاتی مخالف آخری دم تک ان پر کیچڑ اچھالتے اور انہیں مختلف قسم کے القاب سے نوازتے رہے۔ اگر آج بھی اقبال کے کسی ایسے نظریاتی دشمن کو کرید کر دیکھا جائے تو اس کی کھال کے نیچے سے وہی

کانگرسی ذہنیت رکھنے والا ضدی عالم دین، متفرق لبادے اوڑھ کر سامنے آنے والا پرانا نیشنلسٹ مسلمان، دہریہ سوشلسٹ یا کمیونسٹ، علاقائی یا فرقہ وارانہ تعصب کا مریض یا احمدی نکلے گا۔

اس سے قبل کہ اس امر کی طرف توجہ مبذول کی جائے کہ رحلت کے وقت اقبال کے افکار و نظریات کی حتمی صورت کیا تھی، اس سوال کا جواب دینا ضروری ہے کہ کیا اقبال شاعر تھے، فلسفی تھے، ماہر دینیات تھے۔ آخر وہ اپنی نظر میں کیا تھے؟

اقبال نے اپنے آپ کو کبھی حقیقی معنوں میں شاعر نہیں سمجھا۔ ان کے پاس فن شاعری کی باریکیوں کی طرف توجہ کرنے کے لیے وقت نہ تھا۔ وہ شاعری کو اظہار خیال کا محض ایک ذریعہ سمجھتے تھے۔ انہوں نے خود ہی اپنی شاعری کے متعلق فرمایا ہے:

مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو اور بس۔ اس بات کو مدّنظر رکھ کر جن خیالات کو مفید سمجھتا ہوں ان کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کیا عجب کہ آئندہ نسلیں مجھے شاعر تصور نہ کریں۔

اقبال صحیح معنوں میں فلسفی بھی نہ تھے، کیونکہ انہوں نے کوئی مربوط فلسفیانہ نظام پیچھے نہیں چھوڑا، بلکہ فلسفے کو زندگی کے مادی اور روحانی پہلوؤں کے مطالعہ کے لیے ایک حربے کے طور پر استعمال کیا۔ وہ خود فرماتے ہیں:

میری کوئی فلسفیانہ تعلیمات نہیں ہیں۔ بلکہ میں تو نظام ہائے فلسفہ کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہوں، نہ مجھے ان اصولوں اور نتائج پر اعتماد ہے جو فلسفے نے پیش کر رکھے ہیں۔ خالص روحانی حقائق کی تفہیم کے سلسلہ میں انسانی عقل کو جتنا معتوب میں نے گردانا ہے، شاید ہی کسی نے گردانا ہو۔ بلاشبہ میں ان باتوں کو ذکر کرتا ہوں، جن میں عموماً فلسفی دلچسپی لیتے ہیں۔ لیکن میرے یہاں ان کا تعلق زندگی کے عملی مشاہدے اور تجربے سے ہے۔ فکری یا فلسفیانہ استدلال سے نہیں۔

اسی طرح اسلام میں گہری دلچسپی رکھنے کے باوجود اقبال نے کبھی عالم دین ہونے کا دعویٰ بھی نہ کیا۔ اقبال کے تصوّر اسلام کا اہم ترین پہلو کیا تھا؟ انہوں نے مذاہب عالم کی ارتقائی تاریخ کے مطالعے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مذہب اپنے اوائلی دور میں قومی تھا۔ جیسے کہ ہندوؤں، قدیم یونانیوں یا مصریوں کے مذاہب سے ظاہر ہے۔ بعد میں نسلی قرار پایا، جیسے کہ یہودیوں کے مذہب سے واضح ہے۔ عیسائیت نے تعلیم دی کہ مذہب نجی، ذاتی یا انفرادی معاملہ ہے۔ بالآخر اسلام ہی نے اس حقیقت کو آشکار کیا کہ مذہب قومی ہے، نہ نسلی نہ ذاتی بلکہ خالصتاً انسانی

ہے۔ اقبال فرماتے ہیں:

اسلام اصطلاح کے مفہوم قدیم کے مطابق ایک مذہب نہیں، بلکہ یہ تو ایک روّیہ ہے۔ ایسی آزادی کا روّیہ جو کائنات کے ساتھ حریفانہ کشاکش کی ترغیب دیتا ہے۔ دراصل یہ دنیائے قدیم کے تمام تصورات کے خلاف ایک احتجاج ہے۔ مختصراً اسلام انسان کا حقیقی انکشاف ہے۔

پس اقبال اسلام کو ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کا ایک اصول یا انسانی اتحاد کو وجود میں لانے کے لیے ایک عملی تحریک تصور کرتے تھے۔ اور ''مسلم'' سے ان کی مراد تھی وہ مردمومن جو لا اکراہ فی الدین'' کی روشنی میں اپنی مثالی شخصیت اور بلند کرداری کے ذریعے ساری انسانیت کو مرعوب کر کے اپنے عقیدے کی طرف لے آئے۔ اقبال نے ایسے ہی یکتا افراد پر مشتمل ایک نئے مسلم معاشرے کا خواب دیکھا تھا اور ان کی تمام شعری تخلیقات یا نثری کاوشیں اسی نئے معاشرے کو حقیقی طور پر وجود میں لانے کی خاطر عملی تجاویز قرار دی جاسکتی ہیں۔

فکر اقبال میں کئی موضوع ایسے ہیں جن پر دفتر کے دفتر لکھے جاسکتے ہیں۔ مگر اس مرحلے پر ان کے افکار ونظریات کی حتمی صورت یا خدوخال کا تعین کرتے وقت انتہائی اختصار سے کام لیا جائے گا۔ اقبال کے ہاں دین اسلام تمدن اسلام سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ لہٰذا ان کے نزدیک تجدید دین، احیائے تمدن کے بغیر ممکن نہیں۔ ان کے خیال میں دینیات کے شعبے میں روایتی علم الکلام چونکہ یونانی فلسفے کی بنیادوں پر ترتیب دیا گیا تھا، اس اعتبار سے فرسودہ تھا اور مسلمانوں کی جدید نسل اس سے استفادہ نہ کرسکتی تھی۔ پس ضروری تھا کہ جدید سائنس کی تحقیقات کی بنیاد پر ایک نئے علم الکلام کو تشکیل دیا جائے۔

اسی طرح باوجود اس کے کہ محکومی کے دور میں اقبال اجتہاد سے گریزاں تھے، انہیں مسلمانوں کے مستقبل میں آنے والے سیاسی آزادی کے دور میں فقہ اسلامی کی تدوین نو کی ضرورت کا احساس تھا۔ اس ضمن میں ۱۹۰۴ء سے لے کر وفات تک اجتہاد ان کی دلچسپی کا مرکز بنا رہا۔ اجتہاد کے معاملے میں انہوں نے اس قسم کی وسعت نظر کا مظاہرہ کیا ہے اور فقہ میں قرآن وسنت کی حدود میں رہتے ہوئے ایسی انقلابی تعبیریں ان کے ذہن میں تھیں، جنہیں قبول کرنے کے لیے اب تک نہ تو تقلید پسند اور تنگ نظر علماء تیار ہیں، نہ مسلم قوم۔ اقبال کا موقف تھا کہ ارکان دین میں تغیر وتبدل ممکن نہیں، لیکن بیشتر فروعی فقہی مسائل میں فقہ کے قدیم مکاتب فکر کی اندھا دھند تقلید کے بجائے اجتہاد کی نہ صرف گنجائش ہے، بلکہ اشد ضرورت ہے۔

احیائے تمدّن اسلام کے لیے جس طرح دینیات کے شعبے میں نئے علم الکلام اور قانون کے شعبے میں نئی فقہ کی تشکیل کی ضرورت تھی، اسی طرح تعلیم کے شعبے میں بھی انقلابی تبدیلیاں درکار تھیں۔ اس میدان میں اقبال قدیم اور جدید کا امتزاج چاہتے تھے۔ وہ برصغیر کے مفکروں میں پہلی شخصیت تھے جس نے جدیدیت اور مغربیت میں امتیاز واضح کیا۔ وہ بنیادی طور پر مغربیت کے مخالف تھے، لیکن جدیدیت یا تجدید کے ہمیشہ قائل رہے۔

اقبال نے اسلام کی اقتصادی یا معاشی تعلیمات کے متعلق بھی ذاتی اجتہاد کے ذریعے ایک رائے قائم کر رکھی تھی، جس کا اظہار وقتاً فوقتاً وہ اپنی شعری تخلیقات یا نثری تحریروں میں فرماتے رہے۔ اگر اقبال کے معاشی نظریات کا احاطہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ کارل مارکس کی تاریخ انسانی کی مادی تعبیر کو سراسر غلط تصور کرتے تھے۔ ان کے نزدیک بالشویک کمیونسٹ یا سوشلسٹ عقیدہ رکھنا دائرہ اسلام سے خارج ہونے کے مترادف ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ ملوکیت، مذہبی پیشوائیت، جاگیرداری اور سرمایہ داری کے بھی مخالف تھے اور ایسی اجارہ داریوں کو تعلیمات قرآنی کے برعکس سمجھتے تھے۔ ان کے تصور ریاست سے عیاں ہے کہ ان کے نزدیک اسلامی نظام جمہوریت میں کسی ایک مخصوص طبقے کی حکمرانی کی، خواہ وہ جاگیرداروں یا سرمایہ داروں پر مشتمل ہو، خواہ مزدوروں یا کاشتکاروں پر گنجائش نہ تھی۔ ان کی رائے میں اسلام کا مقصد ایک ایسے متوازن معاشی نظام کا انعقاد تھا جس میں کوئی ایک دوسرے کے استحصال کا باعث نہ بن سکے۔

طرز حکومت کے متعلق بھی اقبال کے نظریات قابل توجہ ہیں۔ وہ ہر قسم کی موروثیت یا آمریت کے مخالف تھے، کیونکہ ان کے نزدیک ایسے نظام اللہ کی مطلق حاکمیت کے تصور یا اسلامی تعلیمات کے منافی تھے۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں اموی دور کو عرب امپیریلزم یا آمریت کا عہد قرار دیا ہے۔ جمہوری طرز حکومت پر ایک مفکر کی حیثیت سے ان کا اعتراض خالصتاً اخلاقی اور اصولی تھا، کیونکہ اس میں انتخاب کی بنیاد ووٹروں کی گنتی پر رکھی جاتی ہے اور اس گنتی میں ایک صحیح یا مناسب امیدوار محض ایک ووٹ کم پڑنے سے کسی غلط یا غیر مناسب امیدوار کے مقابلے میں شکست کھا سکتا ہے۔ جمہوری نظام کے اس سقم کا اعتراف ہر سیاسی مفکر نے کیا ہے۔ اسی طرح وہ برصغیر میں ایسے جمہوری نظام کے انعقاد کے بھی خلاف تھے۔ جس سے مسلمان من حیث القوم ایک اقلیت میں منتقل کر دیے جائیں۔

اقبال کے ہاں اسلام کا تصور شوکت کے بغیر نامکمل ہے۔اسی بنا پر وہ برصغیر میں اسلام کو صحیح معنوں میں آزاد اور مسلمانوں کو طاقت ور دیکھنا چاہتے تھے۔انہوں نے برصغیر کے منتشر مسلمانوں کے سامنے مسلم قومیت کا اصول رکھا اور اسی اصول کی بنیاد پر ہی ان کے لیے شمال مغرب میں ایک علیحدہ مسلم ریاست کے قیام کی تجویز پیش کی۔

مگر اقبال کے نزدیک برصغیر میں آزاد مقتدر جدید اسلامی ریاست کا قیام بجائے خود آخری مقصد نہ تھا، بلکہ یہ بھی محض ایک ذریعہ تھا اسلامستان کو وجود میں لانے کا۔اقبال کا خیال تھا کہ ہندی مسلمان مادی طور پر تو شاید عالم اسلام کی کوئی مدد کرنے کے قابل نہ ہوں۔لیکن ذہنی طور پر یقیناً ان کی خدمت کر سکتے ہیں۔اسی سبب اقبال ان سے توقع رکھتے تھے کہ وہ مسلم ممالک کے اتحاد کو وجود میں لانے کے لیے اپنی کوششیں جاری رکھیں گے۔اقبال سید جمال الدین افغانی کے بڑے مداح تھے اور انہیں زمانۂ حال کا مجدّد سمجھتے تھے۔چنانچہ فرماتے ہیں:

> زمانۂ حال میں میرے نزدیک اگر کوئی شخص مجدد کہلانے کا مستحق ہے تو وہ صرف جمال الدین افغانی ہے۔مصر و ایران و ترکی و ہند کے مسلمانوں کی تاریخ جب کوئی لکھے گا تو اسے پہلے عبدالوہاب نجدی اور بعد میں جمال الدین افغانی کا ذکر کرنا ہوگا۔مؤخر الذکر ہی اصل میں مؤسس ہے۔زمانۂ حال کے مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا۔اگر قوم نے ان کو عام طور پر مجدد نہیں کہا یا انہوں نے خود اس کا دعویٰ نہیں کیا تو اس سے ان کے کام کی اہمیت میں کوئی فرق اہل بصیرت کے نزدیک نہیں آتا۔

یہ سب تو فکر اقبال کے خالصتاً اسلامی پہلو تھے، لیکن چونکہ اقبال کے ہاں اسلام دراصل انسان کا انکشاف ہے، اس لیے ان کے فکر کے انسانی پہلوؤں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔اقبال کا پیغام خودی صرف مسلمانوں ہی کے لیے وقف نہ تھا، بلکہ ہندوؤں اور ان سب اقوام کے لیے بھی تھا جو پسماندہ تھیں یا مغربی نوآبادتی اور استعماری قوتوں کے سیاسی و اقتصادی استحصال کا شکار تھیں۔اس ضمن میں ان کی تصانیف میں سے سب سے اہم پس چہ باید کرد اے اقوام شرق ہے۔اقبال نے پسماندہ اقوام کی جدوجہد آزادی کی ہر مرحلے پر حمایت کی۔انہیں خود اعتمادی اور اپنی حقیقت کو پہچاننے کا سبق دیا۔انہیں اپنے اپنے وسائل کو بروئے کار لا کر مستحکم ہونے، مغربی طاقتوں پر انحصار نہ کرنے اور آپس میں اتحاد قائم رکھنے یا ایک دوسرے کے ساتھ اختلافات کی صورت میں جنگ وجدل کے بجائے پرامن گفت وشنید

کے ذرائع اختیار کر کے اختلافات مٹانے کی تلقین کی۔ اقبال کا خیال تھا کہ متموّل مغربی اقوام کے سیاسی واقتصادی استحصال سے محفوظ رہنے کی خاطر ممکن ہے پسماندہ اقوام کو کسی نہ کسی مرحلے پر اپنی ایک علیحدہ ''جمعیت اقوام'' وجود میں لانے کی ضرورت پڑے۔ چنانچہ اس سلسلے میں انہوں نے تجویز کیا کہ جغرافیائی طور پر تہران کو ایسی مرکزیت حاصل ہے جہاں ایسا ادارہ قائم کیا جا سکتا ہے۔

عجیب بات ہے کہ اس ضمن میں اقبال کے خیالات کی بازگشت آج کی دنیا کے لبرل مفکروں کے ہاں بھی سنائی دینے لگی ہے۔

حالیہ عالمی اقتصادی بحران پر قابو پانے کے لیے بعض مغربی مفکرین نے اخلاقیات پر مبنی ایک نئے عالمی اقتصادی نظام کے قیام کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ ان کی رائے میں نوعِ انسان کی جھوٹی تفریقوں سے شدید نقصان پہنچا ہے مثلاً گورے اور کالے کی تمیز، کیپٹلسٹ اور سوشلسٹ کی تمیز یا ترقی یافتہ اور پسماندہ کی تمیز وغیرہ سراسر غلط اور انسانیت کے لیے مضر ثابت ہو چکی ہیں۔

اقبال کی بصیرت کا کمال ہے کہ آج دنیا بھر کے آزاد خیال مفکرین اور اقتصادی ماہرین بھی اپنے تجربات کی روشنی میں انہی نتائج پر پہنچے ہیں جن کا ذکر اقبال کی شعری تخلیقات اور نثری کاوشوں میں کئی مقامات پر ملتا ہے۔ انسانیت کی بقا کی خاطر انسانی اتحاد و یک جہتی کو وجود میں لانے کی ضرورت یا احترام آدمیت کے اخلاقی اصول پر مبنی ایک نئے عالمی اقتصادی نظام کے قیام کا احساس اقبال کو نہیں تھا تو اور کسے تھا؟ خیر یہ بحث تو بحیثیت مجموعی فکر اقبال کی دنیوی جہت سے متعلق تھی، اب مختصراً ان کے آفاقی، الہیاتی اور اخلاقی افکار کی حتمی شکل کا جائزہ لینے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اقبال کے تصور انفرادی اور اجتماعی خودی پر بہت کچھ لکھا گیا ہے، کیونکہ یہی ان کے فکر کا محور ہے، لیکن اس مسئلے پر اقبال کے نظریات کی حتمی شکل وہی رہی جو ان کی مثنویوں، اسرار خودی اور رموز بیخودی میں ملتی ہے۔ اقبال کے ہاں طاقتور انسانی شخصیت کی بہت اہمیت ہے، بلکہ وہ انسان ہی کے متعلق سوچتے ہوئے خدا تک پہنچے تھے۔ فرماتے ہیں:

کمزور اپنے آپ کو خدا میں گم کرتے ہیں۔ طاقتور اسے اپنے اندر ڈھونڈ نکالتے ہیں۔

اقبال کا مردِ مومن یا انسان کامل دراصل ایک طاقتور انسانی شخصیت ہی ہے اور ان کے

عشق رسولؐ کا راز بھی یہی تھا کہ وہ آنحضوؐر کو انسان کامل تصور کرتے تھے۔ ایک واقعہ مشہور ہے: اقبال سے فلسفے کے کسی انگریز پروفیسر نے پوچھا کہ آپ کے پاس خدا کا وجود ثابت کرنے کے لیے کون سی دلیل ہے! جواب دیا: فقط یہی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا فرمایا ہے۔ اسی بنا پر اقبال اپنے تصورات کے عالم میں خدا سے تو گستاخی کے مرتکب ہوتے ہیں، مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق میں ایسے گرفتار ہیں کہ ان کے منہ سے آنحضوؐر کی مدح وستایش اور احترام ہی کے الفاظ نکلتے ہیں۔

اقبال کے نزدیک جو اخلاقی خصوصیات خودی کو مستحکم کرتی ہیں وہ ہیں عشق، حریت، جرأت اور فقر۔ بقول اقبال ایسی خصوصیات کی حامل شخصیت اپنے اندر نفسیاتی تناؤ اور بیداری شعور کی کیفیات کی بنا پر مسلسل بے چینی، بے تابی اور بے قراری کے عالم میں رہتی ہے اور اس عالم میں رہنے کے سبب تخلیقی عمل کی صلاحیت رکھتی ہے۔ مستقبل کا مسلم معاشرہ ایسی ہی منفرد شخصیات پر مشتمل ہوسکتا ہے۔ لیکن جو منفی صورت انسانی شخصیت کی تباہی کا باعث بنتی ہے وہ ہے جمود۔ جمود ہی سے کسی معاشرے میں نفرت، خوف، بدعنوانی، بزدلی، گدائی، نقالی، بے ضمیری، خوشامد اور موقع پرستی فروغ پاتی ہیں۔ جو بالآخر قوموں کے زوال و انحطاط یا غلامی و محکومی کا باعث بنتی ہیں۔ مستحکم شخصیت کے لیے اقبال نے شاہین کی تشبیہ اس لیے استعمال کی ہے کہ بقول ان کے:

> شاہین کی تشبیہ محض شاعرانہ تشبیہ نہیں ہے۔ اس جانور میں اسلامی فقر کے تمام خصوصیات پائے جاتے ہیں:
>
> ۱۔ خوددار و غیرت مند ہے کہ اور کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا۔
>
> ۲۔ بے تعلق ہے کہ آشیانہ نہیں بناتا۔
>
> ۳۔ بلند پرواز ہے۔
>
> ۴۔ خلوت پسند ہے۔
>
> ۵۔ تیز نگاہ ہے۔

پس اقبال کا پیچ و تاب کھاتا ہوا بے تاب اور بے چین انسان دراصل ایک تخلیقی فعلیت ہے اور وہ اپنی قوتوں، اپنے گردونواح کی قوتوں اور ان کے ساتھ ہی کائنات کی تقدیر متشکل کر

سکتا ہے۔ مزید برآں اس بتدریج تغیر پذیر سلسلۂ عمل میں وہ خدا کا معاون اور ہمکار بننے کی اہلیت رکھتا ہے اور چونکہ وہ ایک بہتر اور خوب تر عالم کا تصور کر سکتا ہے، اس لیے موجود کو مطلوب میں بدلنے کی قدرت بھی رکھتا ہے۔

بقولِ اقبال عشق، عاشق اور معشوق دونوں کو انفرادیت کی خصوصیت بخشتا ہے۔ پس سب سے یکتا شخصیت کو حاصل کرنے کے لیے جستجو نہ صرف عبد کو یکتائیت عطا کرتی ہے، بلکہ ساتھ ہی معبود کی یکتائیت کی تصدیق بھی کرتی ہے۔ وہ اپنے ایک خط بنام ظفر احمد صدیقی مورخہ ۱۲/دسمبر ۱۹۳۶ء میں اپنے مسلک کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

جب احکام الٰہی خودی میں اس حد تک سرایت کر جائیں کہ خودی کے پرائیویٹ امیال و عواطف باقی نہ رہیں اور صرف رضائے الٰہی اس کا مقصود ہو جائے تو زندگی کی اس کیفیت کو بعض اکابر صوفیۂ اسلام نے فنا کہا ہے، بعض نے اسی کا نام بقا رکھا ہے۔ لیکن ہندی اور ایرانی صوفیہ میں سے اکثر نے مسئلہ فنا کی تفسیر فلسفہ ویدانت اور بدھ مت کے زیر اثر کی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اس وقت عملی اعتبار سے ناکارہ محض ہے۔ میرے عقیدے کی رو سے یہ تفسیر بغداد کی تباہی سے بھی زیادہ خطرناک تھی اور ایک معنی میں میری تمام تحریریں اس تفسیر کے خلاف ایک قسم کی بغاوت ہے۔

عشق و عقل، جبر و اختیار، حیات بعد موت اور زمان و مکاں کے متعلق بھی اقبال کے نظریات کی حتمی صورت میں کوئی نمایاں تبدیلی رونما نہ ہوئی۔ وہ عشق یا عرفان کو عقل ہی کی ایک اعلیٰ شکل سمجھتے تھے۔ جبر و اختیار کے مسئلے کے بارے میں ان کا موقف ہمیشہ یہی رہا کہ جس حد تک انسان کو اختیار ہے وہ کلی ہے۔ یعنی اگر انسان کے سامنے دو راستے ہوں تو خدا بھی اس کے لیے ان میں سے ایک منتخب نہیں کر سکتا۔ حیات بعد موت کے متعلق انہوں نے اپنا موقف سیّد نذیر نیازی کے نام ایک خط مورخہ ۱۹/اگست ۱۹۳۱ء میں یوں واضح کیا ہے:

میرے نزدیک حیات بعد الممات انسانی کوشش اور فضل الٰہی پر منحصر ہے۔ بچوں کے لیے بعثت زیادہ آسان ہے کیونکہ بعثت کا مفہوم ہے ایک نئے نظام زمانی کے ساتھ توافق کرنے کا: بچوں کے لیے یہ زیادہ آسان ہے، کیونکہ ہمارا نظام زمانی ان کی فطرت میں پورے طور پر راسخ نہیں ہوتا۔ خودی کا نہایت گہرا تعلق نظام زمانی سے ہے۔ مرنے والوں سے اس زندگی میں اتحاد ممکن نہیں، بعینہٖ اسی طرح جس طرح ہم آپس میں ملتے جلتے ہیں۔ مگر یہ اتحاد زیادہ تر کملا یا کامل انسانوں سے ہوتا ہے، کیونکہ خودی کی زندگی بعد از موت یقینی ہے۔ اس کے علاوہ وہ گذشتہ

تجربات کا اعادہ کر سکتے ہیں۔ عوام سے یہ امر محال ہے، خواہ وہ بعد از مرگ زندہ بھی ہوں۔ بعثت ثانیہ مظہر حیات ہے۔ اس میں انسانی کوشش کو بھی ایک حد تک دخل ہے۔ اس کو انسانی کامرانی بھی کہہ سکتے ہیں۔ ابدی موت اور زندگی خاص قسم کے اعمال سے متعین ہوتی ہے۔ میرے نزدیک اگر کوئی شخص ابدی موت کا خواہش مند ہو تو وہ اسے حاصل کر سکتا ہے۔ علی ہذا القیاس دوزخ اور جنت بھی زندگی کے مظاہر ہیں اور ان کی نوعیت کی تعیین اسی مرحلے پر منحصر ہے جو زندہ شے نے حاصل کیا ہو۔ اس زندہ شے کے لیے دوزخ اور جنت ہے یہاں تک کہ پودوں اور حیوانوں کے لیے بھی۔ مگر اس دوزخ و جنت کی نوعیت کی تعیین حیوانی زندگی اور نباتی زندگی کے اسٹیج پر منحصر ہے۔ یہی حال بچوں کی زندگی کا ہے۔ زندگی کے مدارج بے شمار ہیں۔ اس ضمن میں بہت سے امور عقل انسانی سے باہر ہیں۔ ان کے متعلق بصیرت و ایمان اور ذرائع سے پیدا ہوتا ہے۔ ان ذرائع کا تعلق فلسفے سے نہیں ہے۔

انہیں زمان و مکاں کے موضوع سے بے حد دلچسپی تھی اور یہ دلچسپی وفات تک قائم رہی۔ بہر حال اقبال اس مسئلے پر جس تفصیل سے اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہتے تھے۔ اس کا انہیں موقع نہ ملا۔ زمان و مکاں کے مسئلے کو وہ مسلمانوں کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ کیوں سمجھتے تھے، اس کی وضاحت بھی انہوں نے کہیں نہیں فرمائی اور اس ضمن میں محض قیاس آرائی ہی کی جا سکتی ہے۔

مارچ ۱۹۳۸ء کے دوسرے ہفتے میں راقم نے سنٹرل ماڈل اسکول سے آٹھویں جماعت کا امتحان دیا اور اقبال کی رحلت سے قبل نتیجہ نکل آیا۔ راقم امتحان میں کامیاب ہوا اور سائنس کے موضوع میں اوّل آیا۔ اقبال بے حد خوش ہوئے اور فرمایا کہ اگر راقم نے اگلی جماعتوں میں سائنس میں اپنی دلچسپی قائم رکھتے ہوئے میڈیکل ڈاکٹر بننے کا قصد کیا تو اسے اعلیٰ تعلیم کی تحصیل کی خاطر دی آنا (آسٹریا) بھیجیں گے۔ اقبال نے ایک وصیّت نامہ تو ۱۳/اکتوبر ۱۹۳۵ء کو لکھا تھا جو رجسٹرار کے دفتر میں رجسٹر کرایا گیا، لیکن اس کے چار یوم بعد یعنی ۱۷/اکتوبر ۱۹۳۵ء کو ایک اور تحریر اپنی یادداشت کی کتاب میں درج کی جس میں خصوصی طور پر راقم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

> جاوید کو میری عام وصیّت یہی ہے کہ وہ دنیا میں شرافت اور خاموشی کے ساتھ اپنی عمر بسر کرے۔ اپنے رشتے داروں کے ساتھ خوشگوار تعلقات رکھتے۔ میرے بڑے بھائی کی اولاد سب اس سے بڑی ہے، ان کا احترام کرے اور اگر ان کی طرف سے کبھی سختی بھی ہو تو برداشت کرے۔ دیگر رشتے داروں کو اگر اس سے مدد کی ضرورت ہو اور اس میں ان کی مدد کی توفیق ہو تو اس سے

کبھی دریغ نہ کرے۔ جو لوگ میرے احباب ہیں ان کا ہمیشہ احترام ملحوظ رکھے اور ان سے اپنے معاملات میں مشورہ کر لیا کرے۔ باقی دینی معاملات میں میں صرف اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ میں اپنے عقائد میں بعض جزوی مسائل کے سوا جو ارکان دین میں سے نہیں ہیں، سلف صالحین کا پیرو ہوں اور یہی راہ بعد کامل تحقیق کے ط معلوم ہوتی ہے۔ جاوید کو بھی میرا یہی مشورہ ہے کہ وہ اس راہ پر گامزن رہے اور اس بدقسمت ملک ہندوستان میں مسلمانوں کی غلامی نے جو دینی عقائد کے نئے فرقے مختص کر لیے ہیں، ان سے احتراز کرے۔ بعض فرقوں کی طرف لوگ محض اس واسطے مائل ہوتے ہیں کہ ان فرقوں کے ساتھ تعلق پیدا کرنے سے دنیوی فائدہ ہے۔ میرے خیال میں بڑا بدبخت ہے وہ انسان جو صحیح دینی عقائد کو مادی منافع کی خاطر قربان کر دے۔ غرض یہ ہے کہ طریقہ حضرات اہل سنت ط ہے اور اسی پر گامزن رہنا چاہیے اور ائمہ اہل بیت کے ساتھ محبت اور عقیدت رکھنی چاہیے۔

وسط مارچ ۱۹۳۸ء سے اقبال کی حالت تشویش انگیز ہوتی چلی گئی۔ انہی ایام میں دمے کے پے در پے دوروں کے بعد نیم بیہوشی کے عالم میں راقم نے انہیں دو مرتبہ اپنی خوابگاہ میں مرزا اسد اللہ خان غالب اور مولانا جلال الدین رومی سے باتیں کرتے سنا تھا۔ دونوں مرتبہ علی بخش کو بلوا کر پوچھا کہ میرزا غالب (یا مولانا رومی) ابھی اٹھ کر گئے ہیں۔ دیکھنا کہیں چلے تو نہیں گئے اور علی بخش کے اس جواب پر کہ یہاں تو کوئی بھی نہیں تھا، فرمایا۔ چلو ٹھیک ہے۔

چند ہفتے گزرنے کے بعد پاؤں متورم ہو گئے۔ یہ سب علامتیں اچھی نہ تھیں۔ ۱۹/اپریل، ۱۹۳۸ء کو بلغم میں خون آنے لگا تھا اور نبض خفیف ہو گئی تھی۔ حکیم محمد حسن قرشی اور ڈاکٹر جمعیت سنگھ نے انہیں دیکھ کر تشویش کا اظہار کیا۔ ۱۹/اپریل ۱۹۳۸ء کو اقبال نے غالباً اپنا آخری خط سر راس مسعود کے سیکرٹری ممنوں حسن خان کے نام تحریر کروایا جس میں فرمایا کہ دمے کے متواتر دوروں نے انہیں زندگی سے تقریباً مایوس کر دیا ہے اور یہ کہ آنکھوں کا آپریشن مارچ ۱۹۳۸ء میں ہونے والا تھا، مگر دمے کی وجہ سے اسے ستمبر ۱۹۳۸ء تک ملتوی کرنا پڑا۔

۲۰/اپریل ۱۹۳۸ء کی صبح کو ان کی طبیعت کچھ سنبھل گئی تھی۔ شام کی فضا میں موسم بہار کے سبب پھولوں کی مہک تھی اس لیے پلنگ خوابگاہ سے اٹھوا کر دالان میں بچھوایا اور گھنٹہ بھر کے لیے وہیں لیٹے رہے پھر جب خنکی بڑھ گئی تو پلنگ گول کمرے میں لانے کا حکم دیا۔ گول کمرے میں ساڑھے سات سالہ منیرہ آپا جان کے ساتھ ان کے پاس گئی۔ منیرہ ان کے بستر میں گھس کر

ان سے لپٹ گئی اور ہنسی مذاق کی باتیں کرنے لگی۔ منیرہ عموماً دن میں تین بار اقبال کے کمرے میں جاتی تھی۔ صبح اسکول جانے سے پہلے، دوپہر کو اسکول سے واپس آنے پر اور شام کو سونے سے قبل۔ لیکن اس شام وہ ان کے پہلو سے نہ اٹھتی تھی۔ دو تین بار آپا جان نے اسے چلنے کے لیے کہا، مگر وہ نہ مانی۔ یہی کہتی رہی۔ بس تھوڑی دیر اور۔ اس پر اقبال نے مسکراتے ہوئے آپا جان سے انگریزی میں کہا، اسے اس کی حس آگاہ کر رہی ہے کہ شاید باپ سے یہ آخری ملاقات ہے۔ منیرہ اور آپا جان کے اندر چلے جانے کے بعد فاطمہ بیگم، پرنسپل اسلامیہ کالج برائے خواتین گھنٹے آدھ گھنٹے کے لیے آ بیٹھیں اور ان سے کالج میں درس قرآن کے انتظامات کے متعلق باتیں کرتی رہیں۔

رات کو آٹھ ساڑھے آٹھ بجے چوہدری محمد حسین، سید نذیر نیازی، سید سلامت اللہ شاہ، حکیم محمد حسن قرشی اور راجہ حسن اختر آ گئے۔ ان ایام میں میاں محمد شفیع اور ڈاکٹر عبدالقیوم تو جاوید منزل میں ہی مقیم تھے۔ اقبال کے بلغم میں ابھی تک خون آ رہا تھا اور اسی بنا پر چوہدری محمد حسین نے ڈاکٹروں کے ایک بورڈ کی میٹنگ کا انتظام جاوید منزل میں کیا تھا۔ اس زمانے کے معروف ڈاکٹر کرنل امیر چند، الٰہی بخش، محمد یوسف، یار محمد، جمعیت سنگھ وغیرہ سبھی موجود تھے اور انہوں نے مل کر اقبال کا معائنہ کیا۔ گھر میں ہر کوئی ہراساں دکھائی دیتا تھا، کیونکہ ڈاکٹروں نے کہہ دیا تھا کہ اگر رات خیریت سے گزر گئی تو اگلے روز نیا طریق علاج شروع کیا جائے گا۔ کوٹھی کے صحن میں مختلف جگہوں پر اقبال کے اصحاب دو دو تین تین کی ٹولیوں میں کھڑے باہم سرگوشیاں کر رہے تھے۔ اقبال سے ڈاکٹروں کی رائے مخفی رکھی گئی، لیکن وہ بڑے تیز فہم تھے۔ احباب کا بکھرا ہوا شیرازہ دیکھ کر انہیں یقین ہو گیا تھا کہ ان کی موت کا وقت قریب آ پہنچا ہے۔ چند یوم پیشتر جب کسی نے ان کی صحت کے بارے میں تشویش کا اظہار کیا تھا تو فرمایا: میں موت سے نہیں ڈرتا۔ بعد ازاں اپنا یہ شعر پڑھا تھا:

نشانِ مرد مومن با تو گویم
چوں مرگ آید تبسم برلب اوست

پس اس رات وہ ضرورت سے زیادہ ہشاش بشاش نظر آتے تھے۔ راقم کوئی نو بجے کے قریب گول کمرے میں داخل ہوا تو پہچان نہ سکے۔ پوچھا: کون ہے؟ راقم نے جواب دیا: جاوید۔ ہنس پڑے، فرمایا: جاوید بن کر دکھاؤ تو جانیں۔ پھر اپنے قریب بیٹھے ہوئے چوہدری محمد حسین سے

مخاطب ہو کر فرمایا: چوہدری صاحب! اسے ''جاوید نامہ'' کے آخر میں وہ دعا ''خطاب بہ جاوید'' ضرور پڑھوا دیجیے گا۔ اتنے میں علی بخش اندر داخل ہوا۔ اسے اپنے پاس بیٹھنے کے لیے کہا۔ علی بخش نے بلند آواز سے رونا شروع کر دیا۔ چوہدری محمد حسین نے اسے حوصلہ رکھنے کی تلقین کی۔ فرمایا آخر چالیس برس کی رفاقت ہے، اسے رو لینے دیں۔ رات کے گیارہ بجے اقبال کو نیند آ گئی۔ چوہدری محمد حسین، حکیم محمد حسن قرشی، سید نذیر نیازی اور سید سلامت اللہ شاہ خاموشی سے اٹھ کر چلے گئے۔ البتہ میاں محمد شفیع اور ڈاکٹر عبدالقیوم کے علاوہ راجہ حسن اختر نے اس رات جاوید منزل ہی میں قیام کیا اور باہر دالان میں چارپائی بچھا کر لیٹ گئے۔ راقم بھی حسب معمول اپنے کمرے میں جا کر سو رہا۔

اقبال کوئی گھنٹے بھر کے لیے سوئے ہوں گے کہ شانوں میں شدید درد کے باعث بیدار ہو گئے۔ ڈاکٹر عبدالقیوم اور میاں محمد شفیع نے خواب آور دوا دینے کی کوشش کی، مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ فرمایا: دوا میں افیون کے اجزا ہیں اور میں بے ہوشی کے عالم میں مرنا نہیں چاہتا۔ علی بخش اور میاں محمد شفیع ان کے شانے اور کمر دبانے لگے تا کہ درد کی شدت کم ہو، لیکن تین بجے رات تک ان کی حالت غیر ہو گئی۔ میاں محمد شفیع، حکیم محمد حسن قرشی کو بلانے ان کے گھر گئے، مگر ان تک رسائی نہ ہو سکی اور ناکام واپس آ گئے۔ اقبال درد سے نڈھال تھے۔ میاں محمد شفیع کو دیکھ کر فرمایا: افسوس قرشی صاحب بھی نہیں پہنچ سکے۔ تقریباً پونے پانچ بجے راجہ حسن اختر اٹھ کر اندر آئے۔ انہیں بھی حکیم محمد حسن قرشی کو بلانے کے لیے کہا۔ وہ بولے: حکیم صاحب رات بہت دیر سے گئے تھے اور اس وقت انہیں بیدار کرنا شاید مناسب نہ ہو۔ اسی پر اقبال نے یہ قطعہ پڑھا:

سرود رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگار ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

راجہ حسن اختر قطعہ کا مطلب سمجھتے ہی حکیم محمد حسن قرشی کو لانے کے لیے روانہ ہو گئے۔ اقبال کے کہنے پر ان کا پلنگ گول کمرے سے ان کی خواب گاہ میں پہنچا دیا گیا۔ انہوں نے فروٹ سالٹ کا گلاس پیا۔ صبح کے پانچ بجنے میں کچھ منٹ باقی تھے۔ اذانیں ہو رہی تھیں سب کا خیال تھا کہ فکر کی رات کٹ گئی۔ ڈاکٹر عبدالقیوم اور میاں محمد شفیع صبح کی نماز ادا کرنے کی خاطر قریب کی مسجد میں پہنچ گئے تھے اور صرف علی بخش ہی اقبال کے پاس رہ گیا تھا۔ اسی اثناء میں

اچانک اقبال نے اپنے دونوں ہاتھ دل پر رکھے اوران کے منہ سے ''ہائے'' کا لفظ نکلا۔علی بخش نے فوراً آگے بڑھ کرانہیں شانوں سے اپنے بازوؤں میں تھام لیا۔فرمایا: دل میں شدید درد ہے اورقبل اس کے کہ علی بخش کچھ کر سکے، انہوں نے ''اللہ'' کہا اوران کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔ ۲۱را پریل ۱۹۳۸ءکو پانچ بج کر چودہ منٹ صبح کی اذانوں کی گونج میں اقبال نے اپنے دیرینہ ملازم کی گود میں اپنی جان جان آفریں کے سپرد کردی۔طلوعِ آفتاب کے بعد جب راقم اورمنیرہ نے ان کے دروازے کی دہلیز پر کھڑے ہوکر ڈرتے ڈرتے اندر جھانکا تو خواب گاہ میں کوئی بھی نہ تھا۔کھڑکیاں کھلی تھیں اور وہ پلنگ پر سیدھے لیٹے تھے۔انہیں گردن تک سفید چادر نے ڈھانپ رکھا تھا، جو کبھی کبھار ہوا کے جھونکوں سے ہل جاتی تھی۔ان کی آنکھیں بند تھیں، چہرہ قبلہ کی طرف تھا،مونچھوں کے بال سفید ہو چکے تھے اور سر کے بالوں کے کناروں پر راقم کے کہنے سے آخری بار لگائے ہوئے خضاب کی ہلکی سی سیاہی موجود تھی۔

چوہدری محمد حسین اوراقبال کے دیگر احباب صبح ہی آ گئے اوراقبال کی تجہیز وتکفین سے متعلق مسائل پر غور کرنے لگے۔سب سے اوّل مسئلہ یہ تھا کہ تدفین کہاں ہو۔چوہدری محمد حسین کی تجویز تھی کہ انہیں شاہی مسجد کے کسی حجرہ میں دفن کیا جائے۔چنانچہ وہ اورمیاں نظام الدین،میاں امیر الدین، سید محسن شاہ، خلیفہ شجاع الدین، خان سعادت علی خان،مولانا غلام رسول مہر اورعبدالمجید سالک شاہی مسجد گئے اور حجروں کے معاینے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ مسجد کے جنوب مشرقی مینار کے زیر سایہ سیڑھیاں کی بائیں جانب کے خالی قطعۂ زمین کو مدفن کے طور پر استعمال کیا جائے۔اس کے لیے حکومت ہند کے محکمہ آثار قدیمہ (جس کا صدر دفتر دہلی میں تھا) کی منظوری لینا ضروری تھا۔سواس ضمن میں پنجاب کے وزیر سر سکندر حیات سے رابطہ قائم کیا گیا جو ان دنوں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں شرکت کے لیے کلکتے گئے ہوئے تھے۔سر سکندر حیات نے مجوزہ مقام تدفین سے اتفاق نہ کرتے ہوئے اسلامیہ کالج ریلوے روڈ کی گراؤنڈ کی متبادل تجویز پیش کی۔مجوزہ مقام تدفین پر یونینسٹ پارٹی کے ہندو اور سکھ وزراء بھی معترض تھے۔البتہ مسلم وزراء نے سر سکندر حیات کی تجویز کی تائید کی۔بعض حلقوں کی طرف سے مسجد نیلا گنبد کے سامنے خالی پلاٹ کو مدفن بنانے کی تجویز بھی پیش کی گئی، مگر اقبال کے احباب نے ان تجاویز کو کوئی اہمیت نہ دی اور اپنے فیصلے پر اڑے رہے۔بعدازاں ان میں سے پانچ افراد پر مشتمل ایک وفد نے پنجاب کے گورنر سر ہنری کریک سے ملاقات کی، جس نے دوپہر تک مجوزہ قطعۂ زمین کے لیے دہلی سے

اجازت دلا دی اور اس سلسلے میں چار بجے تک تمام کاغذی کارروائی بھی مکمل کر لی گئی۔

اقبال کی رحلت کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلی۔ اخباروں کے ضمیمے چھپے۔ سرکاری دفاتر، اسکول، کالج، عدالتیں، اسلامی ادارے سب بند ہو گئے اور لوگ ہجوم در ہجوم جاوید منزل کا رُخ کرنے لگے۔ ہزاروں لوگوں نے باری باری اقبال کے چہرے کی آخری زیارت کی اور گزرتے چلے گئے۔ وہ سامنے گول کمرے میں سے ان کی خواب گاہ میں داخل ہو کر بغلی غسل خانے سے باہر نکلتے تھے۔ یہ تانتا شام تک بندھا رہا۔

پانچ بجے شام جاوید منزل سے جنازہ اٹھا۔ جنازے کے ساتھ لمبے لمبے بانس مضبوطی سے باندھ دیے گئے تاکہ زیادہ سے زیادہ مسلمان کندھا دے سکیں۔ جنازے کے ساتھ ہزاروں کی تعداد میں پنجاب کے ہر شعبہ زندگی کے لوگ بلاامتیاز مذہب و ملّت شامل تھے۔ وزرائے حکومت، حکام، اعلیٰ عدالتوں کے جج، وکلا، کالجوں کے پروفیسر، اساتذہ، طلبہ، شعرا، ادبا صحافی، مشائخ، علمائ، تجار صناع غرضیکہ عام فرزندان اسلام باچشم گریاں کلمۂ شہادت کا ورد کرتے جا رہے تھے۔ جنازے پر کئی پھولوں کی چادریں چڑھائی گئیں اور پیدل اور سوار پولیس، سرخ پوش رضا کار، نیلی پوش والنٹیر، خاکساروں کے جیش، کامریڈ مسلم جیش، الہلال پارٹی اور کئی جیوش اپنی اپنی وردیاں پہنے جنازے کے ہمراہ تھے راقم کو اب تک یاد ہے، وہ جنازے کے جلوس میں سب سے آخر میں تھا۔ جنازہ قلعہ گوجر سنگھ اور فلیمنگ روڈ سے ہوتا ہوا اسلامیہ کالج کی وسیع و عریض گراؤنڈ میں پہنچا، جہاں نماز جنازہ کی ادائیگی کے لیے تقریباً بیس ہزار مسلمان موجود تھے۔ اتنے میں شور ہوا کہ نماز جنازہ بادشاہی مسجد میں پڑھی جائے گی تاکہ شہر کے لوگ بھی شریک ہو سکیں۔ لوگوں نے افراتفری میں جنازہ اٹھایا اور مجمع بدحواسی کے عالم میں ریلوے روڈ کی طرف بڑھا۔ عاشق حسین بٹالوی اپنی کتاب چند یادیں، چند تاثرات میں فرماتے ہیں کہ جسٹس دین محمد نے سخت غصے میں کہا کہ یہ کیا بیہودگی ہے۔ وہاں نماز دوبارہ بھی تو پڑھی جا سکتی ہے، لیکن ہنگامے میں اُن کی کسی نے نہ سنی۔ عاشق حسین بٹالوی لکھتے ہیں:

> بخشی سر ٹیک چند...... اقبال کی عظمت پہچاننے میں کسی مسلمان سے پیچھے نہ تھے۔ مجھ سے کہنے لگے۔ تمھیں تو اقبال کو دفن کرنا بھی نہیں آتا۔ تم اس کی قدر کیا پہچانو گے۔

بعدازاں جب جنازہ برانڈرتھ روڈ سے دہلی دروازے تک پہنچا تو اس کے ساتھ سوگواروں کی تعداد کوئی پچاس ساٹھ ہزار تک پہنچ گئی۔ سات بجے کے بعد جنازہ شاہی مسجد پہنچا۔

آٹھ بجے شب شاہی مسجد کے صحن میں مولانا غلام مرشد نے نماز جنازہ پڑھائی۔ بعدازاں میّت کو مقام تدفین کے قریب لاکر رکھ دیا گیا، کیونکہ اقبال کے برادر اکبر شیخ عطا محمد اور چند دیگر اعزہ نے ابھی سیالکوٹ سے پہنچنا تھا۔ وہ لوگ تقریباً ساڑھے نو بجے رات وہاں پہنچے اور شیخ عطا محمد نے آخری بار اقبال کے چہرے کا دیدار کیا۔ پونے دس بجے کی قریب اس عاشق رسولؐ اور داعی احیائے اسلام کے جسم کو تابوت میں رکھ کر سپرد خاک کر دیا گیا۔

مزار اقبال کی تعمیر کے لیے ۱۹۳۸ء ہی سے چوہدری محمد حسین کی زیر صدارت مرکزی مجلس اقبال قائم ہوگئی تھی، مگر آٹھ سال تک تعمیر مزار کا کام شروع نہ ہوسکا اور اس مدت میں کچی قبر پر ایک پختہ تعویذ ہی اقبال کا مدفن تھا۔ بہرحال مزار کی تعمیر کا آغاز ۱۹۴۶ء کے اواخر میں ہوا۔ اور چار سال بعد ۱۹۵۰ء میں اس کی تکمیل ہوئی۔ اس پر خرچ آنے والی رقم خاصانِ بارگاہ اقبال نے فراہم کی اور عطیات کے لیے اپیل نہ کی گئی۔ خاکہ تعمیر مزار حکومت افغانستان نے اپنے اطالوی ماہر سے بنوا کر بھیجا، جو مرکزی مجلس اقبال نے اس لیے نامنظور کر دیا کہ نہ صرف انداز تعمیر غیر اسلامی نوعیت کا تھا بلکہ اطالوی کیتھولک روایت کے مطابق تربت پر اقبال کے مجسّمے کو ہاتھ باندھے ہوئے لٹایا گیا۔ بعدازاں حیدرآباد دکن کے نواب زین یار جنگ نے خاکہ تیار کیا، مگر اس خاکے میں نسوانی حد تک نفاست تھی اور مزار کے اندر تربت یوں دکھائی دیتی تھی جیسے کسی منقش سنہری پنجرے میں بلبل قید کر دی گئی ہو۔ چوہدری محمد حسین نے نواب زین یار جنگ کو لاہور بلوایا اور انہیں ساتھ لے کر موقع پر گئے۔ پھر شاہی مسجد کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر فرمایا: دیکھیے! نواب صاحب ایک طرف مسجد ہے جو مسلمانوں کی دینی طاقت کی مظہر ہے اور دوسری طرف قلعہ ہے جو ان کی دنیوی قوت کا مظہر ہے۔

ان تعمیرات کے درمیان مزار اقبال تبھی بھلا لگے گا جب وہ سادگی اور مضبوطی کی خصوصیات کا حامل ہو۔ نیز اقبال کی شخصیّت میں بھی تو یہی خصوصیات نمایاں تھیں۔ اس پر نواب زین یار جنگ نے موجودہ مزار کا خاکہ تیار کیا۔ تعمیر کا ٹھیکہ چوہدری فتح محمد نے لیا۔ محمد سلیمان چیف انجینئر اور میاں بشیر احمد اوورسیر نے بلا معاوضہ رہنمائی اور نگرانی کی خدمات انجام دیں۔ تعمیر میں استعمال ہونے والا سنگ سرخ اور سنگ مرمر ریاست دھولپور (انڈیا) سے حاصل کیا گیا اور اس پتھر کو دہلی، آگرہ اور مکرانہ کے کاریگروں نے تراشا۔ مزار کے اندر کندہ قرآنی آیات اور اشعار اقبال چوہدری محمد حسین کا انتخاب ہیں۔ آیات الٰہی کی خطاطی حافظ محمد یوسف سدیدی

(اب مرحوم) نے کی ہے اور اشعار اقبال کی محمد اقبال ابن پروین رقم نے۔ لوح مزار پر، چبوترے اور تعویذ کے لیے سنگ لاجورد حکومت افغانستان کی طرف سے ہدیہ ہے۔ لوح مزار کی عبارتیں افغانستان ہی سے کندہ شدہ آئی تھیں۔

خیر یہ تو ذکر تھا اس نشان کا جہاں اقبال کا جسم دفن کیا گیا، لیکن اُس کی روح کی بیتابی، بے چینی اور بے قراری آج بھی اقبال کے رازداروں کے سینوں میں شعلہ کی طرح لپکتی ہے۔